افکار
دس سالہ نمبر

پام روز ٹائلٹ سوپ
آپ کے حسن کو نکھارتا
اور آپ کی دلکشی کو
دوبالا کرتا ہے
اس کا ملائم جھاگ نازک سے نازک جلد کو
صاف کرکے رنگ کو نکھارتا ہے اور جلد کی
ملائمت کو برقرار رکھتا ہے۔
اپنی عمدہ خصوصیات کے سبب
پام روز اس دور کا مقبول
ترین صابن ہے۔
PALMROSE
TOILET
SOAP
PALMROSE
MADE IN PAKISTAN
کریسنٹ پاک سوپ
اینڈ آئل ملز۔ کراچی۔
خوبصورتی دوبالا کرنے والا عصر حاضر کا واحد صابن
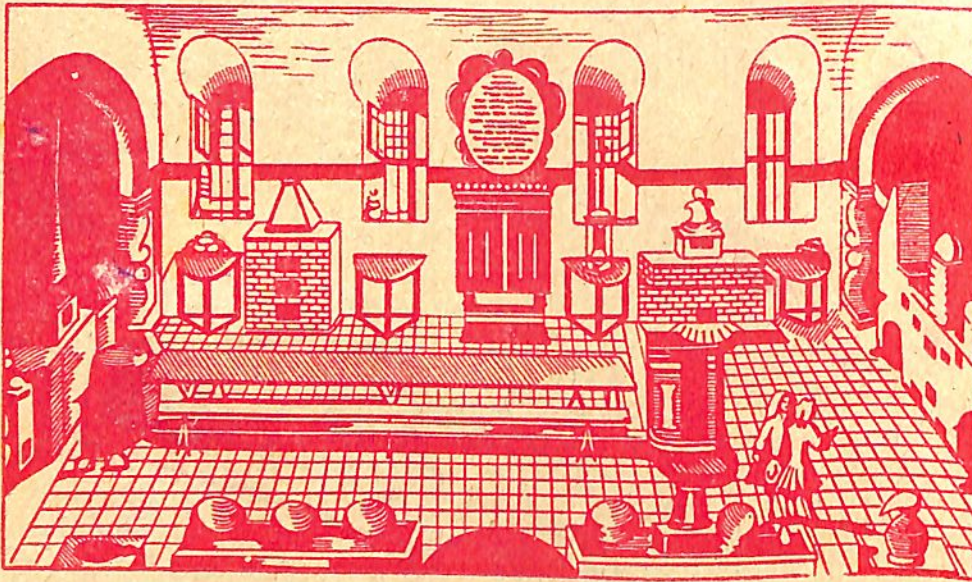
لیدر کلاتھ ۔ کرم کش ادویہ ۔ بارود ۔ غیر آہنی دھاتیں ۔ پلاسٹک ۔ رنگ و روغن ۔
ایک نئے خیال کی نمو...
اٹھارویں صدی میں انسان نے قدرتی قوتوں پر قابو پانے کے لئے سنجیدگی سے کوشش شروع کی تھی۔ یہ تصویر ۱۷۲۰ء کی ایک لیبورٹری کی ہے۔ یہ لیبورٹری جدید ترین لیبورٹری سے کسقدر مختلف ہے۔
تہذیب کے موجودہ بلند معیار پر پہنچنے کے لئے ہم اپنے اسلاف کی ایجادات کے شکر گزار ہیں۔ ایجادات کا یہ کام آج بھی جاری ہے۔ امپیریل کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ کے سائنسداں دواؤں۔ رنگوں۔ کھادوں اور لیدر کلاتھ وغیرہ کی تیاری کے بہتر سے بہتر طریقے ایجاد کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آئی۔سی۔آئی کا نشان کیمیائی صنعت میں سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔
ICI
امپیریل کیمیکل انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
(امپیریل کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ لندن کی ایک ذیلی کمپنی)
کراچی
لاہور
چٹاگانگ
ڈھاکہ
ICP 128

١٩٥٥
١٩٤٥

۱۹۵۵
۱۹۶۵
دس ساله نمبر

مکتبۂ افکار کی ۳ منفرد اور معیاری کتابیں

★

کالا سورج	کرشن چندر	۴-۸-۰
چند تصویر بتاں	جعفر منصور	۲-۸-۰
ستاروں کے خواب	صہبا و سعید	۳-۸-۰

مکتبہ افکار کی کتابیں خرید فرما کر افکار کی سرپرستی فرمائیے

مکتبہ افکار — ادبستان - بندر روڈ - کراچی

۱۹۴۵ ۱۹۵۵
دس ساله نمبر

۱۹۵۵ ۱۹۴۵
دس سالہ نمبر

دس الگ الگ شکل کے آدمیوں کے نام ایک ہو سکتے ہیں

لیکن ـــــ ان کی صورتیں ایک نہیں ہو سکتیں۔

معمے ـــــ ایک جیسے ہو سکتے ہیں

لیکن

انعامات کی رقم، انعامات کی ادائیگی، اور آپ کی خدمت کا طریقہ یکساں نہیں ہو سکتا

ہر بہتر صورت سے آپ کی بہتر خدمت کرتے ہیں

زیادہ اور یقینی انعام پیش کرتے ہیں

اس ماہ اپنی ذہنی قوتوں کو بروئے کار لاکر آپ حاصل کر سکتے ہیں ـــ

Rs. 5,000

پچاس ہزار روپے نقد

رومان معمے ـــ ہر بڑی مالی ضرورت کو پورا کرنے کا آسان ذریعہ ہیں

تفصیلات کیلئے رومان کراچی کا اس ماہ کا شمارہ حاصل کیجئے!

رومان معمے ـــــ ملک کے عظیم ترین ایماندار ـــــ رومان معمے

۱۹۵۵
۱۹۳۵
دس سالہ نمبر
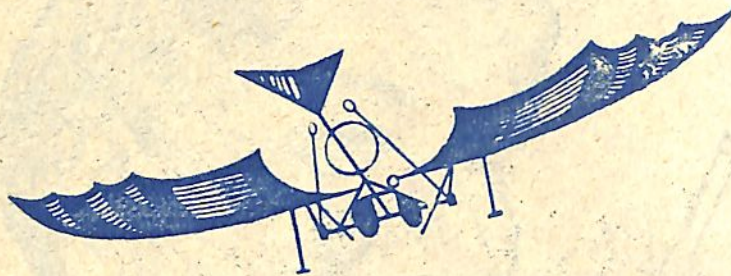
- لیدر کلاتھ - کرم کش ادویہ - بارود - غیر آہنی دھاتیں - پلاسٹک - رنگ و روغن -
رنگ و روغن - پلاسٹک - غیر آہنی دھاتیں - بارود - کرم کش ادویہ - لیدر کلاتھ - ادویہ - کیمیاوی رنگ -
کیمیاوی مرکبات - کیمیاوی کھاد - کیمیاوی رنگ - ادویہ - لیدر کلاتھ - کرم کش ادویہ - غیر آہنی دھاتیں -
ایک خواب
جو حقیقت ثابت ہوا...
تقریباً ۵۰۰ سال پہلے ہوائی جہاز کا تخیل شہرۂ آفاق مصور
لیونارڈو ڈی ونسی کا ایک خواب تھا۔ آج یہ خواب حقیقت بن چکا ہے۔
ایجادات کا جذبہ ہی ہمارے معیار زندگی کو بلند کرتا ہے۔
امپیریل کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ میں ایجادات کرنے والی جماعت
رنگ و روغن۔ کیمیاوی کھاد۔ لیدر کلاتھ وغیرہ کو زیادہ موثر
اور بہتر بنانے کیلئے متواتر تجربات کرتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
آئی۔ سی۔ آئی کا نشان کیمیاوی صنعت میں سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔
ICI
امپیریل کیمیکل انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
(امپیریل کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ لندن کی ایک ذیلی کمپنی)
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ
ICP-127
- پلاسٹک - رنگ و روغن - کیمیاوی مرکبات - کیمیاوی کھاد - کیمیاوی رنگ - ادویہ -

مُدیر

صہبا لکھنوی

قیمت
تین رُوپے

مکتبۂ افکار
ادبستان - بندر روڈ - کراچی

زرِ سالانہ
آٹھ رُوپے

اشاریہ ۲۲ صہبا لکھنوی

پینٹنگس

حسن بیگ ۲۷ حسنِ تخیل
۲۸ ایک منظر
قرۃ العین حیدر ۳۷ موسیقی
۳۷ ریہرسل

عکسِ تحریر غزل

(۸) فیض احمد فیض ۲۹ اثر لکھنوی
پروفیسر اختر انصاری تا احمد ندیم قاسمی
ظہیر کاشمیری ۳۶ سردار جعفری
شان الحق حقی

تصاویر

۳۸ تا ۴۰
قرۃ العین حیدر — فیض احمد فیض
احمد ندیم قاسمی — پروفیسر اختر انصاری
تمنائی — پرکاش پنڈت
اُزیرا احمد — سید بادشاہ حسین
ابو الکلام شمس الدین — فارغ بخاری
رضا ہمدانی — ہنسراج رہبر
ساحر لدھیانوی — راجندر سنگھ بیدی
رضیہ سجاد ظہیر — جاں نثار اختر
مہندر ناتھ — سہیل عظیم آبادی
کرشن چندر — لاہوتی

ابوالفضل صدیقی ۴۰ محمد خالد اختر
ظہور نظر

ناولٹ

(۱) ابوالکلام شمس الدین ۴۱ آشیانہ

ڈرامہ

(۳) پیرکاش پنڈت ۷۱ مُفت خورہ
انور عنایت اللہ ۷۷ تاش گھر
ابراہیم یوسف ۸۶ ایک زینہ

رُباعی، نظم، گیت

(۱۸) جوش ملیح آبادی ۹۳ تازہ رباعیات
پروفیسر شور (علیگ) ۹۵ آزادی کے بعد
شاد عارفی ۹۷ گر عورت کا دل کتنا؟
جاں نثار اختر ۹۹ تمہارے شہر میں
غلام ربانی تاباں ۱۰۱ انسان
قتیل شفائی ۱۰۲ گیت
ظہور نظر ۱۰۳ ایک ساحل ایک یاد
ابن انشاء ۱۰۵ کیسا بلانکا
صہبا لکھنوی ۱۰۶ تعمیرِ نو
مصطفیٰ زیدی ۱۰۷ اندیشہ ہائے دور و دراز
احمد ریاض ۱۰۸ فریب
حسن اعرابی ۱۰۹ نہر کے کنارے
عبدالعزیز خالد ۱۱۰ پارہ پارہ
اختر پیامی ۱۱۱ یادِ وطن
بلراج کومل ۱۱۲ الاؤ
مسلم ضیائی ۱۱۳ روشنی۔ زندگی
شاذ تمکنت ۱۱۴ اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
حسن حمیدی ۱۱۶ بری سی بات

افسانہ، طنز، سفرنامہ، خاکہ

(۱۲) ڈاکٹر ملک راج آنند ۱۱۷ ماہرِ زراعت
خواجہ احمد عباس ۱۲۳ ایک سفرنامہ
قرۃ العین حیدر ۱۲۷ امبوا تلے ڈولا رکھ دو مسافر
صدیقہ بیگم سیوہاروی ۱۳۴ بیمار
ابوالفضل صدیقی ۱۳۹ ستاروں کی چال
انور عظیم ۱۵۷ ایک نیام دو تلواریں
عزیز اثری ۱۶۶ چوکھٹ
جیلانی بانو ۱۷۳ دادا جان
ابن سعید ۱۸۲ چراغ تلے
محمد خالد اختر ۱۹۳ چچا سام کے نام آخری خط
دیویندر اسر ۱۹۷ بلیک میجک
اُمِ عمارہ ۲۰۳ چودھویں صدی

طویل مختصر نظم

(۳) علی اختر حیدرآبادی ۲۰۸ مرے ہمدم
سلام مچھلی شہری ۲۱۱ نیا افق نیا جنم
حمید الماس ۲۱۶ منزل بہ منزل

دیس دیس کی کہانی

(۵) قلندر (پشتو) ۲۱۹ کانٹا
ڈاکٹر فقیر محمد (پنجابی) ۲۲۳ رشتے جو ٹوٹ نہ سکے
محمد ادیب (گجراتی) ۲۲۷ چار قطرے خون
لوہسون (چینی) ۲۳۷ پاگل کی ڈائری
ارک نائٹ (امریکی) ۲۴۴ نصف بہتر

دیس دیس کی نظم

(۵) آزاد جمالدینی (بلوچی) ۲۵۵ روشنی کی تلاش میں
منو بھائی (پنجابی) ۲۵۶ ہمارے گیت صبح کی اذانیں
وحید العالم (بنگالی) ۲۵۷ انوکھا دیس
شیخ ایاز (سندھی) ۲۵۸ ساون آیا
ناظم حکمت (ترکی) ۲۵۹ میرے وطن

فنونِ لطیفہ

(۲) عبدالرحمن چغتائی ۲۶۰ آرٹ کے دس سال
شاہد احمد دہلوی ۲۶۳ کلاسیکی موسیقی میں ترمیم کی گنجائش

مقالے، جائزے

(۷) سید بادشاہ حسین ۲۶۵ ڈرامہ میں مکالمہ کی اہمیت
پروفیسر حنیف فوق ۲۶۹ اسلامی ادب
سید ابوالخیر کشفی ۲۷۹ اردو ادب
ف۔ا۔ع ۲۹۶ سندھی ادب
فارغ بخاری ۳۰۷ پشتو ادب
شریف کنجاہی ۳۱۵ پنجابی ادب
رفرم ۳۲۱ بلوچی ادب

رفتارِ عالم

ح۔ ل ۳۲۸ ادبی و تہذیبی خبریں

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

(چند پیغامات، چند تاثرات)

قاضی محمد عبدالغفار — اثر لکھنوی
مولانا رازق الخیری — ممتاز حسین ۳۳۱
احمد ندیم قاسمی — ڈاکٹر عبادت بریلوی
ڈاکٹر ملک راج آنند — ابراہیم جلیس
پروفیسر شور علیگ — ڈاکٹر سلامت اللہ
کوثر چاند پوری — شوکت صدیقی
اختر سعید خان

ہمارے صنعتی ادارے

ادارہ ۳۳۶ ایک تعارف

اشتہارات

کریسنٹ پاک سوپ — آئی سی آئی
ہمدرد — پی آئی اے
سیونگ سرٹیفکٹ — برما شیل
ایچ ایم سلک ملز — باٹا
طبیہ دواخانہ — رومان سے
ممتاز احمد سلک ملز — کیپسٹن
ای سی ای — سپیر بلاک
ٹرسٹ انڈسٹریز — مکتبہ افکار
ذوالفقار انڈسٹریز — پی آئی آئی ایف
منٹگمری سہگٹ — زنجیر
نن دانہ — کریٹو آرٹ سٹوڈیوز
تبت سنو

گیارھواں سال —— شمارہ ۴۹-۵۰

اشاریہ

دس سال بیت گئے اور کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہے۔ انسان ماضی پرست نہ ہوتے ہوئے بھی — ماضی کے آئینہ میں — اپنی زندگی اور زندگی کی جدوجہد کے نقش و نگار دیکھنا پسند کرتا ہے — گزرے ہوئے لمحات کبھی لوٹ کر نہیں آتے، یہ سچ ہے — پھر بھی انسانی فطرت ماضی کی راکھ کو کرید کر شراروں کو ڈھونڈتی ہے — تپشِ سوز اور حدّت کو تلاش کرتی ہے — کل کی طرح نغموں کا شباب، شب و روز کی گردش اور خوابوں کا حسن — ناقابلِ تسخیر ہے — انسان چاند، سورج تک اڑانیں کرنے کی تدبیریں سوچ سکتا ہے لیکن بیتے ہوئے لمحات کو لوٹا کر نہیں لا سکتا — زندگی — اگر کسی مقصد کا نام ہے تو کل سے آج تک اور آج سے زندگی کی آخری سانس تک ہم عمر کا ایک فاصلہ طے کرنے کے لئے مجبور ہیں — فاصلہ دور و نزدیک بھی ہو سکتا ہے، پُرپیچ اور دشوار گزار بھی — مقصد میں اگر سچائی ہے — راہرو میں اگر ناقابلِ شکست عزم و حوصلہ ہے تو جادۂ حیات کو کامیابی سے طے کر لینا مشکل تو ہو سکتا ہے — ناممکن ہرگز نہیں!

اور جب گھوم کر میں دس سال پہلے کے شب و روز پر نظر ڈالتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ افکار — دس سال تک دستبردِ زمانہ، گردشِ حالات اور حوادثِ روزگار میں کس طرح زندہ و سلامت رہ گیا — لیکن یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے نہ میں جھٹلا سکتا ہوں، نہ آپ انکار کر سکتے ہیں، نہ زبان و ادب کی تاریخ اسے غلط ٹھہرا سکتی ہے کہ سنہ ۴۵ء سے سنہ ۵۵ء تک افکار نے سرد و گرم حالات سے نبرد آزما رہنے اور شدید ترین مشکلات و موانع سے گزرنے کے باوجود — موت سے کبھی شکست نہیں کھائی — اور اپنے وجود کو قایم رکھ کر — آئے دن نکلنے اور بند ہونے والے رسالوں کے مقابلہ میں ایک قابلِ تقلید مثال قایم کی۔

افکار کا دس سالہ نمبر — میں خوشی اور غم کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں — خوشی اس بات کی ہے کہ افکار جیسے علمی، ادبی اور تہذیبی رسالے نے بے بضاعتی، حالات کی ناسازگاری اور بغیر کسی مالی استحکام کے صرف ادیبوں، قلمکاروں، دانشوروں اور افکار دوستوں کی بھرپور اعانت اور ان کی خصوصی سرپرستی کے بل بوتہ پر عمر کی دس منزلیں طے کریں، اور اس کے

معیار، اس کے خصوصی کردار اور ادب و زندگی کے سلسلہ میں اس کے واضح، صحت مند اور تعمیری نقطۂ نظر میں کبھی کوئی لچک، کوئی مصلحت آمیزی کوئی لغزش اور کوئی زمانہ سازی راہ نہ پا سکی ۔ اگر مقصد کی سچائی، کردار کی مضبوطی اور نصب العین کی تکمیل کے سلسلہ میں پانچ سال سے زیادہ عرصہ تک رشدی اور صہبا کو ہر قسم کی جانی اور مالی قربانیاں دینی پڑیں تو یہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ـــ بڑا کارنامہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے جس خلوص نیّت جس جذبۂ خدمت اور جس احساسِ فرض کے ساتھ افکار کو جاری کیا تھا ۔ اس ذمہ داری کو ہر قیمت اور بہر طور پورا کیا ـــ عوامی رسالوں کی تاریخ میں اس نوع کی مثالیں بہت کم ملیں گی ـــ !!

ہمارے سفر کا آغاز سنہ ۴۵ء میں بھوپال سے ہوا ۔ رشدی اس سفر میں میرے ساتھ تھے ـــ وہ اور میں سنہ ۵۰ء کے آخر تک دشوار گزار اور صبر آزما منزلوں کو قدم بہ قدم اور شانہ بشانہ طے کرتے رہے ـــ آبلہ پائی کا گلہ نہیں ـــ پُرپیچ راستوں اور ناقابلِ عبور مرحلوں سے سلامتی کے ساتھ گزر جانا ہی منزل رسی کی نشاندہی کرتا ہے ـــ لہٰذا آج اگر نصف سے زیادہ مسافت میں ساتھ رہنے اور مصائب و مشکلات میں ساتھ نہ چھوڑنے والے عزیز و مخلص دوست اور رفیقِ کار ـــ رشدی کی یادیں ـــ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے ہیں تو ـــ یہ ایک فطری جذبہ ہے ۔

سنہ ۵۱ء سے سنہ ۵۵ء تک ـــ افکار کی زندگی، بقا اور اس کے وجود کو سابقہ روایات کے شایانِ شان قائم رکھنے کے سلسلہ میں تنہا مجھ پر کیا کچھ بیتی ہے، کس کس طرح کے شدید مصائب کا مجھے سامنا کرنا پڑا ہے، کیسے کیسے عالم مجھ پہ گزرے ہیں " افکار " کے افکار نے کس کس طرح راتوں کی نیند اور دن کا سکون مجھ سے چھینا ہے اور نتیجہ میں مجھے زندگی کی آخری بازی تک لگا دینا پڑا ہے ـــ یہ ایک بہت طویل رنج و غم اور المناک کہانی ہے جسے سُنانے کی اس وقت مجھ میں سکت ہے نہ مزید کچھ کہنے کا یارا ـــ دس سالہ نمبر کے سلسلہ میں مسلسل شب بیداری اور دن بھر لگاتار کام کرنے کا نتیجہ بیماری ہی ہو سکتا ہے ـــ چنانچہ اس وقت بھی ـــ جب یہ سطور لکھ رہا ہوں ـــ مجھے ۱۰۵ ٹمپریچر ہے لیکن آپ پریشان نہ ہوں ـــ قدرت نے غیر معمولی قوتِ ارادی اور ناقابلِ شکست حوصلہ عطا کر کے ـــ اس عالم میں کام کرنے کا مجھے عادی بنا دیا ہے ـــ اور اب تو اپنی صحت و توانائی سے زیادہ ہمہ وقت افکار کی صحت و توانائی کی فکر دامن گیر رہتی ہے ـــ !

دسویں سالگرہ پر افکار کی دس سالہ حقیر سی علمی و ادبی خدمات کا ایک مختصر سا خاکہ آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے صرف اتنا اور عرض کروں گا کہ اگر افکار کی دس سالہ زندگی کا یہ خاکہ آپ کے پاکیزہ ذوقِ علم و ادب کو متاثر کر سکے تو پہلے کی طرح آئندہ بھی اس کی اعانت اور سرپرستی فرماتے رہیں کہ افکار میرا نہیں آپ کا ہے ـــ یہ ایک ادبی امانت ـــ ایک ادبی ورثہ ہے ـــ زبان و ادب کی اس امانت اور اس ورثہ کی حفاظت پہلے کی طرح آئندہ بھی آپ ہی کریں گے ۔

افکار نے گزشتہ دس سال (۴۵ء تا ۵۵ء) میں جتنے نمبر اور خاص اشاعتیں شائع کی ہیں، اُن کی تفصیل یہ ہے :-

(۱) لکھنؤ اردو کانفرنس نمبر ـــــــــ سنہ ۴۸ء (بھوپال)
(۲) بھوپال کانفرنس نمبر ـــــــــ سنہ ۴۹ء (بھوپال)
(۳) بھیمڑی (بمبئی) کانفرنس نمبر ـــــــــ سنہ ۴۹ء (بھوپال)
(۴) خاص نمبر ـــــــــ سنہ ۵۱ء (کراچی)
(۵) آزادی نمبر ـــــــــ سنہ ۵۱ء (کراچی)
(۶) خاص نمبر ـــــــــ سنہ ۵۲ء (کراچی)
(۷) آزادی نمبر ـــــــــ سنہ ۵۲ء (کراچی)
(۸) افسانہ نمبر ـــــــــ سنہ ۵۳ء (کراچی)
(۹) آزادی نمبر ـــــــــ سنہ ۵۳ء (کراچی)
(۱۰) سالنامہ ـــــــــ سنہ ۵۴ء (کراچی)
(۱۱) منٹو نمبر ـــــــــ سنہ ۵۴ء (کراچی)
(۱۲) دس سالہ نمبر ـــــــــ سنہ ۵۵ء (کراچی)

سنہ ۴۵ء تا سنہ ۵۰ء افکار بھوپال نے جتنی تخلیقات شایع کیں، وہ یہ ہیں:-

جائزے (تنقیدی، تحقیقی اور علمی مقالات)	آبشار (افسانے، طنزیے، خاکے، رپورتاژ وغیرہ)	آبگینے (نظمیں، غزلیں، گیت، قطعات، رباعیات)
۱۲۳	۱۴۵	۵۸۹

سنہ ۵۱ء تا سنہ ۵۵ء (بشمول دس سالہ نمبر) افکار کراچی نے جو چیزیں پیش کیں اُن کی تفصیل یہ ہے:-

مختصر مضامین، تنقیدی اور تحقیقی مقالات	افسانے، ترجمے، طنزیے، خاکے وغیرہ	ناولٹ	منظومات	دیس دیس کا ادب
۱۸۸	۲۵۹	۱	۵۹۶	۱۵۳

جن ادیبوں، شاعروں، قلمکاروں اور دانشوروں نے آج تک افکار میں لکھا ہے اور اپنی منفرد، اور بلند پایہ تخلیقات سے افکار کو پاک و ہند کا ایک معیاری رسالہ بنایا ہے۔ اُن کے اسمائے گرامی حروف تہجی کے لحاظ سے درج ذیل ہیں:-

(ا)- (پروفیسر) احتشام حسین۔ (پروفیسر) آل احمد سرور۔ (ڈاکٹر) اعجاز حسین۔ آرزو لکھنوی۔ (پروفیسر) اختر انصاری۔ (ڈاکٹر) اختر حسین رائے پوری۔ اثر لکھنوی۔ اسرار الحق مجاز۔ احمد ندیم قاسمی۔ ابراہیم جلیس۔ اختر الایمان۔ اقبال سہیل۔ آل رضا۔ ابو الفضل صدیقی۔ ارشد تھانوی۔ آنند نرائن ملا۔ احسن طباطبائی۔ ابن انشا۔ ادا بدایونی۔ الم مظفر نگری۔ آغا بیدار بخت۔ احمد مجتبیٰ وامق۔ انور عظیم۔ ابن سعید۔ احمد راہی۔ اشعر ملیح آبادی۔ احمد ریاض۔ آنسہ زاہدہ۔ احسن علی خاں، افضل پرویز۔ اقبال صفی پوری۔ ادیب سہارن پوری۔ اطہر پرویز۔ ابراہیم یوسف۔ اشفاق احمد۔ اشتیاق عارف، اختر جمال۔ احمد ظفر۔ اختر ہوشیارپوری۔ اسر سیمابی۔ انجم سلمانی۔ ادیب سہیل۔ اختر عرفانی۔ اختر سعید خاں۔ ایم شکیل۔ ادھو کمار۔ اطہر سعید خاں۔ اقبال متین۔ اختر پیامی۔ امین راحت چغتائی۔ انجم قزلباش۔ اصغر بٹ۔ اُزبر احمد۔ امر سنگھ۔ اشتیاق اظہر۔ انجم صہبائی۔ ایاز عظمی۔ آفاق صدیقی۔

(ب) بہزاد لکھنوی۔ باسط بھوپالی۔ ہاتی صدیقی۔ باقر مہدی۔ باقر رضوی۔ بلراج کومل۔ باسط سلیم۔

(پ) پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی۔ پطرس۔ پنڈت سندر لال۔ پرتھوی ناتھ شرما۔ پریم ناتھ پردیسی۔ پرکاش پنڈت۔ پرویز شاہدی۔ پروین رشدی۔ (ت) تسنیم سلیم چھتاری۔ تنویر نقوی۔ تابش دہلوی۔ تیغ الہ آبادی۔ تحسین سروری۔ تاجور سامری۔ تاب اسلم۔

(ث) ثاقب کانپوری۔ ثریا قمر۔ (ج) جوش ملیح آبادی۔ جگر مراد آبادی۔ جاں نثار اختر۔ جوش ملسیانی۔ جگن ناتھ آزاد۔ جیلانی بانو۔ جلال ملیح آبادی۔ جمیل ملک۔ جاوید نہال۔ جلیل حشمی۔ جگدیش چندر۔ (چ) چراغ حسن حسرت۔

(ح) حسرت موہانی۔ حیات اللہ انصاری۔ حفیظ ہوشیارپوری۔ حامد علی خاں۔ (ڈاکٹر) حبیب الرحمٰن۔ حامد عزیز مدنی۔ حبیب تنویر۔ حامد سعید خاں۔ حنیف فوق۔ حبیب فخری۔ حسن عابدی۔ حسن طاہر۔ حسن اعرانی۔ حمایت علی شاعر۔ حسن منظر۔ حامد جلال۔ حمید کاشمیری۔ حبیب جالب۔ حامد عالم۔ حسن حمیدی۔ حسن نعیم۔ حمید الماس۔ (خ) خواجہ احمد عباس۔ خلیل الرحمٰن اعظمی۔ خاطر غزنوی۔ خیرات ندیم۔

(د) دیویندر اسر۔ (ذ) ذکی انور۔ ذکی بھوپالی۔ (ر) رشید احمد صدیقی۔ راجندر سنگھ بیدی۔ راما نند ساگر۔ رضیہ سجاد ظہیر۔ ریاض رؤفی۔ رام بلاس شرما۔ روش صدیقی۔ رفیق غزنوی۔ رشدی۔ رئیس احمد جعفری۔ رضا ہمدانی۔ رئیس امروہوی۔ رفعت سروش۔ رام پال۔ راز چاندپوری۔ رحمان مذنب۔ رفیق جابر۔ راجندر پردیپ۔ رفیق علی۔ ریاض الرحمٰن۔ رزم آرا۔ راجندر راجن۔ راز۔ رشید جمال۔

(ز) زینت ساجدہ۔ زہرہ جمال۔ زہرہ نگاہ۔ (س) سروجنی نائیڈو۔ سر تیج بہادر سپرو۔ (ڈاکٹر) سید عابد حسین۔ سید سلیمان ندوی۔ سید سجاد ظہیر۔ سردار جعفری۔ سعادت حسن منٹو۔ سبط حسن۔ (ڈاکٹر) سید محمود۔ سیماب اکبر آبادی۔ (ڈاکٹر) سلامت اللہ۔

ساحر لدھیانوی ۔ سردار گوربخش سنگھ ۔ سراج لکھنوی ۔ سید ہاشم رضا ۔ سیف الدین سیف ۔ سکندر علی وجد ۔ سروش عسکری طباطبائی ۔ سلام مچھلی شہری ۔ سید بادشاہ حسین ۔ سید منفی ۔ سلیمان اریب ۔ سید احمد علی ۔ سید ضمیر جعفری ۔ سید رضا کاظمی ۔ سالک الہاشمی ۔ سجاد شاہد ۔ سلطان برنی ۔ سید اکمل علیمی ۔ (ش) شاہد احمد دہلوی ۔ شفیق الرحمٰن ۔ (پروفیسر) شور ۔ شاہد لطیف ۔ شاد عارفی ۔ شورش کاشمیری ۔ شوکت تھانوی ۔ شکیل بدایونی ۔ شوکت صدیقی ۔ شریف کنجاہی ۔ شان الحق حقی ۔ شاعر لکھنوی ۔ شریف عنایت اللہ ۔ شاہد نصیر ۔ شبیر ۔ ش ۔ مظفر نیدی ۔ شفیع عقیل ۔ شاہین ۔ شعری بھوپالی ۔ شفا گوالیاری ۔ شاہد جمیل ۔ شبنم رومانی ۔ شاذ تمکنت ۔ شکیل الرحمٰن ۔ شرون کمار ورما ۔ شاہ میر راہی ۔

(ص) ۔ (مولانا) صلاح الدین احمد ۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ۔ صفیہ جان نثار اختر ۔ صادق الخیری ۔ صنوبر حسین ۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی ۔ صفدر برلاس ۔ صدیق کلیم ۔ صہبا لکھنوی ۔ (ض) ۔ (پروفیسر) ضبط ۔ (پروفیسر) ضیا علیگ ۔ ضیا الحسن موسوی ۔ ضیاء محی الدین ۔ ضمیر اظہر ۔

(ط) طفیل احمد خاں ۔ طفیل احمد جمالی ۔ (ظ) (مولانا) ظفر علی خاں ۔ ظہیر کاشمیری ۔ ظ ۔ انصاری ۔ ظہور نظر ۔ ظفر رحیم ۔

(ع) (ڈاکٹر) عبدالحق ۔ (مولانا) عبدالمجید سالک ۔ علی اختر حیدرآبادی ۔ عبدالرحمٰن چغتائی ۔ عصمت چغتائی ۔ عبادت بریلوی ۔ علی عباس حسینی ۔ علی جواد زیدی ۔ عرش ملسیانی ۔ عبدالسلام خورشید ۔ عندلیب شادانی ۔ عبداللہ ملک ۔ عدم ۔ عبدالمجید بھٹی ۔ عزیز اثری ۔ عادل رشید ۔ عبدالعزیز خالد ۔ عبدالواحد سندھی ۔ (پروفیسر) عظیم عباسی ۔ عرش تیموری ۔ عزیزہ میکر ۔ عزیز قیسی ۔ عاتق شاہ ۔ عمران انصاری ۔ عمران الارشد ۔ عزیز عزنی ۔ (غ) غلام ربانی تاباں ۔ غلام رسول تنویر ۔ (ف) فراق گورکھپوری ۔ فیض احمد فیض ۔ فکر تونسوی ۔ فارغ بخاری ۔ ف ۔ ا ۔ ع ۔ (ق) قاضی عبدالغفار ۔ قدرت اللہ شہاب ۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی ۔ قرۃ العین حیدر ۔ قتیل شفائی ۔ قدوس صہبائی ۔ قمر جلالوی ۔ قیوم نظر ۔ قمر جلال آبادی ۔ قدیر لکھنوی ۔ قمر اجنالوی ۔ قمر جمالی ۔ قمر ہاشمی ۔ قاضی سلیم ۔ قمر ساحری ۔ قمر لدھیانوی ۔ (ک) کرشن چندر ۔ کیفی اعظمی ۔ کوثر چاندپوری ۔ کنول پرشاد کنول ۔ کمال احمد صدیقی ۔ کوکب جمیل ۔ کمار نوری ۔ (گ) گوربچن سنگھ ۔ گل خاں نصیر ۔ گیان سروپ ۔

(م) (ڈاکٹر) ملک راج آنند ۔ (ڈاکٹر) مسعود حسین خاں ۔ ممتاز حسین ۔ (ڈاکٹر) محمد حسن ۔ ممتاز شیریں ۔ معین احسن جذبی ۔ ممتاز مفتی ۔ مخمور جالندھری ۔ مطلبی فریدآبادی ۔ منیب الرحمٰن ۔ میرزا ادیب ۔ مجروح سلطان پوری ۔ مجتبیٰ حسین ۔ (ڈاکٹر) محمد باقر ۔ مہندر ناتھ ۔ میراجی ۔ مقبول حسین احمد پوری ۔ مَیکش ۔ مسعود اختر جمال ۔ مکین احسن کلیم ۔ مجید لاہوری ۔ مدھوسدن ۔ منظر سلیم ۔ محمد خالد اختر ۔ محمد احمد سبزواری ۔ منظم علی ۔ محمد مہدی ۔ مرزا عصمت اللہ بیگ ۔ منظور احمد منظور ۔ مسعود اشعر ۔ منظور عارف ۔ محمد علی تاج ۔ منظفر علی سید ۔ مسلم ضیائی ۔ مقصود عمرانی ۔ مضطر اکبرآبادی ۔ محمود حسین ۔ موج علیگ ۔ مجید شاہد ۔ محمد صبیح ۔ منور سہاب ۔ منیر بن عظیم ۔ مظہر امام ۔ ماجد اشک ۔ مہدی علی صدیقی ۔

(ن) نیاز فتحپوری ۔ (پروفیسر) نواب علی ۔ نہال سیوہاروی ۔ ناہید عالم ۔ نیاز حیدر ۔ نظر حیدرآبادی ۔ نوبتج ۔ نثار عزیز ۔ نصیر انور ۔ نور بجنوری ۔ نریش کمار شاد ۔ نشور واحدی ۔ نذیر میرزا برلاس ۔ نشاط شاہدی ۔ نظم اکبرآبادی ۔ نکہت بریلوی ۔ نسیم احمد ۔ (و) وقار عظیم ۔ وحیدی الحسینی ۔ وحید چغتائی ۔ (ہ) ہاجرہ مسرور ۔ ہنسراج رہبر ۔ ہربنس سنگھ دوست ۔ (ی) یونس احمر ۔ یوسف ظفر ۔ یزدانی جالندھری ۔ یوسف متان ۔

گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں افکار نے جن علاقائی اور بین الاقوامی زبانوں کے ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ پیش کیا ، وہ یہ ہیں :۔

بنگالی ۔ پشتو ۔ سندھی ۔ بلوچی ۔ پنجابی ۔ کشمیری ۔ گجراتی ۔ ہندی ۔ پہاڑی ۔ تامل ۔ انگریزی ۔ امریکی ۔ روسی ۔ فرانسیسی ۔ چینی ۔ عربی ۔ ترکی ۔ ایرانی ۔ اسپینی ۔ برمی ۔ انڈونیشی ، چیک ۔ بلغاروی ۔ ہنگری ۔ نارویجین ۔ نیگرو ۔ تاجکستانی ۔ ملائی ۔ یونانی ۔ اور کاسک ۔

سنہ ۴۸ء تا سنہ ۵۰ء افکار بھوپال نے جتنی تخلیقات شایع کیں، وہ یہ ہیں:-

جائزے	آبشار	آبگینے
(تنقیدی، تحقیقی اور علمی مقالات)	(افسانے، طنزیے، خاکے، رپورتاژ وغیرہ)	(نظمیں، غزلیں، گیت، قطعات، رباعیات)
۱۲۳	۱۴۵	۵۸۹

سنہ ۵۱ء تا سنہ ۵۵ء (بشمول دس سالہ نمبر) افکار کراچی نے جو چیزیں پیش کیں اُن کی تفصیل یہ ہے:-

مختصر مضامین تنقیدی اور تحقیقی مقالات	افسانے، ترجمے، طنزیے، خاکے وغیرہ	ناولٹ	منظومات	دیس دیس کا ادب
۱۸۸	۲۵۹	۱	۵۹۶	۱۵۳

جن ادیبوں، شاعروں، قلمکاروں اور دانشوروں نے آج تک افکار میں لکھا ہے اور اپنی منفرد، اور بلند پایہ تخلیقات سے افکار کو پاک و ہند کا ایک معیاری رسالہ بنایا ہے۔ اُن کے اسمائے گرامی حروف تہجی کے لحاظ سے درج ذیل ہیں:-

(ا)- (پروفیسر) احتشام حسین - (پروفیسر) آل احمد سرور - (ڈاکٹر) اعجاز حسین - آرزو لکھنوی - (پروفیسر) اختر انصاری - (ڈاکٹر) اختر حسین رائے پوری - اثر لکھنوی - اسرار الحق مجاز - احمد ندیم قاسمی - ابراہیم جلیس - اختر الایمان - اقبال سہیل - آل رضا - ابوالفضل صدیقی - ارشد تھانوی - آنند نرائن ملا - احسن طباطبائی - ابن انشا - ادا بدایونی - الم مظفر نگری - آغا بیدار بخت - احمد مجتبیٰ وامق - انور عظیم - ابن سعید - احمد راہی - اشعر ملیح آبادی - احمد ریاض - آمنہ زاہدہ - احسن علی خاں، افضل علی خاں - افضل پرویز - اقبال صفی پوری - ادیب سہارن پوری - اطہر پرویز - ابراہیم یوسف - اشفاق احمد - اشتیاق عارف، اختر جمال - احمد ظفر - اختر ہوشیارپوری - انسر سیمابی - انجم سلمانی - ادیب سہیل - اختر عرفانی - اختر سعید خاں - ایم شکیل - ادھو کمار، اظہر سعید خاں - اقبال متین - اختر پیامی - امین راحت چغتائی - انجم قزلباش - اصغر بٹ - اُزیر احمد - امر سنگھ - اشتیاق اظہر - انجم صہبائی - ایاز عظمی - آفاق صدیقی -

(ب) بہزاد لکھنوی - باسط بھوپالی - باقی صدیقی - باقر مہدی - باقر رضوی - بلراج کومل - باسط سلیم -

(پ) پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی - پطرس - پنڈت سندر لال - پرتھوی ناتھ شرما - پریم ناتھ پردیسی - پرکاش پنڈت - پرویز شاہدی - پروین رشدی - (ت) تسنیم سلیم چھتاری - تنویر نقوی - تابش دہلوی - تیغ الہ آبادی - تحسین سروری - تاجور سامری - تاب اسلم -

(ث) ثاقب کانپوری - ثریا قمر - (ج) جوش ملیح آبادی - جگر مراد آبادی - جاں نثار اختر - جوش ملسیانی - جگن ناتھ آزاد - جیلانی بانو - جلال ملیح آبادی - جمیل ملک - جاوید نہال - جلیل حشمی - جگدیش چندر - (چ) چراغ حسن حسرت -

(ح) حسرت موہانی - حیات اللہ انصاری - حفیظ ہوشیارپوری - حامد علی خاں - (ڈاکٹر) حبیب الرحمٰن - حامد عزیز مدنی - حبیب تنویر - حامد سعید خاں - حنیف فوق - حبیب فخری - حسن عابدی - حسن طاہر - حسن اعرابی - حمایت علی شاعر - حسن منظر - حامد جلال - حمید کاشمیری - حبیب جالب - حامد عالم - حسن حمیدی - حسن نعیم - حمید الماس - (خ) خواجہ احمد عباس - خلیل الرحمٰن اعظمی - خاطر غزنوی - خیرات ندیم -

(د) دیویندر اسر - (ذ) ذکی انور - ذکی بھوپالی - (ر) رشید احمد صدیقی - راجندر سنگھ بیدی - راما نند ساگر - رضیہ سجاد ظہیر - ریاض رؤفی - رام بلاس شرما - روش صدیقی - رفیق غزنوی - رشدی - رئیس احمد جعفری - رضا ہمدانی - رئیس امروہوی - رفعت سروش - رام پال - راز چاندپوری - رحمان مذنب - رفیق جابر - راجندر پردیپ - رفیق علی - ریاض الرحمٰن - رزم آرا - راجندر راجن - راز - رشید جمال -

(ز) زینت ساجدہ - زہرہ جمال - زہرہ نگاہ - (س) سروجنی نائیڈو - سر تیج بہادر سپرو - (ڈاکٹر) سید عابد حسین - سید سلیمان ندوی - سید سجاد ظہیر - سردار جعفری - سعادت حسن منٹو - سبط حسن - (ڈاکٹر) سید محمود - سیماب اکبر آبادی - (ڈاکٹر) سلامت اللہ -

ساحر لدھیانوی۔ سردار گوربخش سنگھ۔ سراج لکھنوی۔ سید ہاشم رضا۔ سیف الدین سیف۔ سکندر علی وجد۔ سروش عسکری طباطبائی۔ سلام مچھلی شہری۔ سید بادشاہ حسین۔ سید فیضی۔ سلیمان اریب۔ سید احمد علی۔ سید ضمیر جعفری۔ سید رضا کاظمی۔ سالک الہاشمی۔ سجاد شاہد۔ سلطان برنی۔ سید اکمل علیمی۔ (ش) شاہد احمد دہلوی۔ شفیق الرحمٰن۔ (پروفیسر) شور۔ شاہد لطیف۔ شاد عارفی۔ شورش کاشمیری۔ شوکت تھانوی۔ شکیل بدایونی۔ شوکت صدیقی۔ شریف کنجاہی۔ شان الحق حقی۔ شاعر لکھنوی۔ شریف عنایت اللہ۔ شاہد نصیر۔ شبرین۔ ش۔ مظفر پوری۔ شفیع عقیل۔ شاہین۔ شعری بھوپالی۔ شفا گوالیاری۔ شاہد جمیل۔ شبنم رومانی۔ شاذ تمکنت۔ شکیل الرحمٰن۔ شرون کمار ورما۔ شاہ میر راہی۔

(ص)۔ (مولانا) صلاح الدین احمد۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم۔ صفیہ جاں نثار اختر۔ صادق الخیری۔ صنوبر حسین۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی۔ صفدر برلاس۔ صدیق کلیم۔ صہبا لکھنوی۔ (ض) (پروفیسر) ضبط۔ (پروفیسر) ضیا علیگ۔ ضیاء الحسن موسوی۔ ضیاء محی الدین۔ ضمیر اظہر۔

(ط) طفیل احمد خاں۔ طفیل احمد جمالی۔ (ظ) (مولانا) ظفر علی خاں۔ ظہیر کاشمیری۔ ظ۔ انصاری۔ ظہور نظر۔ ظفر رحیم۔

(ع) (ڈاکٹر) عبد الحق۔ (مولانا) عبد المجید سالک۔ علی اختر حیدرآبادی۔ عبد الرحمٰن چغتائی۔ عصمت چغتائی۔ عبادت بریلوی۔ علی عباس حسینی۔ علی جواد زیدی۔ عرش ملسیانی۔ عبد السلام خورشید۔ عندلیب شادانی۔ عبد اللہ ملک۔ عدم۔ عبد المجید بھٹی۔ عزیز اثری۔ عادل رشید۔ عبد العزیز خالد۔ عبد الواحد سندھی۔ (پروفیسر) عظیم عباسی۔ عرش تیموری۔ عزیزہ میکر۔ عزیز قیسی۔ عاقل شاہ۔ عمران انصاری۔ عمران الارشد۔ عزیز عزنی۔ (غ) غلام ربانی تاباں۔ غلام رسول تنویر۔ (ف) فراق گورکھپوری۔ فیض احمد فیض۔ فکر تونسوی۔ فارغ بخاری۔ ف۔ ا۔ ع۔ (ق) قاضی عبد الغفار۔ قدرت اللہ شہاب۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی۔ قرۃ العین حیدر۔ قتیل شفائی۔ قدوس صہبائی۔ قمر جلالوی۔ قیوم نظر۔ قمر جلال آبادی۔ قدیر لکھنوی۔ قمر اجنالوی۔ قمر جمالی۔ قمر ہاشمی۔ قاضی سلیم۔ قمر ساحری۔ قمر لدھیانوی۔ (ک) کرشن چندر۔ کیفی اعظمی۔ کوثر چاندپوری۔ کنول پرشاد کنول۔ کمال احمد صدیقی۔ کوکب جمیل۔ کرار نوری۔ (گ) گوربچن سنگھ۔ گل خاں نصیر۔ گیان سروپ۔

(م) (ڈاکٹر) ملک راج آنند۔ (ڈاکٹر) مسعود حسین خاں۔ ممتاز حسین۔ (ڈاکٹر) محمد حسن۔ ممتاز شیریں۔ معین احسن جذبی۔ ممتاز مفتی۔ محمود جالندھری۔ مطلبی فریدآبادی۔ مجیب الرحمٰن۔ میرزا ادیب۔ مجروح سلطان پوری۔ مجتبیٰ حسین۔ (ڈاکٹر) محمد باقر۔ مہندر ناتھ۔ میراجی۔ مقبول حسین احمد پوری۔ مکیش۔ مسعود اختر جمال۔ مکین احسن کلیم۔ مجید لاہوری۔ مدھوسدن۔ منظر سلیم۔ محمد خالد اختر۔ محمد احمد سبزواری۔ منظم علی۔ محمد مہدی۔ مرزا عصمت اللہ بیگ۔ منظور احمد منظور۔ مسعود اشعر۔ منظور عارف۔ محمد علی تاج۔ منظفر علی سید۔ مسلم ضیائی۔ مقصود عمرانی۔ مضطر اکبرآبادی۔ محمود حسین۔ موج علیگ۔ مجید شاہد۔ محمد صبیح۔ منور سہاب۔ منیر بن عظیم۔ مظہر امام۔ ماجد اشک۔ مہدی علی صدیقی۔

(ن) نیاز فتحپوری۔ (پروفیسر) نواب علی۔ نہال سیوہاروی۔ ناہید عالم۔ نیاز حیدر۔ نظر حیدرآبادی۔ نوتیج۔ نثار عزیز۔ نصیر انور۔ نور بجنوری۔ نریش کمار شاد۔ نشور واحدی۔ نذیر میرزا برلاس۔ نشاط شاہدی۔ نظم اکبرآبادی۔ نکہت بریلوی۔ نسیم احمد۔ (و) وقار عظیم۔ وحیدی الحسینی۔ وحید چغتائی۔ (ہ) ہاجرہ مسرور۔ ہنس راج رہبر۔ ہربنس سنگھ دوست۔ (ی) یونس احمر۔ یوسف ظفر۔ یزدانی جالندھری۔ یوسف متان۔

گزشتہ پانچ سال کے عرصے میں افکار نے جن علاقائی اور بین الاقوامی زبانوں کے ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ پیش کیا، وہ یہ ہیں:۔

بنگالی۔ پشتو۔ سندھی۔ بلوچی۔ پنجابی۔ کشمیری۔ گجراتی۔ ہندی۔ پہاڑی۔ تامل۔ انگریزی۔ امریکی۔ روسی۔ فرانسیسی۔ چینی۔ عربی۔ ترکی۔ ایرانی۔ اسپینی۔ برمی۔ انڈونیشی۔ چیک۔ بلغاروی۔ ہنگری۔ نارویجین۔ نیگرو۔ تاجکستانی۔ ملائی۔ یونانی۔ اور کاسک،

علاقائی اور بین الاقوامی زبانوں کے مستند، مشہور اور مایۂ ناز قلمکار جن کی تخلیقات کو افکار نے اردو میں منتقل کرایا وہ یہ ہیں :-

ایوان وازوف ۔ الیگزینڈر روساہیہ ۔ ایڈون مارکھم ۔ اے ۔ ای ۔ کاپرڈ ۔ ایس کے نیومن ۔ ایم ۔ گارشن ۔ ارک نائٹ سٹیفن لیکاک ۔ امبا پالی ۔ ایس ۔ الغ زادہ ۔ احمد شمیم ۔ آغا تاج محمد ۔ بہزاد جمالدینی ۔ احمد راہی ۔ افضل پرویز ۔ بوعلی سینا ۔ بی ۔ برگ ۔ رند ۔ بالم ۔ بشیر موریانی ۔ پشکن ۔ پبلو نرودا ۔ پاول شبونین ۔ پرنیندو شیکھر پتری ۔ تاج صحرائی ۔ ٹینی سن ۔ جان راڈر ۔ جسیم الدین ۔ جعفر منصور ۔ چنگ تئین لی ۔ چیئن دیو ۔ حسن دیناھو ۔ خوشحال خان خٹک ۔ دین محمد وفائی ۔ دوجے ۔ دھرمیندر کمار گوڑ ۔ دھرم دیر بھارتی ۔ رواپیٹر رومن ٹرسکی ۔ رابندر ناتھ ٹیگور ۔ رحمان بابا ۔ رسول میر ۔ ساؤچن ۔ سین دوریتوفی ۔ سعید تقی الدین لبنانی ۔ سگن آہوجہ ۔ سلیم کاشر ۔ شولوخوف ۔ شیکسپیر ۔ شیو کانت بھٹاچاریہ ۔ شیخ ایاز ۔ شیخ راز ۔ شیرین فگارو ۔ شفقت تنویر میرزا ۔ عبدالرحمٰن قرامرزی علاو ۔ عبدالحیٔ مشرقی ۔ علاؤالدین آزاد ۔ عزیز شریف ۔ عابد حسن منٹو ۔ غلام احمد مہجور ۔ غلام حسن ۔ فیدور تیوچیف ۔ فرانسس الین والکس ہارپر ۔ فضل حق شیدا ۔ قاضی نذرالاسلام ۔ قلندر ۔ کانسٹنٹائن پاسٹوفسکی ۔ کیرت بابانی لوھسون ۔ لن کینگ ۔ لنگسٹن ہیوز ۔ لوئی گنیبلو ۔ میکسم گورکی ۔ ماؤزے تنگ ۔ مائیکافسکی ۔ مائیخیل الیساکوفسکی ۔ مائیخیل اسٹل پرسچ ۔ محمد صالح تیہا ۔ (پروفیسر) موہن سنگھ ۔ مشتاق میرپوری مراد مشنواری ۔ مختار زمن ۔ مظاہر حسین چودھری ۔ میر عبدالعزیز ۔ محمد ادیب ۔ محمد محسن ۔ منظور عارف ۔ منو بھائی ۔ ناردیل کریگ ۔ ناظم حکمت ۔ نرت لال لہری ۔ نرائن گنگولی پادھیا ۔ بیندو گھوش ۔ نصیر گل ۔ نیاز ہمایونی ۔ نورالنہار ۔ وال وٹ مین ۔ وارث شاہ ۔ ہری دلگیر ۔ یحییٰ کمال بیات لی ۔

"دس سالہ نمبر" کے سرورق کے لئے ـــــ میں ملک کے مایۂ ناز فنکار عبدالرحمٰن چغتائی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے گوناگوں مصروفیات کے باوجود ازرہِ افکار دوستی صہبا نوازی سرورق کے علاوہ آرٹ کے بارے میں ایک مختصر لیکن جامع مضمون بھی عطا فرمایا ـــــ اس نمبر کی تزئین و آرائش اور ترتیب و تدوین کے سلسلہ میں ملک کے نوجوان آرٹسٹ حسن بیگ اور ماہرین خطاطی حضرات انیس احمد، ظہور احمد، اور منیر احمد کے مخلصانہ اور برادرانہ تعاون کے لئے تہہِ دل سے سپاس گزار ہوں ۔

"آخر میں اُن تمام قلمکاروں، ہمدردوں،
اور افکار دوستوں کا شکریہ ادا کرنا میرا
خوشگوار فرض ہے جن کی ہمدردی اور
رفاقت کے سہارے میں دس سال تک
افکار کو جاری رکھ سکا، اور آج اس
کی دسویں سالگرہ پر "دس سالہ نمبر"
پیش کرنے کے قابل ہو سکا ۔ اس یادگار
موقع پر میں خلوص و محبت کے ساتھ افکار
کے دس سالہ نمبر کو تمام قلمکاروں،
ہمدردوں اور افکار دوستوں کی نذر کرتا ہوں !

صہبا لکھنوی

حسن تخیل

حسن بیگ

ایک منظر — حسن بیگ

ادبستان
عیدگاہ، بندر روڈ، کراچی
جاری شدہ ۱۹۴۵

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیٔ رنگِ گلستاں ہے وہی

سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یار مہرباں ہے وہی

برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونقِ خاکِ آستاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

فیض
کراچی
۱۱ اگست ۵۵ء

ایک منظر

حسن بیگ

افکار
جاری شدہ ۱۹۴۵
ادبستان
عیدگاہ، بندر روڈ، کراچی ۲

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی

سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یارِ مہرباں ہے وہی

برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

فیض کراچی
۱۱ اگست ۵۵ء

فیض احمد فیض

مندرجۂ ذیل اشعار سندھی اردو کانفرنس زیر اہتمام ادبستان
خیر پور میرس منعقدہ ۱۸ اگست ۵۵ء کے لئے فیض صاحب نے
بطور پیغام ارسال کئے

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب ہاتھ میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو، کوچۂ دلبر میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

پھوٹیں گے انقلاب کے دھارے نئے نئے

ڈھونڈیں گے دردمند سہارے نئے نئے

اے محو خواب عشرت دوشینہ دیکھ تو

تابندہ ہیں افق پہ ستارے نئے نئے

کیف و کم حیات کے حلقے سے تو نکل

عالم نئے نئے ہیں، نظارے نئے نئے

طوفاں سے کھیلنا اگر انسان سیکھ لے

موجوں سے اُبھریں آپ کنارے نئے نئے

تڑپائے جو بات کی اُس کے تو کس طرح

رمزیں نئی نئی ہیں، اشارے نئے نئے

فکر خدا کے بندۂ اوہام بن گئے

پوجا کو بت خراد اتارے نئے نئے

انساں کی مغائرت انساں سے ہے جو تھی

میداں مارنے کو تو مارے نئے نئے

اپنے جو تھے امروز بھی اپنے نہیں رہے

ہوتے ہیں امتحاں ہمارے نئے نئے

اثر

حواس و ہوش کی دنیا سے بیگانہ بنا ڈالا
بہاروں نے طبیعت کو یہ کس رستے پہ لا ڈالا

اُتری بہاریں ہیں زہر کی سی تلخیاں دل میں
یہ تم نے آج صہبائے نظر میں کیا ملا ڈالا

تمہاری بھول کے صدقے! نہ بھولی دشمنی تم کو
تمہاری یاد کے قرباں، ہمیں دل سے بھلا ڈالا

نگاہِ لطف پر خوش فہمی کا تھا گماں ہم کو
چلو اچھا ہوا تم نے وہ پردہ بھی اٹھا ڈالا

نہ اس کی صبح ہوتی ہے نہ اس کی شام ہوتی ہے
خبر بھی ہے کہاں ہے وہ جسے تم نے مٹا ڈالا

جن آنکھوں میں اک آنسو بھی نہ آیا جورِ گردوں سے
اُن آنکھوں تک کو اِن اہلِ زمیں نے خوں رُلا ڈالا

بخیلی پر کمر بستہ تجھے پایا تو اے تقدیر!
ہمیں نے دونوں ہاتھوں سے جوانی کو لٹا ڈالا

ہمارے پاس تھا ہی کیا جسے ہم یوں لٹا دیتے
دلِ بدبخت! تو نے جس طرح ہم کو لٹا ڈالا

یہ کیسی آگ ہے اختر کہ میرے دل کے کانوں میں
صدا پیہم یہ آتی ہے، جلا ڈالا، جلا ڈالا!

(پروفیسر) اختر الرحمٰن

اب ساری خدائی ہے تماشائی ہماری
کچھ روز سے آباد ہے تنہائی ہماری

محبوب اگر گل ہے تو ہم موسمِ گل ہیں
یکتائیِ محبوب ہے یکتائی ہماری

ہم مٹ کے بھی دھرتی کے رگ و پے میں رواں ہیں
دیکھو تو ذرا انجمن آرائی ہماری

اب دامنِ صحرا پہ بھی دھوکا ہے چمن کا
اب ختم ہوئی بادیہ پیمائی ہماری

ہر لفظ میں ماضی کے کئی گیت گندھے ہیں
تاریخ کی اک گونج ہے گویائی ہماری

جو پھول کھلا، اس میں گھُلا خون ہمارا
جو جام گرا، اس میں صدا آئی ہماری

جب حرّیتِ فکر کا دستور ہوا طے
کہتے ہیں مشیّت نے قسم کھائی ہماری

احمد ندیم قاسمی

غزل

کہاں احساسِ غربت میں کمی معلوم ہوتی ہے
وطن کی سرزمیں بھی اجنبی معلوم ہوتی ہے

ہر دیدہ تمنا اور ہر جلوہ تلاطم ہے
محبت اعتبارِ زندگی معلوم ہوتی ہے

متاعِ ہر دو عالم کی حقیقت کھل گئی شاید
تہی دستی جنوں کی مفلسی معلوم ہوتی ہے

چراغِ خانۂ صیاد سے دیوارِ گلچیں تک
ہمارے زخمِ دل کی روشنی معلوم ہوتی ہے

ظہیر، اُن کو شبستاں میں گل و نغمہ نظر آیا
مجھے چشمِ شبستاں میں نمی معلوم ہوتی ہے

ظہیر کاشمیری

۱۶ اگست ۵۵

سردار جعفری

دل کی آگ جوانی کے رخساروں کو دہکائے ہے
بہے پسینہ مکھڑے پر یا سورج پگھلا جائے ہے

من اک ننھا سا بالک ہے ہمک ہمک رہ جائے ہے
دور سے مکھ کا چاند دکھا کر کون اسے للچائے ہے

مے ہے تری آنکھوں میں اور مجھ پہ نشہ سا طاری ہے
نیند ہے تیری پلکوں میں اور خواب مجھے دکھلائے ہے

تیرے قامت کی لرزش سے موجِ مے میں لرزش ہے
تیری نگہ کی مستی ہی پیمانوں کو چھلکائے ہے

تیرا دردِ سلامت ہے تو مرنے کی امید نہیں
لاکھ دکھی ہو یہ دنیا رہنے کی جگہ بن جائے ہے

شان الحق حقی

یہ بھی تھی حسرت نمو کی جلی
بجھ رہی ہے سلگ سلگ کے کلی

کچھ نشانِ سحر بھی اے شبِ غم؟
ہے کہاں تک یہ تنگ و تار گلی!

بے خبر، تجھ سے تیری یاد اچھی
صبح وعدہ سے شامِ ہجر بھلی

کتنے حشر اُٹھ کے شرمسار گئے
اُس کی زلفوں کی رات ہی نہ ڈھلی

دل میں بس کر رہا خیال اُس کا
کچھ ارادوں کی پیش ہی نہ چلی

دل فگاری کہ لالہ کاری ہے
سادگی ہے کہ حکمتِ عملی،

دیکھیے دیکھیے بہار آئی
لیجیے لیجیے وہ بیت چلی

ں سالہ نمبر
۵۵ — ۶ء

موسیقی

لعین حیدر

ریہرسل

رام گوپال
کا
نگار خانہ
لندن

قرۃالعین حیدر

قرۃ العین حیدر

فیض احمد فیض
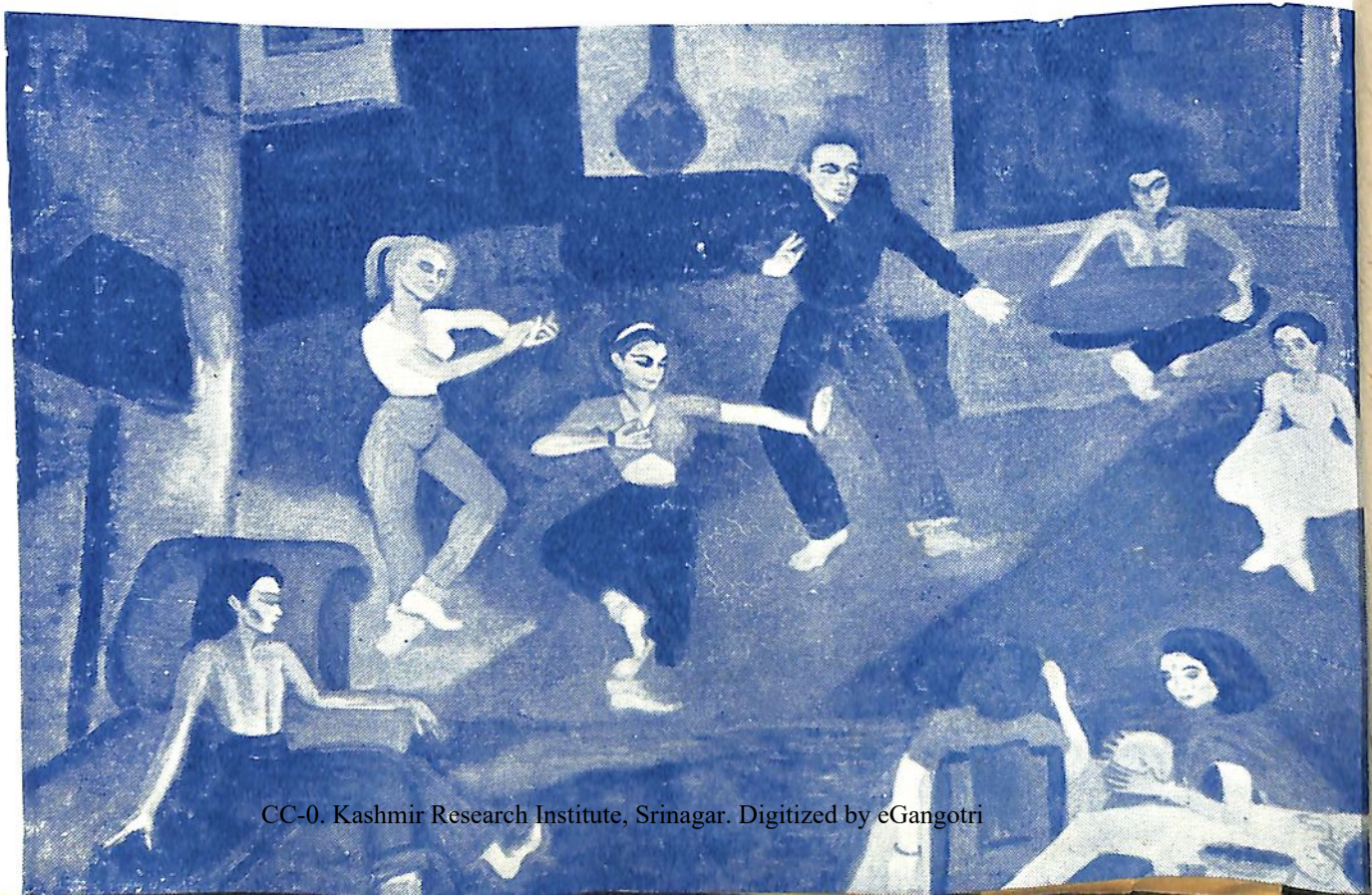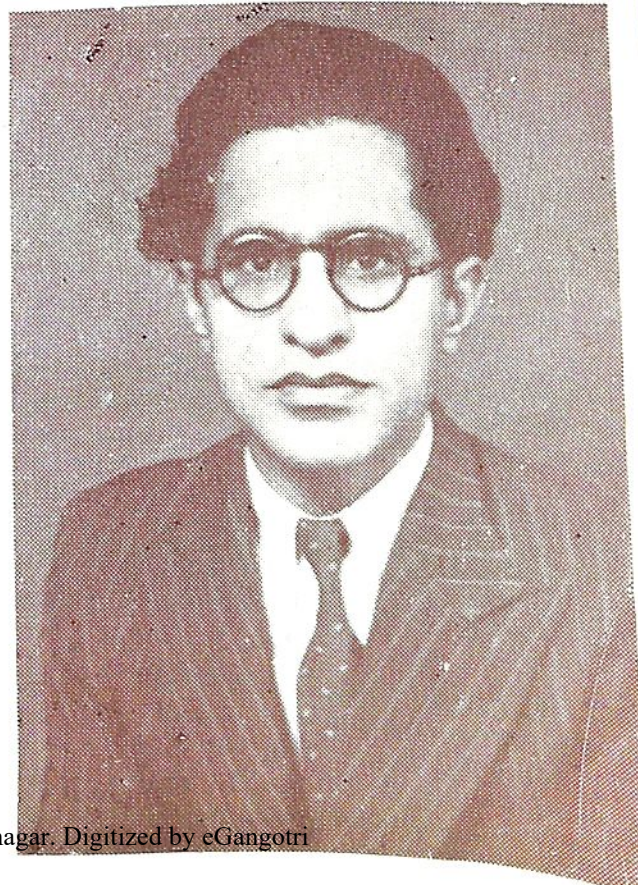
تمنائی
پرکاش پنڈت
آزیر احمد
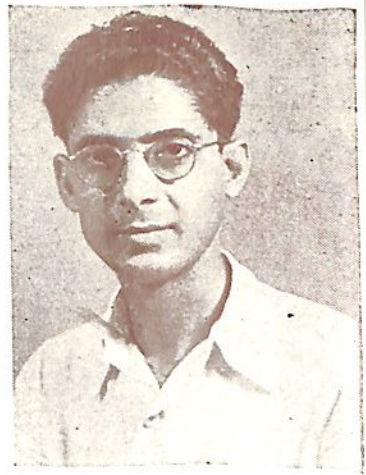
سید بادشاہ حسین
ابوالکلام شمس الدین
فارغ بخاری
اور
رضا ہمدانی
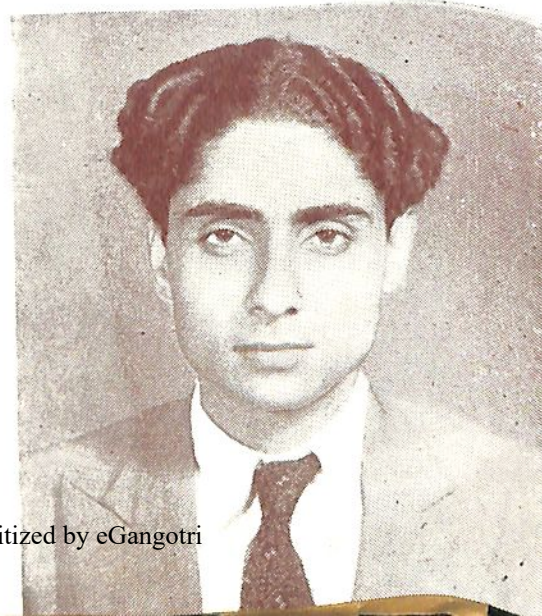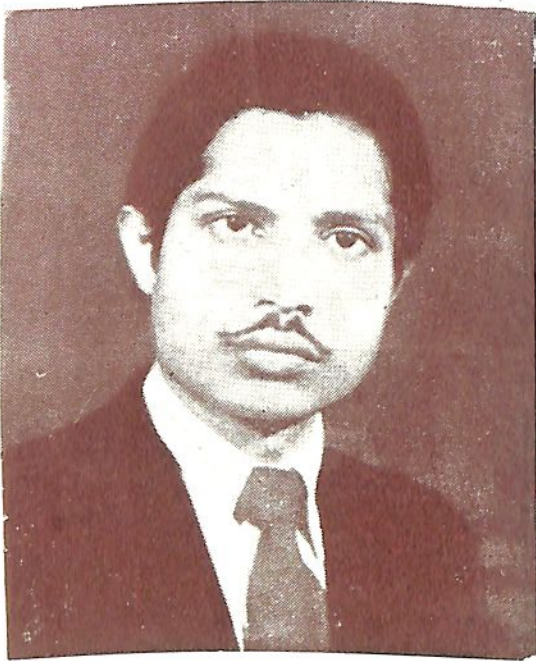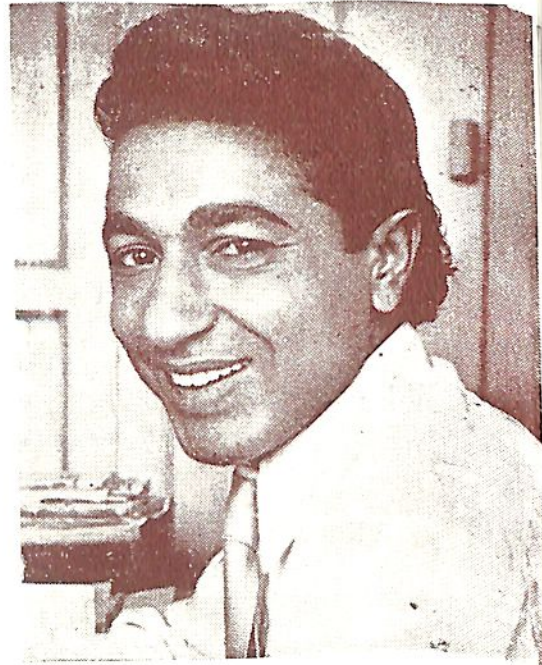
افکار کے چند قلمکار (ایک یادگار گروپ)

ہنس راج رہبر۔ ساحر لدھیانوی ۔ راجندر سنگھ بیدی ۔
رضیہ سجاد ظہیر ۔ مہندر ناتھ ۔ سہیل عظیم آبادی
کرشن چندر اور لاہوٹی
(درمیان میں) جاں نثار اختر

ابوالفضل صدیقی

محمد خالد اختر اور ظہور نظر
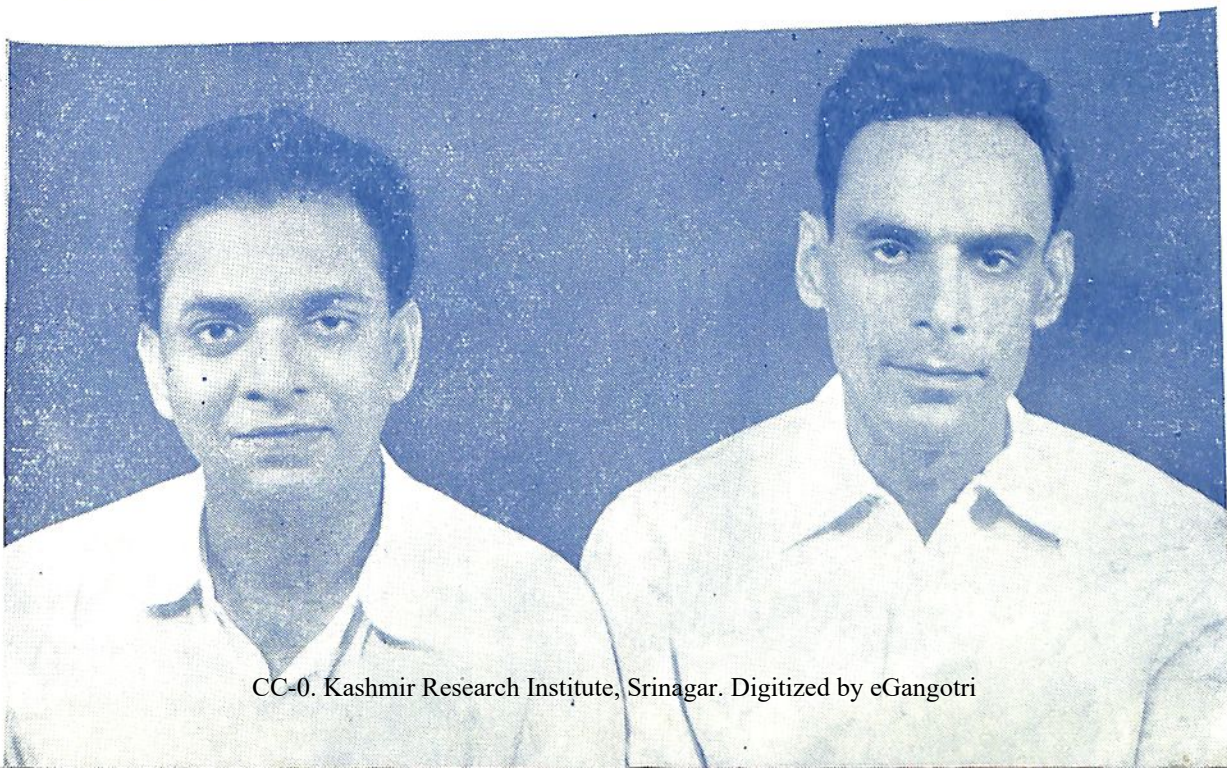
ابو الکلام شمس الدین

ترجمہ

اُزیر احمد

(ناولٹ)

اشارات

فیڈ ان : ——— منظر کا آہستہ آہستہ پردے پر ظاہر ہونا۔

فیڈ آؤٹ : ——— کسی منظر کا آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہونا۔

کٹ : ——— کہانی کے اندر مختلف مناظر جہاں پر ختم ہوتے ہیں اور دوسرا منظر شروع ہوتا ہے۔

ڈیزالو: ــــــ کسی منظر کا جلدی سے غائب ہو جانا۔
وائپ: ــــــ ایک منظر کا ایک طرف سے غائب ہونے کے ساتھ ساتھ دوسرے منظر کا ابھرنا۔
کلوزاپ: ــــــ قریبی منظر
فلیش بیک: ــــــ گذشتہ واقعات کو پھر سے پردے پر دہرانا۔
بیک ٹو پریزنٹ: ــــــ لوٹ کر پھر اصلی موضوع پر آجانا۔

ابوالکلام شمس الدین

ــــــ سنہ پیدائش ۱۹۲۶ء بمقام دیوپور (ضلع باقر گنج، مشرقی پاکستان)

تعلیم: ــــــ ایم اے (کلکتہ یونیورسٹی)

مشاغل: ــــــ ادبی رسائل کی ادارت ــــ ریڈیو پاکستان میں ملازمت ــــ کالج میں درس، اور اب اسسٹنٹ پبلسٹی ڈائرکٹر حکومت مشرقی پاکستان۔

تصانیف: ــــــ ۱۵ سے زیادہ ہیں ــــ افسانے، طنزیہ مضامین اور ناول۔ ان کی پہلی تصنیف ــــ "سٹھی بانو" ــــ ۴۷ء سے قبل چھپی تھی۔ "انجان شاہراہ" ــــ تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ تقسیم سے پہلے تنقید نگاروں نے انہیں مشرقی بنگال کے بہترین فکشن رائٹر (Fiction writer) کی حیثیت سے تسلیم کیا تھا۔

نقطۂ نظر: ــــــ مارکسی ہے۔ اپنی تخلیقات میں عام آدمیوں کی محبت، ان کی نفرت، ان کے دکھ سکھ کی عکاسی کرتے ہیں۔

"آشیانہ": ــــــ ان کا بہترین ناولٹ ہے جو براہ راست بنگالی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔

[فیڈ اِن] :- باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بجلی چمک چمک کر انتہائی بھیانک منظر پیش کر رہی تھی۔ سلاخ لگی ہوئی کھڑکی کے پاس سے یہ منظر دیکھ کر کیمرہ مین پیچھے ہٹ گیا اب کھڑکی کے دوسری طرف ایک عورت کی صاف تصویر نظر آئی کھڑکی کی سلاخوں سے لگی اس بھیانک موسم میں وہ باہر کی طرف نہ جانے کس چیز کو تک رہی تھی۔ اس کا چہرہ بے حد اداس تھا۔ کیمرہ کچھ اور پیچھے ہٹا تو ایک درمیانی طبقہ کے گھر کا ایک حصہ سامنے آگیا۔ ایک طرف ایک کم سن لڑکی ہاتھ میں اخبار لئے ریڈیو کے سامنے بیٹھی تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ کھانے کی میز کا ایک حصہ نظر آرہا تھا۔ جس پر کھانا چنا ہوا تھا۔ پہلی عورت کے قریب ہی باہر کھلنے والا دروازہ تھا جس کے پٹ بند تھے۔ بائیں طرف ایک اور دروازہ تھا جس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے تھے۔ طوفانی ہوائیں دروازے پر ٹکرا رہی تھیں زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہا تھا۔ کبھی کبھی چھت سے لٹکی ہوئی چق بھی ڈولنے لگتی تھی۔ یکایک آسمان پر زور کی چمک ہوئی اور ہیبت ناک گرج کے ساتھ کہیں قریب ہی بجلی گری — دونوں اس اچانک کی چمک اور گرج سے قریب قریب بدحواس ہوگئیں۔

[کٹ]

[کلوز اپ] :- پہلی عورت کی اداسی اور زیادہ نمایاں ہو گئی۔ اب بھی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر دیکھے جا رہی تھی — جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہو [کٹ]

راستے سنسان پڑے تھے۔ آم کے ایک گنجان درخت کی شاخیں اس شدت سے ہل رہی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا طوفان سے جنگ کر رہی ہیں۔ درخت کے قریب ہی ایک لائٹ پوسٹ کی بتی اپنے آپ کو بارش اور طوفان کی زد سے بچا کر جلتے رہنے کی کوشش میں مصروف نظر آ رہی تھی [کٹ]

چھوٹی لڑکی ڈر کے مارے سہمی ہوئی دونوں ہاتھوں سے کانوں کو چھپائے ہوئے تھی۔ آنکھیں بھی بند تھیں — لیجئے اب آنکھیں کھل گئیں اور کانوں پر سے ہاتھ بھی ہٹ گئے۔ اس نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی بڑی لڑکی سے کہا۔

چھوٹی لڑکی :- اللہ کی پناہ! یہ طوفان — معلوم ہوتا ہے کسی کے ساتھ جنگ کر رہا ہے!

جملہ ختم کرتے ہوئے اس نے بڑی لڑکی کی طرف دیکھا اور پھر بولی

چھوٹی لڑکی :- "ارے لیلیٰ آپا! اس طرح تم کیا دیکھ رہی ہو۔ باہر تو موسلا دھار بارش ہو رہی ہے جھکڑ چل رہا ہے اور بجلیاں گر رہی ہیں اور تم اس طرح کھڑکی کھولے اس سے لگی کھڑی ہو"

لیلیٰ :- طوفان کا تماشہ دیکھنے میں بہت مزہ آتا ہے"۔

چھوٹی لڑکی :- چلو ہٹو! میں سمجھ گئی "اب اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، بھیا نہ جانے کہاں اٹک گئے۔ کون جانے شاید تم کو بھول ہی گئے ہوں — اچھا اب کھڑکی سے ہٹ کر ادھر آجاؤ"

لیلیٰ :- "آتی ہوں"

لیلیٰ کچھ شرمائی شرمائی سی کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ پھر اس نے چہرے پر مسکراہٹ پیدا کر کے بات کرنے کی کوشش کی لیکن غم اور فکر کا سایہ کسی طرح دور نہیں ہوا، پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی کھانے کی چیزوں کو دیکھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر ایک کونے پر بیٹھ گئی۔

چھوٹی لڑکی تھوڑی دیر تک گھر کے اندر ادھر ادھر چکر لگاتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا ہے۔ پھر آہستہ سے وہ بھی لیلیٰ کے پاس بیٹھ گئی۔ ایک لمحہ خاموشی کے بعد بولی۔

چھوٹی لڑکی :- لیلیٰ آپا۔ یہ تو بتائیے کہ جب بارش ہوتی ہے تو دل اس قدر اداس اور پریشان کیوں ہو جاتا ہے"

لیلیٰ :- نہ جانے کیا بات ہے"

کچھ دیر پہلے ریڈیو پر گانا ہو رہا تھا۔ ایک برساتی گیت لیکن بجلی کے خوف سے سٹ کھلا رکھنے کی ہمت نہ ہوئی اس لئے چھوٹی لڑکی نے بٹن بند کر دیا لیلیٰ اس کو دیکھ کر صرف ذرا سا مسکرا دی [کٹ]

چھوٹی لڑکی میز پر رکھے ہوئے خوب صورت پیالوں کو چھوتی جارہی تھی اور گنگناتی جارہی تھی، آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوتی گئی اور گنگناہٹ گانے کی شکل میں تبدیل ہو گئی ؎

قلب مغموم کی باقی ہے تمنا اب بھی — اب بھی آباد ہے امید کی دنیا اب بھی
گرچہ ہر راہ طلب میں غم محرومی ہے — شوق وارفتہ ہے ہمدوش ثریا اب بھی
نہ بھول جانے کا گلہ ہے نہ شکایت مجھکو

[کلوز اَپ]:- لیلیٰ ہمہ تن گوش بن کر گانا سننے لگتی ہے، جیسے یہ اس کے دل کی آواز ہو [کٹ]

چھوٹی لڑکی اب تک گائے جا رہی تھی

لیلیٰ میز کے پاس سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اس کے ساتھ ساتھ کیمرا بھی کھڑکی کے پاس آگیا۔

بارش کا زور اب تھم گیا تھا۔ لیکن وہ بے چین سی پھر میز کے پاس چلی آئی۔ اس نے کھانے کی چیزوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ کس قدر احتیاط اور کتنی محنت سے اس نے یہ ساری چیزیں تیار کی تھیں۔

گانا ختم ہو گیا۔

لیلیٰ:- میناؔ، اب تک تمہارے بھیا کیوں نہیں آئے۔ آج ہمارے یہاں کھانا کھانے کی بات طے تھی۔ کتنی محنت سے میں نے یہ سب چیزیں تیار کی تھیں۔ اب تو رات کے ساڑھے آٹھ بج گئے اور اب تک ان کا کچھ پتہ نہیں ہے"

میناؔ:- "شاید بارش کی وجہ سے کہیں رک گئے ہوں"۔

لیلیٰ:- "لیکن ان کو تو یہاں بارش شروع ہونے سے پہلے ہی پہنچ جانا چاہیئے تھا"۔

میناؔ:- ان کو ان باتوں کا خیال ہی کب رہتا ہے۔ کام ہی کچھ اس قسم کا ہے مشکل سے تو کچھ بات چیت کر لیتے ہیں۔ ملک اور قوم کی خدمت میں اس قسم کی بے اعتدالیاں ضروری ہیں۔

لیلیٰ:- لیکن اب کیا خدمت انجام دینا باقی رہ گئی ہے، ملک تو کب کا آزاد ہو چکا، قوم بھی غلامی کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اطمینان اور چین کا سانس لے رہی ہے۔ اب بھی اس طرح جان قربان کرنے سے کیا حاصل؟

میناؔ:- کیا جانے لیلیٰ آپا۔ خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ آج تک انھوں نے کبھی کسی کی بات مانی ہو تب نا! تم تو انکو بچپن سے جانتی ہو ان کے کسی کام میں کبھی کوئی نظم دیکھا ہے تم نے؟"

لیلیٰ کے چہرے سے پھر گھبراہٹ اور پریشانی کا اظہار ہوا۔

لیلیٰ:- لیکن ملک اور قوم کی خدمت کے نام پر کب تک وہ اس طرح ہنگامہ مچاتے رہیں گے۔ ان کی صحت کتنی گر گئی ہے۔ اب ان کو آرام کی ضرورت ہے — اپنی صحت کا خیال کرنے کی ضرورت ہے — وہ . . . .؟

میناؔ:- ہاں ڈاکٹر نے بھی یہی کہا تھا لیکن ان کو ان باتوں کی کیا پروا — ؟"

لیلیٰ:- آخر کیوں؟ — آخر کیوں ان کو کسی بات کا خیال نہیں۔ دیکھ لینا۔ آج ہی اس بات پر میں ان سے سخت جھگڑا کروں گی۔

میناؔ:- ہاں آپا، آپ ہی ان کو یہ باتیں سنا سکتی ہیں، امی نے کہا تھا —

لیلیٰ تعجب سے میناؔ کو دیکھنے لگتی ہے

لیلیٰ:- کیا کہا تھا امی نے؟

میناؔ:- امی نے کہا تھا اگر تم دونوں کی شادی ہو جائے تو ممکن ہے بھیا کی زندگی میں تھوڑا سا تغیر ہو جائے — ممکن ہے وہ کچھ سنبھل جائیں، ممکن ہے —!"

لیلیٰ کی آنکھیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں، نہ جانے کیوں اسے بہت شرم آرہی تھی۔ میناؔ نے اسی طیش کے عالم میں کہا

میناؔ:- واقعی کتنا برا معلوم ہوتا ہے، آج کل آج کل کرتے یہ دن آگیا اور شادی کا اب تک پتہ نہیں۔ خوشی منانے کا موقع ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی ہم اس سے محروم ہیں۔

لیلیٰ:- تمہارے بھیا تو بس بہانے بنا بنا کر دیر پر دیر کیے جارہے ہیں —"

میناؔ:- سچ مجھ کو ان پر اتنا غصہ آتا ہے کہ کیا کہوں۔ مگر ڈر کے مارے ان کے سامنے زبان تک نہیں ہلا سکتی۔ [کٹ]

[کلوز اَپ]:- لیلیٰ نے بہت ہی دبی آواز میں کہا —

لیلیٰ :- مجھ کو کم غصّہ تھوڑا ہی ہے۔ [کٹ]

مینا لیلیٰ کے پاس آ کر بولی

مینا :- آہا! تم جس دن بھابی بن کر ہمارے گھر آ جاؤ گی لیلیٰ آپا —

لیلیٰ :- چلو، بھاگو یہاں سے۔ میں یہاں سوچتے سوچتے —

مینا :- اوہو، اب اتنا بھی مت سوچا کرو۔ اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں

لیلیٰ :- تم بہت شریر ہو گئی ہو آجکل مینا، ٹھہرو تو بتاتی ہوں

مینا :- اچھا چلو، اب معاف کر دو، پھر کبھی نہیں چھیڑوں گی — اری سنو تو کوئی دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے۔ شاید بھیا آ گئے —!

لیلیٰ بھاگ کر دروازہ کھولنے چلی۔ مینا پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا

مینا :- کہو کیسی رہی؟ اب آئیں نا قابو میں۔

لیلیٰ دروازہ کے پاس سے مایوس لوٹ آئی

لیلیٰ :- مینا تم پر بہت غصّہ آ رہا ہے آج!

کیمرے کے سامنے پھر مکان کا سارا حصّہ ابھر آتا ہے۔

مینا :- معاف کرو لیلیٰ آپا! کوئی غصّہ ہوتا ہے تو بے حد دکھ ہوتا ہے — سنا کچھ میں نے کیا کہا؟

قریب آ کر لیلیٰ کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کو پیار کر لیا — بے اختیار لیلیٰ ہنس دی۔

اب کے دروازے پر سچ مچ دستک ہوئی۔ آواز سنتے ہی دونوں چونک اٹھیں

مینا :- سنو — اب کے کوئی سچ مچ دستک دے رہا ہے۔

لیلیٰ :- تم جا کر دیکھو، میں نہیں جاتی۔

مینا :- اری بھیا شاید باہر کھڑے بھیگ رہے ہیں، تم جاؤ نا لیلیٰ آپا۔

لیلیٰ :- تم کیوں نہیں چلی جاتیں — میں نہیں جاؤں گی

لیلیٰ نے غصّہ سے کہا، پھر فوراً ہی بولی

لیلیٰ :- اچھا میں ہی جاتی ہوں۔

دروازہ کھلتے ہی ایک ستائیس اٹھائیس برس کا نوجوان سر سے پیر تک بارش میں بھیگا ہوا کمرے میں داخل ہوا

مینا :- اتنی دیر کہاں لگا دی بھیا؟

اس نے ہنس کر جواب دیا۔

نوجوان :- واقعی بہت دیر ہو گئی — ہے نا!

وہ آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ یکایک جھجک کر رک گیا۔ لیلیٰ ایک طرف کھڑی بہت تیز نظروں سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ نوجوان مینا کی طرف دیکھ کر مسکرا کر بولا

نوجوان :- کیا کروں ہماری انجمن کا ایک ضروری کام تھا۔ اس کو چھوڑ کر کسی طرح یہاں نہ آ سکا۔ فائد ٹولی کا ایک محلہ آج کی بارش میں ایک دم تباہ ہو گیا۔ وہاں جانا ضروری تھا۔

لیلیٰ :- مینا!

نوجوان لیلیٰ کی بھرپور آواز سن کر ایکدم چونک کر خاموش ہو گیا۔

لیلیٰ :- مینا۔ اپنے بھیا سے کہو کچھ بازی چھوڑ کر جلدی سے کپڑے بدل لیں۔ تم میرے ساتھ آؤ، میں کپڑے دیتی ہوں۔

مینا لیلیٰ کے پیچھے ایک دوسرے کمرے میں گئی نوجوان کچھ دیر تک اسی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے اپنے شرابور جسم کو دیکھا۔ [کٹ]

مینا کپڑے لے کر واپس آ گئی

مینا :- سچ بھیا۔ آج تو تم بارش میں بالکل ہی بھیگ گئے کہیں بیمار نہ ہو جاؤ۔ یہ لو کپڑے۔ جلدی سے اس کمرے میں جا کر بدل ڈالو

نوجوان نے کپڑے ہاتھ میں لے لئے۔ تھوڑی دیر تک لیلیٰ کو دیکھتا رہا۔ پھر "اچھا جاتا ہوں" کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ لیلیٰ تھوڑی دیر تک اس کو دیکھتے رہنے کے بعد مینا سے بولی۔

لیلیٰ :- میں پانی گرم کرنے کو رکھ آتی ہوں۔ بھیا کے پیروں کو گرم پانی سے خوب دھونے کی ضرورت ہے!

[واش اپ] :- گھر کے اندر سونے کا ایک کمرہ، بستر پر

لیٹے لیٹے ایک پچاس سالہ آدمی کتاب پڑھ رہا ہے آنکھوں
پر عینک لگی ہوئی ہے، کچی پکی داڑھی اور مونچھ میں چھپے
ہوئے چہرہ سے عقل مندی اور بزرگی کے آثار نمایاں ہیں۔
لیکن کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے چہرے پر افسردگی
چھائی ہوئی ہے۔ لیلیٰ سرہانے آکر کھڑی ہوگئی۔

لیلیٰ:۔ درد کچھ کم ہوا ابا؟

بڈھے نے سر اٹھا کر پوچھا —— آں؟

لیلیٰ:۔ درد پہلے سے کچھ کم ہوا یا ویسا ہی ہے؟

باپ:۔ ہاں بیٹی۔ اب کچھ کم ہے۔ آؤ، میرے قریب
آجاؤ ——!

یہ کہکر انھوں نے باہر کی طرف دیکھا۔ پھر فوراً
اس سے پوچھا۔

باپ:۔ محبوب اب تک نہیں آیا؟

لیلیٰ:۔ جی ابھی ابھی آئے ہیں۔

باپ:۔ اتنی دیر آخر کہاں تھا اب تک؟

لیلیٰ:۔ کہیں کوئی کام تھا

باپ:۔ اچھا بیٹی تم جاؤ۔ کھانے پینے کے بعد اس کو یہاں
لے آنا۔ پیر میں سخت تکلیف ہے ورنہ میں خود ہی آجاتا۔

لیلیٰ:۔ جی اچھا

باپ:۔ کہنا مجھے اس سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔

لیلیٰ کے باپ کی آواز بھرا گئی۔ لیلیٰ تھوڑی دیر وہیں
چپ چاپ کھڑی رہی پھر جس دروازے سے آئی تھی اسی
سے باہر نکل گئی [کٹ]

محبوب تولیہ سے سر پونچھتا ہوا غسل کے کمرے سے
باہر آیا تو مینا نے آگے بڑھ کر پوچھا

مینا:۔ پانی خوب اچھی طرح خشک کر لیا نا؟

محبوب:۔ ہاں!

مینا:۔ کہاں —— دیکھوں تو! یہ کیا اب تک تمہارے
بال اور تمہارا جسم بھیگا ہوا ہے۔ لاؤ تولیہ مجھ کو دے دو۔

محبوب:۔ سچ؟ دیکھو ذرا اچھی طرح پونچھنا۔

مینا:۔ دیکھنا اس مرتبہ تم سخت بیمار پڑو گے۔

محبوب مسکرا دیا۔

محبوب:۔ کوئی پرواہ نہیں، مینا۔ تجھے یاد ہے بچپن میں
دادی سے قصہ سنا تھا کہ کسی سنسان میدان میں ایک شاہزادے نے
بہت سارے دیو مارے تھے۔ قصہ سنتے وقت میں نے عہد کر
لیا تھا کہ اسی شاہزادے کی طرح میں بھی دیوؤں کو مار دوں گا۔ تلوار
کے ایک ہی وار سے سب کو ختم کر دوں گا —— اس کے بعد وہ غیر
ہلکی مسکراہٹ ——

مینا:۔ اس کے لئے صحت بھی تو چاہئیے

محبوب:۔ ہاں چاہئیے تو ضرور لیکن اس سے تو بس تو ہی
ڈرتی ہے میری بھولی بہن۔

اب اچانک محبوب کو لیلیٰ کی غیر موجودگی کا احساس
ہوا ——

محبوب:۔ لیلیٰ کہاں گئی؟

مینا:۔ تمہارے پیر دھونے کے لئے گرم پانی لینے گئی ہے ——
—— لو وہ آگئی۔

لیلیٰ نے گرم پانی کی بالٹی لاکر کرسی کے پاس
رکھ دی اور مینا سے بولی

لیلیٰ:۔ مینا۔ بھیا سے کہو پیر بالٹی کے اندر ڈال دیں اور
بدن کو اس گرم کپڑے سے ڈھک لیں۔

مینا:۔ ہاں بھیّا! جلدی کرو ورنہ خواہ مخواہ کو بیماری کے
پھیر میں پڑ جاؤ گے۔

محبوب:۔ ارے تم کیوں گھبراتی ہو۔

[کلوز اپ]:۔ محبوب بالٹی میں پاؤں ڈالے بیٹھا ہے
آنکھیں اوپر اٹھا کر اس نے لیلیٰ کو دیکھا۔ پھر بولا

محبوب:۔ سمجھا تم کیوں خفا ہو۔ لیکن تم ہی بتاؤ میں کیا کرتا۔
بستی کے لوگوں کو اس حالت میں چھوڑ کر تو تم بھی نہیں آسکتی تھیں۔
دیواریں گر پڑیں۔ پانی گھروں میں گھس آیا۔

لیلیٰ:۔ میں تم سے کیفیت تو طلب نہیں کر رہی

محبوب:۔ لیکن مجھ سے غصہ تو ہو۔ واقعی لیلیٰ۔ مانتا ہوں۔
مجھ سے بڑا قصور ہوا ہے۔ میرے انتظار میں تم نے بہت پریشانی اٹھائی
ہے ——!

لیلیٰ :۔ یہ سب باتیں مجھے کیوں سنا رہے ہو؟ مجھے ان سے کیا! میں جاتی ہوں ابا کے پاؤں میں تکلیف ہے۔ تیل مالش کر آؤں

اس کے بعد مینا سے مخاطب ہو کر بولی

لیلیٰ :۔ دیکھو مینا۔ جب بھیا پیر دھو چکیں تو مجھ کو خبر کر دینا

محبوب :۔ سنو لیلیٰ۔ ایک بات تو سنتی جاؤ

لیلیٰ :۔ کیا ہے ؟

محبوب نے مینا کی طرف دیکھ کر کہا

محبوب :۔ مینا تو جا تو ذرا ماموں کے پاس، دیکھ تو وہ کیا کر رہے ہیں

مینا بادل نخواستہ چلی جاتی ہے۔ [کٹ]

[کلوز اَپ] لیلیٰ اور محبوب آمنے سامنے بیٹھے ہیں

محبوب :۔ بات سنو لیلیٰ، ادھر دیکھو

لیلیٰ :۔ بولو نا۔ سن تو رہی ہوں۔

محبوب :۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ تم مجھ سے خفا ہو لیکن کسی طرح بھی میں وقت پر نہیں آ سکا۔ لوگوں کی کیا بری حالت ہوئی ہے

لیلیٰ :۔ یہ تو میں نے بھی سنا ہے لیکن تمہیں اپنا بھی تو خیال رکھنا چاہیئے

محبوب :۔ مصیبت زدہ لوگوں سے الگ میری اپنی کوئی زندگی نہیں۔ تم جانتی ہو لیلیٰ میں نے اپنے آپ کو ان آفت رسیدوں کی ہستی میں گم کر دیا ہے۔ جب سے شعور پیدا ہوا ہے میں انھیں کے ساتھ رہ کر جد و جہد کر رہا ہوں۔

لیلیٰ :۔ لیکن وہ لڑائی تو کب کی ختم ہو چکی۔ ملک آزاد ہو چکا آخر اب تمہارا جہاد کس کے لئے ہے؟

محبوب :۔ ہاں سچ ہے کہ ملک آزاد ہو چکا ہے لیکن دو سو سال کی غلامی کا جو زہر ہمارے دل و دماغ میں سرایت کر گیا تھا اس کا اثر اب تک زائل نہیں ہو سکا ہے [کٹ]

[کلوز اَپ] محبوب بے خودی کے عالم میں بولے جا رہا تھا

محبوب :۔ ہمارے سماج میں اب بھی لا تعداد بھوکے بستے ہیں۔ ضرورت کے مطابق انھیں کھانے اور پینے کی چیزیں میسّر نہیں آتیں زمینداروں، مالکوں اور سرمایہ داروں کے ظلم اور لوٹ کھسوٹ نے ان کو پریشان کر رکھا ہے۔ ان کے دکھ اور درد کی فریاد اب تک جاری ہے [کٹ]

محبوب لیلیٰ سے کہہ رہا ہے

محبوب :۔ وہ فریاد خدا کے عرش تک پہنچتی ہے یا نہیں۔ خدا معلوم۔ لیکن روزانہ یہ آہ و زاری سنکر ہم کیسے خاموش رہ سکتے ہیں ـــ بتاؤ لیلیٰ تم ہی بتاؤ!

لیلیٰ :۔ لیکن تم کر ہی کیا سکو گے؟

محبوب :۔ بہت ـــ بہت کچھ۔ مساویانہ حقوق اور آزادی کا خواب دیکھ کر ہم لوگوں نے جنگ شروع کی تھی لیکن مساویانہ حقوق کی فتح اب تک نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں یہ جنگ جیتنی ہوگی۔ زندگی کے نصب العین نے ہمیں جو راستہ دکھایا ہے اسی راستے پر چل کر ہم ایک نئی دنیا بسائیں گے اور اسی وقت ہماری جد و جہد ختم ہوگی۔

لیلیٰ :۔ سیاسی آزادی تو مل چکی، آہستہ آہستہ سب کچھ ہو جائیگا ـــ بدن پر پسینہ آنے لگا، کچھ تمہیں خبر بھی ہے؟

محبوب :۔ ارے ہاں! اب تو پسینہ آنے لگا۔

لیلیٰ :۔ اب بالٹی سے پیر باہر نکال لو

بالٹی سے پاؤں باہر نکالتے ہوئے محبوب نے پھر کہنا شروع کیا۔

محبوب :۔ میں جانتا ہوں وہ دن اب زیادہ دور نہیں۔ لیکن اپنے آپ تو نہیں آ جائیگا نا؟ کوشش تو کرنی ہوگی، تو بس میں وہی کر رہا ہوں۔ تم تو جانتی ہو ہمارا ملک نیا ہے۔ اس لئے نئے ملک کے نئے سماج کو نئے سرے سے نئی زندگی بخشنے کے لئے میں یونیورسٹی چھوڑ کر ـــ سب کچھ چھوڑ کر اس جہاد میں کود پڑا ہوں

لیلیٰ نے محبوب کے پاؤں پونچھتے ہوئے کہا

لیلیٰ :۔ خوب جانتی ہوں۔ تم اگر ایسا نہ کرتے تو آج بہت بڑا ادیب ہوتے ـــ بہت بڑے شاعر ہوتے اور نہ جانے کتنی شہرت کے مالک ہوتے۔

محبوب :۔ لیکن تم جانتی ہو کہ میں شہرت کا بھوکا نہیں ہوں ادب ویسے اچھی چیز ہے لیکن کیا کروں مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس میں میں جذبات کو پوری آزادی کے ساتھ بیان نہیں کر سکتا۔ لکھنے میں دو انگلیاں استعمال ہوتی ہیں لیکن ہونٹ بند رہتے ہیں۔ میرے ہی مکان

کے دروازے پر بھوکا سائل کھڑا روٹی روٹی کی آواز لگا رہا ہو تو اس کو اپنے افسانوں یا اشعار کا موضوع بنانا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ تحریروں کے ذریعے بھی سماج بدلنے کی کوشش کیجا سکتی ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر لکھتے رہنا میرے نزدیک حقیقت سے فرار ہے۔ مصیبت زدوں سے واقعی اگر کوئی ہمدردی ہو تو شاعری کرنیکی بجائے میدان عمل میں قدم رکھنا ہوگا۔ جدوجہد کے ذریعہ ان کا خاتمہ کرنا ہوگا۔

لیلیٰ :۔ تمہارے راستے میں اب تک کسی نے رکاوٹ تو نہیں ڈالی۔

محبوب :۔ تم نہ جانے کس دنیا میں رہتی ہو۔ ابا نے کتنی سخت مخالفت کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ میں برباد ہو گیا۔ بعد میں البتہ بعد میں وہ خاموش ہو گئے تھے ـــــ میرا خواب اب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ میں نے ایک نئے سماج کا خواب دیکھا ہے۔ ایک نئے سماج کا جہاں کوئی دکھی نہ ہو، کسی کے ساتھ کوئی ظلم نہ ہو۔ ہر شخص اطمینان اور آرام کی زندگی بسر کر سکے۔ سبھوں کو یکساں مواقع حاصل ہوں تعلیم سب کے لئے ہو۔ کام کرنے کے مواقع ہر شخص کو میسّر ہوں جہاں سب لوگ امن اور سلامتی سے رہ سکیں

محبوب کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور اس کی آواز بھرّا جاتی ہے۔

لیلیٰ :۔ تمہارا یہ خواب کچھ ناممکن ہی سا ہے ـ ممکن ہے میں تمہاری باتیں نہ سمجھ سکوں کیونکہ میں تمہاری طرح پڑھی لکھی اور عقلمند نہیں ہوں۔ بس ایک معمولی سی عورت ہوں۔ بچپن میں تمہاری امید افزا باتیں سن سن کر میں نے بھی ایک خواب دیکھا تھا۔ ایک نئے سماج کا خواب۔ ہر روز میں یہ سوچتی تھی کہ کل ـــــ صبح کو جب آفتاب طلوع ہوگا تو اس کے ساتھ ہی وہ انقلاب بھی آ جائیگا۔ لیکن وہ سارے تصوّرات غلط ثابت ہوئے اور انقلاب نہیں آیا۔

محبوب :۔ نہیں نہیں لیلیٰ، ایسا نہ کہو۔ یہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔

لیلیٰ :۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں ایک معمولی عورت ہوں۔ تمہاری باتیں نہ تو میری سمجھ میں آتی ہیں اور نہ میں انھیں سمجھنا چاہتی ہوں۔ تمہاری باتوں پر میں بہت رہی لیکن اب ان امیدوں کے سہارے اور زیادہ نہیں رہ سکتی۔ تمہارے ٹھیک ہونے کا کوئی امکان مجھے تو نظر نہیں آتا۔ تم اپنی صحت تباہ کر چکے مگر اس پر بھی بس نہیں۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لئے جو راہ تم نے اختیار کی ہے وہ دھیرے دھیرے تمہیں موت کی طرف لئے جا رہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ میں بھی تم سے خفا ہو کر ناخوش رہنے لگی۔ اب اس سے زیادہ برداشت کی قوت مجھ میں نہیں ہے۔ تمہاری خاطر میں اپنے دل کا چین اور سکون اور زیادہ برباد نہیں کر سکتی۔

محبوب کچھ دیر تک خاموش بیٹھا تعجب بھری نظروں سے لیلیٰ کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بہت اداس لہجہ میں کہا ـــ

محبوب :۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے نصب العین پر تمہیں بھروسہ نہیں رہا ـــ لیکن لیلیٰ یہ تو بتاؤ کہ تم چاہتی کیا ہو۔

لیلیٰ :۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تمہیں میری بھی کچھ پرواہ ہے یا نہیں۔ شادی کرو یا نہ کرو، مجھے اس کی کوئی شکایت نہیں لیکن دوست کی حیثیت سے بھی کیا تم میری آرزوؤں اور تمناؤں کی کوئی قیمت نہیں دے سکتے۔؟؟

محبوب نے بہت رک رک کر جواب دیا

محبوب :۔ لیلیٰ مجھے شادی سے انکار نہیں ہے لیکن میں سوچتا ہوں کہ کیا تم مجھ سے شادی کر کے خوش رہ سکوگی، کیا میں تمہیں آسودہ کر سکوں گا؟ میری صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے، مجھے ڈر لگتا ہے کہ مجھ سے شادی کر کے کہیں تم بیوہ نہ ہو جاؤ ـــ جنم جنم کا روگ نہ لگ جائے تم کو۔

لیلیٰ :۔ اوہ۔ چپ بھی رہو محبوب۔ کیا واہیات باتیں نکالنے لگے۔ زندگی کا بہترین حصّہ تو تم ملک اور قوم کی نذر کر چکے۔ اب بقیہ ایام تم میرے حوالے کر دو۔ میں تمہاری خدمت کروں گی اور تمہیں سکھ پہنچا کر خود بھی خوشی اور اطمینان کی زندگی بسر کروں گی۔ بس اس سے زیادہ میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتی۔

محبوب اپنی جگہ سے اٹھ کر لیلیٰ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور پھر بڑے پیار بھرے لہجہ میں بولا

محبوب :۔ ہاں لیلیٰ۔ اگر تم میری خدمت کر کے میری صحت بحال کر سکیں تو وہ صرف تمہارے لئے ہی نہیں بلکہ میرے نصب العین کے لئے بھی مفید ہوگا۔

لیلیٰ :۔ تم خود سوچو نا۔ کیسی خراب ہوگئی ہے تمہاری صحت، اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اب بھی اگر میں کوشش کروں تو تمہاری بگڑی ہوئی صحت بحال ہو سکتی ہے

محبوب :۔ بہت خوب! لو میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج سے میں تمہاری کسی بات کی مخالفت نہیں کروں گا

[کٹ]

مینا کمرے میں داخل ہو رہی تھی کہ اس کے کانوں میں لیلیٰ اور محبوب کے عہد و پیمان کی بھنک پڑی اور وہ وہیں دیوار کے ساتھ لگ کر ان کی باتیں سننے لگی [کٹ]

لیلیٰ :۔ میری طرف تو تم آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور میں صرف تمہارے ہی تصورات کے سہارے زندہ ہوں۔ میں نے جو ایک خوش گوار زندگی کا خواب دیکھا ہے وہ تمہارے بغیر کبھی پورا نہیں ہو سکتا کبھی نہیں۔

محبوب :۔ شاید میری ہی غلطی ہو۔ بچپن ہی سے تم میری ہو — اب تم کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنا بنا لینے کو کیا میرا دل نہیں چاہتا؟ لیکن تم —— لیلیٰ۔ کیا واقعی تم میرے نصب العین پر یقین نہیں کرتیں؟

لیلیٰ :۔ نہیں

محبوب :۔ نہیں لیلیٰ۔ یہ جھوٹ ہے۔ میں تمہاری بات کو سچ نہیں مان سکتا۔

لیلیٰ :۔ یہ بالکل فطری بات ہے۔ تمہارے دماغ میں اور کوئی بات آ ہی تو نہیں سکتی

محبوب :۔ لیکن لیلیٰ! پہلے تو تم اتنی سنگ دل نہیں تھیں —!

لیلیٰ :۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر آج میں مجبور ہوں۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ میں اب اور زیادہ دنوں تک تم کو اپنے نام سے کھیلنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آخر تم جھوٹے وعدے کر کر کے کب تک میری زندگی برباد کرتے رہو گے؟ یاد ہے نا۔ تم نے ایک دن وعدہ کیا تھا کہ مجھ سے ضرور شادی کر لوگے، کتنا حسین تھا وہ دن اور آج تک میں اُسی تسلی کے سہارے زندہ ہوں۔ اب تمہارا وہ شوق کہاں گیا؟ تمہاری آرزوئیں کیا ہوئیں۔ کون جانے، یہ ہو سکتا ہے کہ تم نے مجھ کو دھوکا دیا ہو اور میں اسی جھوٹے وعدے کے سہارے اب تک تمہارا انتظار کرتی رہی،

بولتے بولتے لیلیٰ کی آواز بھرّا گئی اور وہ چپ ہو گئی۔

محبوب :۔ نہیں لیلیٰ! یہ سب جھوٹ نہیں۔ میں نے تمہیں کوئی دھوکا نہیں دیا ہے۔ لیلیٰ میں نے اسی وقت طے کر لیا ہے کہ آئندہ مہینہ میں ہماری شادی ہو جائے گی۔ تمہاری زندگی برباد کرنے کا ارادہ کبھی نہیں تھا — آج بھی نہیں ہے۔ لیلیٰ میں ایسا انسان نہیں ہوں اور نہ میں نے تمہارا نام محض وقتی دلچسپی کیلئے لیا ہے

لیلیٰ نے پیاری پیاری آنکھوں سے محبوب کو دیکھا

[کٹ]

مینا جو اب تک دیوار سے لگی۔ ان کی باتیں سن رہی تھی تالی بجاتی خوشی سے ناچتی اندر بھاگ گئی۔

[کٹ]

لیلیٰ نے سر نیچا کر لیا۔ محبوب نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا

محبوب :۔ کہو اب تو خوش ہوئیں نا؟

اس نے لیلیٰ کی ٹھوڑی پکڑ کر منہ اوپر اٹھایا تو لیلیٰ کی آنکھوں میں شبنمی قطرے تیرتے نظر آئے۔

لیلیٰ نے محبوب کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا

لیلیٰ :۔ لو اب میں جا کر مینا کو بلا لاتی ہوں۔ تم اب گھر جاؤ گے نا؟ ابا سے بعد میں آ کر مل لینا۔ انھوں نے تم کو گھر جانے کو کہا ہے نا! [فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن] :۔ محبوب اور مینا رکشا میں گھر پہنچے۔ محبوب کرایہ دینے کے بعد آہستہ آہستہ اندر داخل ہوا۔ لیکن مینا رکشا سے کود کر دندناتی گھر میں گھس گئی

[کٹ]

اوسط گھرانہ کے سونے کا کمرہ۔ ایک کونے میں مصلّےٰ بچھا ہے اور ایک معمّر خاتون بیٹھی مناجات پڑھ رہی ہیں۔ پہلے مینا کی "امی امی" کی آواز آئی

اور پھر دوڑتی ہوئی خود مینا داخل ہوئی

مینا :۔ امی ۔

مناجات ختم کر کے مینا کی ماں نے مڑ کر دیکھا

امی :۔ کیا ہے بیٹا یا محبوب آیا ہے کیا؟

مینا :۔ ہاں امی ــــ بھیا آگئے ــــ!

ماں :۔ اتنا ہانپ کیوں رہی ہے؟

مینا :۔ سنو تو پہلے

اتنا کہہ کر مینا ماں کے پاس زمین پر بیٹھ جاتی ہے ــــ

مینا :۔ امی! بھیا شادی کرنے پر راضی ہو گئے ہیں ــــ

ــــ ماں کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو گیا ۔ پھر اس نے مزید اطمینان کے لئے پوچھا

ماں :۔ تجھ کو کیسے معلوم ہوا؟

مینا :۔ سن تو تو ماں ۔ بھیا نے خود نیلی آپا سے طے کیا ہے کہ آئندہ مہینہ میں شادی ہو جائے گی

ماں :۔ واقعی؟ جھوٹ تو نہیں بک رہی ہو؟

مینا :۔ نہیں ماں ۔ خود میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے (کچھ توقف کے بعد) ماں اگر ــــ میری بات پر تمہیں اعتبار نہیں آتا تو خود بھیا سے پوچھ لو ۔

مینا کی ماں مصلے سے اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکل جاتی ہیں ۔ مینا بھی ان کے پیچھے جاتی ہے ــــ [کٹ]

محبوب کا کمرہ ۔ سینے پر کھلی ہوئی کتاب رکھے محبوب آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہا ہے ۔ کمرے میں پلنگ، میز، کرسیاں، کتابیں اور دوسری بے شمار اشیاء اِدھر اُدھر کسی ترتیب کے بغیر بکھری پڑی ہیں ۔ پاؤں کی آہٹ پا کر محبوب نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ماں داخل ہو رہی ہے

ماں :۔ کھانا کھا کر آئے ہو محبوب؟

محبوب :۔ جی ہاں امی ۔ (اس نے پھر کتاب اٹھالی)

ماں :۔ اب سوئے گا کیا؟

محبوب :۔ نہیں، تھوڑی دیر بعد سوؤنگا

اس مختصر سے جواب سے ماں کے چہرے پر اداسی چھا جاتی ہے پھر بھی وہ مسکرانے کی کوشش کرتی ہیں

ماں :۔ کچھ ٹھیک ٹھاک کر کے آیا ہے کیا؟

محبوب :۔ کیا؟

ماں کچھ مشکل میں پڑ جاتی ہے

ماں :۔ جیسے کچھ سمجھتا ہی نہیں ۔ اری میں تیری شادی کے متعلق پوچھ رہی ہوں

محبوب :۔ ارے ہاں ۔ میں تو بھول ہی گیا تھا (کتاب ہاتھ سے رکھ کر محبوب اٹھ کھڑا ہوتا ہے) امی ۔ کافی غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شادی میں اور زیادہ تاخیر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ۔ آئندہ مہینے میں کوئی تاریخ مقرر کر لی جائے تو اچھا رہے گا ۔

ماں :۔ سچ کہتا ہے؟

محبوب :۔ (ہنستے ہوئے) کیوں یقین نہیں آتا کیا؟

ماں :۔ تیرے جیسے ہٹ دھرم اور سخت دل کی باتوں پر واقعی یقین نہیں آتا

اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں، خوشی کے آنسو

محبوب :۔ شادی ہو جائے گی جب تو یقین آئے گا نا؟

ماں :۔ تیری باتیں ہمیشہ ہی اوٹ پٹانگ ہوتی ہیں ۔ اچھا لے اب میں جا کر تیرے باپ کو بتاتی ہوں ۔ اتنے دنوں سے تیرے منہ سے اسی 'ہاں' کے انتظار میں تھی ۔ ایسی نیک بخت اور خوبصورت بچی میرے گھر میں بہو بن کر آرہی ہے ۔ خدا سب کو مبارک کرے ۔ آج تو نے واقعی میرا دل خوش کر دیا ہے ۔

اتنا کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں پھر آنسو تیرنے لگتے ہیں ۔ مینا آکر ماں کے پیچھے کھڑی ہو جاتی ہے ۔

مینا :۔ امی، ابا نے آپ کو بلایا ہے

ماں :۔ ہاں بس اب وہیں جا رہی ہوں ۔

ماں کے چلے جانے کے بعد مینا محبوب کے پاس آکر کھڑی ہو جاتی ہے اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس کو

دیکھنے لگتی ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سامنے
کھڑا ہوا آدمی اس کا اپنا بھائی محبوب نہ ہو بلکہ کوئی
اجنبی ہو ۔ محبوب کی پیشانی پر بال بے ترتیبی سے
بکھرے ہوئے تھے ۔ مینا نے چپ چاپ اس کے
پاس جا کر بالوں کو ٹھیک کر دیا —— محبوب نے
پوچھا

محبوب :- امی کو کیسے معلوم ہوا تھا؟

مینا :- واہ! میں کیا جانوں!

مسکراتے ہوئے محبوب نے کتاب پھر ہاتھ میں
اٹھالی ۔ مینا کچھ دیر تک اسی طرح خاموش کھڑی رہی
جیسے سوچ رہی ہو کہ گفتگو کس طرح شروع کی جائے
—— پھر یکایک بول اٹھی ۔

مینا :- چلو اچھا ہوا اب مجھے آپ کا کمرہ ٹھیک ٹھاک کرنے
کی مصیبت سے چھٹکارا مل جائیگا ۔

محبوب :- ویسا کچھ تو میرے کمرے کی دیکھ بھال کرتی ہو وہ مجھ کو
بھی معلوم ہے

کیمرا کمرے کے چاروں طرف گھوم کر پھر اپنی جگہ پر
آ گیا ۔

مینا :- ہاں ۔ اب تو میں نکمی ہو ہی جاؤں گی ۔ اب تو بھابی
آ رہی ہیں نا ۔ اب مجھ کو کون پوچھے گا ۔ ارے میری بھابی !

محبوب :- کیوں، کیا ہے!

مینا :- ارے میری بھابی !

اتنا کہہ کر مینا چیختی چلاتی بھونرے کی طرح ناچتی
پورے مکان میں ادھر سے اُدھر شور مچانے لگی ۔

[فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن] انجمن کا دفتر ۔ تین چار نوجوان بیٹھے
باتیں کر رہے ہیں کہ ایک نوجوان لپکتا ہوا داخل
ہوتا ہے

نوجوان :- ارے تم سب یہاں بیٹھے ہوئے کیا کر رہے
ہو! محبوب کی شادی میں نہیں جاؤ گے کیا ۔ ہم سب کی دعوت ہو
اور آج دوپہر کا کھانا بھی وہیں ہو ۔

سن رسیدہ :- تم تو جا رہے ہو نا؟

نوجوان :- ہاں! مگر مجیب تم نہیں جاؤ گے؟ ہمارے اپنے
محبوب کی شادی ہے ۔

مجیب نے بڑی بے اعتنائی سے کہا

مجیب :- اسی لئے تو نہیں جاؤں گا ۔ ہم نے جو کام اپنے
ذمہ لیا ہے اس میں عشق و عاشقی اور خود غرضی کی کوئی گنجائش نہیں ہو
اسی سے بے راہ روی آتی ہے اور بے راہ روی کے معنی ہیں موت؛
میں محبوب کی شادی سے متفق نہیں ہوں ۔

باہر سے آنے والا نوجوان اک ذرا کشمکش کے
عالم میں دکھائی دیتا ہے ۔ اس نے ایک طرف بیٹھتے
ہوئے کہا

نوجوان :- یہ تمہاری ہٹ دھرمی ہے مجیب ۔ اس کے کوئی
معنی نہیں ۔

اتنا کہہ کر اس نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو دیکھا
لیکن کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ۔

مجیب نے کھڑے ہو کر اب کی ذرا سخت لہجہ میں کہا

مجیب :- مجھے یقین ہے کہ میں ٹھیک راستہ پر ہوں اور اس
میں میری کوئی ہٹ دھرمی نہیں ہے ۔ دنیا کے دکھی اور مصیبت زدہ
انسانوں سے محبت کا عہد کرنے کے بعد اب وہ ایک معمولی عورت
کے لئے اپنا دل نچھاور کر رہا ہے —— چھی!

نوجوان :- اچھی بات ہے ۔ اگر تم لوگ نہیں جاؤ گے تو میں
اکیلا اس کی شادی میں شریک نہیں ہونگا ۔ [فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن] :- لیلیٰ کے مکان کا بیرونی منظر ۔ پھاٹک
کے پاس شامیانے کے نیچے شہنائی بج رہی ہے اور
کافی چہل پہل ہے

[سُوپر امپوز] :- کیمرا اب گھر کے اندر کا منظر پیش
کرتا ہے ۔ ہر طرف شادی کا سامان بکھرا پڑا ہے ۔ پاؤں
کی تکلیف کے باوجود لیلیٰ کے والد انتظامات کے سلسلے
میں ادھر ادھر آ جا رہے ہیں ۔ جہاں عورتوں کے کپڑوں
پر رنگ اور بدن پر ابٹن لگا ہوا ہے ۔ اور اب عورتیں
لیلیٰ کے بدن پر ابٹن مل رہی ہیں ۔ تحفے تحائف کی چیزوں

کو ایک طرف سجایا جا رہا ہے - باہر باورچی خانہ میں چولھے گرم ہیں اور ان پر بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوئی ہیں اب کیمرا ایک طویل منتاز شاٹ پیش کرتا ہے جس میں پورا مکان شادی کے ہنگاموں کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اب کیمرا لیلیٰ کے کمرے کا منظر پیش کرتا ہے۔ لیلیٰ اپنی سہیلیوں میں گھری لجائی شرمائی اور بنی سنوری بیٹھی ہے ۔ ایک لڑکی گانا گا رہی ہے ۔ گانا ختم کر کے اس نے لیلیٰ سے پوچھا ۔

لڑکی :۔ کیوں جی ! گانا پسند آیا؟

لیلیٰ نے کچھ نہیں کہا ۔ آنکھوں آنکھوں میں پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے پھر نظریں نیچی کر لیں ۔ [کٹ]

لیلیٰ کے پاس بیٹھی ہوئی ایک سانولی لڑکی نے کہا :۔ خدا کا شکر ہے کہ بیل منڈھے چڑھی اور اللہ آمین سے شادی ہو کر رہی

دوسری لڑکی :۔ ہاں بھائی، لیکن دیکھو شادی کے بعد ہمیں ایکدم نہ بھول جانا۔ کہیں اپنا آشیانہ ایسی جگہ نہ بنا لینا جہاں ہم لوگ پر بھی نہ مار سکیں

گانیوالی لڑکی :۔ ہاں بھئی آشیانہ ضرور بنانا لیکن ایسا نہ ہو کہ ہم لوگوں کے ہاتھوں سے ایکدم ہی نکل جاؤ ۔

دوسری عورت :۔ آشیانہ؟

گانیوالی لڑکی :۔ ہاں ہاں آشیانہ !

دوسری عورت :۔ واہ! بہت خوب!!

اِدھر اُدھر دیکھ کر لیلیٰ نے بھی زیر لب کہا

لیلیٰ :۔ آشیانہ ! آشیانہ !

دوسری عورت :۔ ہاں بھائی ۔ دھن دولت کچھ نہیں بس یہ ایک آشیانہ تھا جس کی تم نے آرزو کی تھی ۔

لیلیٰ :۔ اچھا یہی سہی ۔

سب لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہیں

ایک عورت :۔ لیکن دولھا اب تک آ کیوں نہیں رہا ہے

دوسری عورت :۔ ابھی آ جائے گا —— وہ دیکھو شاید آ ہی رہا ہے ۔

ایک نوکرانی دروازے سے اندر آتے ہوئے بولی ۔

نوکرانی :۔ باپ رے باپ! دوڑتے دوڑتے میں تو بے حال ہو گئی ۔ میں نے تو سوچا تھا کہ ذرا اپنی آپا کے پاس بیٹھ کر ہنسی مذاق کروں گی مگر یہاں تو دوڑتے دوڑتے کمر ہی ٹوٹ گئی ۔ بس ہر گھڑی اِس کو بلا لاؤ اُس کو بلا لاؤ کی رٹ لگی رہتی ہے —— ادے ہاں آپا ۔ ابا نے آپ کو بلایا ہے ۔ وہ ڈائنی روم میں بیٹھے ہیں ۔

ایک لڑکی :۔ ارے کولی کی ماں، یہ ڈائنی روم کیا ہوتا ہے؟

نوکرانی :۔ اب جانے بھی دیجئے آپ تو مجھ کو بنانے لگیں ۔ جیسے آپ کو ڈائنی روم کے معنی بھی نہیں معلوم ہیں

لیلیٰ نے چہرہ اوپر کو اٹھاتے ہوئے ہولے سے کہا

لیلیٰ :۔ کولی کی ماں نے نئی نئی انگریزی سیکھی ہے اسی لئے وہ ڈرائنگ روم کو ڈائنی روم کہتی ہے ۔ بیچاری کا تلفظ اب تک ٹھیک نہیں ہوا ۔

تمام عورتیں ہنسنے لگتی ہیں

لیلیٰ :۔ اچھا بھئی، تم لوگ یہیں بیٹھو میں ذرا ابا کی بات سن آؤں ۔

لیلیٰ اٹھی اور اس کے ساتھ ساتھ کیمرہ بھی دالان سے ہوتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچکر رک گیا ۔ سامنے ایک طرف لیلیٰ کے والد ایک چھڑی کا سہارا لئے کھڑے ہیں ۔ ان کے چہرے سے پریشانی اور تکلیف کا اظہار ہوتا ہے ۔ لیلیٰ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ بھی آگے بڑھے

والد :۔ بیٹی ! دل تجھ کو دیکھنے کے لئے بہت بے چین ہو رہا تھا اسی لئے بلا بھیجا ہے

لیلیٰ :۔ کیوں ابا ؟

والد :۔ بیٹی ! تھوڑی دیر بعد ہی تو اس گھر سے کہیں اور چلی جائیگی تیرے بوڑھے باپ کو تیری جدائی ابھی سے ستانے لگی ہے ۔ میں نے تجھ کو بچپن سے پالا ہے اور اس گھر میں ہم لوگوں نے اکیلے ہی زندگی بسر کی ہے ۔ اب تو بھی چلی جائے گی ۔ بتا تو صحیح ۔ اب تیرے چلے جانے کے بعد میں اپنا وقت کس طرح گزاروں گا ۔

لیلیٰ :۔ ابا میں آپ کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گی ۔

والدہ:- لیلیٰ — بیٹی کو باپ کا مکان چھوڑنا ہی پڑتا ہے ۔ سسرال جانا ہی پڑتا ہے ۔

لیلیٰ:- جاؤں گی بھی تو جلد ہی لوٹ آؤں گی ۔ ہم لوگ یہیں رہیں گے ۔

والد:- اچھا بیٹی اچھا! یہ سب تو بعد میں دیکھا جائے گا ۔ آج میں بہت خوش ہوں، آج میری زندگی کا سب سے خوش نصیب دن ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک غم بھی میرے دل کو کھائے جا رہا ہے

لیلیٰ:- وہ کیا غم ہے ابا؟

والد:- محبوب کی صحت دیکھ کر میرے دل میں طرح طرح کے خیال پیدا ہوتے ہیں

لیلیٰ:- ابا - آپ اس کی فکر نہ کریں - میں ان کی خدمت کرکے انھیں نئی زندگی عطا کروں گی - آپ صرف ہم لوگوں کے لئے دعا کیجئے گا ۔

والد:- بیٹی، تم دونوں کے لئے دعا تو ہر وقت میرے روئیں روئیں سے نکلتی رہے گی ۔ جب تک زندہ ہوں اپنی آخری سانسوں کے ساتھ تیری بھلائی سوچتا رہوں گا ۔ بیٹی ۔ اب تیرا بیاہ ہو جائے گا ۔ شادی کے بعد عورت کا سب کچھ اس کا شوہر ہی ہوتا ہے ۔ تو اگر چاہے تو اللہ پر بھروسہ کرکے ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے - تیرا سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ محبوب کو سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ رکھے ۔ وقت پر کھانا پینا اور آرام کرنا اس کے لئے بہت ضروری ہے - خدا تیری مدد کرے — ! [کٹ]

لیلیٰ کے والد محبوب کو نصیحت کر رہے ہیں

والد:- تم سے بھی کہتا ہوں بیٹے! سیاست کا نشہ بہت برا ہوتا ہے ۔ بیٹے ایک بہت بڑے شاعر کا قول ہے کہ "سیاست چند نفوس کی بھلائی کی خاطر عوام کی شورش کا نام ہے" اس طرح سچا نصب العین کبھی بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا ۔ میری خواہش ہے کہ آب وہوا بدلنے کے لئے تم دونوں کچھ دنوں کے لئے کاکس بازار چلے جاؤ ۔ وہاں میرے ایک ڈاکٹر دوست رہتے ہیں ۔ میں نے ان کو خط لکھ دیا ہے - تمہارے رہنے سہنے کے لئے ایک مکان کا انتظام کرکے وہ مجھ کو اطلاع دیں گے ۔ مجھے یقین ہے کہ چند دنوں میں وہاں تم دونوں کی صحت بہت اچھی ہو جائے گی [کٹ]

محبوب لیلیٰ اور لیلیٰ کے والد بیٹھے بات کر رہے ہیں —

والدہ:- اری او مینا ۔ حدھن سے کہنا کہ وہ بھی یہیں میرے ساتھ آکر رہیں

اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی ۔ لیلیٰ اور محبوب دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے

والد:- اچھا بھئی جاؤ اب تم لوگ بھی روانگی کی تیاری کر لو ۔ رات زیادہ ہو گئی ہے اور براتی لوگ دیر سے شور مچا رہے ہیں [وائپ]

[فیڈ ان]:- انجمن کا دفتر - کچھ پریشان سا ایک نوجوان داخل ہوتا ہے

نوجوان:- مجیب الرحمن ہے؟

ایک آدمی نے اندر ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا ۔

نوجوان:- ایک خبر سنی مجیب؟

مجیب:- کیا؟

نوجوان:- محبوب آب وہوا بدلنے کے خیال سے بیوی کے ساتھ کاکس بازار گیا ہے

مجیب:- سچ؟

نوجوان:- ہاں ابھی ابھی معلوم ہوا ۔

مجیب:- ہوں ۔ ہم لوگوں کو خبر کئے بغیر ہی چلا گیا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند دنوں میں ہی اس نے ہم لوگوں کو یکسر بھلا دیا لیکن اس طرح چھپ کر کب تک زندگی بسر کرے گا؟

نوجوان:- ٹھیک طرح سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔

مجیب:- یہ تو بڑی عجیب بات ہوئی ۔ یہاں ہم اس کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور وہ کچھ کہے بغیر ہی چلا گیا ۔ محبوب سے ایسی امید تو نہ تھی ۔

نوجوان:- تعجب تو یہی ہے کہ محبوب نے ایسا کیوں کیا ۔

مجیب:- اچھا بھئی ۔ تم اندر چل کر بیٹھو ۔ میں ان لوگوں سے باتیں کرکے آتا ہوں ۔ تم سے کچھ ضروری گفتگو کرنی ہے [وائپ]

کو ایک طرف سجایا جا رہا ہے - باہر باورچی خانہ میں
چولھے گرم ہیں اور ان پر بڑی بڑی دیگیں چڑھی ہوئی ہیں
اب کیمرا ایک طویل منتاژ شاٹ پیش کرتا ہے جس میں
پورا مکان شادی کے ہنگاموں کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اب
کیمرا لیلیٰ کے کمرے کا منظر پیش کرتا ہے۔ لیلیٰ اپنی سہیلیوں
میں گھری لجائی شرمائی اور بنی سنوری بیٹھی ہے۔ ایک
لڑکی گانا گا رہی ہے۔ گانا ختم کر کے اس نے لیلیٰ سے
پوچھا۔

لڑکی :۔ کیوں جی! گانا پسند آیا؟

لیلیٰ نے کچھ نہیں کہا۔ آنکھوں آنکھوں میں پسندیدگی
کا اظہار کرتے ہوئے پھر نظریں نیچی کر لیں۔ [کٹ]

لیلیٰ کے پاس بیٹھی ہوئی ایک سانولی لڑکی نے
کہا:۔ خدا کا شکر ہے کہ بیل منڈھے چڑھی اور اللہ
آمین سے شادی ہو کر رہی

دوسری لڑکی:۔ ہاں بھائی، لیکن دیکھو شادی کے
بعد ہمیں ایکدم نہ بھول جانا۔ کہیں اپنا آشیانہ ایسی جگہ نہ بنا
لینا جہاں ہم لوگ پر بھی نہ مار سکیں

گانیوالی لڑکی:۔ ہاں بھئی آشیانہ ضرور بنانا لیکن ایسا نہ ہو
کہ ہم لوگوں کے ہاتھوں سے ایکدم ہی نکل جاؤ۔

دوسری عورت:۔ آشیانہ؟

گانیوالی لڑکی:۔ ہاں ہاں آشیانہ!

دوسری عورت:۔ واہ! بہت خوب!!

اِدھر اُدھر دیکھ کر لیلیٰ نے بھی زیر لب کہا

لیلیٰ:۔ آشیانہ! آشیانہ!

دوسری عورت:۔ ہاں بھائی۔ دھن دولت کچھ نہیں
بس یہ ایک آشیانہ تھا جس کی تم نے آرزو کی تھی۔

لیلیٰ:۔ اچھا ہی سہی۔

سب لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہیں

ایک عورت:۔ لیکن دولھا اب تک آ کیوں نہیں رہا ہے

دوسری عورت:۔ ابھی آئے گا ـــــ وہ دیکھو شاید آ ہی
رہا ہے۔

ایک نوکرانی دروازے سے اندر آتے ہوئے
بولی۔

نوکرانی:۔ باپ رے باپ! دوڑتے دوڑتے میں تو
بے حال ہوگئی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ ذرا اپنی آپا کے پاس بیٹھ کر ہنسی
مذاق کروں گی مگر یہاں تو دوڑتے دوڑتے کمر ہی ٹوٹ گئی۔ بس ہر
گھڑی اِس کو بلاؤ اُس کو بلاؤ کی رٹ لگی رہتی ہے ـــ اوے
ہاں آپا۔ ابا نے آپ کو بلایا ہے۔ وہ ڈانی روم میں بیٹھے ہیں۔

ایک لڑکی:۔ ارے کولی کی ماں، یہ ڈانی روم کیا ہوتا ہے؟

نوکرانی:۔ اب جانے بھی دیجئے۔ آپ تو مجھی کو بنانے لگیں۔ جیسے
آپ کو ڈانی روم کے معنی بھی نہیں معلوم ہیں

لیلیٰ نے چہرہ اوپر کو اٹھاتے ہوئے ہولے سے کہا

لیلیٰ:۔ کولی کی ماں نے نئی نئی انگریزی سیکھی ہے اسی لیئے وہ
ڈرائنگ روم کو ڈانی روم کہتی ہے۔ بیچاری کا تلفظ اب تک ٹھیک
نہیں ہوا۔

تمام عورتیں ہنسنے لگتی ہیں

لیلیٰ:۔ اچھا بھئی، تم لوگ یہیں بیٹھو، میں ذرا ابا کی بات
سن آؤں۔

لیلیٰ اٹھی اور اس کے ساتھ ساتھ کیمرہ بھی دالان
سے ہوتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچکر رک گیا۔ سامنے
ایک طرف لیلیٰ کے والد ایک چھڑی کا سہارا لیئے کھڑے
ہیں۔ ان کے چہرے سے پریشانی اور تکلیف کا اظہار ہوتا
ہے۔ لیلیٰ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ بھی آگے بڑھے

والد:۔ بیٹی! دل تجھ کو دیکھنے کے لیئے بہت بے چین
ہو رہا تھا اسی لیئے بلا بھیجا ہے

لیلیٰ:۔ کیوں ابا؟

والد:۔ بیٹی! تھوڑی دیر بعد ہی تو اس گھر سے کہیں اور چلی جائیگی
تیرے بوڑھے باپ کو تیری جدائی ابھی سے ستانے لگی ہے۔ میں نے
تجھ کو بچپن سے پالا ہے اور اس گھر میں ہم لوگوں نے اکیلے ہی زندگی بسر
کی ہے۔ اب تو بھی چلی جائے گی۔ بتا تو صحیح۔ اب تیرے چلے جانے کے
بعد میں اپنا وقت کس طرح گزاروں گا۔

لیلیٰ:۔ ابا میں آپ کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جاؤں گی۔

والد:- لیلیٰ — بیٹی کو باپ کا مکان چھوڑنا ہی پڑتا ہے ۔
سسرال جانا ہی پڑتا ہے ۔

لیلیٰ:- جاؤں گی بھی تو جلد ہی لوٹ آؤں گی ۔ ہم لوگ یہیں
رہیں گے ۔

والد:- اچھا بیٹی اچھا! یہ سب تو بعد میں دیکھا جائے گا ۔
آج میں بہت خوش ہوں، آج میری زندگی کا سب سے خوش
نصیب دن ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک غم بھی میرے دل کو
کھائے جا رہا ہے

لیلیٰ:- وہ کیا غم ہے ابا؟

والد:- محبوب کی صحت دیکھ دیکھ کر میرے دل میں طرح طرح
کے خیال پیدا ہوتے ہیں

لیلیٰ:- ابا ۔ آپ اس کی فکر نہ کریں ۔ میں ان کی خدمت
کر کے انھیں نئی زندگی عطا کروں گی ۔ آپ صرف ہم لوگوں کے لئے دعا
کیجئے گا ۔

والد:- بیٹی، تم دونوں کے لئے دعا تو ہر وقت میرے رونگٹیں
روئیں سے نکلتی رہے گی ۔ جب تک زندہ ہوں اپنی آخری سانسوں کے
ساتھ تیری بھلائی سوچتا رہوں گا ۔ بیٹی ۔ اب تیرا بیاہ ہو جائے گا ۔
شادی کے بعد عورت کا سب کچھ اس کا شوہر ہی ہوتا ہے ۔ تو اگر چاہے تو
اللہ پر بھروسہ کر کے ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہو ۔ تیرا سب سے پہلا کام یہ
ہونا چاہیئے کہ محبوب کو سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ رکھے ۔ وقت
پر کھانا پینا اور آرام کرنا اس کے لئے بہت ضروری ہو ۔ خدا تیری مدد
کرے — ! [کٹ]

لیلیٰ کے والد محبوب کو نصیحت کر رہے ہیں

والد:- تم سے بھی کہتا ہوں بیٹے! سیاست کا نشہ بہت
برا ہوتا ہے ۔ بیٹے ایک بہت بڑے شاعر کا قول ہے کہ "سیاست چند
نفوس کی بھلائی کی خاطر عوام کی شورش کا نام ہے" اس طرح سچا
نصب العین کبھی بھی حاصل نہیں کیا جا سکتا ۔ میری خواہش ہو کہ
آب وہوا بدلنے کے لئے تم دونوں کچھ دنوں کے لئے کاکس بازار چلے
جاؤ ۔ وہاں میرے ایک ڈاکٹر دوست رہتے ہیں ۔ میں نے ان کو خط
لکھ دیا ہے ۔ تمہارے رہنے سہنے کے لئے ایک مکان کا انتظام
کر کے وہ مجھ کو اطلاع دیں گے ۔ مجھے یقین ہے کہ چند دنوں میں
وہاں تم دونوں کی صحت بہت اچھی ہو جائے گی [کٹ]

محبوب لیلیٰ اور لیلیٰ کے والد بیٹھے بات کر رہے
ہیں —

والد:- اری او مینا ۔ مدھن سے کہنا کہ وہ بھی یہیں میرے
ساتھ آ کر رہیں

اتنا کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی ۔ لیلیٰ اور محبوب
دونوں حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے

والد:- اچھا بھئی جاؤ اب تم لوگ بھی روانگی کی تیاری
کر لو ۔ رات زیادہ ہو گئی ہے اور براتی لوگ دیر سے شور مچا رہے ہیں
[وائپ]

[فیڈ اِن]:- انجمن کا دفتر ۔ کچھ پریشان سا ایک
نوجوان داخل ہوتا ہے

نوجوان:- مجیب الرحمن ہے؟

ایک آدمی نے اندر ایک کمرے کی طرف اشارہ
کیا ۔

نوجوان:- ایک خبر سنی مجیب؟

مجیب:- کیا؟

نوجوان:- محبوب آب و ہوا بدلنے کے خیال سے بیوی کے
ساتھ کاکس بازار گیا ہے

مجیب:- سچ؟

نوجوان:- ہاں ابھی ابھی معلوم ہوا ۔

مجیب:- ہوں ۔ ہم لوگوں کو خبر کئے بغیر ہی چلا گیا ۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ چند دنوں میں ہی اس نے ہم لوگوں کو یکسر بھلا دیا
لیکن اس طرح چھپ کر کب تک زندگی بسر کریگا؟

نوجوان:- ٹھیک طرح سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔

مجیب:- یہ تو بڑی عجیب بات ہوئی ۔ یہاں ہم اس کے
انتظار میں ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور وہ کچھ کہے بغیر ہی چلا
گیا ۔ محبوب سے ایسی امید تو نہ تھی ۔

نوجوان:- تعجب تو یہی ہے کہ محبوب نے ایسا کیوں کیا ۔

مجیب:- اچھا بھئی ۔ تم اندر چل کر بیٹھو ۔ میں ان لوگوں
سے باتیں کر کے آتا ہوں ۔ تم سے کچھ اہم گفتگو کرنی ہو [وائپ]

[فیڈ ان]:۔ کاکس بازار ۔ دھواں چھوڑتا، زور زور سے سیٹیاں بجاتا جہاز اسٹیمر گھاٹ سے آلگا۔ لیلیٰ اور محبوب سامنے عرشہ پر کھڑے تھے۔ گھاٹ پر کھڑے ہوئے ایک آدمی نے ان کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلایا۔

لیلیٰ محبوب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے اس طرف دیکھ کر کہا۔

لیلیٰ:۔ ہمارے ڈاکٹر چچا ہمیں لینے کو آگئے ہیں۔

[کٹ]

مسافروں کے اترنے کی سیڑھی لگ گئی تو لیلیٰ اور محبوب قُلی کے ساتھ جہاز سے نیچے اتری ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ ان دونوں نے جھک کر ڈاکٹر صاحب کی تعظیم کی

کلوزاپ میں دکھایا گیا کہ ڈاکٹر ان کے لئے دعا کر رہا ہے

ڈاکٹر:۔ جیتے رہو، خدا تمہاری مدد کرے

پھر ان سے کہا: چلو بچو۔ اب گھر چلیں۔ زیادہ دیر نہ کرو۔ قریب ہی ایک نوکر کھڑا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا

ڈاکٹر:۔ رحمان! تم یہ سامان لے کر آجاؤ۔ ہم لوگ چلتے ہیں [کٹ]

راستہ کے خوش گوار مناظر لیلیٰ کو بہت پسند آتے ہیں۔ حسرت سے چاروں طرف دیکھتی ہے اور بے ساختہ بول اٹھتی ہے

لیلیٰ:۔ واہ واہ کیسی پیاری جگہ ہے ——!

چلتے چلتے ڈاکٹر نے ہنس کر کہا

ڈاکٹر:۔ اگر یہ جگہ اتنی اچھی نہ ہوتی تو آخر میں کیوں پڑا رہتا کچھ روز رہ کر دیکھو نا۔ واپس جانے کو جی نہیں چاہے گا۔ اب تم اپنے ابا کو بھی یہیں بلا لو۔

یکایک لیلیٰ کا چہرہ اداس ہو گیا شاید باپ کا غمگین ہیولا آگیا۔ اس نے کہا۔

لیلیٰ:۔ وہ تو خود آنے کو کہہ رہے تھے مگر پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے مجبور ہو رہے ہیں۔ ذرا آرام ہو لے تو ضرور آئیں گے

بات کرتے ہوئے سب لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں ——

[وائپ]:۔ یہ قافلہ ایک مکان کے سامنے آکر رک جاتا ہے۔ ایک طرف ناریل اور تاڑ کے درختوں کے جھنڈ نظر آرہے ہیں اور ذرا آگے کو وسیع سمندر اپنی سیمیں چادر پھیلائے ہوئے ہے۔ بے قرار موجیں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو رہی ہیں

ڈاکٹر:۔ تم لوگوں کے لئے یہی مکان لیا گیا ہے۔

لیلیٰ کا چہرہ مسرت سے جگمگانے لگا۔

لیلیٰ۔ واہ کتنی عمدہ جگہ ہے۔ کیسا خوب صورت مکان ہے

ڈاکٹر:۔ ایسی جگہ پر چند دن رہنے کے بعد خراب سے خراب صحت بھی درست ہو جاتی ہے۔ انشاء اللہ —— یہاں رہ کر محبوب بھی تندرست ہو جائے گا۔

ڈاکٹر زور سے ہنستا ہے

سیڑھیاں طے کر کے سب اوپر کی منزل پہ آجاتے ہیں

[وائپ] لیلیٰ گھر ٹھیک ٹھاک کرنے میں لگ جاتی ہے۔

ڈاکٹر:۔ کمروں کی صفائی میں نے کرا دی ہے۔ تم صرف اپنا سامان قرینے سے سجا لو

لیلیٰ رحمن کی مدد سے ہولڈال کھول کر دونوں بستر ٹھیک کرتی ہے

ڈاکٹر:۔ لیلیٰ بیٹی۔ تم یہاں آکر بیٹھ جاؤ اور رحمان کو بتاتی جاؤ وہ سب ٹھیک کر دے گا۔

رحمن:۔ ہاں آپا آرام کیجئے۔ میں سب درست کر لوں گا

لیلیٰ ڈاکٹر اور محبوب کے پاس آکر بیٹھ جاتی ہے

[کٹ]

لیلیٰ اب بڑے اطمینان کے ساتھ خانہ داری کا
کام کرنے لگی ہے ۔ کھانا پکا کر محبوب کو کھلاتی ہے ۔
نماز پڑھ کر محبوب کی صحت کے لئے دعا کرتی ہے چیزوں
کو اِدھر اُدھر قرینے کے ساتھ رکھتی ہے ۔ پھر ایک خط لکھ
کر رحمٰن کو ڈاکٹر کے پاس بھیجتی ہے ۔ ڈاکٹر صاحب آتے
ہیں اور خاص توجہ کے ساتھ محبوب کا معائنہ کرتے ہیں ۔
لیلیٰ بڑی پابندی کے ساتھ دوائیں پلاتی ہے ۔ اس نے اپنی
نظام العمل کی مکمل فہرست بنالی ہے ۔ کب کیا پکائے گی ۔ کب
سیر و تفریح کے لئے نکلے گی ۔ غرض کہ سب کی فہرست
ہے ۔ کبھی کبھی وہ قبائیلوں کی بستی میں جا نکلتی ہے
اور ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کا مطالعہ کرتی ہے ۔ تمام دن
کی محنت کے بعد محبوب کے سو جانے پر لالٹین کی مدھم
روشنی میں وہ اپنے باپ کو خط لکھتی ہے ۔ پھر ٹائم پیس میں
سویرے کا الارم لگا کر خود بھی سو جاتی ہے ۔ اس طرح ایک ایک
کرکے کئی دن گزر جاتے ہیں ۔

ایک دن صبح کے وقت محبوب نے کہا

محبوب :۔ دیکھو تو لیلیٰ ۔ میرا بدن کچھ گرم ہو رہا ہے

لیلیٰ :۔ ہاں ہے تو ۔ تم جاکر چپ چاپ لیٹ جاؤ ۔ حرکت
نہ کرنا ۔ میں ابھی رحمٰن کو ڈاکٹر چچا کے پاس بھیجتی ہوں

[وائپ] :۔ ڈاکٹر نے محبوب کو دیکھنے کے بعد کہا

ڈاکٹر :۔ ہوں ! ذرا احتیاط کی ضرورت ہے ۔ ممکن ہے کہ تکلیف
زیادہ ہوجائے [کٹ]

دو تین دن کے اندر محبوب کی تکلیف اور زیادہ ہوگئی
ڈاکٹر صاحب پھر آئے اور معائنہ کے بعد انھوں نے کہا

ڈاکٹر :۔ ٹھنڈک کا اثر ہے ۔ خطرہ ہے کہ برونکائٹس نہ ہوجائے
بہرحال زیادہ فکر و تردد کی ضرورت نہیں ۔ انشاءاللہ چند دنوں میں سب
ٹھیک ٹھاک ہوجائے گا ۔ میں دوا وغیرہ بھجوا دیتا ہوں لیکن تیمار
داری کی سخت ضرورت ہے ۔ ہر وقت دیکھ بھال پوری ہونی چاہیئے

لیلیٰ :۔ آپ مجھ کو تمام باتیں بتا دیجئے ۔

ڈاکٹر :۔ چلو ادھر میرے ساتھ آؤ ۔ میں تمہیں سمجھا دوں گا

لیلیٰ ڈاکٹر کے پیچھے کمرے سے باہر آجاتی ہے [کٹ]

بے چین لیلیٰ محبوب کی نرسنگ میں ہمہ تن معروف
ہے ۔ نرسنگ کے کچھ مناظر ایک تیز شاٹ میں ابھر
آتے ہیں سینہ پر تیل کی مالش ہو رہی ہے ۔ گلاس میں
ناپ کر دوا پلائی جا رہی ہے ۔ تھرمامیٹر سے بخار دیکھا جا رہا
ہے ۔ لیلیٰ پلنگ پر بیٹھی آہستہ آہستہ پنکھا ہلا رہی ہے ۔
پرہیزی کھانا کھلا رہی ہے ۔ کبھی پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتی
ہے ۔ اور ان کاموں سے فرصت ملتی ہے ۔ کبھی کبھار تو کوئی چھوٹا موٹا
دوسرا کام بھی کر لیتی ہے ۔ رات کو محبوب کے سرھانے بیٹھی جاگتی
رہتی ہے ۔ اس طرح کئی دن گزر جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ
محبوب روبہ صحت ہونے لگتا ہے ۔ ایک دن تھرمامیٹر لگانے کے
بعد لیلیٰ نے کہا

لیلیٰ :۔ آج بخار نارمل ہے ۔ ڈاکٹر چچا نے کہا ہے کہ کل تم کو
کھانے میں بھات ملیگا ۔

لیلیٰ کا چہرہ مسرت کی آنچ سے جگمگا رہا ہے اور
اس کو خوش دیکھ کر محبوب کو بھی خوشی ہوتی ہے

محبوب :۔ لیلیٰ میں تو اب اچھا ہوگیا لیکن معلوم ہوتا ہے
کہ میرے غم میں اب تم بیمار ہو جاؤ گی ۔

لیلیٰ :۔ ارے یہ سب کچھ نہیں ۔ ذرا تھکان کا اثر ہے ۔ چند
دنوں کے اندر سب کچھ جاتا رہے گا

لیلیٰ کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ محبوب کی بات
کو ٹال رہی ہے اور اس کا خیال دوسری طرف بٹانا چاہتی
ہے ۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے کیلنڈر میں ٹوکس باڑہ
میں قیام کے انتیسویں دن پر نشان لگا دیا ۔

محبوب نے جیسے چونک کر دیکھا اور کہا

محبوب :۔ انتیس دن گزر گئے ۔

لیلیٰ :۔ ہاں انتیس دن ۔ لیکن اس میں زیادہ تر تو تم بیمار
ہی رہے ۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ اب تم اچھے ہو گئے ہو

آہستہ آہستہ وہ محبوب کے پاس آکر کہتی ہے

لیلیٰ :۔ ابھی ابھی تم نے کھانا کھایا ہے ۔ اب ذرا لیٹ جاؤ

محبوب بستر پر لیٹ گیا اور پھر اس نے آنکھیں بھی
بند کرلیں [فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن] تین مہینے کے بعد

کاکس بازار کے نیچے سمندر کا وسیع ساحل پھیلا ہوا ہے ——— بے انتہا وسیع۔ سمندر کی موجیں آآ کر ساحل سے ٹکرا رہی ہیں۔ آبی پرندے ادھر ادھر اڑتے پھر رہے ہیں [کٹ]

لیلیٰ اور محبوب دونوں ساحل پر سیر کر رہے ہیں

محبوب کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی ہے لیکن لیلیٰ کے چہرے اور آنکھوں سے ماندگی کے آثار نمایاں ہیں۔ پہلے سے بہت دبلی بھی ہو گئی ہے۔ محبوب نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

محبوب :۔ چلو لیلیٰ، اب گھر چلیں۔ دوپہر میں جو کتاب میں نے شروع کی تھی اس کو ختم نہیں کر سکا ہوں۔ میرا دل اسی میں اٹکا ہے

لیلیٰ نے ہوا میں اڑتے ہوئے بالوں کو درست کرتے ہوئے حکمانہ انداز میں کہا

لیلیٰ :۔ نہیں جی نہیں۔ ابھی ایک گھنٹہ پورا نہیں ہوا ہے تم بھول کیوں جاتے ہو۔ ڈاکٹر چچا کا آرڈر ہے کہ روزانہ ایک گھنٹہ سمندر کے کنارے سیر کی جائے۔ کھانے پینے سیر کرنے اور مطالعہ کیلئے میری بنائی ہوئی فہرست میں وقت مقرر ہے اور اس کی خلاف ورزی نہیں ہونی چاہئے ——— آؤ چلو!

محبوب بے بس قیدی کی طرح آگے چلنے لگتا ہے

[وائپ] ۔ نرم ریت پر محبوب اور لیلیٰ کے پاؤں کے نشانات بنتے جا رہے ہیں۔ چلتے چلتے لیلیٰ ایکدم سے رک جاتی ہے اور جھک کر کچھ سیپیاں اٹھا لیتی ہے۔

لیلیٰ :۔ دیکھو تو محبوب کتنی حسین سیپیاں ہیں [کٹ]

[کلوز اَپ] محبوب اور لیلیٰ پاس پاس کھڑے ہیں ۔ محبوب کہہ رہا ہے

محبوب :۔ لیلیٰ ۔ یہ آسمان، یہ سمندر اور یہ سارا ماحول ان سیپیوں سے بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے ہم ہوا میں پرواز کر رہے ہیں

لیلیٰ :۔ آؤ محبوب شرط لگا کر دوڑیں۔ دیکھیں وہ جو سامنے بانس گڑا ہوا ہے وہاں تک پہلے کون پہنچتا ہے۔

بیماری اور کمزوری کے باوجود محبوب عورت سے ہار ماننے کو تیار نہیں۔ شرط لگتی ہے اور لیلیٰ کے وَن ٹو۔ تھری کہتے ہی دونوں دوڑنا شروع کرتے ہیں اور جلد ہی محبوب لیلیٰ کو پیچھے چھوڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے

محبوب :۔ کیوں لیلیٰ! ہار گئیں نا شرط۔ ہونا آخر کو .....

لیلیٰ کی ساری اس کے پاؤں میں لپٹ جاتی ہے اور وہ ریت پر گر پڑتی ہے۔ محبوب اس کو گرتا دیکھ کر فوراً اس کی طرف دوڑتا ہے

محبوب : کیوں زیادہ چوٹ تو نہیں لگی ۔

لیلیٰ :۔ نہیں ۔ !

محبوب :۔ تو اب اٹھو بھی چکو ——— ہار گئیں نا ؟

لیلیٰ :۔ میں نہیں اٹھتی ۔ مجھے ایسے ہی پڑا رہنے دو!

محبوب اس کے پاس ہی ریت پر بیٹھ جاتا ہے اور لیلیٰ اس کی گود میں اپنا سر رکھ کر محبت بھری نظروں سے اس کو دیکھتی ہے [کٹ]

آفتاب غروب ہو رہا ہے اور افق لالہ زار بنا ہوا ہے [کٹ]

محبوب اب تک محبت سے لیلیٰ کا سر گود میں رکھے اس کو دیکھ رہا ہے ۔

محبوب :۔ لیلیٰ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان اور سمندر کے کنارے کسی نے رنگ کا ڈبہ الٹ دیا ہے

لیلیٰ :۔ سنو محبوب، ذرا کان لگا کر سنو! سمندر گانا گا رہا ہے اس کی زبان سمجھ میں نہیں آتی۔ پھر بھی اس گانے سے ایک نامعلوم جذبہ بیدار ہو رہا ہے ——— محبوب! یہ نامعلوم جذبہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ تم کو ——— ہاں صرف تم کو اپنے سے اور قریب کر لوں بالکل اپنا بنا لوں [کٹ]

[کلوز اَپ] محبوب نے لیلیٰ کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا ——

محبوب :۔ تو اب تک تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے بالکل قریب نہیں آ گیا ہوں

لیلیٰ :۔ نہیں! ابھی تک تم اپنے آپ میں نہیں ہو ——— ابھی

تک تم اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے سوچتے ہو۔ میں یہ نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ جو ہمارا چھوٹا سا آشیانہ ہے اس میں کوئی تیسرا نہ ہو۔ میں اپنے آشیانے میں کسی اور کا آنا برداشت نہیں کر سکتی۔

محبوب:۔ لیکن انسان دنیا میں سب سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ سماج کے ساتھ اور سماج کے ہر فرد کے ساتھ انسان کا لازمی تعلق ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

لیلیٰ:۔ یہ باتیں نہ تو میں سمجھ پاتی ہوں اور نہ سمجھنا چاہتی ہوں۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنے دل سے ملک، جماعت، قوم اور سماج کا خیال بالکل نکال دو۔ آزاد رہو اور بے فکری کی زندگی بسر کر کے اپنی صحت اور تندرستی ٹھیک کر لو۔ میری بھلائی اسی میں ہے اور اپنی بھلائی سے زیادہ مجھے اور کسی چیز کی تمنا نہیں۔

محبوب: لیکن یہ تو بڑی خود غرضی ہے۔ ذرا آنکھیں اٹھا کر اس آسمان کو دیکھو۔ اس سمندر کو دیکھو۔ یہ خاموش پرسکون فضا۔ یہ تاریک شام، ——— اس میں ہم دونوں کس قدر حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ اس آسمان پر چمکنے والے لاکھوں تاروں نے ہماری طرح نہ جانے کتنے انسانوں کو دیکھا ہے۔ دنیا کی اس وسعت میں ہماری کیا ہستی ہے۔ افراد کی حیثیت سے ہماری کیا قیمت ہے؟؟ [کٹ]

لیلیٰ آسمان اور سمندر کی طرف دیکھتی ہے

محبوب پھر کہتا ہے

محبوب:۔ لیکن لیلیٰ! اگر تم یہ سمجھ لو کہ تمہارے تن من کا ہر ذرہ اس وسیع دنیا کا ایک حصہ ہے تو اس وقت، تمہارے دل میں اس درد کا احساس باقی نہیں رہیگا۔ اس کے انگ انگ میں تم اپنے آپ کو موجود پاؤ گی لیکن اس سے علیحدہ ہو کر تمہاری اپنی کوئی ہستی نہیں ——— کوئی وجود نہیں۔

لیلیٰ:۔ محبوب! خیالات کے یہ جو فانوس تم بنا رہے ہو یہ میری سمجھ سے باہر ہیں۔ تم اپنی سیاست، اپنے ملک اور اپنے سماج کو بھول جاؤ۔ اب تمہاری نئی زندگی شروع ہوتی ہے ——— تم کو نیا انسان بننا پڑے گا ——— تم صرف میرے بن کر رہو گے

محبوب کچھ دیر تک خاموش رہتا ہے

محبوب:۔ میری نظر میں نئے انسان کا تصور کچھ اور ہے۔ خیر جانے دو۔ تمہاری ان باتوں کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ تم میری صحت درست کرنا چاہتی ہو۔ یہ تو ہو ہی رہا ہے۔ گزشتہ تین مہینوں میں سمندر کی ہوا، پرسکون ماحول اور غذا اور آرام نے میری صحت کو بہت بہتر بنا دیا ہے

لیلیٰ:۔ میں اس ترقی کو ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھنا چاہتی ہوں میں چاہتی ہوں تم قہقہے لگا کر ہنسو ——— دل سے سب کچھ بھلا کر مسرت و شادمانی کی زندگی بسر کرو ——— اسی طرح تمہاری صحت ٹھیک ہو سکتی ہے [کٹ]

[کلوز اپ]

محبوب:۔ ہنسی، قہقہے، کھیل کود! لیلیٰ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں نے جو کچھ پڑھا لکھا اور سیکھا ہے اس کو بھلا دوں۔ اب میں آنکھیں بند کر کے کیسے رہ سکتا ہوں

لیلیٰ:۔ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ تم صرف سوچنا چھوڑ دو

محبوب:۔ میرا پروگرام اب تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ ہم لوگوں نے جو عہد کیا تھا اس کو بھول کر میں نے یہاں خود غرضی کا آشیانہ بنا لیا ہے ——— !

لیلیٰ:۔ اس وقت اسی کی ضرورت تھی۔

محبوب:۔ میں اپنی انجمن کا صدر ہوں۔ میں نے ہی اپنے تمام ساتھیوں کو اکٹھا کر کے ایک نصب العین مرتب کیا تھا اور اب میں ہی ان سب کو چھوڑ کر یہاں بھاگ آیا ہوں۔ لیلیٰ مجھے اپنا پروگرام پورا کرنا ہے۔

لیلیٰ:۔ یہ تبھی ممکن ہے جب تم پورے طور پر صحت یاب ہو جاؤ دل و دماغ کی صحت کے بغیر صحیح نصب العین کا تصور بھی ممکن نہیں۔

محبوب:۔ لیلیٰ! تم میرے راستہ میں ایسی سنگین رکاوٹ نہ بنو اب میں اپنے آپ کو بہت بڑا مجرم بہت بڑا گنہگار سمجھنے لگا ہوں۔ کم از کم تم مجھے اپنے ساتھیوں سے خط و کتابت کرنے کا حق دیدو۔ تمہاری حراست میں اس قید و بند کی زندگی سے اب میں اکتا سا گیا ہوں اب طبیعت گھبرانے لگی ہے۔

کہتے کہتے محبوب اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ لیلیٰ زیر لب دہراتی ہے۔

لیلیٰ:۔ قید و بند کی زندگی ——— حراست!

محبوب:۔ ہاں۔ قید و بند اور حراست۔ زندہ ہوتے ہوئے

بھی میں مُردوں سے بدتر ہوں۔ اس طرح تمہارا آنچل پکڑ کر ساری دنیا
کو بھول جانا میری دانست میں بہت بڑا جرم ہے

محبوب بولتے بولتے آگے نکل گیا۔

لیلیٰ :- میں یہ سب کچھ تمہاری ہی بھلائی کے لئے کہتی ہوں۔
نہ جانے یہ معمولی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی [فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن] شہر میں آفس کا کمرہ۔ مجیب الرحمٰن
تین چار نوجوانوں سے بیٹھا باتیں کررہا ہے۔

مجیب :- تعجب ہے کہ ایک خط کا بھی جواب نہیں آیا

ایک نوجوان :- میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس کے ہاتھ
میں ایک خط بھی نہیں پہنچا ہے۔

مجیب :- کیوں ؟

نوجوان :- لیلیٰ ہمارے خط اس کے پاس پہنچنے ہی نہیں
دیتی ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے محبوب کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھتی ہے

مجیب :- خط روک لیتی ہے۔ چھی۔ تو کیا اب یہی سمجھ لیا
جائے کہ محبوب نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔

مجیب :- ہمارا کام بند ہے۔ کتنی محنت کے بعد ایک منصوبہ
تیار کیا گیا تھا۔ جب اس پر عمل کرنے کا وقت آیا تو محبوب ہی
ہمارا ساتھ چھوڑ کر علیحدہ ہوگیا۔ ایسے وقت میں اس نے لیلیٰ کے
آنچل کی پناہ لے لی۔ چھی۔

نوجوان :- وہ ہمارا صدر ہے۔ اس طرح بیٹھ رہنے
سے تو کام نہیں بنے گا۔

مجیب :- پھر اب کیا کرنا چاہیئے۔

نوجوان :- میری رائے ہے کہ تم اس کو آخری خط لکھو۔
خوب تفصیل کے ساتھ۔ اس سے پوچھو کہ آخر اس کا پروگرام کیا ہے

دوسرا نوجوان :- گویا اس سے کیفیت طلب کی جائے

پہلا نوجوان :- ہاں۔

مجیب :- بہت خوب۔ آؤ۔ یہ خط ہم سب مل کر لکھیں
اب اگر اس کا بھی کوئی جواب نہ آیا تو ——— تو میں خود
کاکس بازار جا کر اس سے کیفیت طلب کروں گا اگر اس نے واقعی
ہمارا ساتھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کرلیا ہے تو پھر ہم آئندہ کے لئے
پروگرام بنائیں گے۔

نوجوان :- ہاں یہی ٹھیک رہیگا [کٹ]

رحمٰن لیلیٰ کے ہاتھ میں ڈاک دے جاتا ہے
لیلیٰ محبوب کی آنکھیں بچا کر وہاں سے ہٹ جاتی ہے
محبوب کتاب پڑھنے میں مصروف ہے اور ارد گرد
سے بالکل غافل ہے۔ لیلیٰ ایک خط کھول کر پڑھتی
ہے اور پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے چولھے میں
ڈال دیتی ہے [کٹ]

لیلیٰ ایک خط ہاتھ میں لئے آتی ہے اور محبوب
کو دیتے ہوئے کہتی ہے

لیلیٰ :- لو محبوب' ابا کا خط ہے۔

محبوب :- اور کوئی خط نہیں؟

لیلیٰ :- نہیں۔

محبوب تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا ہے اور پھر
کتاب پڑھنے لگتا ہے۔

لیلیٰ :- جواب نہیں لکھو گے ؟

محبوب :- ہاں ذرا ٹھہر کر لکھوں گا

لیلیٰ :- تم خط لکھ لو۔ اتنی دیر میں میں کھانا تیار کرلیتی ہوں

لیلیٰ کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔ محبوب اُٹھ
کر لکھنے کی میز پر جا بیٹھتا ہے۔ کاغذ اور قلم لیکر
کچھ دیر تک لکھتا ہے۔ پھر کچھ جملے کاٹتا ہے
پھر وہاں سے اٹھ کر ایک کھلی ہوئی کھڑکی کے
سامنے کھڑا ہو جاتا ہے [کٹ]

باہر آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے
ہیں۔ تاڑ کے درختوں کے پاس پرندے اپنے
اپنے آشیانوں میں جلدی جلدی پناہ لے رہے
ہیں۔ [کٹ]

سمندر کافی مضطرب نظر آتا ہے [کٹ]

محبوب کھڑکی کے پاس کھڑا یہ سارے مناظر
دیکھ رہا ہے۔ پرندوں کے آشیانے تیز و تند ہوا
کے جھونکوں سے ہل رہے ہیں۔ لیلیٰ بھی آ کر اس
کے قریب کھڑی ہو جاتی ہے

لیلیٰ :- ادھر چلے آؤ محبوب طوفان آنے والا ہے

محبوب :- آنے دو طوفان کو۔ بڑا خوش گوار منظر ہے کھڑکی سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا۔

لیلیٰ - خیال رکھنا پانی کے چھینٹوں میں بھیگنا نہیں

محبوب :- بہت اچھا۔

لیلیٰ پھر باہر چلی گئی۔ محبوب نے کھڑکی پر کہنی سے ٹیک لگا کر دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے اور باہر چڑیوں کے گھونسلوں کو دیکھنے لگا۔ پھر زوردار بارش شروع ہو گئی۔ محبوب دیر تک اس منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں کے سامنے چند پرانے مناظر ابھر آئے۔

[فلیش بیک] گاؤں بارش کی رو میں بہہ گیا ہے جالیاں ٹوٹی پڑی ہیں۔ چاروں طرف بس پانی ہی پانی ہے۔ مصیبت زدہ اور ناچار باشندے پناہ کی تلاش میں ادھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کچھ لوگ بے بسی کے عالم میں ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ محبوب اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں پہنچا ہوا ہے۔ بے آسروں کے لئے آسرا اور ننگے بدن والوں کے لئے کپڑا مہیا کیا۔ بچوں میں دودھ تقسیم کیا گیا۔ چند گھنٹوں کے اندر گاؤں کے سارے باشندوں کو اس ناگہانی مصیبت سے بچا لیا گیا۔ بانس کے ایک ٹوٹے ہوئے گھر میں ایک بوڑھا سارے بدن سے بھیگا ہوا بیٹھا کانپ رہا ہے۔ محبوب اسے گود میں اٹھا کر ایک پڑوسی کے مکان میں لے گیا جس کی چھتیں ثابت تھیں۔ وہیں اس کے رہنے کا بندوبست کیا گیا۔ بوڑھا جب بدن پر گرم کمبل ڈال کر لیٹا تو اس نے رقت بھری آواز میں محبوب کو دعائیں دیں۔

بوڑھا :- اللہ تمہارا بھلا کرے۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے

بوڑھے کو خوش اور مطمئن دیکھ کر محبوب کا دل بھی باغ باغ ہو گیا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا

محبوب :- آپ دعا کریں کہ میں ہمیشہ اسی طرح عوام کی خدمت کر سکوں۔ ان کی مصیبت دور کرنا اور ان کے کام آنا ہی میری تمنا ہے۔

[بیک ٹو پریزینٹ] یکایک محبوب نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر باہر کی طرف دیکھا۔ طوفانی ہواؤں سے چڑیوں کے آشیانے اب تک ہل رہے تھے۔ ایک بہت بڑا سا آشیانہ بڑے زور شور سے ہل رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بس اب کے جھونکے کے ساتھ زمین پر آ رہے گا۔ یہ منظر دیکھ کر اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ پھر بھی اس کے چہرے سے خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

[وائپ] :- محبوب نے کچھ دیر پہلے جو خط لکھا تھا اس کو لفافے میں بند کر کے اس پر پتہ لکھا۔

مسٹر مجیب الرحمٰن

8/9 ۔ ہیر اسٹریٹ

پوسٹ داری۔ ڈھاکہ

ابھی محبوب نے پتہ لکھنا ختم ہی کیا تھا کہ اس کو لیلیٰ کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور اس نے جلدی سے خط کو دراز میں چھپا دیا۔ لیلیٰ پلیٹ میں کھانا لئے ہوئے اندر آئی۔ میز درست کرنے کے بعد اس نے محبوب کو آواز دی

لیلیٰ :- کھانا تیار ہو چکا ہے۔

محبوب :- مجھے بھوک نہیں۔

لیلیٰ :- یہ بھی اچھی رہی۔ کھانا تو تم ضرور ہی کھاؤ گے۔

محبوب :- لیلیٰ تم ہمیشہ اس طرح زبردستی کیوں کرتی ہو؟

محبوب کی آواز میں کچھ غصہ تھا اور کچھ جھنجلاہٹ تھی لیلیٰ نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی :

لیلیٰ :- تم جانتے ہو یہ تو میری عادت ہے

لیلیٰ کی مسکراہٹ بے حد معصوم معلوم ہوئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جمع تھے

چہرے سے تھکاوٹ اور بیماری کا پتہ چلتا تھا۔ محبوب لمحہ
پھر اس کو دیکھتا رہا۔ پھر بادل ناخواستہ کھانے کی
میز پر جا بیٹھا۔

محبوب:۔ خاصہ اندھیرا ہو گیا ہے

لیلیٰ:۔ میں ابھی لیمپ لے کر آتی ہوں

لیلیٰ جلتا ہوا لیمپ لئے واپس آتی ہے

لیلیٰ:۔ شام ہو گئی ہے۔

محبوب:۔ اب تھوڑی دیر کے بعد رات کا کھانا کھانے کو
کہوگی۔ رات دن صرف کھاؤ کھاؤ کی رٹ لگائے رہتی ہو۔ کبھی
کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ بالکل حیوان ہوتا جا رہا ہوں

لیلیٰ:۔ آج کھانا پکانے میں مجھے دیر ہو گئی۔ طبیعت
کچھ خراب معلوم ہو رہی ہے اس لئے وقت پر تیار نہ کر سکی۔

لیلیٰ کی آواز اور اس کے چہرہ سے بیماری کے آثار
صاف نمایاں تھے۔ محبوب نے اک ذرا تعجب سے اس کو
دیکھا۔ پھر نظریں نیچی کریں

محبوب:۔ دیکھو لیلیٰ تمہیں اپنا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔
میری خدمت کرتے کرتے کہیں تم خود بیمار ہو گئیں تو اور مصیبت ہو
جائے گی۔!

لیلیٰ نے بے بس نگاہوں سے محبوب کو دیکھا اور پھر
بسکٹ کھانے لگ گئی۔ پیالی کی بقیہ چائے کو ایک
گھونٹ میں ختم کرکے محبوب میز سے اٹھ گیا۔ [ڈیزالو]

سونے کے کمرے میں لیلیٰ نے محبوب کا بستر درست
کیا اور مچھر دانی کے پردے گرا کر بستر سے دبا دیا۔ پھر
کمرے کا دروازہ بند کرکے وہ محبوب کے پاس آگئی۔ محبوب
گال پر ہاتھ رکھے کچھ سوچ رہا تھا۔

لیلیٰ:۔ کیا سوچ رہے ہو محبوب؟

محبوب:۔ کچھ بھی نہیں۔

ایک گہری لمبی سانس چھوڑ کر محبوب پھر اپنے
خیالوں میں گم ہو گیا

لیلیٰ:۔ چلو اب چل کر سو جاؤ

محبوب:۔ ابھی نہیں۔ آج کچھ دیر سے سوؤں گا۔

لیلیٰ:۔ نو تو بج چکے۔

محبوب:۔ بجنے دو۔ میں کیا کروں

لیلیٰ:۔ طبیعت خراب نہیں ہو گی؟

محبوب:۔ طبیعت! طبیعت! طبیعت! صرف کھاؤ اور
سوؤ اور طبیعت ٹھیک کرو۔ تم نے مجھ کو بالکل جانور بنا دیا ہے
یہ ظلم ہے شدید ظلم۔

محبوب سونے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ لیلیٰ
کچھ دیر تک بت بنی اس کو تکتی رہتی ہے اور پھر ایک دل آزار
ہنسی کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ لالٹین
جل رہی تھی۔ لیلیٰ نے اس کی مدھم روشنی میں اخبار پڑھنا
شروع کیا لیکن زیادہ دیر تک نہ پڑھ سکی۔ آرام کرسی
پر لیٹ کر اس نے بایاں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیا
اور آنکھیں بند کرکے بالکل بے جان مورت کی طرح پڑی رہی

کچھ دیر بعد محبوب خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔

محبوب:۔ اندر سخت گرمی ہے۔ میں کچھ دیر بعد سونے جاؤں گا
تم جا کر سو جاؤ۔ مجھ کو خواہ مخواہ دق نہ کرو

لیلیٰ ہڑبڑا کر کرسی سے اٹھ جاتی ہے

لیلیٰ:۔ پیارے چلو میں پنکھا جھلتی ہوں۔ زیادہ دیر تک
جاگتے رہنے سے تمہاری طبیعت پھر خراب ہو جائے گی

محبوب:۔ نہیں! نہیں! نہیں! تھوڑی دیر میں کوئی نقصان
نہیں ہوگا۔ تم جا کر سو رہو۔ میں بعد میں آؤں گا۔

محبوب کے برتاؤ سے تنگ آ کر زخم خوردہ لیلیٰ اس
کے راستے سے ہٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ کچھ دیر
تک چپ کھڑے رہنے کے بعد اس نے پھر کہا۔

لیلیٰ:۔ نہ جانے آج تم کو کیا ہو گیا ہے کہ بات بات پر
خفا ہو جاتے ہو۔ میری کوئی بات تم کو پسند ہی نہیں آتی

محبوب:۔ مجھ کو کچھ نہیں ہوا ہے لیکن ایک بار پھر میں تم
سے التجا کرتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے مجھ کو تنہا چھوڑ دو۔

لیلیٰ:۔ ناں بابا۔ میں تم کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ تنہائی
میں تم نہ جانے کیا کیا سوچو گے۔ میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔
تمہیں اگر جاگنا ہی ہے تو آؤ چلو، میرے ساتھ باتیں کرو۔

محبوب :۔ لیلیٰ میں تمہارے ہاتھ جوڑتا ہوں تم اس وقت تو مجھ کو اکیلے ہی چھوڑ دو۔ اس وقت میں کسی کے ساتھ باتیں نہیں کر سکتا۔ اس طرح تم میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑو گی تو فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوگا۔ اس وقت میری طبیعت بے حد مضطرب ہے۔ خدا کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دو

لیلیٰ :۔ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو؟ میری توجہ سے تمہاری صحت کو نقصان پہنچے گا؟ محبوب آج تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو؟

محبوب :۔ میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں لیلیٰ۔ میں بنی نوع انسان سے محبت کرتا ہوں۔ دردمندوں کا ہمدرد ہوں۔ میں مجاہد سپاہی ہوں۔ مجھ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس طرح تمہارے آنچل کے اوٹ میں اپنا ایک الگ آشیانہ بناؤں۔ لیلیٰ یہ خود غرضی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ لوگ میری بگڑی ہوئی حالت پہ ہنستے اور میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ اب میں اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے ــ!

محبوب کی باتوں سے لیلیٰ کو سخت تکلیف پہنچی لیکن اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

لیلیٰ :۔ دیکھو محبوب اس طرح جذباتی نہ ہو۔ ایسی باتیں تمہیں میں بھی سنا سکتی ہوں لیکن نہیں سناؤں گی کیونکہ تمہاری بھلائی کے سوا دنیا میں میری کوئی اور آرزو نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ تم میری باتوں کو سمجھنے کے باوجود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ــ کیونکہ تمہارے سینے میں دل نہیں ہے۔

محبوب :۔ تمہارے دل میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے یہ میں کیسے جان سکتا ہوں۔ البتہ تم چاہتی ہو کہ بنی نوع انسان کے دکھ درد کی طرف سے آنکھیں بند کر کے میں تمہاری محبت کا کلمہ پڑھتا رہوں تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ تمہیں بتاؤ لیلیٰ یہ خود غرضی نہیں تو اور کیا ہے۔ لیلیٰ ہماری اور تمہاری محبت بنی نوع انسان کی محبت سے مختلف ہے۔ [کٹ]

لیلیٰ محبوب کی طرف پشت کر کے کھڑی ہوئی ہو آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا رہی ہیں۔ چند قطرے چہرے پر بھی ڈھلک آئے ہیں لیکن وہ ان آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کر رہی ہے

محبوب نے اس کی اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے بھی کسی ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔

محبوب :۔ ہمارے مذہب نے ہم کو بنی نوع انسان سے محبت کرنا سکھایا ہے۔ ان کے دکھ درد میں کام آنا میرے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی خدمت ہے [کٹ]

محبوب نے لیلیٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

محبوب :۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ کل صبح ڈھاکہ واپس چلا جاؤں گا۔

لیلیٰ :۔ اچھا چلے جانا۔ میں تمہارے راستے میں رکاوٹ نہیں پیدا کروں گی۔ بس اب جا کر سو جاؤ۔ [کٹ]

محبوب نے دراز کھول کر دیکھا۔ اس نے مجیب کے نام جو خط لکھا تھا وہ اس میں نہیں تھا۔

محبوب :۔ لیلیٰ میں نے اس میں ایک خط رکھا تھا وہ کہاں گیا؟

لیلیٰ :۔ میں نے پھاڑ ڈالا اس خط کو!

محبوب :۔ کیا کہا؟ پھاڑ ڈالا! کیوں؟ آخر تم نے یہ جرأت کس طرح کی۔ تم کو کس نے خط پھاڑنے کو کہا تھا۔ اچھا تو اب آج سے میرا اور تمہارا رشتہ بھی ختم۔ جس کو میرے خیالات اور جذبات سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہیں ہے اس کے ساتھ میں اپنی ساری عمر کس طرح بسر کر سکتا ہوں۔

محبوب تیزی کے ساتھ سونے کے کمرے میں چلا گیا لیلیٰ نے زور سے آہ کھینچی اور لڑکھڑاتی ہوئی جنگلے کی سلاخ کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔

باہر اب طوفان ختم ہو چکا تھا۔ صرف کبھی کبھی بادلوں کے گرجنے کی آواز آ جاتی تھی۔ یا تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بجلی چمک جاتی تھی۔ لیلیٰ نے بجلی کی اس روشنی میں دیکھا کہ تاڑ کے درخت میں چڑیا کا وہ ٹوٹا آشیانہ اب نہیں ہے۔

لیلیٰ کافی خوف زدہ ہو گئی۔ جلدی سے وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی لیکن اسی طرح تاریکی میں باہر گھورتی رہی۔ اس کے دل میں اس وقت شدید درد ہو رہا تھا۔ [فیڈ آؤٹ]

[فیڈ ان] آسمان پر ابھی صرف صبح کا ستارہ طلوع ہوا ہے ۔ گزشتہ شب کے طوفان سے تھکی ماندی فضا اب صبح کی روشنی میں نئی زندگی حاصل کر رہی ہے [کٹ]

موذن نے مسجد کے مینار سے اَللّٰہُ اَکبَرُ کا نعرہ بلند کیا ۔ [کٹ]

سونے کے کمرے میں صبح کی ہلکی روشنی دبے پاؤں داخل ہوئی ۔ محبوب نے اِدھر اُدھر دیکھا تو لیلیٰ کمرے میں نظر نہیں آئی ۔ بستر سے اٹھ کر دیکھا — مگر وہ یہاں تھی ہی نہیں ۔ گھبرا محبوب کے ساتھ ساتھ کمرے سے باہر آیا ۔ ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں لیلیٰ آرام کرسی پر پڑی سو رہی تھی ۔

محبوب وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گیا — ! [کٹ]

صبح کی پیامبر ننھی ننھی چڑیاں کھڑکی پر آ کر صبح کا گیت سنانے لگیں ۔

رحمٰن کمرہ صاف کرنے آیا تو لیلیٰ کو اس طرح آرام کرسی پر لیٹے دیکھ کر گھبرا گیا ۔

رحمٰن :- آپا — !

لیلیٰ آنکھ کھول کر اس کو دیکھتی ہے

رحمٰن :- آپا ۔ آپ یہاں اس طرح کیوں لیٹی ہیں ؟ طبیعت ٹھیک ہے نا ؟

لیلیٰ :- ہاں رحمٰن ۔ میں بالکل اچھی ہوں

لیلیٰ نے مسکرا کر رحمٰن کو اور اطمینان دلانا چاہا ۔ مگر اس کی تسلّی نہ ہوئی ۔ قریب آکر ڈرتے ڈرتے اس نے لیلیٰ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا ۔

رحمٰن :- لیلیٰ آپا ۔ آپ کی پیشانی جل رہی ہے ۔ بہت تیز بخار ہے ۔

لیلیٰ :- ارے یہ سب کچھ نہیں ۔ رات کو نیند اچھی طرح نہیں آئی ۔ شاید اسی کا اثر ہے — تم جلدی سے چولھا گرم کر لو ۔ کھانا سویرے تیار کرنا ہے ۔ صاحب آج — شاید — ڈھاکہ جائیں گے !

رحمٰن :- ڈھاکہ جائیں گے ؟ کیوں ؟

لیلیٰ :- ہاں ہاں ۔ جاؤ ۔ دیر نہ کرو ۔

رحمٰن چپ چاپ باہر نکل جاتا ہے [کٹ]

برآمدے میں محبوب اور رحمٰن کھڑے باتیں کر رہے ہیں

رحمٰن :- آپا کو سخت بخار ہے ۔ سارا بدن جل رہا ہے

محبوب :- سچ ؟ مجھ سے تو لیلیٰ نے کچھ نہیں کہا ۔ اچھا تم جاؤ ۔ میں دیکھتا ہوں ۔

رحمٰن باورچی خانے کی طرف چلا گیا ۔ اور محبوب لیلیٰ کے کمرے میں ۔ آہستہ آہستہ وہ لیلیٰ کے قریب آیا اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا

محبوب :- لیلیٰ — !

لیلیٰ نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور محبوب کو اپنے پاس کھڑا دیکھ کر کہا ۔

لیلیٰ :- ارے تم ؟

محبوب :- ہاں میں ! آؤ یہاں لیٹ جاؤ ۔ تم کو سخت بخار ہو رہا ہے

لیلیٰ :- نہیں محبوب ۔ بس معمولی ٹھنڈک کا اثر ہے — اب چل کر تمہارے کھانے کا انتظام کرتی ہوں ۔

محبوب نے لیلیٰ کی پیشانی سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا

محبوب :- میرے لئے ہی کیوں ؟ تم نہیں کھاؤ گی ؟

لیلیٰ :- میری طبیعت کھانے کو نہیں چاہ رہی ہے ۔ ذرا ٹھیک ہو لوں تو کھاؤں گی ۔

لیلیٰ باورچی خانے کی طرف جاتی ہے

محبوب :- سنو لیلیٰ ۔ میں بھی کچھ نہیں کھاؤں گا ۔ میرے لئے کچھ پکانے کی ضرورت نہیں ہے

لیلیٰ جاتے جاتے رک کر محبوب کو دیکھتی ہے اور پھر اچھا کہہ کر باہر جانے لگتی ہے ۔

محبوب :- سنو لیلیٰ ۔ کل میں نے غصّہ میں آکر تم سے کچھ

سخت باتیں کہدی تھیں ۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس بعد میں ہوا ۔ امید ہے کہ تم معاف کر دوگی ۔

لیلیٰ :۔ نہیں تو قصور میرا ہی تھا ۔ میں اسی لائق تھی ۔

لیلیٰ کمرے سے باہر چلی جاتی ہے [کٹ]

باورچی خانہ ۔ لیلیٰ پراٹھا تیار کر رہی ہے ۔ رحمن اس کا ہاتھ بٹا رہا ہے

رحمن :۔ آپ اب آرام کیجئے آپا میں سب کچھ کر لوں گا ۔

لیلیٰ :۔ نہیں پگلے ۔ میرے ہاتھ کا کھانا نہیں ہوگا تو تمہارے صاحب کو پسند نہیں آئیگا ۔

محبوب اپنے کمرے سے رحمن کو آواز دیتا ہے

محبوب :۔ رحمن ! رحمن !!

لیلیٰ :۔ تم کو صاحب بلا رہے ہیں رحمن ۔ جا کر سن آؤ کیا کہتے ہیں ۔

رحمن تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے

رحمن :۔ مجھ کو صاحب باہر جانے کو کہہ رہے ہیں

لیلیٰ :۔ تو جاؤ نا ۔۔ لیکن جلدی لوٹ آنا

رحمن :۔ بہت اچھا !

لیلیٰ نے پھر کچھ سوچ کر پوچھا

لیلیٰ :۔ لیکن جانا کہاں ہے تم کو ؟

رحمن اس وقت تک باہر نکل چکا تھا ۔ لیلیٰ نے زور سے اس کو پکارا لیکن چیخنے کے ساتھ ہی اس کو کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ کھانستے کھانستے پریشان ہو گئی [کٹ]

محبوب کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھ کر خودبخود ہی بول اٹھا

محبوب :۔ چڑیا کا آشیانہ ٹوٹ گیا ! ٹوٹے گا اسے کوئی نہیں روک سکتا !

آہستہ آہستہ وہ خیالات کی دنیا میں کھو گیا اور ایک پرانا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا

[فلیش بیک] :۔ محبوب ایک پبلک جلسہ میں تقریر کر رہا ہے ۔

محبوب :۔ آج کی دنیا میں مشکلات کی کوئی انتہا نہیں ۔ گنتی کے چند افراد اپنی ذاتی بھلائی کی خاطر لاکھوں کروڑوں انسان کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں ۔ حرص و ہوس کے نشہ میں مدہوش یہ سمندر پار سے ہمارے ملک میں آئے اور پھر ہم کو لوٹنا شروع کیا ۔ ان کی لالچ کی آگ کروڑوں انسانوں کو جلا چکی ہے ۔ انسانیت پر اس ظالمانہ حملہ کے خلاف کوئی آدمی تنہا کچھ نہیں کر سکتا ۔ اگر اس ظلم کا انسداد کرنا ہے تو سب کو متحد ہونا پڑے گا ۔ [کٹ]

محبوب تقریر کئے جا رہا ہے

محبوب :۔ تنہا عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کے لئے آدمی چاہے جتنی دولت جمع کر لے اور کتنی ہی شان و شوکت سے رہے لیکن یہ زندگی کوئی زندگی نہیں ۔ ہم اپنے محل میں ٹھاٹھ کی زندگی بسر کریں اور ہمارے پڑوس میں ہمسائے کی تاریک جھونپڑی میں بیوی بچے بھوک سے بلک رہے ہوں ۔ عیش و آرام سب کے لئے ہونا چاہئیے ۔ میرا عیش و آرام اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جب ہمارے پڑوس میں کوئی دکھی نہ ہو ۔ وقتی آرام کا جو آشیانہ ہم نے بنا رکھا ہے وہ ہمیشہ رہنے والا نہیں ۔ [کٹ]

محبوب لمبی سانس لے کر میز کے پاس آ کر بیٹھ جاتا ہے ۔ رحمن اندر داخل ہوتا ہے

رحمن :۔ ڈاکٹر صاحب آ گئے ہیں ۔

محبوب ان کے استقبال کے لئے باہر جاتا ہے

رحمن لیلیٰ سے کہتا ہے

رحمن :۔ آپا رکابی مجھے دے دیجئے !

لیلیٰ :۔ لو صاحب کے سامنے میز پر لگا دو ۔ میں منہ ہاتھ دھو کر ابھی آتی ہوں ۔

رحمن رکابی لے کر چلا جاتا ہے [کٹ]

ڈاکٹر اور محبوب چائے کی میز پر پاس پاس بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں ۔

ڈاکٹر :۔ میری لیلیٰ نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے ۔ میں نے کتنی ہی لڑکیاں دیکھی ہیں مگر اس جیسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی ۔ ہاں اب آپ بالکل تندرست ہو گئے ہیں ۔ آئندہ آپ صحت کے متعلق

کسی قسم کا کوئی شک و شبہ دل میں نہ لائیے گا۔ آپ جس حالت کو پہنچ چکے تھے اگر کچھ دنوں تک اور ویسے ہی رہتے تو دق یقینی ہو جاتی سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کو دیکھ کر شروع میں مجھ کو اسی کا شبہ ہوا تھا —— خیر اب اس تذکرہ ہی کو چھوڑیئے اور یہ بتایئے کہ آپ نے صبح ہی صبح مجھ کو کیوں طلب کیا۔ خیریت ہے نا؟ کوئی خاص بات تو نہیں؟

محبوب:۔ لیلیٰ کی طبیعت کچھ خراب معلوم ہوتی ہے۔ آپ ذرا اس کا معائنہ کر لیجئے۔

ڈاکٹر:۔ کیوں، میری بیٹی کو کیا ہو گیا؟

محبوب:۔ کوئی خاص تشویش کی بات نہیں، شاید سردی کی وجہ سے بخار آ گیا ہے۔ اصل میں آج میں ڈھاکہ جانا چاہتا ہوں آپ اس کو دیکھ کر مجھے بتایئے کہ اس حالت میں سفر کرنا ٹھیک ہوگا یا نہیں؟

ڈاکٹر:۔ اتنی جلدی نہیں بھئی۔ ابھی تو اور کئی مہینہ تم لوگوں کو یہاں رہنے کی ضرورت ہے۔ خبردار! ابھی یہاں سے جانے کا نام نہ لینا —!

محبوب:۔ نہیں ڈاکٹر صاحب۔ اب یہاں اور رہنا ممکن نہیں۔ ڈھاکہ میں بہت کام پڑا ہوا ہے۔ پھر یہاں رہتے رہتے طبیعت بھی اکتا گئی ہے [کٹ]

لیلیٰ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ بے حد افسردہ بے انتہا پریشان۔ تھکی تھکی سی۔ لیکن ڈاکٹر کو دیکھتے ہی منہ پر رونق آ جاتی ہے۔ لیلیٰ آداب عرض کرتی ہوئی قریب آتی ہے

لیلیٰ:۔ آپ کے مزاج اچھے ہیں؟

ڈاکٹر:۔ ہاں بیٹی! میں تو اچھا ہوں لیکن یہ تم نے اپنی کیا حالت بنائی ہے۔ کیسی طبیعت ہے؟

لیلیٰ:۔ ٹھیک ہی ہوں ڈاکٹر چچا۔ ذرا ....

ڈاکٹر:۔ ذرا نہیں بیٹی۔ تمہاری طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔ چلو کمرے میں ذرا تم کو دیکھ لوں

لیلیٰ:۔ چلتی ہوں۔ پہلے آپ چائے تو پی لیجئے!

پھر بڑی ناگواری کے ساتھ کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ جاتی ہے۔ ڈاکٹر نے پہلے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا پھر تعجب سے بولا

ڈاکٹر:۔ ارے تم کو تو بہت تیز بخار ہے اور اس حالت میں بھی تم آرام کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر دوڑتی پھر رہی ہو

لیلیٰ آنکھیں بند کئے چپ چاپ سنتی رہی۔ ڈاکٹر نے جیب سے آلہ نکال کر خوب غور سے اس کو دیکھا۔ ڈاکٹر کے چہرے سے پریشانی کا اظہار ہوتا تھا لیکن وہ اس کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا

رحمٰن دروازے سے لگا بے چینی کے ساتھ ڈاکٹر کا فیصلہ سننے کا منتظر تھا۔

ڈاکٹر:۔ بیٹی اب تم اسی طرح لیٹی رہو۔ آرام کی سخت ضرورت ہے۔ میں گھر جا کر ابھی فوراً دوائی بھیجتا ہوں۔ ہدایت کے مطابق استعمال کرنا —— میں شام کو پھر آؤنگا۔ سمجھیں!

ڈاکٹر کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ لیلیٰ نے اس کو بلایا

لیلیٰ:۔ ڈاکٹر چچا ——!

ڈاکٹر:۔ کیا ہے بیٹی؟

لیلیٰ:۔ طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہے نا؟

ڈاکٹر:۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ دو چار دن کے علاج اور احتیاط سے ٹھیک ہو جائے گا۔

صورت حال کو چھپانے کے لئے ڈاکٹر کی کوشش ناکام رہی اور لیلیٰ بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ پھر بھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا

لیلیٰ:۔ ڈاکٹر چچا۔ میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں

ڈاکٹر لیلیٰ کے قریب آ کر بیٹھ جاتا ہے۔

ڈاکٹر:۔ بیٹی، میں تمہارے والد کا دوست ہوں۔ جو کچھ کہنا چاہتی ہو بلا تکلف کہو۔

لیلیٰ:۔ میری ایک درخواست ہے ڈاکٹر چچا۔ اگر مجھے کوئی سخت بیماری ہو گئی ہو تو آپ اُن سے نہ کہیئے گا۔ اس سے ان کو تکلیف پہنچے گی۔ اب تک جو اُن کو صحت ہوئی ہے اس کو پھر سے نقصان پہنچے گا —— کیوں ڈاکٹر چچا۔ آپ نہیں کہیں گے نا؟

ڈاکٹر:۔ اچھا بیٹی میں محبوب سے کچھ نہیں کہوں گا۔

ڈاکٹر محبوب کے کمرے کی طرف جاتا ہے

ڈاکٹر:۔ کوئی خاص تردد کی بات نہیں۔ سردی لگ جانے کی وجہ سے بخار ہوگیا ہے۔ میں گھر سے دوا بھجوا دیتا ہوں۔ دو چار دن میں آرام ہوجائے گا۔

محبوب:۔ تو آج میرے ڈھاکہ جانے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ڈاکٹر:۔ آپ پاگل ہیں! میرے خیال میں ابھی اور کئی مہینوں تک آپ دونوں کو یہاں رہنا چاہیئے ۔۔ اچھا اب میں جاتا ہوں!

محبوب:۔ کئی مہینے ۔۔؟

ڈاکٹر کے تیز قدموں کی چاپ کی آواز میں محبوب کی آواز ڈوب کر رہ جاتی ہے [کٹ]

سمندر کے کنارے کنارے ڈاکٹر اپنے گھر کی طرف جارہا ہے [کٹ]

ڈاکٹر اپنے گھر پہنچتا ہے۔ باہر دوا خانے میں چند مریض بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر داخل ہوتا ہے تو سب کے سب کھڑے ہو کر اس کو سلام کرتے ہیں لیکن ان کی طرف توجہ کئے بغیر وہ میز کے پاس جا کر کرسی پر بیٹھ کر کاغذ قلم نکالتا ہے اور کچھ لکھنے لگتا ہے۔

ایک مریض اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آتا ہے۔

ڈاکٹر:۔ صبر سے بیٹھو۔ میں ابھی بلا لوں گا۔

وہ پھر لکھنے لگتا ہے۔ کیمرا اس کی پیٹھ کی جانب سے اس کی پیروی کرتا ہے۔

ڈاکٹر خط لکھ کر پڑھتا ہے

ڈاکٹر:۔ پیارے بھائی!

ابھی ابھی تمہاری بچی لیلیٰ کو دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں اس کے معائنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ طبیعت زیادہ خراب ہے اس نے اپنے شوہر کو تو نئی زندگی بخش دی لیکن حد سے زیادہ محنت اور بے پروائی نے خود اس کی صحت برباد کر گیا۔ میرے خیال میں اس وقت تمہارا یہاں آنا بہت ضروری ہے۔ زیادہ لکھنا فضول ہے۔ امید ہے کہ تم پریشان نہ ہوگے

میں ہر وقت اس کی خبرگیری کر رہا ہوں۔

تمہارا خیر خواہ

کیمرا لوٹ کر پھر اپنی جگہ پر آگیا

خط پر دستخط کر کے ڈاکٹر نے لفافہ میں بند کیا اور اس پر ٹکٹ لگا کر ایک مریض سے کہا

ڈاکٹر:۔ بھئی اس کو ذرا ڈاک خانے میں چھوڑ آؤ۔

مریض خط لے کر باہر چلا جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے ایک کاغذ پر چند دوائیں لکھیں۔ پھر کمپاؤنڈر کو بلا کر کہا

ڈاکٹر:۔ احسن اللہ!

کمپاؤنڈر:۔ جی ڈاکٹر صاحب' ابھی آیا۔

ڈاکٹر:۔ یہ دوائیں جلدی سے بنالاؤ۔ اگر کوئی دوا اسٹاک میں نہ ہو تو شہر آدمی بھیج کر منگا لینا۔

کمپاؤنڈر:۔ بہت بہتر!

ڈاکٹر:۔ (مریضوں سے) ہاں بھئی' اب تم آؤ۔ کہو کیا حال ہے

چار پانچ مریضوں میں سے ایک جو سب سے زیادہ خستہ حال تھا اٹھ کر ڈاکٹر کے پاس آیا

ڈاکٹر:۔ کہو کیا حال ہے۔

[وائپ] محبوب کا بنگلہ۔

محبوب نے زور سے آواز دی

محبوب:۔ رحمن!

رحمن:۔ جی صاحب!

دوڑ کر آتا ہے

محبوب:۔ تمہاری آپا کہاں ہیں؟

رحمن:۔ وہیں کمرے میں لیٹی ہیں۔

محبوب:۔ اچھا تم یہ آرام کرسی اور میز باہر درخت کے نیچے رکھ دو

رحمن:۔ جی اچھا صاحب!

محبوب ہاتھ میں کتاب لئے باہر احاطہ میں نکل جاتا ہے [کٹ]

محبوب درخت کے نیچے کتاب کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ فاصلے پر سمندر کا پانی صبح کی اجلی دھوپ میں چاندی کی طرح چمک رہا ہے۔ پانی

کے اوپر سفید دریائی چڑیاں ناچ رہی تھیں

رحمٰن :۔ اور کچھ چاہیئے صاحب ۔

محبوب :۔ نہیں ۔ اب تم جاؤ ۔ جا کر دیکھو تمہاری آپا کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہو ۔

محبوب نے سمندر کی طرف دیکھا ۔ دور پانی کی لہروں پر ایک چھوٹی کشتی بہی جا رہی تھی اور مانجھی گا رہا تھا ۔

بادل بھی گرجتے ہیں مانجھی ، بجلی بھی چمکتی ہے مانجھی
دائیں بائیں سناٹا ہے ، اور رات اندھیری ہے مانجھی
بجھتا ہے من کا دیا مانجھی
ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

کشتی نظروں سے اوجھل ہو گئی مگر محبوب دیر تک اداس اداس کھویا کھویا سا اسی طرف دیکھتا رہا ۔ پھر اپنے آپ بول اٹھا

محبوب :۔ میں بھی تو اپنے راستہ پر دیر تک نہیں چل سکا ۔ دکھ کے سمندر میں میں نے اپنے لئے ایک نصب العین بنایا تھا اور اس کی موج میں بہنے والی کشتی کا میں ناخدا بنا تھا لیکن میں بھی تو اس کشتی کو کنارے تک نہیں پہنچا سکا ۔ [کٹ]

پیچھے مجیب الرحمٰن آ کر کھڑا ہو جاتا ہے

مجیب :۔ اب اور نہیں چھپ سکو گے

محبوب :۔ کون ؟؟؟

مجیب :۔ میں — ہم — جو تمہاری قیادت میں دنیا کی عیش و آرام کو تج کر مصیبت زدوں کی مدد کرنے کے لئے دکھ کے سمندر میں کود پڑے تھے —!

محبوب : کون — مجیب ؟

مجیب : کیوں اب پہچان بھی نہیں سکتے ؟ ہاں تم نے جو راہ عمل اختیار کی ہو ۔ اس کے بعد ہم لوگوں کو نہ پہچاننا ہی مصلحت ہو تم نے جو دھوکہ دیا ہے .... ! محبوب :۔ دھوکہ —!"

مجیب :۔ دھوکہ نہیں تو اور کیا ۔ تم ہی نے تو ہم لوگوں کو ذاتی آرام و آسائش کو تج کر انسانیت کی خدمت کے لئے قربانیاں دینے کا سبق دیا تھا ۔ تم ہی نے تو ہمارے لئے ایک نصب العین مرتب کیا تھا ۔ آج تمہارا وہ عہد کیا ہوا ؟

محبوب :۔ میری بات تو سنو مجیب ! میرا کوئی قصور نہیں تم مجھ پر غلط الزام مت لگاؤ ....

مجیب :۔ تمہارا کوئی قصور نہیں ؟ تمہاری ہمت افزائی پر ہی تو ہم لوگوں نے تمہارے ساتھ کام کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی ۔ تمہارے ہی کہنے پر ہم لوگ اپنے گھروں میں برے بنے ۔ اپنے اہل و عیال کی طرف سے اپنے فرائض سے غافل ہوئے اور پھر تم خود ہم سے بھاگ کر یہاں چھپ رہے ۔ اپنے وعدوں کو بھول گئے اپنا نصب العین بھول گئے اور حد تو یہ ہے کہ ہمارے خطوں کا بھی کوئی جواب نہ دیا ۔

محبوب :۔ تم نے خط لکھا تھا ؟ مجھے تو ملا نہیں مجیب !

مجیب :۔ بہت خوب ۔ معلوم ہوتا ہے کہ لیلیٰ کے آنچل کی ہوا نے تم کو حد سے زیادہ گرا دیا ہے ۔ مجھے امید نہیں تھی کہ تم اس قدر صاف جھوٹ بولو گے ۔ جی چاہتا ہے کہ آج ان تمام آدمیوں کو یہاں بلا کر تمہارا یہ روپ دکھاؤں جن کے سامنے تم نے بڑے بڑے دعوے کئے تھے

محبوب :۔ میں جھوٹ نہیں کہتا مجیب ! مجھے تمہارا ایک خط بھی نہیں ملا ۔

مجیب :۔ جہاں تک مجھے یاد ہے گزشتہ تین مہینوں میں کم از کم دس خط تم کو لکھے ۔ پتہ بھی غلط نہیں تھا ۔ پھر وہ کیا ہوئے

محبوب :۔ مجھے تو ایک بھی نہیں ملا ۔ کہیں لیلیٰ کا تو ہاتھ نہیں ہو اس کے پیچھے !

[وائپ] لیلیٰ نے اپنے کمرے سے رحمٰن کو آواز دی ۔

لیلیٰ :۔ رحمٰن ! او رحمٰن !! صاحب کہاں ہیں ؟

رحمٰن :۔ باہر لان میں کسی صاحب سے باتیں کر رہے ہیں ۔

لیلیٰ :۔ کون صاحب ہیں —؟

لیلیٰ اٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے ۔ مجیب الرحمٰن دور زور سے بول رہا تھا ۔ [کٹ]

/ محبوب اور مجیب

محبوب :۔ مجھ پر اتنی سختی نہ کرو مجیب ۔ تم جانتے ہو میری صحت کس قدر خراب ہو چکی ہو ۔

مجیب :۔ اور میری صحت کیا بہت اچھی ہو ؟ میرے بھائی !

ملک وملت کے کام میں بہلوانوں کی ضرورت نہیں ہے - اس قسم کے کام میں جان ومال کی قربانی تو دینا ہی ہوتی ہے -

محبوب :- میں اس سے کب پیچھے بھاگتا ہوں ——— لیکن ....

مجیب :- لیکن کیا ؟

محبوب :- ایک وقت میں نے ایک لڑکی سے محبت کا وعدہ کر لیا تھا - پھر میں یہ برداشت نہ کر سکا کہ میرے انتظار میں وہ اپنی زندگی برباد کرلے - ایک دن اس نے میرا دامن پکڑ لیا اور.....

مجیب :- میں یہاں تمہارے دل کی داستان سننے نہیں آیا ہوں - محبوب ! مجاہد کو عشق زیب نہیں دیتا - آج تو میں تم سے صاف صاف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ اب آئندہ تمہارے کیا ارادے ہیں - تم نے کیا طے کیا ہے !

محبوب :- کیا طے کیا ہے ....؟

کچھ دیر کے لئے محبوب کھو سا جاتا ہے اور مجیب بے چینی سے اس کے جواب کا انتظار کرتا ہے

[فلیش بیک] :- سمندر کے کنارے لیلیٰ اور محبوب - لیلیٰ کہہ رہی ہے -

لیلیٰ :- یہ باتیں نہ تو میں سمجھ پاتی ہوں اور نہ سمجھنا چاہتی ہوں میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اپنے دل سے ملک' سماج' قوم اور جماعت کا خیال بالکل نکال دو - آزاد رہو اور بے فکری کی زندگی بسر کرکے صحت اور تندرستی درست کرلو - میری بھلائی اسی میں ہے اور اپنی بھلائی سے زیادہ مجھے اور کسی چیز کی تمنا نہیں - [ڈیزالو]

لیلیٰ کہہ رہی ہے

ی: بھولے احیلا تمہیں یہ قانون جو تمہارے ہیں یہ میری سمجھ سے باہر ہیں - تم اپنی سیاست اپنے ملک اور اپنے سماج کو بھول جاؤ اب تمہاری نئی زندگی شروع ہوئی ہے ——— تم کو نیا انسان بننا پڑے گا - تم صرف میرے بن کر رہوگے - میں چاہتی ہوں کہ دل سے سب کچھ بھلا دو اور صحیح معنوں میں میرے اور صرف میرے بن جاؤ - ورنہ میں یہ سمجھوں گی کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے ہو - تمہیں میری کوئی پرواہ نہیں ہے ——— اب دونوں میں سے جا ہے جو پسند کرو تم اپنے لئے انتخاب کرلو -

[بیک ٹو پریزنٹ] :- محبوب اور مجیب -

مجیب :- کیوں چپ کیوں سادھ لی ؟

محبوب :- میں صحت درست کرنے کے خیال سے کچھ دن آرام کر رہا ہوں -

مجیب :- صحت تو تمہاری بہت اچھی ہوگئی ہے - اب ڈھاکہ چلو ——— !

محبوب :- ابھی یہ تو نہیں ہوسکتا - لیلیٰ بیمار ہے - یہاں اور کچھ دن رہنا ضروری ہے -

مجیب :- تمہاری وجہ سے سارا کام رکا پڑا ہے - اب اور زیادہ دیر تو نہیں ہوسکتی - اگر تم ابھی ہمارے ساتھ نہیں چلتے ہو تو ہمیں تمہارے ساتھ تمام تعلقات منقطع کرنے پڑیں گے - ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمارے ایک ساتھی نے ہم کو دھوکا دیا

محبوب :- مجیب ! میرے سامنے لفظ دھوکہ دوبارہ استعمال نہ کرنا - جن لوگوں کو میری ذات سے ہمدردی نہیں میں ان کے ساتھ کوئی کام کرنے کو تیار نہیں ہوں

مجیب :- بہت خوب ! اب اور زیادہ سننے کی ضرورت نہیں - تمہارا جواب معلوم ہوگیا - تمہاری خاطر ہمارا کام رکا نہیں رہ سکتا ——— اچھا اب میں چلتا ہوں -

محبوب :- ایں - کیا اسی وقت چلے جاؤگے ؟

مجیب :- ہاں - اب یہاں رہنے سے کوئی فائدہ نہیں - ہم نے جن لوگوں سے وعدے کئے تھے وہ ہم سے بدظن ہورہے ہیں ——— تمہاری خاطر اتنے دنوں تک ہم نے سب کچھ برداشت کیا - لیکن اب اور تاخیر ممکن نہیں - ہم سپاہی ہیں - ہمیں اپنے بھائیوں کی مدد کرنا ہے ——— !

مجیب الرحمٰن لمبے لمبے ڈگ بھرتا محبوب کے پاس سے چلا جاتا ہے [فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن] محبوب بنگلہ کے اندر واپس آتا ہے لیلیٰ کچھ پریشان سی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی ——— ——— محبوب اس کے پاس پہنچ کر پوچھا -

محبوب :- لیلیٰ - ڈھاکہ سے میرے نام جو خطوط آئے تھے

وہ کیا ہوئے؟ تم نے مجھ کو کیوں نہیں دیئے وہ خط!

تھوڑی دیر تک لیلیٰ چپ رہی۔ ویسے ہی پریشان اور گھبرائی گھبرائی سی۔

پھر بولی

لیلیٰ:۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان خطوں کو پڑھ کر تمہارا دماغ پراگندہ ہو جائے گا اور دماغی طور پر پریشان ہونے کی صورت میں جلد صحت یاب ہونا مشکل تھا اسی لئے میں نے.....

محبوب:۔ صحت! صحت! صحت! — ایسی صحت سے میں باز آیا۔ ساتھیوں سے تعلقات ختم ہو گئے۔ ان کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوا اور انھوں نے مجھے جھوٹا اور فریبی سمجھ لیا۔ میرا مذاق اڑایا۔ تمہاری صحت صحت کی رٹ نے مجھے ساری دنیا میں رسوا کر دیا۔

لیلیٰ:۔ میں نے تم کو ذلیل یا رسوا نہیں کیا۔ میں بھی اسی ملک کی ایک لڑکی ہوں۔ تم مجھے اپنے رستہ کی رکاوٹ نہ سمجھو۔ اب تک میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تمہاری ہی بھلائی کے خیال سے کیا ہے۔ اب بھی میں تمہاری ہی بھلائی چاہتی ہوں۔ انسوس ہے کہ اب تک تم نے مجھ کو نہیں سمجھا — !

محبوب: تم ہی میری سب کچھ نہیں ہو لیلیٰ!

یہ بات لیلیٰ پر تازیانہ بن کر گری مگر اس نے کسی ردعمل کے بغیر کہا

لیلیٰ:۔ مجھے یہ معلوم ہے۔ مگر میرے سب کچھ تم ہی ہو۔ تمہاری خاطر میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ میں نے جو قصور کیا ہے اس کی تلافی کی بھی کوشش کی ہے۔ جس بات کے لئے تم ذلیل ہوئے اس کو میں نے اپنے اوپر لے لیا ہے۔ وہ دیکھو میں نے تمہارے دوست کو واپس بلا لیا ہے۔ اب میں تمہارے راستہ کی رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ تم خوشی کے ساتھ دل سے ہمراہ ڈھاکہ چلے جاؤ۔ [کٹ]

رحمٰن کے پیچھے پیچھے مجیب الرحمٰن کمرہ میں داخل ہوتا ہے

مجیب:۔ میری سخت سست باتوں کے لئے مجھے معاف کر دو محبوب۔ ابھی تمہاری بیوی کے خط سے تمام باتیں معلوم ہوئیں اور میری غلط فہمی دور ہو گئی

مجیب الرحمٰن نے محبوب کو سینہ سے لپٹا لیا۔

[کٹ]

لیلیٰ ان تمام باتوں سے اکتا چکی تھی۔ چپ چاپ جا کر اپنے کمرہ میں بستر پر لیٹ گئی۔

[وائپ]:۔ شہر میں لیلیٰ کے ابا کا مکان۔ لیلیٰ کے والد اور مینا کمرے میں نظر آتے ہیں۔ مینا ٹوٹی ہوئی عینک کے شیشے زمین پر سے چن چن کر اٹھا رہی ہے۔

لیلیٰ کے ابا:۔ یکایک سارا بدن کپکپانے لگا اور عینک ہاتھ سے گر گئی۔ بتاؤ تو مینا ایسا کیوں ہوا۔ اب تو آنکھوں سے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔ مینا بیٹا۔ ایسا کیوں ہوا؟

مینا:۔ آپ فکر کیوں کرتے ہیں ماموں جان۔ پھر نئی عینک آجائے گی۔

لیلیٰ کے والد بے حد اداس نظر آتے ہیں۔ کھوئے کھوئے سے، جیسے کچھ سوچ رہے ہوں جیسے ان کی کوئی بہت قیمتی شے کھو گئی ہو۔

لیلیٰ کے ابا:۔ مینا بیٹا۔ آج کی ڈاک آگئی؟

مینا:۔ جی نہیں ماموں جان۔

لیلیٰ کے ابا:۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ اپنے بڈھے باپ کو بھول گئی ہو۔ پھر خط کیوں نہیں آتا ہے؟ یقیناً کوئی بات ہے

مینا:۔ آپ خواہ مخواہ گھبرا رہے ہیں ماموں جان۔ کل تک خط ضرور آجائے گا۔

لیلیٰ کے والد:۔ باپ کے دل کو تم نہیں سمجھ سکتیں مینا۔ لیلیٰ کا وہ پرانا خط تو لاؤ ذرا

مینا جا کر خط لاتی ہے۔ پھر ماموں کے کہنے پر خط سنانے لگتی ہے۔

مینا:۔ سنیئے ماموں جان۔

پیارے ابا جان۔ آداب

آپ کے پچھلے خط سے معلوم ہو کہ اب آپ کے پیر کا درد پہلے سے کچھ کم ہے اور طبیعت بھی ٹھیک رہتی ہے معلوم نہیں یہ سب سچ ہے یا آپ نے محض میرے خوش کرنے کو لکھا ہے۔ یہ تو ضرور ہے کہ آپ کو رات کے وقت ٹھیک سے نیند نہیں آتی ہوگی۔ میں ہمیشہ آپ کا سر دبا کر آپ کو سلایا کرتی تھی۔ پتہ نہیں مینا آپ کی خدمت

ٹھیک طرح سے کرتی ہو یا نہیں امید ہے کہ آپ تفصیل سے لکھیں گے ۔ آج یہاں آئے ہوئے پورے تین مہینہ ہو گئے ۔ اب طبیعت گھبرانے لگی ہے اور جی چاہتا ہے کہ دوڑ کر آپ کے پاس چلی آؤں ۔ آپ کو دیکھنے کے لئے دل بہت بے چین ہے ۔ کیا آپ مینا کو لے کر کچھ دنوں کے لئے یہاں نہیں آسکتے ؟ [کٹ]

[کلوز اَپ] لیلیٰ کے ابا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ دو ایک قطرے چہرے پر بھی ڈھلک گئے ۔

مینا گھبرا کر بولی

مینا :- ہیں یہ کیا ماموں جان ! آپ تو رونے لگے

لیلیٰ کے ابا :- نہیں بیٹی ۔ میں رو تو نہیں رہا ۔

مینا :- ماموں جان اس طرح گھبرانے اور پریشان ہونے سے کیا حاصل ؟ چلئے نا کچھ دنوں کے لئے ہم لوگ وہاں ہو آئیں

لیلیٰ کے ابا :- ہاں مینا ۔ چلو ہم لوگ بھی وہاں کی سیر کر لیں میں ابھی خط لکھے دیتا ہوں ۔

[واٹپ] :- لیلیٰ بستر پر لیٹی ہے ۔ ڈاکٹر نے انجکشن دے کر پوچھا

ڈاکٹر :- کیوں لیلیٰ ۔ تکلیف تو نہیں ہوئی ؟

لیلیٰ نے دھیرے سے مسکرا کر کہا

لیلیٰ :- نہیں تو

ڈاکٹر اپنا سامان اٹھا کر چلنے لگا تو لیلیٰ نے پھر پوچھا

لیلیٰ :- ڈاکٹر جی ! میں اچھی تو ہو جاؤں گی نا ؟

ڈاکٹر :- پگلی ۔ اتنی فکر کیوں کرتی ہے ۔ بس چند دنوں میں ہی دوڑتی پھرتی نظر آؤ گی

لیلیٰ :- چند دنوں کے اندر ؟

ڈاکٹر :- ہاں چند دنوں کے اندر ۔ کہہ تو دیا تم فکر نہ کرو ۔ لو اب تم سو جاؤ ۔ میں کل صبح پھر آ جاؤں گا ۔

ڈاکٹر چلا گیا

لیلیٰ :- رحمن ——

رحمن :- کیا ہے آپا

لیلیٰ :- صاحب کہاں ہیں ؟

رحمن :- کمرے میں بیٹھے اپنے دوست سے باتیں کر رہے ہیں

لیلیٰ :- اور ——

رحمن :- انھوں نے ابا کو خط لکھ کے ابھی ابھی ڈاک میں بھجوا دیا ہے ۔ ان کے آنے کے بعد صاحب اپنے دوست کے ساتھ ڈھاکہ چلے جائیں گے ۔

لیلیٰ :- ڈھاکہ چلے جائیں گے —— مجھ کو یہیں چھوڑ کر ؟؟

لیلیٰ کا چہرہ زرد ہو گیا اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں

لیلیٰ :- چوبیس سال کی عمر تک میں ان کی راہ تکتی رہی ۔ ان کی بیماری کو اپنے سر لے لیا ۔ پھر بھی انھوں نے میری طرف نہیں دیکھا —— پھر بھی ان کا دل خوش نہیں ہوا ۔

کہتے کہتے لیلیٰ رونے لگی ۔ اس نے تکیہ میں منہ چھپا لیا اور ہچکیاں لے لے کر روتی رہی ۔ پھر سخت کھانسی شروع ہوئی ۔ کھانسی کی شدت سے اس کا سارا جسم ہلنے لگا ۔ اس نے منہ میں ساڑی کا پلو مروڑ کر ٹھونس لیا لیکن بستر پر خون دیکھ کر چیخ پڑی اور پھر بے ہوش ہو گئی ۔

رحمن اس کے پاس ہی کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔ اس نے گھبرا گھبرا کر لیلیٰ کو پکارنا شروع کیا لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو محبوب کے کمرے کی طرف دوڑا ۔ [کٹ]

رحمن :- صاحب ۔ جلدی آیئے ۔ آپا بے ہوش ہو گئی ہیں ۔

محبوب اتنا سنتے ہی تیز تیز قدم اٹھاتا لیلیٰ کی طرف چل دیا ۔ [کٹ]

لیلیٰ اسی طرح بے ہوش پڑی ہے ۔ محبوب اس کے پاس کھڑا اس کو پکار رہا ہے

محبوب :- لیلیٰ — لیلیٰ !

محبوب :- رحمن ! بھاگ کر ڈاکٹر صاحب کو خبر کر دو ۔ اپنے ساتھ ہی لیتے آنا ۔ کیا سمجھے ۔

رحمن ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا

محبوب نے پھر لیلیٰ کو پکارا مگر جواب ندارد ۔ ساڑی کے آنچل سے اس نے اس کے ہونٹوں سے خون صاف

کیا۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھا اور پھر دھیرے سے پکارا

محبوب:۔ لیلیٰ!　[کٹ]

[کلوز اَپ] لیلیٰ نے آہستہ سے آنکھیں کھولیں اور محبوب کو اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر پھر بند کرلیں۔ اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ اب تک کانپ رہے تھے ایک ہاتھ سے اس نے محبوب کا ہاتھ پکڑ کے سینہ پر رکھ لیا۔ اور پھر یکایک آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔

محبوب:۔ تمہاری طبیعت اتنی زیادہ خراب تھی تو مجھے کیوں نہیں بتایا　[کٹ]

کاکس بازار کے گھاٹ پر جہاز آکر لگتا ہے۔ لیلیٰ کے ابا اور مینا اس سے اتر کر باہر آتے ہیں

[کٹ]

رحمن ڈاکٹر کے ساتھ گھر کی طرف لپکتا ہوا جا رہا ہے　[کٹ]

لیلیٰ محبوب کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہی تھی

لیلیٰ:۔ محبوب! میرا آشیانہ ٹوٹ گیا

محبوب اس کو تسلی دے رہا تھا

محبوب:۔ نہیں لیلیٰ ایسا نہ کہو۔ ہم دونوں مل کر سارے ملک میں ابدی مسرت کا آشیانہ بنائیں گے

لیلیٰ:۔ وہ تمنا اب پوری نہیں ہوگی محبوب۔ میری آرزو تھی کہ تمہاری جیون ساتھی بنوں۔ وہ آرزو پوری ہوگئی۔ اب میں زیادہ دنوں تک تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی اور میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم اپنے مقصد میں ناکام رہو۔ میں تم کو چھوٹا اور ذلیل نہیں ہونے دونگی۔

محبوب:۔ لیلیٰ؟

لیلیٰ:۔ مجھ کو اپنے کام میں رکاوٹ نہ سمجھو۔ محبوب تم جاؤ مجھ کو میرے حال پر رہنے دو، تم جاؤ۔

محبوب:۔ لیلیٰ تمہارے بغیر اس آشیانے کی خوشی آدھی بھی نہیں ہوگی۔ تمہاری بغیر میرا خواب ادھورا ہی رہے گا۔

لیلیٰ:۔ نہیں محبوب۔ ایک نہ ایک دن لاکھوں کروڑوں انسانوں کی مسرت سے ساری فضا گونج اٹھے گی۔ میں اگر نہ بھی ہوں تو کوئی غم نہیں۔ تمہاری محنت رائگاں نہیں جائے گی

محبوب:۔ ایسا نہ کہو لیلیٰ۔ تم بہت جلد اچھی ہو جاؤ گی۔ اب تم آرام سے سو جاؤ

لیلیٰ کو سانس لینے میں تکلیف ہو رہی تھی پھر بھی اس نے کہا

لیلیٰ:۔ ہاں محبوب۔ اب میں سو جاؤں گی۔ آرام اور اطمینان کی نیند۔ اب مجھ کو کوئی نہیں جگا سکے گا — کوئی مجھ کو —

جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ لیلیٰ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ محبوب اس کے سینہ سے لپٹ گیا۔ [فیڈ آؤٹ]

[فیڈ اِن] سب لوگ ساحل سمندر کی طرف جا رہے ہیں۔ قلی آگے آگے سامان لئے جا رہا تھا اور تمام لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے [کٹ]

چلتے چلتے محبوب تاڑ کے درخت کے نیچے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس دن کے طوفان میں جو گھونسلہ گر گیا تھا وہ نیچے خالی پڑا ہے۔ محبوب ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور اس کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا۔

یہ دیکھ کر مجیب الرحمن آگے آیا اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر کہا

مجیب:۔ دل چھوٹا نہ کرو دوست۔ جو آشیانہ ٹوٹ گیا اب اس کا غم فضول ہو — اس سے بڑے آشیانے کی تیاری اب تمہارے سامنے ہے — آؤ چلیں!

محبوب نے سامنے کی طرف دیکھا۔ آسمان جہاں جھک کر سمندر سے ملتا تھا وہ جگہ نئی صبح کے قرمزی رنگ سے جگمگا رہی تھی۔

ایک لمبی آہ چھوڑ کر محبوب آگے بڑھ گیا۔ ایک نئے اُفق کی طرف — [فیڈ آؤٹ]۔

مفت خور

پرکاش پنڈت

کردار

۱ مراری لال مہمان۔

۲ گلزاری لال میزبان

۳ کمال میزبان کا ملازم

۴ ہوٹل کا بٹلر

۵ بزاز کا کارندہ

۶ مکان مالک کا منشی

۷ پڑوسی کا ملازم

۸ پولیس انسپکٹر

اور تین چار سپاہی

مراری لال: (اپنے آپ سے) ہوں! آج خوب مزا رہے گا۔ بچّہ جی روز جُل دے جاتے تھے۔ سال بھر سے کہہ رہے تھے، آج کھلائیں گے، کل دعوت ہوگی۔ اُس دن معاف کردیا تو آج پھر معاف کر دیجئے آج سب معافیاں ایک ساتھ نکل جائیں گی — لیکن ابھی تک وہ آیا کیوں نہیں۔ اب تک تو اُسے آجانا چاہئے تھا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ انتڑیاں الگ چیخ رہی ہیں۔ (قدرے بلند آواز سے) اے بھائی — کیا نام ہے تمہارا — موہن! موہن یا چندر کانت؟

کمال: جی، کمال!

مراری: کمال! خوب! خوب نام ہے۔ اچھا بھائی کمال تمہارے بابو جی

کب آئیں گے ؟

کمال: جی! جی وہ ہوٹل تک گئے ہیں۔

مراری: ہوٹل تک گئے ہیں۔ خوب، خوب۔ پھر تو خوب ٹھاٹ کی دعوت ہوگی۔ مجھے بھوک بھی خوب کراری لگی ہے۔ آج صبح سے دہنی آنکھ پھڑک رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے خوب لذیذ کھانا ملے گا۔ کمال! تمہارے بابو کو گئے کتنی دیر ہوگئی؟

کمال: جی بہت دیر ہوگئی۔

مراری: بہت دیر ہوگئی تو پھر آنے میں زیادہ دیر نہ ہوگی۔ دیکھو تب تک ایک چلم تمباکو ہی بھر لاؤ۔

کمال: جی تمباکو تو باہر نہیں ہے۔ بابو بند کرکے رکھ گئے ہیں۔

مراری: کیا کہا۔ بابو تمباکو بند کرکے رکھ گئے ہیں۔ ایسا تو کبھی نہیں سُنا۔ یہ کوئی پرامسری نوٹ تو تھے نہیں کہ بند کرکے رکھ گئے ہیں۔ خیر، لیکن اُت د تمباکو کا کچھ انتظام کرو۔ نہ ہو تو مالی یا کسی اور ہی سے ایک چلم تمباکو مانگ لاؤ۔ بڑی طلب لگ رہی ہے۔

کمال: جی بازار سے لانا ہوگا۔

مراری: بازار سے؟ — کیوں؟ کیا مالی تمباکو نہیں پیتا؟ — عجیب دستور ہے۔ اچھا بھائی یونہی سہی۔ یہ لو ایک اکنی اور لپک کر تمباکو لے آؤ۔

کمال: جی اکنی میں تو نہیں ملے گا۔

مراری: اکنی میں نہیں ملے گا! کیوں نہیں ملے گا؟ تم کہیں مجھے لکھنؤ کا نواب تو نہیں سمجھ بیٹھے؟ سولہ روپے تولے کا مشکی تمباکو نہ ملنے پر بھی کسی طرح میرا کام چل سکتا ہے — جاؤ بہت مل جائے گا اکنی میں۔

کمال: جی حقہ اور چلم بھی تو نہیں ہے۔

مراری: تو کیا تمہارے بابو اسے بھی فولاد کے بکس میں بند کرکے رکھ گئے ہیں؟ کسی بنک میں سیف ڈیپازٹ کیوں نہیں کرا گئے؟ تمباکو نہیں ہے۔ حقہ اور چلم بھی نہیں ہے۔ کیسی جگہ آ پڑا ہوں — اچھا بھائی یہ لو تین آنے۔ تانگے کے لئے رکھ چھوڑے تھے تم تمباکو کے لئے لے جاؤ۔

(کمال جاتا ہے)

مراری: (اپنے آپ سے) مکان تو خاصا اچھا ہے لیکن بالکل بے مرمت پڑا ہے۔ جالے تک بھی تو نہیں اتارے گئے۔ وہ کسی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ ہر چیز سلیقہ مانگتی ہے۔

(کمال آتا ہے)

مراری: کیوں لے لے آیا تمباکو؟ ہاتھ میں تو صرف چلم دیکھتا ہوں حقہ کیوں نہیں لائے؟

کمال: جی۔ یہاں تین آنے میں حقہ نہیں ملتا چلم ہی کے دام ڈھائی آنے ہیں۔

مراری: چلم ہی کے دام ڈھائی آنے ہیں؟ دیکھو کمال! اوپر سے جتنا بیوقوف میں نظر آتا ہوں اصل میں اتنا ہوں نہیں۔ جسم جتنا موٹا ہے عقل اتنی ہی باریک ہے — اب سمجھ میں آیا کہ تمہارے بابو کو حقہ چلم تک لوہے کے بکس میں بند کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔ ایک تم ایسے گولکنڈے کے ہیرے کو باہر چھوڑ جانا ان کی نادانی ہے ورنہ — لیکن یاد رکھو اب تم بھی زیادہ دنوں تک باہر نہ رہ سکو گے۔ حکومت کو خبر ہونے کی دیر ہے کہ وہ پہرا اٹھا کر تمہیں بڑی حفاظت سے رکھے گی — خیر، جو ہے سو لاؤ — افیم نہ ہو نہ سہی تمباکو کے بنا نہیں رہا جا سکتا — ارے! تم تو آگ بھی دھر لائے ہو۔ سچ سچ بتاؤ راستے میں کتنے کش لگائے تھے جھوٹ مت بولنا......

(کش لگا کر بُری طرح کھانستا ہے)

...... اوہو — ہو — ہو، ظالم! یہ کہاں کا تمباکو ہے۔ دم لگانے کے ساتھ ہی دم نکلنے کو ہے چین ہوا ٹھا۔ اس سے تو یہی اچھا تھا کہ لٹھ مار کے میرا بھیجا نکال دیتے — نہیں کسی کام کا نہیں رہنے دو۔ گلزاری کے آنے پر دیکھا جائے گا — لیکن اس کے آنے کی تو کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔ حضرت کسی ہوٹل میں بیٹھے رس گلے اڑا رہے ہوں گے۔ ادھر میرے پیٹ میں ایسی آگ لگی ہے کہ دھوتی تک کے جل جانے کا اندیشہ ہے۔ پیاس بھی کچھ کم نہیں لگی لیکن پانی مانگتے ہی

ہمارے کمال بہادر بول اٹھیں گے — گلاس خرید کر لانا ہوگا۔ بابو بند کر کے رکھ گئے ہیں۔ نہیں، کوئی ضرورت نہیں۔ باغیچے سے ایک آدھ سنگترہ منگا کر جوس پیتا ہوں — کمال! دیکھو بھائی میرا ایک کام کرو گے؟ ذرا باغیچے سے ایک سنگترہ تو توڑ لاؤ۔ بڑی پیاس لگی ہے۔

کمال: جی سنگترہ نہیں مل سکتا۔

مراری: کیوں جناب سنگترہ کیوں نہیں مل سکتا۔ باغیچے میں بے شمار سنگترے دیکھ آیا ہوں۔

کمال: جی ہاں۔ لیکن تمام درخت اور پھل گنے ہوئے ہیں۔

مراری: تمام درخت اور پھل گنے ہوئے ہیں — کیا کہہ رہے ہو؟ تو کیا ایک بھی سنگترہ نہیں مل سکتا۔

کمال: پیسے چاہئیں۔

مراری: پیسے! خوب!! بہت ہی خوب!! پیسے تو اب میرے پاس نہیں ہیں۔ گلزاری کو آنے دو۔ دیکھنا کیا گت بنواتا ہوں تمہاری — یوں جیب میں تنخواہ کے روپے موجود تو ہیں لیکن میں انہیں ایک سنگترے کے لئے نہیں تڑا سکتا۔ اس زمانے میں بھی اتنا بڑا ڈکیت دن دہاڑے لوگوں کو لوٹتا ہے۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا — معلوم ہوتا تو ...... معلوم ہوتا ہے، آ رہا ہے۔ آہٹ سن رہا ہوں۔ تم بھی سن رہے ہو نا کمال! ...... نہیں، وہ تو نہیں۔ تم کون ہو جی؟

بٹلر: جی حضور میں! ہوٹل سے آیا ہوں۔

مراری: ہوٹل سے آئے ہو۔ شاباش! شاباش!! لیکن تمہارے ساتھ اگر بابو بھی آجاتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ لاؤ کیا کچھ بھیجا ہے انہوں نے؟

بٹلر: حضور یہ بل!

مراری: بل! کیسا بل؟ کس نے بھیجا ہے؟ اوہ! ارے بھائی جس بابو کے نام کا یہ بل ہے وہ یہاں موجود نہیں ہے۔ سمجھے۔ میں تو یہاں دعوت کھانے آیا ہوں۔

بٹلر: حضور یہ بھی تو دعوتوں ہی کا بل ہے۔

مراری: پھر وہی — میں کہتا ہوں میں وہ شخص نہیں ہوں۔ میرا نام مراری لال ہے۔ گلزاری لال دوسرے صاحب ہیں۔ میں تو یہاں دعوت .....

بٹلر: حضور تو مذاق کرنے لگے۔ آپ ہی کا نام گلزاری لال ہے۔

مراری: میرا نام گلزاری لال ہے؟ خوب! مراری لال نام کیا نہیں پسند نہیں۔ عجیب عقل کے مالک ہو — اچھا دیکھو اتنے بکھیڑے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر انتظار کرو، وہ آتے ہی ہوں گے۔ تمہارا وہم ابھی دور ہو جائے گا۔ ویسے مجھے تو اس بات ہی سے بڑی تسکین ہو رہی ہے کہ تم ہوٹل سے آئے ہو۔ تمہاری پگڑی کو اگر ابالا جائے تو اس میں سے بھی کچھ نہ کچھ ..... نہیں نہیں، گھبراؤ نہیں۔ میں تمہاری پگڑی نہیں لوں گا۔ لیکن بل بھی نہیں لینا چاہتا — تو کیا صبح صبح اسی لئے میری دہنی آنکھ پھڑک اٹھی تھی — کھانا تو آیا نہیں، بل پہلے آ موجود ہوا — لو وہ آگئے۔ میں نہ کہتا تھا کہ آتے ہی ہوں گے۔ پاؤں کی چاپ سن رہے ہو نا۔ یہ وہی ہیں۔ ایں، آپ؟ آپ کون صاحب ہیں؟

کارندہ: بے شک! اب آپ کیوں پہچاننے لگے؟ مدت بھی تو بہت بیت چکی ہے اور کیا مجال جو ایک بار بھی صورت دکھائی ہو۔ ادھر میں ہوں کہ سینکڑوں چکر کاٹ کاٹ کے لوٹ چکا ہوں۔ خوش قسمتی سے آج آپ مل گئے۔

مراری: شکریہ۔ شکریہ۔ فرمائیے کیسے تکلیف فرمائی آپ نے؟

کارندہ: اچھا تو اب یہ بھی بتانا ہوگا — جناب میں کپڑے کے دام لینے آیا ہوں۔

مراری: کپڑے کے دام؟ کون سے کپڑے کے دام، میں کچھ سمجھا نہیں۔

کارندہ: بابو جی یہ چکمہ کسی اور کو دیجئے گا۔ میرے ساتھ یہ سب نہیں چل سکتا۔ یہ دیکھئے بجک! پانچ روپے دس آنے آپ کے نام!

مراری: پانچ روپے دس آنے! اوہ! ہاں، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن بھائی صاحب آپ بھی دھوکہ کھا گئے ہیں۔ میں گلزاری لال نہیں ہوں۔ گلزاری لال دوسرے صاحب ہیں۔ میرا نام مراری لال ہے۔

کارندہ: مراری لال! جی ہاں میں ایسا بچہ ہی تو ہوں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں نام بدل لینے سے آپ بچ جائیں گے۔

مراری: تو کیا میرے ماتھے پر گلزاری لال نام کا سائن بورڈ لٹک رہا ہے؟ کمال ہے۔ ہر کسی کو میں گلزاری لال ہی دکھائی دیتا ہوں۔ اچھا جناب۔ نام یا لباس کی طرح جسم بدلنا تو کوئی آسان کام نہیں۔ آپ نے میرے جسم کے کس حصے سے پہچانا ہے کہ میں گلزاری لال ہوں؟

کارندہ: میں کچھ نہیں جانتا۔

مراری: بالکل ٹھیک! میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں بندہ پرور کہ آپ کچھ نہیں جانتے۔ اگر آپ جانتے یا جاننے کی کوشش کرتے تو اس طرح —— دراصل میں یہاں دعوت کھانے آیا ہوں۔ مجھے تو خود ان کا انتظار ہے ...... لیجئے بڑی عمر ہے ان کی۔ زبان پر ان کا نام آیا نہیں کہ ...... نہیں، یہ تو وہ نہیں ہیں۔ آیئے آیئے تشریف لایئے — آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ تشریف رکھئے۔

منشی: جی شکریہ۔ میں کرایہ لینے حاضر ہوا ہوں۔

مراری: کرایہ؟ کس بات کا کرایہ؟

منشی: مکان کا کرایہ جناب۔ چوتھا مہینہ جا رہا ہے۔ سیٹھ جی نے تو آج مجھے بتایا ورنہ ——

مراری: کس حساب سے کرایہ لیتے ہیں آپ کے سیٹھ جی؟

منشی: آپ سے بھولا ہوا ہے کیا۔ وہی ستر روپے ماہوار!

مراری: ستر روپے ماہوار! خوب! اچھا صاحب ذرا حساب کرکے بتایئے تین گھنٹے کا کیا کرایہ بنتا ہے؟

منشی: جناب، یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ مجھے ضروری کام سے باہر جانا ہے۔

مراری: تو میں آپ کو کب روکتا ہوں۔ بڑے شوق سے جایئے۔ بلکہ میں تو خود آپ سے کہنے والا تھا کہ اگر اس وقت آپ تشریف لے جائیں تو آپ کے اور میرے دونوں کے حق میں بہتر ہوگا۔ اس مکان میں مدعو ہو کر میں دو گھنٹے اور پچپن منٹ سے بیٹھا ہوں، پینے کے لئے تمباکو تک اپنی گرہ سے منگوانا پڑا ہے۔ اس پر بھی اگر آپ نہیں مانتے اور کرایہ لینا ہی چاہتے ہیں تو حساب کرکے تین گھنٹے کا جو مناسب کرایہ بنتا ہے وصول کر لیجئے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

منشی: آپ اپنے ان دوستوں کا ہی کچھ خیال کیجئے۔ کیوں خواہ مخواہ ......

مراری: دوست؟ جی نہیں۔ یہ بھی آپ ہی کی طرح میرے مہربان ہیں، آپ سے ملئے، آپ کھانے کا بل لائے ہیں جو میرے فرشتوں تک نے نہیں کھایا، اور آپ — آپ کپڑے کے داموں کا تقاضا فرما رہے ہیں۔ حیران ہوں کہ آپ بھی انہیں کی طرح دھوکے میں ہیں۔ آپ بھی مجھے نہیں پہچان سکے۔ میرا نام گلزاری لال نہیں، مراری لال ہے۔ یقین کیجئے پیدائش ہی سے میرا نام مراری لال ہے۔ نام بدلنے کا گناہ میرے نزدیک مذہب بدلنے سے بھی بڑا ہے۔

منشی: اور میرا نام بھی رام دلارے ہے۔ سمجھے آپ — آپ کو مکان چھوڑنا پڑے گا۔ آج ہی۔ ابھی، اسی وقت۔ میں دیکھ لوں گا —— واہ!

مراری: معاف کیجئے جناب۔ یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ تین گھنٹے سے یہاں بیٹھا پیٹ کی آگ میں جھلس رہا ہوں۔ جونہی کھانا آنے کا وقت آیا، آپ نازل ہوئے۔ ان گیدڑ بھبکیوں سے میں مکان چھوڑ کر کہاں بھاگ جاؤں گا۔ اتنا بیوقوف مجھے مت سمجھئے۔ یہاں بیٹھئے، اور جو کچھ کہنا ہو آرام سے کہئے۔ میں پہلے کھانا کھاؤں گا اس کے بعد مکان چھوڑوں گا —— پھر کون بلا آئی۔ اب تو اس میں خیریت ہے کہ گلزاری لال ......

ملازم: میں پندرہ منٹ سے باہر برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ آپ مصروف ہیں شاید ......

مراری: نہیں، نہیں۔ ایسی تو کوئی خاص مصروفیت نہیں۔ یونہی ذرا گپ بازی ہو رہی تھی۔ فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟

ملازم: ہری بابو نے آپ کو بلا بھیجا ہے۔

مراری: ہری بابو! کون ہری بابو؟! بھیا میرے مہربان دوست کا تو صبح سے کچھ ٹھکانا نہیں، اور جن سے میری دوستی ہے نہ جان پہچان، وہ میرے درشنوں کے لئے کیوں اس قدر اتاولے ہو اُٹھے ہیں؟ کیوں جی، ہری بابو نام کے کسی بزرگ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے؟

ملازم: آپ نے اپنی بیوی کے ہاتھ کا کنگن گھڑانے کے لئے اُن سے زیور کا نمونہ لا کر واپس نہیں کیا۔ مانگ رہے ہیں۔

مراری: کنگن! واہ، واہ!! کوئی تار چھلّہ بھی نہیں ایک دم کنگن۔ دیکھئے جناب اس بارے میں مجھے بہت کچھ کہنا ہے لیکن سر دست کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتا، معاف کیجئے گا، بھوک پیاس سے میرا حلق سوکھا جا رہا ہے۔ چھاتی پھٹ رہی ہے۔ آپ کچھ دیر کے لئے یہاں بیٹھنے کی زحمت گوارا کیجئے، سب حال معلوم ہو جائے گا —— اس وقت اپنے طور پر میں آپ سے صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے کسی سے کوئی زیور نہیں لیا۔ میری بیوی تک کو مرے چھ برس ہو چکے ہیں —— اُف اب تو بالکل نہیں سہا جاتا۔ سر چکرا رہا ہے۔ پیٹ میں کھلبلی مچ رہی ہے —— ارے او گلزاری لال —— ارے او ٹھگ، پاجی، دغاباز، بدمعاش......

سب جنے دایک ساتھ): آپ ہمیں گالیاں دے رہے ہیں۔

مراری: گالیاں! اجی نہیں میں آپ سے کچھ نہیں کہہ رہا۔ بھوک کی بے چینی سے پریشان ہو کر واہی تباہی بک رہا ہوں۔ اپنے پیارے دوست کو پکار رہا ہوں۔ آپ آرام سے بیٹھئے۔

بزاز کا کارندہ: اب ہم سے نہیں بیٹھا جاتا۔

مراری: تو کوئی مضائقہ نہیں۔ بڑے شوق سے تشریف لے جائیے۔ میں خود آپ کا زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اتنا کیا کم ہے کہ آپ لوگوں کی دلچسپ باتوں سے ہنسی خوشی اتنا وقت کٹ گیا ہے۔

منشی: میں تو آج کرایہ لئے بنا نہیں ٹلوں گا —— اِدھر یا اُدھر ——

آپ ہیں کس ہوا میں؟

مراری: بھائیو! آپ سے یہ کہنا لاحاصل ہوگا کہ آپ دونوں وقت بھر پیٹ کھانا کھاتے ہیں، آج تک آپ کو بھوکا رہنے کا موقع نہ ملا ہوگا۔ بھوک کی وجہ سے آدمی کا مزاج کیسا ہو جاتا ہے، اتنا شاید آپ نہیں سمجھ سکتے۔ میں اتنی دیر سے بڑے جبر کے ساتھ اپنا غصہ دبائے بیٹھا ہوں۔ بعد میں خون خرابا کر بیٹھوں گا تو آپ......

بزاز کا کارندہ: ہونہہ! بڑے تیس مار خاں ہیں نا آپ!

بٹلر: میں تو پہلے ہی کہتا تھا۔ گھی سیدھی انگلیوں نہ نکلے گا۔

پڑوسی کا ملازم: لاتوں کے بھوت اگر باتوں سے مان جائیں تو......

مراری: اررر...... آپ تو آستینیں چڑھانے لگے۔ میرے جسم ہی کا کچھ لحاظ کیجئے۔ اس حالت میں میرا مطلب ہے خالی پیٹ پر میں مار کیسے سہہ سکوں گا۔ بھوک نے تو پہلے ہی میری ساری طاقت نچوڑ ڈالی ہے۔ آپ کو کیسے یقین دلایا جائے کہ میں یہاں دعوت کھانے آیا ہوں گالیاں اور گھونسے نہیں —— اچھا، اچھا، بیٹھئے، تو سہی بیٹھئے، صاحب۔ جناب ذرا بیٹھئے۔ بتایئے مجھ سے کتنے روپے لے کر آپ میری جان بخش سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کس کا کتنا باقی ہے۔ اتفاق سے تنخواہ کے روپے جیب میں پڑے ہیں —— نہیں، آپ فکر نہ کیجئے۔ گلزاری لال کے آنے پر میں سود سمیت وصول کر لوں گا —— ہاں تو جناب! سب سے پہلے آپ بتایئے، آپ سب سے زیادہ گرم مزاج دکھائی دیتے ہیں —— کے دام ہیں کپڑے کے؟

بزاز کا کارندہ: پانچ روپے دس آنے۔

مراری: بس! کل پانچ روپے دس آنے —— اور اب تک آپ نے کم از کم پچپن روپے کی گالیاں دے ڈالی ہیں۔ خیر یہ لیجئے اپنے پیسے اور چلتے پھرتے نظر آیئے —— حضور اَن داتا! میرا روئے سخن آپ کی طرف ہے بٹلر صاحب۔ آپ کا بل بھی چکائے دیتا ہوں لیکن کبھی بھولا بھٹکا آپ کے یہاں چلا آؤں تو بھولئے گا نہیں۔ میرا نام مراری لال ہے مانک محلے کا مراری لال۔ یہ

لیجئے نو روپے ایک آنہ اور یہ چونی بخشش۔ آں ہاں! سلام کی ضرورت نہیں ــــ اور آپ کو چاہئے تین مہینے کا کرایہ۔ دیکھئے ایک مہینے کا تو اس وقت لے جائیے باقی پھر ادا ہو جائے گا۔ زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔ ایک دو روز میں ہی کوئی نہ کوئی قسمت کا مارا دعوت کے جھانسے میں ضرور یہاں آ پھنسے گا۔ گن لیجئے ستر روپے ہی ہیں نا۔ پانچ دس دس کے نوٹ ہیں اور بیس ایک ایک کے ــــ ہاں تو اب رہ گئے آپ! دیکھئے جناب، آپ کے ہری بابو کا زیور لوٹانا میرے بس کی بات نہیں۔ اگر میری بیوی زندہ ہوتی اور مجھے اس کے لئے کنگن ضرور گھڑانا ہوتا، تب بھی ہری بابو کے کنگن کا نمونہ اُتارنا میں کچھ زیادہ پسند نہ کرتا۔ لیکن اب جب کہ وہ ہے ہی نہیں اور زیور کی شکل میں نے نہیں دیکھی، تو آپ خود ہی غور فرمائیے، زیور لوٹانا کیسے ممکن ہے۔ اس کے باوجود اگر آپ نہیں مانتے تو آپ کے ہری بابو کے پاس مجھے جانا ہی پڑے گا ــــ لیکن کھانے کا سامان آتا ہے یا نہیں، یہ دیکھے بنا میں یہاں سے ایک قدم باہر نہیں نکالوں گا۔ آپ تھوڑی دیر اور بیٹھئے ...... اوہو ہو ...... اب تو بھگوان ہی ہے جو ...... چندر کانت ...... ابے او چندر کانت، نہ۔ نہ رے کیا نام تھا تمہارا؟ ہاں کمال! اجی او کمال تم کیا کر رہے ہو؟

کمال: جی مالش!

مراری: خوب! بہت ہی خوب!! اب صرف اسی چیز کی تو کسر رہ گئی تھی ــــ سنو، ڈنڑ بعد میں پیلنا پہلے میری بات سنو۔

کمال: جی۔

مراری: دیکھو، تم تو اپنے بابو کو پہچانتے ہو نا؟ سچ سچ بتاؤ وہ آج کل اور پرسوں، ان تین دنوں میں ہوٹل سے کب لوٹیں گے؟

کمال: جی آج تو شاید نہ لوٹیں گے۔

مراری: آج نہ لوٹیں گے۔ ٹھیک، بالکل ٹھیک! اتنی دیر کے بعد تمہاری صرف اس بات پر مجھے یقین آیا ــــ جو ہو، بڑی بھوک لگی ہے دوست! اب انتظار سے کچھ ملے گا نہ گالیاں بکنے سے ــــ لو یہ اٹھنی، اور اگر بازار سے کچھ کھانے کو لا دو تو جان بچے

مراری: (اپنے آپ سے) نوابی کرتا پھرتا تھا۔ کام دھندا کچھ ہے نہیں، نہ کوئی کاروبار نہ کہیں سے ٹکے کی آمدنی۔ ہم بھی کہیں، بابا! آخر اتنا خرچ چلتا کیسے ہے۔ یہ معلوم نہ تھا کہ ــــ لیکن روز روز گالیاں کھا کر، اتنے بل ٹال کر اتنے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا بھی تو کوئی آسان کام نہیں۔ اس سے تو ٹوکری ڈھونا اچھا ہے۔ اس کے بجائے کولہو چلانے میں زیادہ سکھ اس سے تو......

مراری: کیوں جی، لے آئے۔ کیا لائے ہو؟

کمال: چنے۔

مراری: چنے؟ صرف چنے؟

کمال: جی یہاں اور کچھ نہیں ملتا۔

مراری: کچھ پیسے بچے؟

کمال: جی نہیں۔

مراری: جی ہاں کیسے بچیں گے ــــ اچھا بھائی، لاؤ چنے ہی دو ــــ آہا، کمال! بھوک کی آگ میں یہ چنے امرت کا کام کر رہے ہیں۔ بہت دعوتیں کھائیں لیکن ایسا سُکھ اور سواد کہیں نہیں پایا ــــ لو، تم بھی چکھو۔

کمال: جی نہیں۔

مراری: جی کیوں نہیں۔ کمال کرتے ہو، کھاؤ، یہ لو ــــ اچھا دیکھو اب اگر کہیں سے کرایے پر ایک رکشا لا دو تو .....

کمال: جی رکشا یہاں نہیں ملتا۔

مراری: رکشا نہیں ملتا۔ دنیا کی کوئی چیز ایسی بھی ہے جو یہاں ملتی ہے، عجب مصیبت ہے۔ ان تھوڑے سے چنوں کے سہارے بھوکا پیاسا دو ڈھائی میل میں کیسے چل سکوں گا۔ ادھر سے تو دعوت کی امید پر پیدل چلا آیا تھا ــــ اوہ ــــ ابھی تو ہری بابو کے یہاں بھی جانا ہوگا ــــ کمال! آج تم نے مجھ پر بیسیوں احسان کئے ہیں۔ دب گیا ہوں تمہارے احسانوں تلے۔ اب اور کچھ نہیں چاہتا۔ صرف اس بھلے آدمی کو سمجھا دو کہ میں گلزاری

لال نہیں ہوں، مانکسہ محلے کا مراری لال ہوں۔

کمال: جی یہ میری بات نہیں مانیں گے۔

مراری: تمہاری بات نہیں مانیں گے؟ معلوم ہوتا ہے یہ بہت دنوں سے تمہیں جانتے ہیں۔ ورنہ ضرور جان لیتے۔ تمہاری تو پہلی ملاقات ہی دل اور دماغ دونوں پر بہت گہرا اثر چھوڑتی ہے — لیکن صاحب، میری جو حالت آپ دیکھ رہے ہیں، اس سے راستے میں اگر مجھے کچھ ہوگیا تو میرے کریا کرم کا بار آپ پر ہوگا — لیکن میں نے جو اتنی رقم دی ہے وہ کیسے وصول ہوگی؟ کوئی قیمتی چیز ہاتھ لگ جائے تو لے جاؤں — قیمتی چیزوں میں تو یہ ایک کمال ہی نظر آتا ہے لیکن یہ تو کل کو مجھی کو بیچ ڈالے گا — ایں، وہ کیا ہے ...... آہا ...... وارے نیارے ہوگئے۔ زنجیر بھی بڑھیا ہے۔ سنہری معلوم ہوتا ہے۔ گھڑی اور زنجیر دونوں لئے لیتا ہوں۔ کم سے کم دو سو کا مال تو ضرور ہوگا ...... کیوں بے کمال! اب کیا ہوا؟ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟

کمال: پولیس؟ پولیس آرہی ہے۔ بھاگئے۔

مراری: پولیس آرہی ہے۔ بھاگ جاؤں۔ کیوں؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو صرف ایک صاحب کے یہاں دعوت .... دہی دیکھ رہا ہوں۔ ابے او کمال کہاں بھاگ گئے تم؟ ہری بابو کے اس آدمی کو بھی نہیں دیکھ رہا — کیا سبھی رفو چکر ہوگئے۔

انسپکٹر: امرناتھ! پہنا دو ہتھکڑی۔

مراری: ہتھکڑی ہتھکڑی کیوں ...... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ مجھے کیوں ہتھکڑی پہنا رہے ہیں؟ — دیکھئے صاحب کہیں چوٹ لگ جائے گی۔ میں شریف آدمی ہوں کوئی چور ڈاکو نہیں

انسپکٹر: جی ہاں! یہ شریفوں ہی کے تو کارنامے ہیں۔

مراری: سنتری جی — میں نے کہا سنتری جی، چاہو تو مٹھائی کے لئے کچھ پیسے لے لو ...... ان صاحب ...... اگر آپ چوری کو پکڑنا چاہتے ہیں تو چلئے، میں آپ کو لئے چلتا ہوں جب سے جیل خانہ بنا ہے ایسا چور وہاں نہ گیا ہوگا۔

انسپکٹر: ہونہہ! لے چلو امرناتھ!! حضرت کس ٹ ان سے جیون لال کے دستخط کر کے ہیملٹن کی دوکان سے گھڑی اڑا لائے اب جیل کی ہوا کھائیں گے تو دماغ ٹھکانے پر آجائے گا۔

مراری: جیل کی ہوا — ہیملٹن کی دوکان — جیلی دستخط۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں — اوہ، ہو یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ زنجیر کو مت کھینچئے، یہ گھڑی میری نہیں۔ زنجیر ٹوٹ گئی، تو مصیبت پڑ جائے گی — اچھا، اچھا! اگر یہ گھڑی ہیملٹن ہی کی ہے تو لے جائیے۔ بڑے شوق سے لے جائیے۔ لیکن گھڑی کے ساتھ آپ مجھے کیوں کھینچتے ہیں۔ میں تو سونے کی زنجیر نہیں۔ میں تو یہاں دعوت کھانے ...... انسپکٹر صاحب .... سنتری جی ...... اجی او سنتری جی ....

(مرکزی خیال ماخوذ)

انور عنایت اللہ

افراد

سعید
تسنیم
ڈپٹی صاحب
ماں

(ڈپٹی صاحب کے ڈرائنگ روم میں — شام کا وقت ہے۔ سعید بیٹھا تاش کے پتوں سے جی بہلا رہا ہے — ماتک سے قریب تاش پھینٹنے کی آواز)

سعید۔ (دھیمے لہجے میں آپ ہی آپ) غلام — دہلا — اور یہ اٹھا — ہنہ — شاید یہ راؤنڈ بھی فضول جائے گی — نہ جانے یہ کم بخت اینٹ کی رانی کہاں ہے۔ (تاش کے پتے پھینٹنے کی آواز) — یہ پنجا — اور یہ ستا — اور — اور — بیچ مولا — بیچ — یہ — یہ نکلی رانی!! — (مایوس ہو کر) ہنہ!! کم بخت چڑیا کی ہے۔ شاید میری قسمت میں اینٹ کی رانی ہے ہی نہیں — یہ راؤنڈ بھی فضول ہی گئی!!! (تاش پھینٹنے کی آواز)

(قدموں کی چاپ — کوئی آرہا ہے.. دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز — سعید کے والد ڈپٹی صاحب داخل ہوتے ہیں)

ڈپٹی۔ خوب!!! — تو جناب یہاں بیٹھے ہیں!! — خدا ایسی نکمی اولاد دشمن کو بھی نہ دے۔

سعید۔ خدا کے لئے دروازہ اچھی طرح بند کر دیجئے ابا جان! — آج غضب کی ہوا چل رہی ہے۔

ڈپٹی۔ جی ہاں سعادت مند بیٹے! — بند کئے دیتا ہوں۔ اب میں اسی لائق تو رہ گیا ہوں کہ دن اور رات فرماں بردار

بیٹے کے احکام بجا لاتا پھروں ۔

سعید ۔ بھٹکے ہوئے بچے ہیں، ۔۔۔ اوہ ۔۔۔ خدا کے لئے خاموش بھی رہئے ابا جان !! یہ کم بخت رانی مجھ سے روٹھ گئی ہے ۔

ڈپٹی ۔ خوب !! ۔۔۔ تو اب سعادت مند بیٹے اپنے معاشقے سنا رہے ہیں بوڑھے باپ کو !! ۔۔۔ میں کہتا ہوں سعید ! کیا تو زندگی بھر یونہی نکما رہے گا ؟ تیرے ساتھ والے دو دو بچوں کے باپ ہوگئے ہیں اور تجھے اب بھی رانی ہی کی تلاش ہے !!

سعید ۔ آپ نے پھر مجھے غلط سمجھا ابا جان !! آپ کو یوں غلط نہ سمجھنا چاہئے ۔ مجھے رانی کی تلاش ضرور ہے لیکن اپنے لئے نہیں بلکہ اینٹ کے راجہ صاحب کے لئے ۔۔۔ میں "پیشنس" (Patience) کھیل رہا ہوں ابا جان !

ڈپٹی ۔ مجھے معلوم ہے برخوردار ! ۔۔۔ لیکن رونا تو یہی ہے کہ ساری زندگی تم نے پیشنس (Patience) کھیلتے ہی گذار دی ۔ نہ تمہیں کبھی اپنے مستقبل کا خیال آیا اور نہ کبھی تمہیں اس گھر کے دوسرے باشندوں کا ۔۔۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں ۔ مجھے اب آرام کی سخت ضرورت ہے ۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ بقیہ زندگی بھی مجھے یوں ہی گذارنی ہوگی ۔

سعید ۔ خدا نہ کرے ابا جان !! ۔۔۔ اس کا دکھ ہمارے پاس بہت کچھ ہے ۔ آپ کو تو آرام سے زندگی کے بقیہ دن گذارنے چاہئے ۔

ڈپٹی ۔ اب اپنی نصیحت بند کرو سعید ۔۔۔ بہت سن چکا ہوں !! ۔۔۔ میں آج صاف طور پر تم سے کچھ جاننا چاہتا ہوں ۔ کیا زندگی بھر یوں ہی وقت ضائع کرتے رہو گے ؟ تمہاری عمر کے نوجوان دو دو بچوں کے باپ ہوگئے ۔۔۔ !!

سعید ۔ (بات کاٹ کر) ۔۔۔ پھر آپ نے دو بچوں کا ذکر شروع کر دیا ابا جان ؟ ۔۔۔ چھوڑیئے بھی ان فضول سی باتوں کو ۔ اچھا یہ تو بتایئے کہ آج امی کہاں گئی ہیں ؟ ۔۔۔ آج انہوں نے آپ کو گھر پر کیسے چھوڑ دیا ؟

ڈپٹی ۔ (غصہ سے) اب تو چپ بھی رہے گا یا نہیں سعید ؟ سالا تو بہت زیادہ بدتمیز ہوگیا ہے ۔

سعید ۔ بھٹکے ہوئے بچے ہیں، اوہ ۔۔۔ اب آپ نے بھی شروع کر دی لیکچر بازی ؟ ۔۔۔ پچیس برسوں کے بعد امی نے آپ کو بھی مقرر بنا کر ہی دم لیا ۔۔۔ چچ چچ چچ ۔۔۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے ابا جان !! ۔۔۔

ڈپٹی ۔ میاں صاحبزادے ۔ تم بدتمیز ہی نہیں بلکہ منہ پھٹ بھی ہوگئے ہو ۔ غلطی میری ہے ۔ آج پچیس برسوں کے بعد مجھے تمہاری امی کی ذہانت اور دوراندیشی کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا ہے ۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی سعید !!!

سعید ۔ آخر میں نے کون سا گناہ کیا ہے جو آپ یوں مجھ سے ناامید ہوگئے ہیں ؟ میں دو گھنٹے سے تاش کھیل رہا ہوں ۔ یہ کوئی گناہ نہیں ۔ مجھے اینٹ کی رانی کی تلاش تھی ۔ یہ بھی کوئی گناہ نہیں ۔ میں نے امی کے بارے میں بڑی صاف گوئی سے اپنی رائے کا اظہار کیا ۔ یہ بھی کوئی گناہ نہیں ۔ پھر آخر بات کیا ہے ؟ ۔۔۔ آپ جب سے آئے ہیں یہی کہہ رہے ہیں کہ آپ کو مجھ سے اس کی امید نہ تھی اور اس کی امید نہ تھی !!

ڈپٹی ۔ بات صرف اتنی سی ہے صاحبزادے کہ آج صبح تمہاری امی نے تمہیں اس چمارن کے ساتھ دیکھ لیا ۔ بس پھر کیا تھا غضب ہوگیا ۔ چونکہ تم گھر سے غائب تھے ۔ اس لئے سارا غصہ مجھ پر اتارا گیا ۔۔۔ اگر تمہیں کسی سے دوستی کرنی ہے تو شوق سے کرو ۔ لیکن خدارا اپنے خاندان اور اپنے بوڑھے باپ کی عزت کا خیال رکھا کرو ۔ مجھے تمہارے ذوق پر فخر تھا ۔ لیکن اب دیکھ رہا ہوں کہ اس چمارن سے پینگیں بڑھا کر تم نے بدذوقی کی حد کر دی ہے ۔

سعید ۔ خدا کے لئے آپ بار بار طلعت کو چمارن چمارن نہ کہئے ۔ اس کے باپ کا جوتوں کا کارخانہ ہے ۔ اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ چمار ہیں ۔

ڈپٹی ۔ طلعت نام ہے اس کا ؟ ؟

سعید - ہاں ابا جان۔ اس کا نام طلعت ہے ــــ آپ خاموش میرا
منہ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اس نام نے آپ کے ذہن میں ماضی
کی بہت ساری بھولی بسری باتیں یاد دلا دیں؟ ــــ کاش
آپ طلعت کو قریب سے دیکھتے ابا جان۔ اس میں اور میری
مرحوم بہن میں کوئی فرق نہیں۔ وہی نام ویسی ہی شکل و صورت
ویسا ہی رنگ اور روپ ــــ باتیں کرنے کا انداز بھی وہی۔
میں آپ کو یقین دلاتا ہوں طلعت میری دوست ضرور ہے
لیکن میں نے ہمیشہ اسے اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے۔

ڈپٹی - مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے سعید۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ
تمہاری امی نہ جانے کہاں کہاں سے بہت ساری فضول سی
چیزیں دیکھ آتی ہیں، اور پھر سارا غصہ مجھ پر اتارتی ہیں۔ آج
میں نے لاکھ کہا کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا بچہ ایسا ذلیل
نہیں۔ ــ تو لگیں مجھی کو ڈانٹنے ــــ مجبوراً مجھے خاموش ہونا
پڑا۔ میں نے تو ایسی باتوں کو نہ کبھی اہمیت دی ہے اور نہ کبھی
دوں گا۔ لیکن آج وہاں تسنیم بھی موجود تھی۔ اس نے بھی تمہاری
امی کی ساری بکواس سن لی۔

سعید - تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے ابا جان ــــ وہ شوق سے سنا
کرے۔

ڈپٹی - (دھیمے پڑتے ہوئے) بھئی سعید ــ بات دراصل یہ ہے کہ ــ
اب میں کیسے کہوں تم سے! ــــ تمہیں تو معلوم ہی ہے تسنیم
میرے سب سے عزیز دوست کی واحد نشانی ہے ــــ
بستر مرگ پر میرے عزیز دوست نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ
میں تسنیم کو مرتے دم تک اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھوں گا۔
وہ بڑی ہو جائے تو کسی اچھے سے نوجوان سے اس کی شادی
کر دوں گا ــ سمجھے سعید؟؟

سعید - ہاں ہاں۔ سمجھ رہا ہوں ابا جان! ــ لیکن اس میں پریشانی
کی ایسی کون سی بات ہے؟ شہر میں پچاسوں اچھے نوجوان
موجود ہیں۔ کسی سے بھی تسنیم کی شادی ہو سکتی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ
ہے، خوب صورت ہے۔ ایک دولت مند گھرانے میں اس
کی پرورش ہوئی ہے۔ وہ یقیناً اپنے ساتھ بہت سارا روپیہ
لے جائے گی ــــ ایسی لڑکی کے لئے اچھے نوجوانوں کی
کمی نہیں ابا جان۔

ڈپٹی - (کھانس کر) تمہارا بھی خیال ہے کہ وہ خوب صورت ہے
سعید؟؟

سعید - (بڑی بے تکلفی سے) ہاں ہاں ابا جان۔ کافی جاذب نظر
ہے وہ ــــ لیکن آپ نے اگر دل کھول کر جہیز دیا تو کوئی بھی
اس سے شادی کے لئے راضی ہو جائے گا۔ دنیا شکل اور
صورت نہیں دیکھتی، چال چلن نہیں دیکھتی، علم اور ہنر نہیں
دیکھتی، وہ تو بس یہ دیکھتی ہے کہ فلاں لڑکی لائے گی کیا
اپنے ساتھ۔

ڈپٹی - تم ٹھیک کہہ رہے ہو سعید ــــ مجھے تم سے یہی امید تھی۔
تم نے آج صاف گوئی سے اپنے خیالات کا اظہار کر کے
میرے دل سے ایک بڑا بوجھ ہٹا دیا۔ سعادت مند بیٹے ایسے
ہی ہوتے ہیں۔ (رازدارانہ لہجے میں) ــ وہ بھی تجھے بہت
پسند کرتی ہے سعید۔

سعید - مجھے پسند کرتی ہے؟ اوہ ــ اب سمجھا میں ــ اب کی آپ
کو سراسر غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تسنیم کو ایک اچھی لڑکی ضرور
سمجھتا ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس سے شادی
کے لئے تیار رہوں۔

ڈپٹی - (غصے سے) تو بک چکا سعید؟ تیری امی صحیح کہا کرتی ہیں۔
میرے لاڈ اور پیار نے تجھے منہ پھٹ بنا دیا ہے۔

سعید - آپ خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہیں ابا جان ــــ آج کل آپ
بالکل امی کے مخصوص انداز میں گفتگو کرنے لگے ہیں۔ یہ آپ
کی صحت کے لئے بے حد مضر ہے۔ سنا ہے اس سے ہاضمہ
بہت جلد بگڑ جایا کرتا ہے ــــ

ڈپٹی - میں یہاں سنجیدگی سے ایک ضروری مسئلہ پر بات چیت کرنے
کی کوشش کر رہا ہوں اور سعادت مند بیٹے اپنی امی اور ابا
کا مذاق اڑا کر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ تجھے اس مسئلہ کی

اہمیت کا اندازہ نہیں، سعید۔ ورنہ تو ایسی طفلانہ حرکتیں نہ کرتا ـــــ میں تو تسنیم کے ساتھ تیری شادی مقرر بھی کر دی سعید!!

سعید۔ (حیرت سے) اباجان ؟؟؟

ڈپٹی ۔ ہاں سعید۔ اس کی خبر سوائے تسنیم کے اور کسی کو نہیں۔ تمہاری امی کو بھی اس کی خبر نہیں۔ ارادہ تھا تم سے پہلے گفتگو کروں تو پھر رات کے کھانے کے بعد تمہاری امی کو یہ خوشخبری سناؤں۔ تم تو اس سے واقف ہی ہو کہ دن اور رات کے چوبیس گھنٹوں میں یہی وہ وقت ہے جب تمہاری امی کا دماغی توازن کچھ ٹھیک رہتا ہے۔ مجھے تو صرف تمہاری رضامندی کی فکر تھی۔ ورنہ بیگم کو تو اس رشتے سے انکار نہ ہوگا۔ (دراز دوار [illegible] بجے ہیں) ویسے تسنیم تو یہی سمجھے بیٹھی ہے کہ یہ سلسلہ تمہاری طرف سے شروع ہوا ہے۔

سعید۔ میری طرف سے شروع ہوا ہے ؟؟ ـــــ میں نے آج تک ایسی فضول سی باتیں نہیں سنیں۔ میں نے شاید تسنیم کی ذہانت کا غلط اندازہ لگایا تھا۔ ایسی حماقت کی باتیں اُس کے ذہن میں آئیں کیسے ؟

ڈپٹی ۔ اس کے ذہن میں خود بخود نہیں آئیں، بلکہ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔

سعید۔ (حیرت سے) آپ نے ؟؟ ـــ آپ نے اُس پر ادر مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ اباجان ـــــ مجھے یہ شادی منظور نہیں۔

ڈپٹی ۔ تیرا دماغ تو نہیں چل گیا سعید؟ ـــــ وہ یہ ہتک برداشت بھی کر سکے گی ؟؟

سعید۔ اگر برداشت نہیں کر سکے گی تو میں کیا کروں ؟ آپ کی یہ عجیب عجیب سی حرکتیں آج تک میری سمجھ میں کبھی نہیں آئیں ؟

ڈپٹی ۔ اب میں کچھ سننے کے لئے تیار نہیں سعید۔ ـــ تجھے یہ شادی کرنی ہی ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ میں نے سوچا کہ اس شادی ہی سے میری اور تسنیم کے مرحوم والد کی دوستی کے بندھن اور مضبوط ہو جائیں گے۔ تسنیم میرے مرحوم دوست کی نشانی ہے۔ میں اسے اپنی بہو بنا کر دم لوں گا۔

سعید۔ بیٹی بنا کر آپ کا دل نہیں بھرا، تو اب آپ اسے بہو بنانے کی فکر میں ہیں ؟ ـــــ شادی میری ہو رہی ہے اور مجھے یہ شادی منظور نہیں۔

ڈپٹی ۔ (غصہ سے) اس شادی سے انکار کر کے نہ صرف تو نے تسنیم کو ذلیل کیا ہے بلکہ میرے منہ پر بھی ایک زوردار طمانچہ لگایا ہے۔ میں آج تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ تو میرا سعادت مند بیٹا ہے۔ تجھے اپنی خوشی سے زیادہ میری خوشنودی کا خیال ہے۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ اس گھر میں میری کوئی وقعت نہیں ـــــ تیرے جو جی میں آئے کر سعید۔ صرف اتنا یاد رکھنا کہ اگر میری معصوم بچی نے اس صدمے کی تاب نہ لا کر جان دے دی تو ایک نہیں بلکہ دو انسانوں کا خون تیری گردن پر ہوگا۔

سعید۔ خدا کے لئے میری سنئے اباجان !!!

(لیکن باپ رُکتا نہیں۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلا جاتا ہے۔ قدموں کی چاپ۔ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)

سعید۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) چلے گئے۔ میری سنے بغیر چلے گئے۔ اُف اباجان !! ـــــ اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ مجھے تسنیم سے نفرت نہیں۔ بخدا مجھے نفرت نہیں !!! ـــ تسنیم مجھے کتنی عزیز ہے اس کا اندازہ آپ زندگی بھر نہ لگا سکیں گے ـــــ (مختصر سا وقفہ) ـــــ آؤ میری رانی !! تمہاری تلاش پھر سے شروع کر دوں ـــــ (ماچس کے قریب تاش پھینٹنے کی آواز) ـــــ ساری زندگی منزل کی تلاش میں گذری۔ اور جب کافی عرصہ تک تاریکیوں میں بھٹکنے کے بعد دور منزل کی دھندلی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آئی تو کسی نے سرگوشیوں میں کہا۔ پاگل ! یہ منزل نہیں سراب ہے۔ تیری منزل تو خود راستے سے بھٹک گئی ہے۔ (تاش پھینٹنے

کی آواز) —— یہ دہلا —— یہ یکّا —— اور یہ رانی ——
چلو اچھا ہی ہوا جو رانی جلد آگئی، ورنہ یہاں تو اپنی زندگی میں رانی کے داخلے کی کوئی اُمید نہیں، کوئی آس نہیں —آپ بھی کتنے سادہ لوح ہیں ابا جان۔ امی کو تسنیم کی شکل سے نفرت ہے اور آپ اسے اپنی بہو بنانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے ایک معصوم کے دل میں میری محبت کی چنگاری تو پیدا کردی لیکن یہ نہیں سوچا کہ جب یہ چنگاری شعلہ میں تبدیل ہوجائے گی تو امی اسے ایک ہی تھپیڑے سے گل کردیں گی —— اور میاں سعید! تم یہ سب خاموش بیٹھے دیکھ رہے ہو۔ لیکن تم سے اس کے خلاف بولا نہیں جاتا۔ تم سے ہلا نہیں جاتا۔ بس ایک بے جان بُت کی طرح بیٹھے دنیا کا منہ تک رہے ہو۔

(تاش کے پھینٹنے کی آواز —— قدموں کی چاپ ——
دروازہ کھلنے کی آواز —— تسنیم داخل ہوتی ہے)

تسنیم۔ معاف کیجئے گا اباجان!! —— مجھے —— ڈپٹی صاحب کی جگہ سعید کو دیکھ کر رُک جاتی ہے) —— اوہ آپ؟ —سعید بھائی؟ اباجان کہاں ہیں؟

سعید۔ اباجان شاید باغیچے میں ہوں گے تسنیم۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ یہیں تھے۔

تسنیم۔ تو میں اُن سے باغیچے ہی میں مل لوں گی۔ (وہ جانے کے لئے مڑتی ہے)

سعید۔ ذرا ٹھہرو تسنیم۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ آج امی بھی گھر پر نہیں ہیں —— تم بیٹھ جاؤ نا۔

تسنیم۔ مجھے اباجان سے ابھی فوراً ملنا تھا سعید بھائی۔

سعید۔ مجھ سے اتنی بیزاری تسنیم؟ ——

تسنیم۔ (دھیمے لہجے میں) مجھے غلط نہ سمجھئے سعید بھائی!! —— امی کو اگر یہ معلوم ہوگیا تو —— ؟؟

سعید۔ (ہنس کر) تو ان دنوں تم پر بھی امی کی خفگی کا بھوت سوار ہے تسنیم؟ —— یہ دیکھو میں اب تاش کے پتے رکھے دیتا ہوں۔

تسنیم۔ آپ کو یہ تاش کے پتے بہت پسند ہیں سعید بھائی؟ —میں نے ہمیشہ آپ کو ان ہی سے دل بہلاتے دیکھا ہے۔

سعید۔ تمہارے بیان میں کچھ تھوڑی سی ترمیم کی ضرورت ہے تسنیم۔ مجھے یہ تاش کے پتے عزیز ضرور ہیں لیکن اتنے عزیز نہیں کہ دن اور رات میں انہیں سے دل بہلاتا رہوں۔ دنیا میں دل بہلانے کی اور بہت سی چیزیں ہیں تسنیم۔

تسنیم۔ آپ صحیح کہہ رہے ہیں سعید بھائی۔ فضول قسم کے دوستوں کی محفل میں وقت گنوانے سے زیادہ بہتر تو یہی ہے، کہ ان بے جان پتوں کی صحبت میں وقت گذارا جائے۔

سعید۔ یہ تاش کے پتے میرے بہت پرانے ساتھی ہیں تسنیم۔ آج سے برسوں پہلے مجھے اپنے کمرے کی تنہائی میں خاموش بیٹھے تاش کے گھر بنانا بے حد عزیز تھا۔ میں اکثر تاش کے دومنزلہ سہ منزلہ مکانات بنایا کرتا، اور پھر ان کی خوب صورتی پر گھنٹوں غور کیا کرتا۔ لیکن بعد کو کچھ سمجھ آئی تو میں نے سوچنا شروع کیا —— یہ تاش کے گھر کتنے ناپائدار ہوتے ہیں۔ ذری سی ہوا چلی کی اڑا —— ٹرا —— ٹرا —— دھم!! سارے کے سارے دھم سے زمین پر آرہے —— (ٹھنڈا سانس لے کر) یہ ہمارا اونچا پورا بنگلہ بھی تو تاش ہی کا گھر ہے تسنیم، جس کی بنیادیں اب اتنی کھوکھلی ہوگئی ہیں کہ ہوا کا ایک کمزور سا جھونکا بھی اسے زمین پر لے آئے گا۔

تسنیم۔ آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں سعید بھائی۔ مجھے پتہ ہے آپ ایسی باتیں کبھی سنجیدگی سے نہیں کیا کرتے۔ لیکن پھر بھی اگر یہ باتیں امی کے کانوں تک گئیں، تو وہ بے حد خفا ہوں گی۔

سعید۔ اب یہاں امی کی خفگی کا کسے خیال ہے تسنیم!! یہاں رونا تو صرف اسی بات کا ہے کہ دنیا نے آج تک مجھے سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ میری ہر بات کو مذاق سمجھا گیا۔ ہوسکتا ہے آج سے پہلے میں نے ایسی باتیں یوں ہی باتیں

بنانے کی خاطر کی ہوں۔ لیکن آج میں پوری سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہوں تسنیم !!۔۔۔

تسنیم ۔ (دھیمے لہجے میں) مجھے یقین ہے سعید بھائی !!

سعید۔ آج میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تسنیم۔ اگر میرے متعلق تمہارے دل اور دماغ میں کبھی کچھ عجیب سے خیالات آئیں تو یہ نہ بھولنا کہ انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی زبان سے وہ سب کچھ ادا کر سکے جو اس کے دل میں ہے۔ دل کی باتیں تو اسی لئے ہوتی ہیں کہ انہیں تا عمر دل کی گہرائیوں میں دفن رکھا جائے۔

تسنیم ۔ (دھیمے لہجے میں) میں ایک بات پوچھوں سعید بھائی ؟ ۔۔۔ یہ آج یکایک آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں۔

سعید۔ (جلدی سے) خدارا مجھے غلط نہ سمجھو۔ ہم آج تک بہت اچھے دوست رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی بھی غلط فہمی کی بنا پر ہماری یہ دوستی کے بندھن ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ جائیں۔ اگر خدانخواستہ کبھی ایسا ہوا تو مجھے بے حد صدمہ ہوگا تسنیم۔

تسنیم ۔ خدا نہ کرے جو کبھی ایسا ہو سعید بھائی۔

ماں ۔ (عقب میں ۔۔۔ مائک سے دور) ارے فضلو !! ۔۔۔ او فضلو ! ۔۔۔ نہ جانے یہ کم بخت ملازم کہاں مر جاتے ہیں !!

سعید۔ (جلدی سے) امی آگئی ہیں تسنیم !!

تسنیم ۔ میں چلتی ہوں سعید بھائی !! ۔۔۔

(قدموں کی چاپ ۔۔۔ دروازہ کھولنے اور بند ہونے کی آواز ۔۔۔ وہ چلی جاتی ہے)

سعید۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) گئی ۔۔۔ وہ بھی گئی ۔۔۔ آؤ میرے تاش کے پتو ۔۔۔ اب تم ہی میرے دوست ہو۔ تم ہی میرے ہمدم۔ جب دنیا کی ساری ہمدردیاں میرے لئے ختم ہو جائیں گی۔ تو اس وقت بھی میں تمہاری ہی آغوش میں پناہ لوں گا (مائک سے قریب تاش پھینٹنے کی آواز ۔۔۔ قدموں کی چاپ ۔ دروازہ کھلنے کی آواز ۔۔۔ ماں داخل ہوتی ہے)

ماں ۔ (طنزیہ لہجے میں) تو یہاں بیٹھے ہیں صاحبزادے !!

سعید۔ آپ نے آج بہت دیر کر دی امی ؟ ۔۔۔ ابا آپ کو ڈھونڈ رہے تھے۔

ماں ۔ جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ میں ان سے باغیچہ میں مل کر آ رہی ہوں ۔۔۔ لیکن میں پوچھتی ہوں سعید۔ کیا تم دونوں باپ بیٹوں نے یہ مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ خاندان کی رہی سہی عزت خاک میں ملا کر دم لو گے ؟ صاحبزادے بیٹھے ہیں کہ ایک چمارن کے دیوانے ہو رہے ہیں، اور بوڑھے باپ ہیں کہ ایک ایسی بد نصیب لڑکی کو بہو بنانے کے منصوبے باندھ رہے ہیں جس کے ماں باپ کا کوئی پتہ نہیں !!

سعید۔ (حیرت سے) امی ۔۔۔ ؟؟؟

ماں ۔ ہاں ہاں۔ تم صرف یہیں بیٹھے امی امی کی رٹ لگاتے رہو۔ تمہیں کیا۔ دنیا تمہارے والدین کے منہ پر تھوکے، یا تمہارے خاندان کو حقارت سے دیکھے۔ تمہیں تو ان موئے تاش کے پتوں سے فرصت ملے تب نا ۔۔۔ جب دیکھو یہ تاش کے پتے ہیں اور یا پھر اس چمارن کا گھر ہے۔

سعید۔ خدا کے لئے آپ خاموش ہو جائیے امی !! ۔۔۔ نہ جانے طلعت نے آپ لوگوں کا کیا بگاڑا ہے جو آپ سب اُسے یوں چمارن چمارن کہہ کر ذلیل کر رہے ہیں۔

ماں ۔ (تیز لہجے میں) میں بہت سن چکی صاحبزادے، اور میں نے اب تک برداشت بھی بہت کیا۔ لیکن اب کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے اس طلعت کی بچی سے ملنا جلنا بند نہ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میں نے تمہارے ابا سے بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اب اگر انہوں نے کبھی ایک ایسی لڑکی کو بہو بنانے کا ارادہ ظاہر کیا جو ہمارے ٹکڑوں پر پلی ہے، اور جس کے والدین کا کوئی پتہ نہیں، تو نہ صرف وہ مجھے اپنا مخالف پائیں گے بلکہ سارے خاندان کو اپنا دشمن پائیں گے ۔۔۔ کسی بات کی بھی حد ہونی چاہئے۔

سعید۔ خدا کے لئے آپ دھیرے بولیے امی ۔۔۔ شاید تسنیم اپنے

کمرے میں موجود ہے۔

ماں ۔ (غصہ سے بیخ کر) دھیرے بولوں؟ کیوں بولوں؟ کیا مجھے کسی کا ڈر ہے؟ میں تو اس چڑیل کے منہ پر کہوں گی کہ میں کسی کی ناجائز اولاد کو ہرگز اپنی بہو بنانے کو تیار نہیں۔

سعید ۔ خدا کے لئے امی!! ___ اس بے کس کے جذبات کا تو خیال کیجئے۔

ماں ۔ مجھے کسی کے جذبات وزبات کی پروا نہیں جس روز وہ اس گھر میں آئی تھی اسی روز میں نے تمہارے ابا سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اس کی پرورش ہمارے گھر میں ممکن نہیں لیکن تمہارے ابا کاہے کو میری سننے لگے۔ لیکن میں تمہیں صاف صاف بتائے دیتی ہوں سعید!! تسنیم اس گھر کی بہو ہرگز نہیں بن سکتی۔ کم ازکم میری زندگی میں تو نہیں بن سکتی سمجھے؟؟ ___

(وہ چلی جاتی ہے ___ قدموں کی چاپ ___ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز)

سعید ۔ (دھیمے لہجے میں) دنیا کے لوگ یوں ہی آتے اور جاتے رہیں گے اور میاں سعید! تم یوں ہی کٹھ پتلی کی طرح خاموش بیٹھے ان تاش کے بے جان پتوں سے جی بہلاتے ہوگے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں یہ خاموشی کب تک؟ بے حسی کب تک؟ ہاں سعید میاں آخر کب تک؟؟ ___ (انگڑائی لیتے ہوئے اٹھ کر) آہ ___ آہ ___ آہ ___ نیلے آسمانوں میں چاند مسکرا رہا ہے۔ دور تارے ٹمٹما رہے ہیں۔ باغیچے کے ہر غنچے سے مسرت اور آسودگی کی بو آرہی ہے ___ پر میں اداس ہوں۔ بے حد اداس ہوں!!!

تسنیم ۔ میں اندر آسکتی ہوں سعید بھائی؟

سعید ۔ (حیرت سے ___ چونک کر) ___ تسنیم؟ ___ آؤ بھئی! میرا تو خیال تھا کہ تم ابا جان کے ساتھ باغیچے میں ہو۔

تسنیم ۔ (دھیمے لہجے میں) میں وہیں سے آرہی ہوں سعید بھائی ___ میں آج آپ سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مجھے کسی اسکول میں ملازمت مل جائے؟

سعید ۔ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ لیکن تسنیم بیٹھے بٹھائے ایسے فضول قسم کے خیالات تمہارے دماغ میں آئے کیوں؟ جب تک ابا جان بقید حیات ہیں تمہیں ایسی باتیں سوچنی بھی نہیں چاہئے۔ بخدا اگر ابا جان کو معلوم ہوگیا۔ تو انہیں بے حد صدمہ ہوگا۔

تسنیم ۔ (گلوگیر آواز میں) اب آپ بھی مجھے بنانے کی کوشش کر رہے ہیں سعید بھائی؟ بدقسمتی سے میں ابھی کچھ دیر پہلے اپنے کمرہ میں تھی، اور میں نے آپ کی اور امی کی گفتگو سنی ___ میرے والدین کون ہیں سعید بھائی؟ کیا میں سچ مچ اپنے والدین کی ناجائز اولاد ہوں؟ آج تو میں ابا جان سے پوچھ کر ہی رہوں گی۔

(قدموں کی چاپ ___ دروازہ کھلنے کی آواز ___ ڈپٹی صاحب داخل ہوتے ہیں) ___

ابا جان!! (اضطراب بھرے لہجے میں) ___ میں کافی دیر سے آپ کی تلاش میں ہوں۔ میں اپنے ماضی کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہوں ابا جان۔

ڈپٹی ۔ (اضطراب بھرے لہجے میں) اب سمجھا میں!! ___ سعید! ذرا اپنی امی کو تو بلالا۔ ان کا مجھ سے جھگڑ کر جی نہ بھرا، تو اب انہوں نے یہ حرکت کی۔ میں نے اب تک بہت برداشت کیا سعید۔ میری اس خاموشی ہی کا نتیجہ ہے کہ اس گھر میں اب بہت ساری بے جا باتیں ہونے لگی ہیں ___ جا تو بلالا انہیں!!

(قدموں کی چاپ ___ ماں داخل ہوتی ہے)

ماں ۔ آپ یہاں بیٹھے ہیں، اور میں نے آپ کی تلاش میں سارا باغیچہ چھان ڈالا۔

ڈپٹی ۔ تم آگئیں بیگم؟ کیا تم نے آج تسنیم سے بھی گفتگو کر ڈالی؟

بیگم ۔ میری جوتی کو غرض پڑی تھی جو میں تسنیم سے اس سلسلہ میں گفتگو کرتی۔ میں نے صرف سعید سے صاف صاف کہہ دیا

تھا کہ اس کی شادی نہ اس طلعت کی بچی سے ہو سکتی ہے اور نہ تسنیم سے۔

ڈپٹی۔ (غصہ سے) سعید! تو کھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟ کہتا کیوں نہیں کہ تو تسنیم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟ اگر تجھ میں ذرا سا بھی مردانہ وقار ہے، تھوڑی سی بھی انسانیت ہے تو صاف صاف کہہ کہ مجھے تسنیم سے محبت ہے۔

تسنیم۔ (گھبرا کر) ابا جان ـــ!!!

سعید۔ اب مجھ سے صبر نہیں ہو سکتا ابا جان۔ آخر آپ لوگوں نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ میں پتھر کا ایک بے جان بت ہوں؟ شادی میری ہو رہی ہے۔ لیکن میری سنے بغیر آپ نے اور امی نے جھگڑنا شروع کر دیا۔ یہ جھگڑا صرف آپ دونوں کے درمیان ہوتا تو میں خاموش رہتا۔ لیکن اس جھگڑے کے درمیان بار بار ایک معصوم بے کس لڑکی پر، اس کی عزت پر، اس کے احساسات پر حملے کیے گئے۔ کیوں؟ آخر کس لئے؟ ـــ اگر اسے اپنے والدین کا پتہ نہیں، تو نشانِ ملامت وہ بنے؟ اگر اسے کسی اچھے نوجوان سے محبت ہے تو وہ گنہگار ہے؟؟

ماں۔ (غصہ سے) تو اب بہت بکنے لگا ہے سعید!!

سعید۔ کاش میں آج سے بہت پہلے بکنے لگتا امی۔ میری بکواس ایک معصوم لڑکی کی آج عزت تو بچا سکتی۔ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ اس منحوس چار دیواری میں، اس تاش کے گھر میں جس کی بنیادیں اب کھوکھلی ہو چکی ہیں، میں نے صرف ایک تماشائی بن کر زندگی گذاری۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میری خاموشی آج یہ دن دکھائے گی۔ میں آج آپ سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مجھے تسنیم سے محبت ہے، اور میری شادی تسنیم ہی سے ہوگی ـــ اور امی۔ آپ یہ بار بار ناجائز اولاد کا کیا ذکر لے بیٹھتی ہیں؟ آپ ماں بن کر بھی یہ نہ سمجھ سکیں کہ ایک ماں کے لئے اس کے تمام بچے جائز ہوتے ہیں؟؟

ڈپٹی۔ میں کہتا ہوں آج یہ ناجائز اولاد کا تذکرہ بار بار کیوں ہو رہا ہے سعید؟ کس بیوقوف نے تجھ سے کہہ دیا کہ تسنیم اپنے والدین کی ناجائز اولاد ہے؟ تجھے شاید یہ معلوم نہیں کہ تسنیم کے والدین کی شادی خاندان والوں کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی جب تسنیم کے باپ کا یہ طمانچہ شادی کے روپ میں خاندان والوں پر پڑا تو انہوں نے اپنی خفت مٹانے کی خاطر یہ مشہور کروا دیا کہ یہ شادی جائز نہیں۔

سعید۔ اگر یہ صحیح ہے تو آپ نے فوراً امی کے بیان کی تردید کیوں نہیں کی ابا جان؟؟ آدھ گھنٹے سے تسنیم نشانِ ملامت بنی ہوئی ہے اور حیرت ہے کہ آپ اب تک خاموش تھے۔

ڈپٹی۔ تردید کرتا؟ تمہاری امی کے کون کون سے بیانات کی تردید کروں؟ اب بڑھاپے میں شاید یہی ایک مشغلہ رہ گیا ہے میرے لئے۔ تمہاری امی نے تسنیم کے والدین سے متعلق جو کچھ کہا سراسر غلط ہے۔ انہوں نے ہمارے خاندان کی عظمت کے گن گائے۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہمارے دادا مرحوم نے یہ جائداد اپنے مرحوم بھائی کے نابالغ بچوں سے غبن کر کے حاصل کی تھی۔

ماں۔ (غصہ سے) یہ تو آپ کے دادا جان نے کیا ہوگا ـــ میں تو اپنے خاندان کی عظمت کے گن گا رہی تھی۔

ڈپٹی۔ (طنزیہ لہجے میں) خوب؟؟ ـــ تو اب تم اپنے خاندان کے بارے میں بھی سن کر ہی رہو گی؟ ـــ مجھے شاید نہیں معلوم ہے سعید۔ تیرے نانا مرحوم جوتے بیچا کرتے تھے۔ اب اگر میں ان کی دیانت داری کے قصے سناؤں تو تیری امی کے خاندان کی چپٹی ناک اور چپٹی ہو جائے گی۔

ماں۔ (غصہ سے) اب آپ میرے خاندان کے بارے میں فرضی قصے سنا رہے ہیں؟ ـــ چپٹی ہو گی آپ کے خاندان کی ناک، میرا خاندان تو سارے صوبے میں مشہور ہے۔

سعید۔ (بیزاری سے) اب چپ بھی رہئے امی۔ مجھے نہ آپ کے خاندان کی ناک سے دلچسپی ہے اور نہ ابا جان کے خاندان

(باقی صفحہ ۹۲ پر ملاحظہ فرمایئے)

ایک زینہ

ابراھیم یوسف

افراد تمثیل :-

ارشد :- ایک بیرسٹر

نزہت :- ارشد کی بیوی

اجد :- ایک پروفیسر

گلنار] ملازم
وحید]

منظر :- ارشد کا شاندار ڈرائنگ روم

وقت :- شام تقریباً ½ ۴ بجے

دور :- موجودہ

جب پردہ اُٹھتا ہے تو ارشد اِدھر اُدھر ٹہلتا ہوا نظر آتا ہو۔ گلنار اور وحید کمرہ کو صاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ارشد ایک میز کی طرف اشارہ کر کے۔

ارشد - یہ میز صاف کی ہے تم نے ؟ (وحید کے ہاتھ سے کپڑا لیکر خود صاف کرتا ہے) آنکھیں بند کر کے کام کرتے ہو۔ (کپڑا پھر وحید کو واپس کرتا ہے) اچھلو جلدی کرو۔ (گلنار کی طرف دیکھکر) اور آپ کیا کر رہی ہیں۔ بیگم صاحبہ۔ دن بھر چیخو مگر آپ کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

گلنار :- سرکار آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ اب کام ہو تو رہا ہے

ارشد :- کب سے کمرہ کی صفائی ہو رہی ہو اور ابھی تک ختم نہیں ہوئی حالانکہ صبح ہی سے ہدایات دے دی تھیں۔ (بیچینی سے کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے) پھر

ایک صوفے کی طرف اشارہ کرکے، یہ ملاحظہ ہو۔ بالکل آنکھوں پر پٹی باندھ کر کام کرتے ہو (سگریٹ کاٹن اٹھاکر سگریٹ نکالتا ہے۔ وحید ایک سگریٹ کاٹن اٹھالاتا۔ وحید کمرہ سے نکل جاتا ہے) گلنار تو جاکر اپنی بیگم صاحبہ کو تو بھیجدے (گلنار بھی کمرہ سے نکل جاتی ہے ارشد کمرہ میں ٹہلنے لگتا ہے پھر بلند آواز سے) گلنار۔ (گلنار) کیا سانپ سونگھ گیا؟

(نزہت کمرہ میں داخل ہوکر)

نزہت: آپ تو چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔ مجھ سے فرمائیے کیا کام ہے۔ آخر بیچاری کو دو چار منٹ دم تو لینے دیا کیجئے۔

ارشد: آپ ہی نے ان لوگوں کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ جا بے جا طرفداری کیا کرتی ہیں۔

(گلنار کمرہ میں داخل ہوکر)

گلنار: جی فرمائیے سرکار

ارشد: کیا مرگئی تھی یا وحید کے ساتھ لیلے مجنوں شروع کر دیا تھا دیکھ غسلخانہ میں نہانیکا انتظام ہے؟

چل بھاگ یہاں سے۔

(گلنار کمرہ سے نکل جاتی ہے۔ وحید داخل ہوکر سگریٹ کاٹن دیتے ہوئے)

وحید: سرکار آپ کا فون

ارشد: (سگریٹ کاٹن لیکر) اچھا۔ (کمرہ سے نکل جاتا ہے، کمرہ میں خاموشی رہتی ہے، نزہت کمرہ کا سامان ادھر ادھر برابر کرنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد ارشد واپس آکر وحید سے) آپ یہاں کھڑے کیا تیر مار رہے ہیں چلئے اپنا کام کیجئے۔ (وحید کمرہ سے نکل جاتا ہے نزہت سے مخاطب ہوکر) بیگم سلطان کا فون تھا۔ آج ان کے یہاں ڈانس ڈنر ہے۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) لیکن میں نے معذرت چاہ لی ہے۔

نزہت: (مسکراکر) آخر ایسے کہاں کے لاٹ صاحب تشریف لا رہے ہیں جن کیلئے یہ اہتمام ہو رہا ہے؟

ارشد: پروفیسر ماجد

نزہت: پروفیسر ماجد۔ (کچھ دیر سوچتی ہے) نام تو کئی مرتبہ سنا ہے چلو ان کے درشن بھی ہو جائیں گے۔

ارشد: کالج میں عرصہ تک میرا اس کا ساتھ رہا ہے۔ بلا کا ذہین ہے یہ سات سال کے بعد اس سے ملاقات ہوگی۔ میرا سب سے اچھا دوست ہے (مسکراکر) مجھے اس سے صرف یہ شکایت رہتی تھی کہ وہ کالج میں سب عزت خود ہی ہضم کر لیتا تھا۔

نزہت: (دلچسپی لیتے ہوئے مسکراکر) اچھا۔

ارشد: ہاں اس نے ہر میدان میں مجھے شکست دی ہے یہاں تک کہ ہم دونوں جس لڑکی سے محبت کرتے تھے وہ اس کو بھی جیت کر لیگیا۔ (مسکراکر) مگر آج میری شان و شوکت دیکھکر ضرور رعب کھا جائیگا۔

(نزہت کا چہرہ دیکھکر) اچھا جاؤ اب تم لباس تبدیل کرلو

نزہت: (مسکراکر) دوست آپ کے آرہے ہیں بھلا مجھے دلہن بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ میری نمائش تو رہنے ہی دیجئے۔

ارشد: بہت خوب! وہ آپ کا حلیہ دیکھکر کیا کہیگا کہ آپ جیسے ملک کے مایہ ناز بیرسٹر کی رفیقۂ حیات اور جب میں شاندار الفاظ میں آپ کا تعارف کراؤنگا تو اس کے چہرہ پر وہی مخصوص مسکراہٹ آئیگی جس سے مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اچھا جاؤ فوراً لباس تبدیل کرلو۔ (مسکراکر) وہی کاسنی ساڑی۔ (موٹر کا ہارن بجتا ہے تیزی سے دروازہ کی جانب جاتے ہوئے) یہ لو وہ آہی گیا۔ (کمرہ سے نکل آتا ہے، نزہت ایک صوفے پر بیٹھ جاتی ہے کچھ دیر بعد ارشد ماجد کو لیکر داخل ہوتا ہے اور نزہت سے تعارف کراتے ہوئے)

نزہت: یہ ہیں میرے عزیز دوست پروفیسر ماجد

(نزہت کھڑی ہوتی ہے دونوں کی نظریں چار ہوتی ہیں۔ نزہت تعجب سے)

نزہت: ارے آپ ــ

ماجد: اوہ۔ اسنو وائٹ (مسکراکر) آداب

ارشد: اچھا تو گویا آپ دونوں ایک دوسرے کو پہنچانتے ہیں۔ بیٹھو کھڑے کیوں ہو؟

ماجد: (ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے) یوں سمجھو بچپن کے ساتھ کھیلے ہوئے ہیں۔ سولہ سترہ سال پڑوس میں رہے ہیں۔ پھر یکایک ایسی غائب ہوئیں کہ (مسکراکر) آج درشن دے رہی ہیں۔

ارشد: اچھا بھئی ماجد تمہارے آنیکا تار ملا تو میں خوشی سے پاگل ہوگیا۔ کہو نسیمہ تو اچھی ہے۔

(مسکراکر نزہت سے، ہم دونوں ایک ہی لڑکی سے محبت کرتے تھے (ماجد سے مخاطب ہوکر)

خوب تھی وہ بھی۔ تم اس کو ساتھ کیوں
نہیں لائے۔ سُنا ہے تمہاری خانگی زندگی
کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے۔

ماجد:۔ نسیمہ۔ (ٹھنڈی سانس بھر کر) اس کا تو تین سال ہوئے
انتقال ہوگیا۔

ارشد:۔ انتقال ہوگیا! مجھے یہ سن کر دکھ ہوا۔ (سگریٹ کا کش
لیکر) مگر ماجد! میں شادی کے معاملے میں بڑا خوش قسمت رہا۔

ماجد:۔ (مسکرا کر) تو اب میری مبارکباد قبول کرو۔

ارشد:۔ شکریہ! (بلند آواز سے) گلنار۔ او گلنار

گلنار:۔ (داخل ہوکر) جی سرکار

ارشد:۔ نہانے کا انتظام ہے؟

گلنار:۔ جی ہاں سرکار

ارشد:۔ کہو ماجد پہلے نہاؤ گے یا چائے پیو گے۔ میرا خیال ہے پہلے
چائے پی جائے (نزہت سے) ذرا آپ چائے کا انتظام کیجئے (نزہت
اور گلنار کمرہ سے نکل جاتی ہیں) بھئی ہماری بیوی بھی خوب عورت ہے۔
کشمیر میں محبت ہوئی اور وہیں شادی۔ کلب میں ایک اچھی ساتھی، زندگی
کی راہ میں ایک بہترین ہمسفر۔ تین سال سے کلب کی آنریری سکریٹری ہے
دو سال تو بلا مقابلہ کامیاب ہوئی ہے ـــ تم نے مگر نسیمہ کے ساتھ
خوب نباہ کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالکل گھریلو قسم کی عورت نکلی۔ زندگی
کیا خوشگوار رہی ہوگی۔

ماجد:۔ (مسکرا کر) مگر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میری زندگی خوشگوار
نہیں رہی۔

ارشد:۔ مجھے ایسی ہی اطلاعات ملی تھیں کہ نسیمہ نے اپنے
چڑچڑے پن سے تمہاری زندگی اجیرن کردی ہے۔

ماجد:۔ (مسکرا کر) میری زندگی بیحد کامیاب رہی۔ اب میرا ایک
لڑکا اور ایک لڑکی ہے دونوں ذہین۔ خیر چھوڑو۔ میں اس وقت تمہارے
پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔

ارشد:۔ یہ کاروباری بات بعد میں ہوگی۔ اس وقت۔

ماجد:۔ (قطع کلام کرکے) مگر مجھے کل ہی واپس جانا ہے اس
لئے کہ۔

ارشد:۔ کل! ہرگز نہیں۔ میں تمہیں اس قدر جلد نہیں جانے
دوں گا۔

ماجد:۔ لیکن کلیم اور بلبل بیچین ہوں گے۔

(نزہت داخل ہوتی ہے اور اس کے پیچھے پیچھے
گلنار چائے لئے آتی ہے)

ارشد:۔ اچھا اچھا۔ دیکھا جائیگا ابھی تو چائے پیو۔

(نزہت چائے بنا کر ماجد کی طرف بڑھاتی ہے جو
اس وقت کسی گہری سوچ میں ہے)

نزہت:۔ کیا سوچ رہے ہیں آپ؟

ماجد:۔ ہیں! ـــ (مسکرا کر) ویسے گذرا زمانہ یاد آگیا تھا۔ جب آپ
اسکول جایا کرتی تھیں۔ کہئے اب بھی آپ کو جمیل یاد آتا ہے۔

نزہت:۔ (مسکرا کر) ہاں۔ عرصہ کے بعد گذشتہ سال اس سے کشمیر میں
ملاقات ہوئی تھی۔ کہہ رہا تھا کسی فلم کمپنی میں ہے۔

ماجد:۔ اسے بچپن ہی سے ڈراموں سے شوق تھا۔

ارشد:۔ (مسکرا کر) یہ جمیل صاحب کون بزرگ ہیں؟ آپ نے پہلے
کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔

نزہت:۔ یہ ہمارا مشترکہ دوست تھا۔ بیحد شریر۔ لڑکیاں تو اس
کی شکل سے بیزار رہتی تھیں۔

ماجد:۔ میرا اس کا کافی عرصہ ساتھ رہا۔ (مسکرا کر) آؤ دیکھتا تھا نہ تاؤ
بس فوراً عاشق ہو جاتا تھا۔

ارشد:۔ نزہت! تم لباس تبدیل کرو۔ کیا کلب نہیں چلنا۔ ماجد کا وہاں
کے افلاطونوں سے تعارف کرائیں گے۔

نزہت:۔ تعارف تو کل بھی ہو سکتا ہے۔ ہم ان کو چائے پر بلالیں گے
آج سنیما کا پروگرام کیسا رہیگا۔

ارشد:۔ ہاں ہاں سنیما چلئے۔ تو جائیے آپ لباس تبدیل کیجئے۔

(نزہت اُٹھ کر چلی جاتی ہے کچھ دیر خاموش رہتی
ہے ماجد سگریٹ جلا کر کش لیتا ہے۔ پھر ارشد
سے مخاطب ہوکر)

ماجد:۔ ارشد مجھے تم سے ایک بہت ہی ضروری کام تھا۔

ارشد:۔ اماں رہنے بھی دو۔ کچھ دیر آرام کرو پھر دیکھا جائیگا۔

ماجد:۔ مجھے ہر حالت میں کل واپس جانا ہے (سگریٹ کا کش
لیکر) میرے چھوٹے بھائی نے اس سال "لا" کر لیا ہے۔

ارشد:۔ اچھا ـــ

ماجد:۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ ایک اچھا اور کامیاب وکیل بن جائے میرا ارادہ اسے یورپ بھیجنے کا تھا مگر مالی حالت اجازت نہیں دیتی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے ساتھ کچھ روز کام کرے تاکہ اس پیشہ کی نکات کو سمجھ سکے۔

ارشد:۔ اس کو لا پڑھا کر تم نے زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ اس پیشہ میں اب جان نہیں۔ وکیلوں کی تعداد حشرات الارض کی طرح پھیلتی جارہی ہے۔

ماجد: لیکن انسان اگر محنت سے کام کرے تو وہ اپنا راستہ خود پیدا کرلیتا ہے۔ اور پھر وہ تو بیحد ذہین ہے۔

ارشد:۔ ہر شخص ایسی ہی خوش فہمیوں میں مبتلا رہتا ہے۔ پریکٹس شروع کرانے سے بہتر ہے کہ تم اس سے تجارت کراؤ۔

ماجد:۔ اس کا رجحان تجارت کی طرف نہیں ہے، اور تجارت کیلئے روپے کی ضرورت ہے۔ میری خواہش ہے کہ وہ اس پیشہ میں نام و شہرت حاصل کرے۔

ارشد:۔ تم اپنی خواہش کی اسٹیک پر اسے لگا رہے ہو۔ میں تمہاری خواہش پر اس کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہتا۔

ماجد:۔ لیکن تمہیں اس پر کیا اعتراض ہے کہ وہ چند دن تمہارے ساتھ کام کرے۔

ارشد:۔ اس لئے کہ مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ اس پیشہ میں ناکام ہو کر نوجوان اسکول کی ماسٹری کرتے پھرتے ہیں۔

ماجد:۔ میرا خیال تھا کہ تم میری اس خواہش کو بخوشی قبول کرلوگے مجھے تم سے ایسی توقع نہیں تھی۔

(نزہت داخل ہوتے ہوئے)

نزہت:۔ کیا توقع نہیں تھی؟

ارشد:۔ کچھ نہیں ـــ آپ نے وحید اور گلنار کو ہدایات دیدیں کہ ہم کھانا سینما سے آکر کھائیں گے۔ (ماجد سے) ماجد! تم جلد نہا کر لباس تبدیل کرلو

(ماجد چند سیکنڈ سوچتا ہے اور دھیرے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی رہتی ہے۔ ارشد فاتحانہ مسکرا کر)

ارشد:۔ ماجد کے بھائی نے "لا" پاس کر لیا ہے۔

نزہت:۔ (صوفے پر بیٹھتے ہوئے) اچھا! واجد نے! جب ہم پڑوسی تھے تو وہ بالکل چھوٹا تھا۔

ارشد:۔ ماجد چاہتا ہے کہ وہ کچھ روز میرے ساتھ کام کرے تاکہ پیشہ کی نکات کو سمجھ سکے۔

نزہت:۔ بڑی خوشی کی بات ہے واجد بیحد ذہین اور ہنس مکھ ہے آپ اس سے مل کر بیحد خوش ہونگے

ارشد:۔ نزہت! میں اس قدر احمق نہیں ہوں کہ اپنی آستین میں خود ہی سانپ پال لوں، اپنی شہرت عزت اور دولت میں ایک حصہ دار پیدا کرلوں۔

نزہت:۔ (تعجب سے) لیکن ـــ

ارشد:۔ نوجوانوں کی ایک فوج میری طرف بڑھ رہی ہے۔ کیا میں اپنے ہتھیار ان کو سونپ دوں؟ ان کے عزائم بلند ہیں، جو میری دیواروں کو کسی وقت بھی کھوکھلا کرکے گرا سکتے ہیں۔

نزہت:۔ لیکن اگر آپ کسی نوجوان کو سہارا دے دیں تو اس میں حرج بھی کیا ہے؟

ارشد:۔ تم یہ چاہتی ہو کہ اس کو سہارا دینے میں میں خود دب جاؤں۔ خلوص اور جذبات کے کھوٹے سکوں میں میں اپنی قسمت نہیں بیچ سکتا۔

نزہت:۔ (کسی قدر برہم ہو کر) یہ خود غرضی ہے۔ آپ کو میری خاطر اس کی مدد کرنا پڑیگی۔

ارشد:۔ نزہت! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم نہیں جانتیں کہ میں نے ماجد سے کسقدر شکستیں کھائی ہیں۔ وہ آج میرا پیشہ ـــ خیر ـــ میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

نزہت:۔ مجھے آپ کی بزدلی پر دکھ ہو رہا ہے (کسیقدر غصہ سے) آپ ایسا سوچتے ہیں یہ کس قدر عجیب اور مضحکہ خیز ہے۔

(ماجد داخل ہو کر)

ماجد:۔ کیا گرما گرم بحث ہو رہی ہے۔ آپ لوگ ابھی تیار نہیں ہوئے۔

ارشد:۔ ابھی تیار ہوئے جاتے ہیں۔ نزہت تو تیار ہیں

ماجد:۔ ڈاکٹر شہناز بھی تو یہیں ہیں۔

ارشد:۔ ہاں ہاں ـــ کیا تم ان کو جانتے ہو۔

ماجد:۔ کیوں نہیں ـــ مجھے ہیگل اور مارکس کا درس انہی نے دیا تھا بھی ان سے ملے بنا واپس نہیں جاسکتا۔ کیا تمہارا تعارف نہیں ہے۔

ارشد:- ہے کیوں نہیں۔ تم فون یہاں سے گفتگو کرلو۔ اس عرصہ میں میں بھی تیار ہوا جاتا ہوں۔ فون میرے آفس میں ہے۔

ماجد:- ہاں ــــ میں فون کرکے ابھی واپس آتا ہوں۔

(جانے کے لئے مڑتا ہے)

ارشد:- ذرا جلدی کرنا۔ کہیں پکچر مس نہ ہوجائے ــ (ماجد کمرہ سے نکل جاتا ہے نزہت سے مخاطب ہوکر) آپ کو ماجد کا اس قدر خیال کیوں ہے؟

نزہت:- اس لئے کہ وہ میرا بہت پرانا دوست ہے۔ آپ سے بھی زیادہ پرانا!

ارشد:- (برہم ہوکر) تمہیں یہ کہتے شرم آنا چاہئے۔ ہماری مشرقی تہذیب میں ــــ

نزہت:- (قطع کلام کرکے) یہ مشرقی تہذیب کیا ہے؟ اس سے پہلے تو آپ کے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں سُنی۔

ارشد:- (غصہ سے) آپ مذہبی اور قانونی نقطہ نظر سے میری بیوی ہیں اس کو نہ بھولئے۔

نزہت:- (طنزیہ) بیوی! ــــ ایک بیوی اپنے شوہر سے کیا چاہتی ہے اور اسے کیا ملنا چاہئے کبھی آپ نے اس پر غور فرمایا۔

ارشد:- نزہت!

نزہت:- ہم ساتھ کھیلے کودے ہیں، ایک دوسرے سے محبت بھی کی ہے۔ وہ کچھ مانگ رہا ہے اس کو دے کر واپس کر دیجئے۔

ارشد:- واپس کردوں۔ ایک مرتبہ جبکہ میں جیت کے دروازہ پر آگیا ہوں۔ اس سے پھر ہار جاؤں۔

نزہت:- تم بہت غلط ہو ارشد بہت غلط۔ انتہائی کمزور۔ بہت اسے واپس کردو

ارشد:- میں اسے واپس نہیں کرسکتا۔ وہ میرا دوست ہے۔

(ماجد کمرہ میں داخل ہوکر)

ماجد:- ارے بھئی ارشد تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟

ارشد:- میں ابھی تیار ہوا جاتا ہوں۔ کیا ڈاکٹر سے گفتگو نہیں ہوئی؟

ماجد:- کیوں نہیں۔ انہوں نے کل صبح ہم سب کو چائے پر بلایا ہے

(سگریٹ جلاکر پینے لگتا ہے ارشد جاتے ہوئے)

ارشد:- میں ابھی آیا۔

(کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ چند منٹ خاموشی رہتی ہے ماجد نزہت کے پاس آکر)

ماجد:- ڈاکٹر شہباز سے تو آپ کی ملاقات اکثر ہوتی ہوگی؟

نزہت:- جی ہاں اکثر ــــ

ماجد:- (نزہت کو سر سے پیر تک دیکھکر) آپ کی آواز کیوں کانپ رہی ہے (نزہت کا چہرہ دیکھکر) آپ کی آنکھوں میں آنسو! آخر بات کیا ہے؟

نزہت:- کچھ نہیں ــ ویسے ہی ذرا کچھ ــــ

ماجد:- نزہت! تمہاری گھریلو زندگی خوشگوار نہیں ہے؟

نزہت:- جی نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ مجھے دکھ ہو رہا ہے

ماجد:- دکھ! کس بات کا دکھ؟

نزہت:- یہی کہ ارشد نے آپ کی بات نہیں مانی۔ وہ بہت کمزور اور بزدل ہے۔

ماجد:- (مسکراکر) تو اس میں تشویش کی کونسی بات ہے؟ (واحد کو آپ جانتی ہیں وہ بیحد ذہین ہے اپنا راستہ خود پیدا کرلیگا۔ مجھے تو کوئی دکھ نہیں ہوا۔

(دونوں خاموش ہوجاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد نزہت جیسے خود پر قابو پاکر)

نزہت:- آپ کے بچے کتنے ہیں؟

ماجد:- دو ــــ کلیم اور ببلی۔ کلیم کی عمر کوئی سات برس کی ہے اور ببلی کی بھی پانچ سال کے قریب دونوں بڑے حام سے بچے ہیں مگر بہت معصوم بیحد ذہین (مسکراکر) کہیں آپ میرے یہاں آئیں تو ان سے مل کر بیحد خوش ہوں گی۔

(ارشد بہت ہی ہیجانی انداز میں داخل ہوتا ہے اور نزہت سے مخاطب ہوکر)

ارشد:- لو بھئی نزہت مبارک ہو۔

نزہت:- (مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے) کہئے خیریت تو ہے، کس بات کی مبارکباد دی جارہی ہے

ارشد:- آپ پھر سکریٹری الیکٹ کرلی گئیں۔ مس انور نے بری طرح شکست کھائی ــ بھئی خدا کی قسم بڑی خوش قسمت ہو۔ ابھی مرزا نے فون پر مبارکباد دی ہے۔

نزہت: ۔خوش قسمت!

ارشد: (نزہت کا چہرہ دیکھکر جس پر افسردگی کے آثار ہیں) یہ خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟

نزہت: ۔ہاں خوش قسمتی کی انتہا ہے کہ میں کلب کی آنریری سکریٹری ہوں۔ اس سے زیادہ میرے اور آپ کے لئے اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ اور اگر میں اس قدر خوش قسمت نہ ہوتی تو میرے بچے ہوتے میں ان سے محبت کرتی اور ان کو اعلیٰ تعلیم دلواتی۔

ارشد: ۔آپ کے سوچنے کا انداز بھی کس قدر دلچسپ ہے۔ آپ ہی کی وجہ سے کلب میں رونق ہے۔

نزہت: ۔لیکن کلب میں ایسی خواتین بھی ہیں جن کی تمنائیں اور خواہشات مجھ سے زیادہ ہیں۔ اب ان کو موقع ملنا چاہئے (کھڑکی کے پاس کھڑی ہوتی ہے اور وہاں سے باہر پارک میں دیکھتے ہوئے) اگر میں نے ان کو موقع نہیں دیا تو وہ خود مجھے راستہ سے ہٹا دینگی۔

ارشد: ۔(تعجب سے) آپ کیا سوچ رہی ہیں

نزہت: ۔اپنی دانست میں صحیح سوچ رہی ہوں جو طوفان اُٹھ رہا ہے بہتر ہے کہ اس کے لئے میں راستہ صاف کر دوں۔ ورنہ وہ مجھے اپنے ساتھ اڑا کر لے جائیگا۔ میں اس عزت کو قبول کرنے کے لئے اب تیار نہیں ـــ (پلٹ کر ارشد کو دیکھکر) میں کل اپنا استعفیٰ بھیجدونگی۔

(خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگتی ہے ارشد کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر نزہت سے مخاطب ہو کر)

ارشد: ۔میرا خیال ہے کہ آپ اپنے فیصلہ پر ایک مرتبہ اور غور کریں۔ (نزہت کوئی جواب نہیں دیتی) آخر یہ حماقت کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے اس مرتبہ آپ کے انتخاب کیلئے کس قدر جد وجہد کرنا پڑی ہے۔

نزہت: ۔مجھے علم ہے ـــ میں چار سال سے مسلسل سکریٹری ہوں۔ اب دوسروں کو چانس ملنا ہی چاہئے۔

ارشد: ۔لیکن جو چیز اس قدر کوشش کے بعد حاصل کی گئی ہے اسے یوں چھوڑ دینا دانشمندی کے عین منافی ہے۔

(گلنار داخل ہو کر)

گلنار: ۔سرکار آپ کا فون۔

ارشد: ۔اچھا ـــ (نزہت سے مخاطب ہو کر) نزہت اس پر غور کر دیکھ جلد بازی مناسب نہیں ہے۔ ہماری عزت اور شہرت پر اس کا برا اثر پڑیگا۔

(کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے گلنار جاتی ہے کچھ دیر خاموش رہ کر)

نزہت: ۔ماجد! میں اس زندگی سے اکتا چکی ہوں۔ ارشد نے مجھے ساتھ لے کر بہت کچھ حاصل کیا ہے ـــ عزت، دولت، شہرت اور کیا کچھ نہیں۔ اور جب اس کو یہ سب کچھ مل گیا تو وہ یہ چاہتا ہے کہ میں یہ بھول جاؤں کہ میں عورت ہوں

ماجد: ۔ارشد کی کچھ کمزوریاں ضرور ہیں ـــ وہ تم سے بیحد محبت کرتا ہے

نزہت: ۔ارشد نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ـــ وہ اپنے آپ سے محبت نہیں کر سکا۔ خدارا مجھے اس ماحول سے نکال لو جہاں خود غرضی پلتی ہے۔ میں عورت بن کر دنیا کو دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ کس قدر حسین ہے۔

ماجد: ۔ازدواجی زندگی بذات خود ایک حسین دنیا ہے۔ اس سے باہر نکل کر تم کچھ بھی نہ پا سکو گی تمہیں ماحول اداس اداس اور زندگی پھیکی نظر آئیگی۔

نزہت: ۔مگر ماجد! میری حالت ایک زینہ سے زیادہ نہیں ہے جس کے سہارے ارشد بلندیوں پر چڑھتا رہا ہے اور چڑھتا رہنا چاہتا ہے اس نے ایک بار بھی تو مجھے عورت نہیں سمجھا۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں کلیم اور رابیل سے محبت کرنا چاہتی ہوں۔

ماجد: ۔تم کیا سوچ رہی ہو نزہت ـــ (طنز اور محرومی کے انداز میں) کیا یہ ممکن ہے؟

نزہت: ۔سب کچھ ممکن ہے ماجد! کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے کیا تم نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ تم مجھ سے ہی شادی کرو گے۔

ماجد: ۔لیکن اب دوسرے کی بیوی ہو نزہت ـــ جو میرا دوست ہے

نزہت: ۔ماجد ـــ ارشد نے مجھ سے شادی کی مگر ہمیشہ مجھ کو دوست کی حیثیت سے ملتا رہا۔ کبھی شوہر کے روپ میں نہیں ملا (ٹھنڈی سانس بھر کر) مجھے ہمیشہ شوہر کی ضرورت رہی

ماجد: ۔کس قدر عجیب! اور

نزہت: ۔(قطع کلام کر کے) میں شوہر کے لئے تڑپ رہی ہوں ماجد! سنا ہے اس کے دل میں خلوص اور باہوں میں حرارت ہوتی ہے۔ اس کے جذبات میں تڑپ اور احساسات میں نرمی ہوتی ہے۔ میں اس لذت سے آشنا ہونا چاہتی ہوں۔ ماجد آؤ مجھے سہارا دو۔ اپنی اسنو وائٹ کو۔ (ماجد کسی گہری سوچ میں مبتلا ہو جاتا ہے) ماجد! تم میرے لئے پھول توڑ نیکو کے لئے کانٹوں

دار جھاڑیوں میں کود جایا کرتے تھے۔۔۔ تم ایک بار سیر اور رومال بچانے کے
لئے تیز رو دریا میں کود پڑے تھے۔ تم کہا کرتے تھے کہ "اسنو وائٹ میں تمہارے
لئے شفق کی سرخی چرا کر لا سکتا ہوں۔ یاد ہے تم کو۔۔۔ (ماجد خاموش
رہتا ہے) مجھے بزدل مردوں سے نفرت ہے ماجد۔ بہت نفرت۔

ماجد۔ مگر نزہت۔۔۔

نزہت: تم بہت سوچتے ہو ماجد! ۔۔۔ (بالکل شکست خوردگی
کے لہجہ میں) میں کب تک ڈنر ڈانس کی رونق بنتی رہونگی۔ میں کب تک
کلب کی سیکریٹری نہیں رہونگی۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ (آہستہ شکست
آمیز لہجہ میں) میں کب تک تمام تمام رات سوشل فنکشن اٹنڈ کرتی رہونگی۔
(سر پکڑ کر ایک صوفے پر بیٹھ جاتی ہے) میں کب تک ایک عورت بننے کے لئے
ترستی رہونگی۔

ماجد۔ تم بہت جذباتی ہوتی جارہی ہو نزہت! ارشد میرا دوست
ہے۔۔۔ اور پھر میں سماجی بندھن کیسے توڑ سکتا ہوں۔ میری اپنی عزت ہے
سماج میں میرا ایک مقام ہے۔ خدارا مجھے اس بلندی سے نیچے نہ گھسیٹو خدا
را میری اسنو وائٹ۔

نزہت:۔ سماج۔۔۔ سماج۔۔۔ سوسائٹی۔۔۔

(ارشد داخل ہو کر)

ارشد:۔ کلب کے کچھ ممبر آپ کو مبارکباد دینے آرہے ہیں۔

نزہت:۔ میں ان سے ملنا نہیں چاہتی۔۔۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔
میں ماجد کے ساتھ جارہی ہوں۔۔۔ مجھے ان کے بچوں سے ملنا ہے
کلیم اور نبیل سے۔۔۔ ماجد کیا سوچ رہے ہو۔

ماجد:۔ (کھڑے ہو کر) میں آج کی رات ڈاکٹر شہباز کے یہاں گذارنا
چاہتا ہوں۔۔۔ صبح میرا سامان اسٹیشن پہنچا دیجئے گا۔

(تیزی سے کمرے سے نکل جاتا ہے۔ نزہت متحیر
چکرا کر بیٹھ جاتی ہے۔ ارشد بالکل مبہوت
کھڑا رہتا ہے۔) (پردہ)

(بقیہ) ۔۔۔ تاش گھر ۔۔۔ (صفحہ ۸۵ سے آگے)

کی ناک سے؟؟

ڈپٹی۔ تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے سعید۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں
خاندانوں کی ناکیں چپٹی ہیں۔ تم نوجوانوں کو ایسی فضول سی
حماقتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

سعید۔ ہاں ابّا۔۔ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔۔ کیوں تسنیم؟؟

تسنیم۔ (اس سوال سے گھبرا کر) میں!! ۔۔۔ (رک کر) آپ ٹھیک
کہہ رہے ہیں سعید بھائی۔

سعید۔ یہ "میں میں" ۔۔ کیا شروع کر دی تسنیم؟ ۔۔۔ اور پھر
سعید بھائی؟؟ (ہنستا ہے) ہماری شادی کو اب بہت
تھوڑا وقت رہ گیا ہے تسنیم!! ۔۔۔ اُف میرے اللہ۔ اس
شرم پر خدا کی مار۔۔۔ تم نے یہ اپنا چہرہ کیوں ہاتھوں سے
ڈھانپ لیا۔

ڈپٹی۔ ہاتھوں سے نہیں تو کیا پیروں سے ڈھانپتی سعید؟ ۔۔۔ تم
بچوں کو کیوں گھور رہی ہو بیگم؟ چلو یہاں سے۔ مجھے تسنیم
کے جہیز کے بارے میں تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔

بیگم۔ (غصہ سے) میں!! ۔۔۔ میں!! ۔۔۔ دیکھتی ہوں کیسے ہوتی
ہے یہ شادی!!

ڈپٹی۔ اب تم نے بھی "میں میں" شروع کر دی بیگم؟ مجھے تو
اس کمرے کی آب و ہوا خطرناک معلوم دیتی ہے۔۔۔ اب
چلو بھی بیگم۔۔۔

(قدموں کی چاپ۔۔۔ دونوں چلے جاتے ہیں)

سعید۔ (ٹھنڈا سانس لے کر) گئے۔ دونوں گئے۔ اب اس کمرے
میں ہم دونوں رہ گئے ہیں تسنیم۔۔۔ سامنے میز پر تاش کے
پتے بکھرے پڑے ہیں۔ نیلے آسمانوں میں حسین چاند مسکرا رہا
ہے۔ دور تارے ٹمٹما رہے ہیں۔ باغیچے کے ہر غنچے سے مسرت
اور آسودگی کی بو آرہی ہے۔۔۔ اور۔۔۔ اور میں خوش ہوں
بے حد خوش ہوں ہم بے حد خوش ہیں۔ کیوں تسنیم؟؟ (وقفہ)

تسنیم۔ (دھیمے لہجے میں) ہاں سعید!! میں بھی بے حد خوش
ہوں۔

(اور سعید قہقہہ لگا کر ہنستا ہے۔۔۔ فیڈ آؤٹ)

جاری شدہ ۱۹۴۵ء

ادبستان
عید گاہ، بندر روڈ، کراچی

تازہ رُباعیات

جب زیست پہ ہوتے ہیں ترانے ممنوع
تب سازِ سرود موت کرتی ہے شروع
ہر شام جو گدا قبر میں ہوتا ہے غروب
اُس مہر کا اُفق لحد سے ہوتا ہے طلوع

جوش
۱۶/۵/۵۵ کراچی

ہم اہلِ قلم، تاجِ سرِ آدم ہیں
اسمِ اعظم ہیں اور جامِ جم ہیں
شاہانِ عظیم و فاتحانِ اکبر
تاریخ میں تم ہو اور دلوں میں ہم ہیں

اک سمت ہیں فاتحانِ آہن بازو
اک سمت ہیں شاعرانِ خونیں پہلو
خنجر سے ٹپکتا ہے وہاں غیر کا خوں
رِستا ہے یہاں قلم سے اپنا ہی لہو

مجھ سا کوئی مے کدہ میں ہے بھی ساقی
جس میں ہو گرج بھی اور لَے بھی ساقی
وہ لہجہ مجھے عطا ہوا ہے جس میں
غلطاں ہے لہو بھی، موجِ مے بھی ساقی

اعضا کو توانائی و طاقت بخشی
اِدراک کو پختگی و وسعت بخشی
جس کو بھی چھوا مرے نفس نے، اُس کو
حِدّت، حرکت، حیات، ہمّت بخشی

پروفیسر شور (علیگ)

آزادی کے بعد

یہ ہوا یہ دھوپ، یہ برسات، یہ خرمن، یہ کشت
اے کہ تیرے دام کا نخچیر ہے سارا بہشت

جس کی کرنوں نے کفن ظلمات دوراں کے سیئے
تو سمجھتا ہے وہ سورج ہے فقط تیرے لئے

اے دلِ محراب و منبر، اے ضمیر خانقاہ
اپنے مقتل کے شہیدوں کی طرف بھی اک نگاہ

خشتِ ہر دیوار سے آتی ہے جن کے خوں کی بو
آج انہی کا زرد چہرہ دیکھ کر ہنستا ہے تو

کتنی گلیوں کے خنک سائے میں کملاتے ہیں روپ
کتنے رخساروں کو جھلساتی ہے بام و در کی دھوپ

کتنے برقعے ہیں کہ جن میں شل ہے اک دستِ سوال
کتنی آنکھوں سے ٹپکتا ہے ملالِ ماہ و سال

آج بھی ہنستے ہیں عریانی پہ کمخواب و حریر
زہر میں ڈوبے ہوئے ہیں آج بھی سونے کے تیر

نیرگی سے آج بھی بوجھل ہے پشتِ آفتاب
جل رہی ہے آج بھی عرفان و حکمت کی کتاب

آدم و حوا کی عظمت آج بھی ہے نوحہ گر
آج بھی طوفاں کی ہے غماز گردِ رہ گزر

آج بھی اک طنز ہے راتوں پہ سورج کا فروغ
الاماں دین و مساوات و اخوت کا دروغ!

آج بھی ریش و قبا ہے مفتی و ملا کا سود
آج بھی ہیں رونقِ بازار کعبے کے یہود

مومن و درویش و صوفی اب بھی ہیں یزداں شکار
اب بھی ہر دو کاں پہ بکتے ہیں رسول و کردگار

زہد کی فتنہ گری ہے آج بھی پشمینہ پوش
آج بھی گندم نما ہیں طاعتوں کے جو فروش

رہ گئے ہیں بجھ کے جن تاریک سینوں کے چراغ
اُن کے ماتھوں پر بھی ہیں اُبھرے ہوئے سجدوں کے داغ

طاعت و تقدیس کی شمعیں ہیں اب بھی دود خیز
آج بھی ابلیس ہے یزداں سے سرگرمِ ستیز

اب بھی ہے ڈوبی ہوئی ظلمات میں آدم کی روح
آج بھی درکار ہے اُمت کو اک طوفانِ نوح!

اب بھی تیمور و ہلاکو کو ہے نازِ اعتکاف
آج بھی چنگیز کر جاتے ہیں کعبے کا طواف

لب کشائی اب بھی ہے حق و صداقت پر حرام
اب بھی ہر سقراط کا ہے زہر سے لبریز جام

ہے غمِ ہر ابنِ مریم آج بھی مرگِ صلیب
کارفرما اب بھی ہے دین و سیاست کا فریب

اعتبارِ ناخدا و بادباں؟ کچھ بھی نہیں
بحر کے سینے میں جز موجِ رواں کچھ بھی نہیں

ان شکستہ کشتیوں کے ڈوبنے کا غم نہ کر
فطرتِ دریا سمجھ گرداب کا ماتم نہ کر

یہ ہوائیں، یہ تلاطم، یہ اندھیرا، یہ بھنور،
ہیں کسی طوفانِ نو آغاز کے پیغامبر

بحر کہتا ہے سفینے ٹوٹ کر رہ جائیں گے
مَوج کہتی ہے یہ ساحل دُور تک بہہ جائیں گے

کوئی طغیانی ہوا اپنا رُخ بدلتی ہے ضرور
ناخدا ڈوبے کہ اُبھرے مَوج چلتی ہے ضرور

باخبر اے نیتِ شب اے دھندلکے ہوشیار
کوئی سورج رہ نہیں سکتا اندھیرے کا شکار

وقت کے رُخسار سے ڈھلنے کو ہے ظلمت کی دھول
خاک کے سینہ پہ ہوگا تازہ کرنوں کا نزول!

شاد عارفی

مگر عورت کا دل کتنا؟

پہلے شہناز کے گھر ہو آؤں
پھر بتاؤں گا تجھے اے ہمدم
رات وہ جال بُنا ہے میں نے
پھنس کے رہ جائے گا آہوئے حرم

دوست فطرت بھی تو کوئی شے ہے
یعنی "رنگین" ہوں میں — تو "سادہ"
میں نے اک چال چلی تھی لیکن
عقد پر وہ نہ ہوئی آمادہ!

باز آتا ہے کہیں عزمِ جواں
پیش دستی سے نہ چوکے غالب
یاد کر — برق.... فلاں.... اور فلاں
اور پھر.... میں نے جو بدلے قالب

آپ کو میرا پیامِ شرعی
ایک دیوانے کی بڑ تھی گویا
"قاقم و صوف" میں پیوند "پلاس"
اس جسارت پہ کئی دن رویا

تو نے بی۔اے نہ کیا پاس ابتک
لڑکیوں پر تری دام اندازی
یہ ترے عزم کے دو رُخ کیسے
کہیں گھامڑ تو کہیں ہے نازی

کل بھی معذورِ "پسندِ خاطر"
آج مختار ہے — مجبور نہیں
ابھی رستہ میں یہ سوچا میں نے
آپ سب کچھ ہیں پہ مشہور نہیں

ذوق مرحوم کے اسباب ..... نمود　　　مند گئی آنکھ تو ہر دولت مند
کوئی تالاب ... کوئی پل ... بیشک　　　خاک کے ڈھیر میں تبدیل ہوا
حوض قاضی ہو کہ پیلا تالاب　　　گھاس رہتی نہیں برسات کے بعد
یادگاروں کا مخالف ہے فلک　　　"خال" ماحول میں تحلیل ہوا

لاٹ - مینار - ابوالہول - ہرم　　　آپ کو بھی نہ بھلا دے دُنیا
ابدیت کا یہ امکان ہی کیا　　　گھاس رہتی نہیں برسات کے بعد
دے نہ تاریخ گواہی جب تک　　　نام اولاد سے "کے ؟ پشتوں تک"
ذکر تھا ..... آپ پہ احسان ہی کیا　　　اصل اوجھل ہیں فروعات کے بعد

ساتھ ہے اُن کے مری ہمدردی　　　فلم لائن پہ کبھی غور کیا ؟
جن کو ماحول غلط ملتا ہے　　　اس میں شہرت کی وہ رفتار کہ آج
طیش آتا ہے مجھے فطرت پر　　　روشنی اپنی سُبک بیسری پر
پھول کانٹوں میں اگر کھلتا ہے　　　سُست رَو - پست قدم - سرد مزاج

اپنے والد کی ہیں اکلوتی آپ　　　ابھی جھاڑو پھری شہناز کا تار
موت کا نام نہیں ہے گالی　　　ڈپٹی صاحب نے پڑھا اور روئے
وہ جو اللہ کو پیارے ہو جائیں　　　"بمبئی کا کوئی زچہ خانہ"
صاف میدان اُفق تک خالی　　　کنواریاں ہیں انہیں اللہ کھوئے

جاں نثار اختر

تمہارے شہر میں !

(نذرِ بھوپال)

تمہارے شہر میں، میں لاکھ بار آیا ہوں
بڑے حسین مناظر ہیں، پھول، کلیاں ہیں
مگر میں تم سے فقط ایک بات پوچھوں گا
تمہارے شہر میں کتنی اُجاڑ گلیاں ہیں

بہت حسین سہی مالوے کی یہ راتیں
نظر اُٹھاؤ در و بام پر اُداسی ہے
بہت حسین سہی یہ حسین برساتیں
تمہارے شہر کی لیکن زمین پیاسی ہے

تمہارے تال کا یہ خوش نُما حسیں منظر
کنول کھلے ہیں کہ پانی میں آگ لگتی ہے
لُبھائے گا یہ تماشائے آب و رنگ کسے
کہ داغ داغ ہیں دل، ہر نظر سلگتی ہے

یہ دل نواز مناظر مجھے بھی پیارے ہیں
مگر بنیں گے نہ مرکز مرے خیالوں کا
پتہ نہیں کہ یہ احساس تم کو ہے کہ نہیں
کہ شہر نام ہے شہروں میں بسنے والوں کا

اُداس اُداس یہ چہرے، بجھے بجھے لہجے
جھکی جھکی یہ جبینیں کہ جن پہ نور نہیں
تھکی تھکی یہ نگاہیں، یہ سوگوار آنکھیں
جو کہہ رہی ہیں کہ جینا کوئی ضرور نہیں

تمہیں بتاؤ، تمہارے یہ نوجواں شاعر
لب و نظر کی کوئی بات کیوں نہیں کرتے
سوائے خونِ جگر، اپنے شاہکاروں میں
جواں دلوں کا جواں رنگ کیوں نہیں بھرتے

تمہیں بتاؤ، تمہارے حسین باغوں میں
یہ بات کیا ہے جواں قہقہے بلند نہیں
یہ بات کیا ہے کہ کتنے ہی لوگ کہتے ہیں
کہ اُن کو کوئی بھی تہوار ہو پسند نہیں

تمہیں بتاؤ، تمہاری حسین جنت میں
مسرتوں کے جواں پھول کیوں نہیں کھلتے
دل و نظر کے یہ بے رنگ و بُو نظارے بھی
انہی حسین نظاروں سے کیوں نہیں ملتے

نظر اُٹھا کے تو دیکھو، یہ جھلملاتی رات
تمہارے گھر کے سیہ آنگنوں پہ ہنستی ہے
تمہارے صحن میں جلتے ہوئے چراغوں سے
بجائے نور کے اک تیرگی برستی ہے

میں تم سے پوچھ رہا ہوں، جواب دو مجھ کو
تمہارے شہر کو کیوں ظلمتوں نے گھیرا ہے
میں تم سے پوچھ رہا ہوں، جواب دو مجھ کو
تمہارے شہر میں تم ہو تو کیوں اندھیرا ہے

غلام ربانی تاباں

انسان

نگار خانۂ ہستی کا شاہکار ہے تُو
بڑا مقام ہے تیرا بڑا ہے نام ترا

یہ کائنات، دو عالم ترے تصرف میں
زمیں کنیز تری آسماں غلام ترا

نواحِ شمس و قمر بھی تری گزرگاہیں
کہ ہر مقام سے آگے ہے کچھ مقام ترا

ہر انقلاب ہے اک تازہ زندگی کی نمود
بس ایک جہدِ مسلسل پہ ہے قیام ترا

گزر بھی ساحل و کشتی کی جستجو سے گزر
کہ موج موج کے دامن میں ہے مقام ترا

درِ مغاں سے طلب کر نہ ایک دو ساغر
بہ شرطِ تشنہ لبی مے کدہ تمام ترا

نہیں مُقلّد دیر و حرم مذاقِ سلیم
امامِ دہر ہے تُو کون ہے امام ترا

وہی عناصرِ فطرت جو تھے ترے مسجود
ہوئے ہیں زیر تو کرتے ہیں احترام ترا

سحر سے مل تو گیا سلسلہ ضیا کا تری
چراغِ بزم! بس اک شب سہی قیام ترا

مقام و وقت کی پابندیوں سے تو آزاد
جہانِ شوق میں ہنگامہ ہے دوام ترا

ترے جگر کا لہو شاملِ نگارِ چمن
روش روش سے عیاں حسنِ انتظام ترا

بہت ہوئی ہیں نمودِ چمن کی تفسیریں
اب اہتمامِ بہارِ چمن ہے کام ترا

قتیل شفائی

میرے مچلے ہوئے خوابوں کا لہکتا ہے چمن   آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
کھو گئی پیار کی ٹھنڈک میں جدائی کی جلن   آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

میرے شانوں پہ ہے بکھری ہوئی زلفوں کی گھٹا
جانے کیا کہتی ہے مجھ سے تیرے آنچل کی ہوا

اپنے ہی سائے سے شرمانے لگا میرا بدن   آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

جھلملاتا ہے ترا پیار مرے سینے میں
عکس تیرا ہی دمکتا ہے اس آئینے میں

تیرے دھوکے میں کہیں چوم نہ لوں اپنا بدن   آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

میں جو انگڑائیاں لوں دل میں مرے ہوک اٹھے
میری ہر سانس میں کوئل سی کوئی کوک اٹھے

کیا اسی چیز کو کہتے ہیں محبت کی لگن   آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

میری آنکھوں پہ دمکتا سا کوئی سایہ ہے
دل کی گہرائی میں تو ایسے اتر آیا ہے

جیسے شبنم پہ تھرکتی ہوئی سورج کی کرن   آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

کوئی تصویر خیالوں میں نظر آتی ہے
پاس کوئی نہیں آواز مگر آتی ہے

چاپ قدموں کی بنی جاتی ہے دل کی دھڑکن   آج پھر جھوم رہا ہے میرا من
میرے مچلے ہوئے خوابوں کا مہکتا ہے چمن   آج پھر جھوم رہا ہے میرا من

ظہور نظر

ایک ساحل ایک یاد

زمستاں کی یخ بستہ شب ڈھل رہی ہے
گراں خواب تنہائی، گہری اداسی
دھندلکے میں لپٹی ہوئی چل رہی ہے

فضا اتنی موہوم
اتنی فسوں کار
اتنی مجرد بنی ہے کہ جیسے
فروشندہ ساحل پہ کچھ بھی نہیں ہے
نم آلود جھونکے
نہ ریگِ بریدہ
نہ کہرے کی چادر
نہ شوریدہ لہریں
خیالوں کے زخمی پرندے نہ جانے کہاں جا کے ٹھہریں!؟

پریشان و درماندہ نظروں کا محور
ابھی تک تو ہے ایک دھندلا سا جگنو
بہت دور شاید کسی بادبانی سفینے میں جلتی ہے قندیل کوئی
یا ہے کوئی تارا، پراسرار تارا
اُتر کر فرازِ فلک سے جو چُپ چاپ لہروں کے زینے پہ چلنے لگا ہے

یا ہے میرا دل ہی جو اُکتا کے مجھ سے سمندر کے سینے میں جلنے لگا ہے
کہاں جاؤں کس کو پکاروں
کہ ماحول بے رحم یادوں میں ڈھلنے لگا ہے

بہت دور اے ناریل کے درختوں تلے قبر میں سونے والی نگاہو!
کبھی ایک ایسی ہی موہوم شب میں
مجھے تم نے جس بے پناہی سے چاہا تھا،
پھر آج چاہو
اُسی ساحرانہ اداؤں سے ناچو
اُسی والہانہ محبت سے گاؤ
اُسی طرح پھر دیدہ و دل میں مچلو
اُسی طرح پھر روح میں مسکراؤ
میرے پاس آؤ —— میرے پاس آؤ
کنارِ سمندر بھی ویرانۂ مرگ سے کم نہیں اک نظر دیکھ جاؤ —— !!

فضا اتنی موہوم
اتنی فسوں کار
اتنی مجرّد بنی ہے کہ جیسے
خروشندہ ساحل پہ کچھ بھی نہیں ہے
نم آلود جھونکے
نہ ریگِ بریدہ
نہ کہرے کی چادر
نہ شوریدہ لہریں

غمِ دل کے لامنتہی راستے پر
اکیلی مری زندگی چل رہی ہے
زمستاں کی یخ بستہ شب ڈھل رہی ہے

ابن انشاء

کیسا بلانکا!

مراکش میں کوہ اطلس کے دامن میں ایک خوبصورت شہر ہے کیسا بلانکا۔ ۲۰، ۲۱، ۲۲ اگست کو اس کے نواحات میں فرانسیسی دستوں نے قوم پرست مظاہرین کو جو آزادی آزادی چلا رہے تھے، گولیوں سے بھون ڈالا۔ ابتدائی اندازے کے مطابق سولہ سو مراکشی ہلاک ہوئے اور ہزاروں مارے زخمی۔

پھر گولیاں چل چل اُوب گئیں — اے کیسا بلانکا
تری سڑکیں خوں میں ڈوب گئیں — اے کیسا بلانکا
مقتل ہے کہ گھاٹی اطلس کی — اے کیسا بلانکا
گلرنگ ہے ماٹی اطلس کی — اے کیسا بلانکا
ہر راہ میں ٹوپیوں والے ہیں — اے کیسا بلانکا
سنگین و تفنگ سنبھالے ہیں — اے کیسا بلانکا
بڑھے لشکر ہتیارے — اے کیسا بلانکا
لئے توپیں، ٹینک اور طیّارے — اے کیسا بلانکا
جہاں گاؤں تھے اب ویرانے ہیں — اے کیسا بلانکا
جہاں لوگ تھے اب افسانے ہیں — اے کیسا بلانکا
پر تیری دلاور آبادی ! — اے کیسا بلانکا
پھر لب پہ ہے نعرۂ آزادی — اے کیسا بلانکا
کھل جائیں گے ان کے پیچ سبھی — اے کیسا بلانکا
ہیں فور و فرانکو ایچ سبھی — اے کیسا بلانکا
دو روز کی ان کو مہلت ہے — اے کیسا بلانکا
بس کوچ نقارا باجت ہے — اے کیسا بلانکا
تو بے کس و بے مقدور نہیں — اے کیسا بلانکا
تری منزل اب کچھ دُور نہیں — اے کیسا بلانکا
لا ہاتھ ہیں دیں ہم ہاتھ ترے — اے کیسا بلانکا
ہم لوگ کروڑوں ساتھ ترے — اے کیسا بلانکا

صہبا لکھنوی

تعمیرِ نو

گھنے اندھیروں سے پھوٹا سپیدۂ سحری ضمیرِ خاک میں جاگا مذاقِ دیدہ وری

غموں سے دور مسرت کی شاہراہوں میں

حیات ڈھونڈ رہی ہے نشانِ استقبال

تہوں میں ڈوب کے ابھری ہے فکرِ انسانی

نکل رہا ہے سیاہی سے آفتابِ کمال

لہو کے چھینٹوں سے بدلی ہے قسمتِ آدم زمانہ ناپ رہا ہے جنوں کے پیمانے

خرد کی مے سے کہیں سیر ہو سکی ہے طلب سرِ درِ عقل کے وا ہوں ہزار مے خانے

یہ زندگی ہے بہر حال زندگی کی طلب

طلب نہ ہو تو جواں سال حوصلے نہ رہیں

حیات و موت نہیں جز تصادمِ ناگاہ

طلب نہ ہو تو جنوں کا ردلولے نہ رہیں

فضا میں کیف، کلی پر شباب گل پہ نکھار ابھی تو جشنِ بہاراں کو عام کرنا ہے

ابھی فروغِ مہ و مہر کی ضرورت ہے نگارِ شب کی ستاروں سے مانگ بھرنا ہے

یقینِ عزم و عمل، اشتراکِ فکر و نظر

انہیں سے درسِ تپش لے رہی ہے روحِ بشر

"حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو

چلو تو سارے زمانے کو سات لے کے چلو"

گھنے اندھیروں سے پھوٹا سپیدۂ سحری ضمیرِ خاک میں جاگا مذاقِ دیدہ وری

مصطفیٰ زیدی

اندیشہ ہائے دُور و دراز

اب سے پہلے بھی اِس محفلِ رقص میں گھنگھرؤں کے چھنا کے بکھرتے رہے
قبل اور وسط اور حال کے قافلے سب اسی راستے سے گذرتے رہے
مندروں میں کھنکتی رہیں گھنٹیاں، مسجدوں کے منارے اُبھرتے رہے

اب سے پہلے بھی آسودگی کے لئے آسماں کی طرف آنکھ اٹھتی رہی
اب سے پہلے بھی جشنِ سفر کے لئے کہکشاں کی طرف آنکھ اٹھتی رہی
اب سے پہلے بھی انسان کے نکتہ چیں اعتقادات کی بات کرتے رہے

خوب صُورت لبادے پہن کر سخن گر نے، ہیروں کے جگر میں اُلجھا دیا
معتبر رہنماؤں نے دھوکے دیئے، خضر صورت بزرگوں نے بہکا دیا
خضر صورت بزرگوں کی آنکھوں میں، تقدیس کے سُرخ ڈورے اُترتے رہے

آدمی کے تراشے ہوئے دیوتا نے آدمی کے لئے خار و خس چُن دیئے
قیصروں سے غلامی کا تمغہ ملا دیوتاؤں نے افلاس کے ہُن دیئے
پاک پروردگارِ مہ و مہر کی رحمتوں سے اندھیرے نکھرتے رہے

چشمِ مشتاق کو رُخ کی تابانیاں دیکھنے کی سعادت نہیں مل سکی
شام گذرے بھی مدت ہوئی اور ابھی آئینے کو اجازت نہیں مل سکی
صبح بھی تجھ سے پوچھیں گے اے دردِ دل، تیرے گیسو کہاں تک سنورتے رہے!

احمد ریاض

فریب

امن عالم کی تعمیر کے نام پر
مشورے ہو رہے ہیں یہ داراؤں میں
ذرّے ذرّے سے تابندگی چھین لو
گل کا سرمایۂ رنگ و بُو لُوٹ لو
عشق کی بزم کا ہر نشاں پھونک دو
ہیر کے سر سے رنگیں قبا نوچ لو
کاکلوں کی گھٹاؤں کا رُخ موڑ دو
حق پسندوں کے بڑھتے قدم روک دو
زندگی کو اُبھرنے مچلنے نہ دو
علم و تخلیق و فن کی زباں کاٹ لو
جامِ احساس میں زہرِ غم گھول دو
ذہن کو موت کے غار میں جھونک دو
تیرگی روشنی کو نگلتی رہے
زلفِ تہذیب محرومِ شانہ رہے
مشقِ تعزیرِ دار و رسن کم نہ ہو
آتش و خون کا کھیل جاری رہے

آدمیت کی توقیر کے نام پر
بیڑیاں ڈال دو وقت کے پاؤں میں
خواہشِ لذّتِ زندگی چھین لو
غنچے غنچے کا ذوقِ نمو لُوٹ لو
حسن کا محملِ زرفشاں پھونک دو
قیس کے سر سے تاجِ وفا نوچ لو
آنچلوں کی ہواؤں کا رُخ موڑ دو
سیلِ امواج کا زیر و بم روک دو
ظلمتوں کو حقائق میں ڈھلنے نہ دو
ارتقاء کی رگوں کا لہو چاٹ لو
زر کی میزاں میں انسان کو تول دو
فکر کو دشتِ پُرخار میں جھونک دو
یُونہی بارود کی بُو پگھلتی رہے
امن کی فاختہ بے ٹھکانا رہے
اقتدار و ہوس کی لگن کم نہ ہو
ایٹموں کی سدا شہریاری رہے

امن عالم کی تعمیر کے نام پر
آدمیت کی توقیر کے نام پر
مشورے ہو رہے ہیں یہ داراؤں میں
بیڑیاں ڈال دو وقت کے پاؤں میں

حسن اعرافی

نہر کے کنارے

مستقبل کے مدھم مدھم شورِ مسلسل،
شورشِ حال سے گھبرا کر
جانبِ نہر نکل جاتا ہوں
وقتِ سکوتِ شام اکثر

ایک جواں، بلے گھر دوشیزہ ——
سنولائے سنولائے عارض
کملائے کملائے پھول ——
ہانفہ بیمار سے آتی ہے
کرتی ہے دل کو داورطول

گھبرایا گھبرایا سا دل ——
دور آلودہ فضاؤں سے
کھیتوں پر پھیلی پھیلی
منحوس گھنیری چھاؤں سے
گلشن گلشن لہرانے
موہوم، بھیانک سایوں سے ——
ایک آسیب زدہ کی صورت
پھوٹ پھوٹ کر روتا ہے
دامن سے
وحشت کے سیہ دھبے سے

مسلسل دھوتا ہے
یا مثلِ سیلاب زدہ
پاپا کے کنارا کھوتا ہے

اک دن وقتِ سکوتِ شام
ایک زنِ فتنہ ساماں ——
شانوں پر لہرائے ردائے سرخ و سیاہ
پیٹھ پہ آہن کی گٹھری
سر پہ کتابوں کا لبستہ
ایک ہاتھ میں زر کی تھیلی
اک میں دواؤں کا بقچہ ——
کر کے چند اشارے
ہوگئی آنکھوں آنکھوں میں عنقا
خونِ جگر، دل ٹکڑے ہو کر بہہ نکلا
اشکِ رواں سے ہو گیا
ایک ہیجان درونِ نہر بپا ——

اسے ہم دم!
مت پوچھ وہ عالم
تشنۂ طوفاں لہروں کا

عبدالعزیز خالد

پارہ پارہ

خوکردگانِ رم کی وحشت کا امتحاں ہے
پھر کاروانِ خوشبو ہے میہمانِ صحرا

آبِ حیات جس کو کہتے ہیں سادہ مشرب
اک جامِ سرگراں ہے مے خانۂ فنا کا

اے ہرزہ تازِ شوقِ نظّارگی ہوس ہے
کرتا ہے صرفِ بیجا ذوقِ نظر کو رُسوا

عجزِ ادائے شوخی ، رنجِ خمارِ مستی
گلکاریٔ نظارہ ، گلچینیٔ تماشا

اے سوزِ عشق پھر کیوں برہم ہے دل کا عالم
کچھ زلفِ مشکبو کا ہم کو نہیں ہے سودا

اک گھونٹ کو ترستے ہیں نے نوازِ کب سے
یاروں کے ہاتھ میں ہے رطلِ گرانِ صہبا

مسکینی و تضرع نومیدی و تورّع
کتنا گراں نشیں ہے اخلاص کا عطیہ

اب یہ ستم کے مارے ہوں داد خواہ کس سے
سب انتقاد پیشہ ہیں ذوق سے معرّا

حلقوم بادہ نوشوں کے تشنۂ تجرّع
پروازِ بالِ مے ہے محدودِ شاخِ مینا

جوہر کے ارتقا کو کہتے ہیں جدلیاتی
یہ کائناتِ رنگیں میکانکی ہے گویا

ہست کہ بقائے اصلح کا راز ہے تنازع
شارعؑ سے پُوچھ شرحِ مَا أَيْمَكُثُ وَيَبْقى!

خارج ہیں کارگاہِ اسباب سے خوارق
امروز و دوش ہی سے ڈھلتا ہے نقشِ فردا

اس عقلِ حیلہ گر نے کیا کیا صنم تراشے
پر کھل سکا نہ رازِ سوز و تپِ سویدا

ہیگل کا فلسفہ ہو یا برگساں کی حکمت
وہم و گماں کا نسخہ تخمین و ظن کا طغرا!

کرتے رہے مفکّر عرضِ متاعِ دانش
اب تک ہے ناکشودہ تقدیر کا معمّا

جبریل صید آئے ، یزداں شکار آئے
تارِ سراب نکلا ملکِ بقا کا جادہ

وابستگی کی کاہش وارستگی کی خواہش
فیضانِ سرمدی سے ہم کو بھی ہے بہرہ

دامن کو چاک کر کے دل کو فگار کر کے
کیا اعتبار کھویا کیا اشتہار پایا

کرتی ہے کوچ حسرت کی آخری رمق بھی
اے شاعرِ گرامی لکھ آرزو کا نوحہ!

اختر پیامی

یادِ وطن

کچھ ایسے دن بھی گذر چکے ہیں کہ جن کی یادوں کے زخم اب تک بھرے نہیں ہیں

میں سوچتا ہوں کہ بوڑھی گنگا کے آئینے میں جمالِ گنگ و جمن ملے گا
غزالِ وحشی، نہ مضطرب ہو، کہیں تو بوئے چمن ملے گی، کہیں تو دشتِ ختن ملے گا

سحر، کہ جس کے کنوار پن سے فضا سہاگن بنی ہوئی تھی
وہ شام جس کی سلونی رنگت سیاہ زلفوں میں ڈھل گئی تھی
شفق، کہ جس کی فسوں طرازی سے چشمِ خوباں میں لاکھوں ڈورے پڑے ہوئے تھے
وہ اوس جس کے بس ایک چھینٹے سے دھانی آنچل پہ کتنے موتی جڑے ہوئے تھے
چمکتے ذرّے جو بھیس بدلے کلائیوں میں کھنک رہے تھے
وہ سخت پتھر جو کتنے ہاتھوں پہ لعل بن کر دمک رہے تھے
ہوا کی نرم و لطیف لہریں، جو زلف و رُخ کے حسین جھگڑے چکا رہی تھیں
وہ آبشاروں کی ننھی پریاں جو رقص کرتی ہوئی فضا میں رسیلے نغمے لُٹا رہی تھیں
گھنیرے جنگل، کہ جن کے سائے اچھوتے ہونٹوں کا لمس بن کر لرز رہے تھے
وہ لالہ زاروں کا عکس جس سے ہزاروں عارض گلاب بن کر کھلے ہوئے تھے
وہ عارضوں کا چمن کہاں ہے
وہ صبح و شامِ وطن کہاں ہے
غزالِ وحشی، ختن کہاں ہے

کچھ ایسے دن بھی گذر چکے ہیں کہ جن کی یادوں کے زخم اب تک بھرے نہیں ہیں

عبدالعزیز خالد

پارہ پارہ

خو کردگانِ رم کی وحشت کا امتحاں ہے
پھر کاروانِ خوشبو ہے میہمانِ صحرا

آبِ حیات جس کو کہتے ہیں سادہ مشرب
اک جامِ سرگراں ہے مے خانۂ فنا کا

اے ہرزہ تاز شوقِ نظّارگی ہوس ہے
کرتا ہے صرفِ بیجا ذوقِ نظر کو رُسوا

عجزِ ادائے شوخی ، رنجِ خمارِ مستی
گلکاریٔ نظارہ ، گلچینیٔ تماشا

اے سوزِ عشق پھر کیوں برہم ہے دل کا عالم
کچھ زلفِ مشکبو کا ہم کو نہیں ہے سودا

اک گھونٹ کو ترستے ہیں نے نواز کب سے
یاروں کے ہاتھ میں ہے رطلِ گرانِ صہبا

مسکینی و تضرّع نومیدی و تورّع
کتنا گراں نشیں ہے اخلاص کا عطیہ

اب یہ ستم کے مارے ہوں داد خواہ کس سے
سب انتقاد پیشہ ہیں ذوق سے معرّا

حلقوم بادہ نوشوں کے تشنۂ تجرّع
پروازِ بالِ مے ہے محدودِ شاخِ مینا

جوہر کے ارتقا کو کہتے ہیں جدلیاتی
یہ کائناتِ رنگیں میکانکی ہے گویا

ہست کہ بقائے اصلح کا راز ہے تنازع
شارعؔ سے پوچھ شرحِ مایُمکُث وَیَبقیٰ!

خارج ہیں کارگاہِ اسباب سے خوارق
امروز و دوش ہی سے ڈھلتا ہے نقشِ فردا

اس عقلِ حیلہ گر نے کیا کیا صنم تراشے
پر کھل سکا نہ رازِ سوز و تپِ سویدا

ہیگل کا فلسفہ ہو یا برگساں کی حکمت
وہم و گماں کا نسخہ تخمین و ظن کا طغرا!

کرتے رہے مفکّر عرضِ متاعِ دانش
اب تک ہے ناکشودہ تقدیر کا معمّا

جبریل صید آئے ، یزداں شکار آئے
تارِ سراب نکلا ملکِ بقا کا جادہ

وابستگی کی کاہش وارستگی کی خواہش
فیضانِ سرمدی سے ہم کو یہی ہے بہرہ

دامن کو چاک کر کے دل کو فگار کر کے
کیا اعتبار کھویا کیا اشتہار پایا

کرتی ہے کوچ حسرت کی آخری رمق بھی
اے شاعرِ گرامی لکھ آرزو کا نوحہ!

اختر پیامی

یادِ وطن

کچھ ایسے دن بھی گذر چکے ہیں کہ جن کی یادوں کے زخم اب تک بھرے نہیں ہیں

میں سوچتا ہوں کہ بوڑھی گنگا[1] کے آئینے میں جمالِ گنگ و جمن ملے گا
غزالِ وحشی، نہ مضطرب ہو، کہیں تو بوئے چمن ملے گی، کہیں تو دشتِ ختن ملے گا

سحر، کہ جس کے کنوار پن سے فضا سہاگن بنی ہوئی تھی
وہ شام جس کی سلونی رنگت سیاہ زلفوں میں ڈھل گئی تھی
شفق، کہ جس کی فسوں طرازی سے چشمِ خوباں میں لاکھوں ڈورے پڑے ہوئے تھے
وہ اوس جس کے بس ایک چھینٹے سے دھانی آنچل پہ کتنے موتی جڑے ہوئے تھے
چمکتے ذرّے جو بھیس بدلے کلائیوں میں کھنک رہے تھے
وہ سخت پتھر جو کتنے ہاتھوں پہ لعل بن کر دمک رہے تھے
ہوا کی نرم و لطیف لہریں، جو زلف و رُخ کے حسین جھگڑے چکا رہی تھیں
وہ آبشاروں کی ننھی پریاں جو رقص کرتی ہوئی فضا میں رسیلے نغمے لُٹا رہی تھیں
گھنیرے جنگل، کہ جن کے سائے اچھوتے ہونٹوں کا لمس بن کر لرز رہے تھے
وہ لالہ زاروں کا عکس جس سے ہزاروں عارض گلاب بن کر کھلے ہوئے تھے
وہ عارضوں کا چمن کہاں ہے
وہ صبح و شامِ وطن کہاں ہے
غزالِ وحشی، ختن کہاں ہے

کچھ ایسے دن بھی گذر چکے ہیں کہ جن کی یادوں کے زخم اب تک بھرے نہیں ہیں

---

[1] مشرقی بنگال کی ایک ندی

بلراج کومل

الاؤ

چراغِ امروز بجھ رہا ہے
دھوئیں کی موجیں اُبھر رہی ہیں

شبِ سیہ منتظر کھڑی ہے
اندھیرا چپ چاپ چھا رہا ہے
ابھی ہمارے گھروں کے اندر
سُلگ اٹھیں گے الاؤ، اپنے ہی جسم ایندھن کا کام دیں گے
گھروں سے باہر
شجر پہ اُلّو کی سرد چیخیں
ہنسیں گی ہم پر
کہ تنگی کوئی شے نہیں ہے
کہ زندگی کوئی شے نہیں ہے

کھنڈر کی جانب نظر اٹھاؤ
یہ دور سے کتنا خوبصورت ہے۔ پاس آؤ
یہ موت کی ایک داستاں ہے

جمالِ شب واہمہ ہے اے دل
ہماری بستی میں رہنے والے
پرانے مینخوار واقفِ دردوغم نہیں ہیں
ہمیں ہیں دونوں
یہ میں، یہ تو، ہم جلیں گے شب بھر۔

مسلم ضیائی

روشنی - زندگی

دوسری جنگ میں امن کے واسطے
سرفروشانہ ہم نے بڑھائے قدم
ظالموں جنگ بازوں کے مغرور سر
ہم نے بڑھ کر جھکائے بہ نوکِ قلم

گیت افسانے مضمون ہم نے لکھے
ان میں تھی گھن گرج ان میں تھی روشنی
ہم نے تاریکیوں کو اجالا دیا
ہم نے مفلوج سورج کو دی زندگی

ہم نظر ہم قدم آگے بڑھتے ہوئے
مسکراتے رہے گنگناتے رہے
امن، انسانیت اور انصاف کے
ساری دنیا کو نغمے سناتے رہے

تیسری جنگ کے دیو نے آج پھر
موت کا ساز چھیڑا ہے چنگھاڑ کر
اور چنگیز و ہٹلر کے لاشے اٹھے
اپنی قبروں سے کہنہ کفن پھاڑ کر

اڑ رہے ہیں فضاؤں میں ہوائی جہاز
چار جانب ہیں تاریکیاں جنگ کی
ایٹم اور ہائیڈروجن کے بم دیکھ کر
فکرِ فردا سے مغموم ہے زندگی

کل جو یورپ میں مصروف پیکار تھے
ایشیا میں وہ تشریف لے آئے ہیں
کرگسوں کی خدائی میں مریخ نے
موت کے نت نئے سانچے بنوائے ہیں

آج اٹھائے ہیں پھر ہم نے اپنے قلم
امن کے واسطے زندگی کے لئے
آج اٹھائے ہیں پھر ہم نے اپنے قدم
راہِ تاریک میں روشنی کے لئے

نغمۂ امن میں نے تمہارا پڑھا
"نعرۂ امن" پڑھا جو موقع ملے
آج ہم دور ہیں سیکڑوں کوس پر
دوسری جنگ میں پاس ہی پاس تھے

آج بھی سب وہی ہے جو اُس وقت تھا
آج بھی جنگ سے کشمکش ہے وہی
آج بھی سرفروشانہ ہے زندگی
گر کمی ہے تو بس اک تمہاری کمی

— تم کہ ہمشانی، روشنی، زندگی

شاذ تمکنت

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو

یہ نرم اُداس رُت خزاں کی
شاخوں میں ہوائیں کھو گئی ہیں
نیموں کی مہکتی ٹہنیوں سے
نمکولیاں پک کے جھڑ چکی ہیں
دہلیزِ خزاں پہ چپکے چپکے
پُروا کے ہلورے رو رہے ہیں
برگد کے مسن بریدہ گیسو
شانے کو ترس ترس گئے ہیں

کلیوں کا مزار بن گئی ہے
شبنم کی سجل، لچکتی چلمن
ہر رگ تیاگی بن چکا ہے
دکھلا گئی چھب خزاں کی جوگن

میں سوچ رہا ہوں مدتوں سے
اے آنسوؤ تم گواہ رہنا
اس حسن کے خال و خط کا نغمہ
کس وادیٔ غم میں کھو گیا ہے

آنکھوں میں ہے خواب گاہ اسکی
کھڑکی کی جبیں پہ سبز بیلیں
کیا آج بھی پاسبان ہوں گی
کیا آج بھی اک لچیلی ٹہنی
شیشوں سے ٹھٹھک کے جھانکتی ہے

وہ صحن کے ننھے ننھے پودے
وہ گود کے پالے کیاریوں کی
جھنکار کی ٹھنڈکیں لٹاتے
اب جھوم کے گنگناتے ہوں گے

میں اجنبی راہ پر کھڑا ہوں
ماضی کے کھنڈر کو تک رہا ہوں
ملبے کے دھوئیں کی زلفِ پُرخم
ہر سانس کے ساتھ گوندھتا ہوں

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
ایوانِ نگار تک پہونچ کر
چوکھٹ پہ لٹا کے میرے آنسو
اُس جانِ وفا سے اتنا کہنا
بوئے تھے جو انبساط کے بیج
اب اشک کی فصل بن گئے ہیں

جب پیڑوں کی چھتریوں سے گذرو

شاخوں سے مرا سلام کہنا
چڑیوں کی ملیں گی تم کو چیخیں
کہنا کہ وہ مطربِ فسردہ
مضراب کی چوٹ کھا چکا ہے
خود اپنے لہو میں بہہ رہا ہے

جب گزرو گے صحن و بام و در سے
کچھ زخمی صدائیں پاس آ کر
پوچھیں گی مری شب او حالی
تم اُن کو گلے لگا کے کہنا
میں سازِ سکوت بن گیا ہوں
آہوں سے نباہ کر رہا ہوں

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
اُس پیکرِ حُسن کی قبا کا
مہکار لیے طواف کرنا
اُن آنکھوں کی پُرسکون جھیلیں
کب جانتی ہیں اتھاہ اپنی
ظلماتِ مژہ کو کیا خبر ہے
کیا شے ہے متاعِ آبِ حیواں
وہ لب کہ خیالِ شیشہ سازاں
رخسار کہ بالشِ تبسم ہے

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
جب زلف کے بن میں سنسناؤ
افشاں کے ملیں گے تم کو جگنو
وہ مانگ کہ کہکشاں کا لچکا
وہ مانگ کہ ہے کہ شفق کا فیتہ
اُس مانگ کے دیپ سے یہ کہنا

تم پو کی حنائی راگنی ہو
میں صبح کا تارہ بن گیا ہوں
آنکھوں میں تمہاری دید کی پیاس
کس درد سے کے ڈوبتا ہوں

پھر تم کو ملے گی دل کی سرحد
آہستہ گزرنا اس جہاں سے
یہ کانچ کا فقرِ قرمزی ہے
یہ سیج شفق کے پھول کی ہے
یہ نقرئی جوئے نغمگی ہے
مندر ہے یہ زخم کی ہنسی کا
بجتے ہیں یہاں یہ یاد کے سنکھ
تم دیکھنا اے خزاں کے جھونکو
شاید مرے عشق کا پروہت
جپتا ہو کہیں لہو کی مالا

جب گزرو گے اس کے نقشِ پا سے
سجدے کے تمہیں نشاں ملیں گے
اُن مٹتے نقوش سے یہ کہنا
اب میری جبیں جبیں نہیں ہے
اک سنگِ مزار بن گئی ہے

اے بادِ خزاں کے نرم جھونکو
یہ آخری التجا ہے تم سے
کہنا مرے روز و شب سے جا کر
کیوں روٹھ گئے ہو مجھ سے آخر
دل خوں تھا گلہ گزار کب تھا
میں ایسا گناہ گار کب تھا!

حسن حمیدی

بُری سی بات

ہے بُری سی بات اگر کہوں
شبِ تار ہے یہ سحر نہیں
یہ تسلیوں کی نزاکتیں مری زندگی کے یہ مرحلے
نہ وفورِ غم میں کمی ہوئی نہ یہ چاکِ زخمِ جگر سِلے
مری آرزو کے شرار سے نئے گمرہی کے دیئے جَلے
مری مفلسی کے مزار پر نئے زر نگار محل بنے
کئی جھونپڑوں کے دیئے بجھے
ہیں کہاں سحر کی تجلیاں مری چشمِ تر کو خبر نہیں

ہے بُری سی بات اگر کہوں
شبِ تار ہے یہ سحر نہیں
وہی اشک ہے وہی آہ ہے وہی صبح ہے وہی شام ہے
وہی چہرہ دستِ خاص ہے وہی بے کسئ عوام ہے
مرے جذبِ دل کے خلوص کو نئی رہبری یہ کلام ہے
نئی رہزنی کو سلام ہے
مری کاوشوں پہ نظر تو ہے مری مفلسی پہ نظر نہیں

ہے بُری سی بات اگر کہوں
شبِ تار ہے یہ سحر نہیں
ہے بُری سی بات اگر کہوں کہ بدل دے نظمِ چمن کوئی
جسدِ خزاں سے اُتار دے یہ لباسِ سرو چمن کوئی
یہ نظامِ کہنہ کی لاش کو بھی اڑھا دے آج کفن کوئی
ہو نثارِ صبحِ وطن کوئی
نئی رہبری کے خمار پر مری تلخیوں کا اثر نہیں

ہے بُری سی بات اگر کہوں
شبِ تار ہے یہ سحر نہیں

مُلک راج آنند

ماہرِ زراعت

دھرتی کا ہر حصہ ایک زرخیز باغ کی حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ وہ صحرا کا ریتلا میدان ہو یا دلدل کا ٹکڑا ۔ خواہ وہ راہ گم کردہ دریا کے کنارے کی پتھریلی زمین ہو یا برف کا وسیع و عریض کھیت ۔ دورِ حاضر کا کرشمہ ساز انسان یقیناً جوہر (ایٹم) کو ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے، زمین کے چہرے کو بھی اپنی پسند کے مطابق تبدیل کر سکتا ہے ۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر ایم لی سینکو کا اعتقاد یہ ہے کہ ماحول سب کچھ ہے بشرطیکہ کوئی اچھا باغبان موجود ہو ـــــ اور اس اعتقاد کی وجہ یہ ہے کہ اس نے کبھی اپنے ملک میں برف میں چاول کو پیدا ہوتے نہیں دیکھا ۔ خواہ دنیا اسے پسند کرے یا نہ کرے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ نئی اقوام غیر شعوری طور پر روس کی رفتارِ ترقی سے متاثر ہو رہی ہیں جس نے بنجر زمینوں کو قابلِ کاشت بنایا، اور شمال کی یخ بستہ زمین میں ہل چلایا ۔ نئی اقوام میں صرف اچھے باغباں کی کمی محسوس کی جا رہی ہے ۔ اس کے علاوہ ان میں وہ ہماہمی اور سرگرمی کے جذبات بھی نہیں ہیں جو نئی زندگی میں تعمیری روح پھونکتے ہیں ۔ اسی لئے نتیجہ صفر رہ جاتا ہے ۔ کیونکہ یہ نیا جادو جسے ہم سائنس کہتے ہیں اس وقت تک اپنا کمال نہیں دکھاتا جب تک کہ اس کا استعمال کرنے والا شعبدہ باز کے بجائے واقعی ساحر نہ ہو ـــــ اور چونکہ ایک فسانہ گو کے لئے اپنے قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھنا نہایت ضروری ہے اس لئے میں میر محمد مصطفےٰ مشہور ماہر زراعت کے کارناموں کی داستان آپ کو سناتا ہوں ۔

کئی سال قبل بڑھتے ہوئے انسانوں کے لئے جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ چنانچہ چند سرداروں کی کوشش سے ایک نئی ریاست تلقلی سبنا وجود میں آگئی ۔ نومولود ریاست کے حکمرانوں نے جو اس سرزمین پر آباد ہونے کے لئے آئے تھے، اپنے گرد و نواح پر نظر ڈالی اور یہ دیکھا کہ اس سرزمین میں قوتِ نشوونما اور زرخیزی بہت ہے ۔ یہ ریاست مشرق و مغرب کے دو حصوں میں منقسم تھی ۔ اور ریاست کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اس کے وسائل لامحدود تھے ۔ مغربی حصہ میں تین چار بڑی ندیاں اور دریا تھے اور مشرقی گوشہ کافی سرسبز و شاداب تھا ۔ لیکن قدرت کے ان عطیات کے باوجود بعض حصے ایسے بھی تھے جنہیں غیر زرخیز بلکہ بنجر کہا جا سکتا ہے ۔ اور اس لئے ایسے حصے کو زرخیز بنانے کے لئے اس ریاست کو ماہر باغبانوں کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک غیر ملکی سیاح کا یہ مشورہ بھی پسند کیا گیا کہ سرزمین کو بہتر بنانے کے لئے ایک ماہر زراعت کی خدمات حاصل کی جائیں،

جو زمینوں کو زیادہ پیداوار کے قابل بنائے اور پھلوں کی نشو ونما میں جدید طریقوں کو اپنا سکے۔ لہٰذا اس مشیر خاص کے جذبات و احترام کی بنا پر ایک ماہر زراعت کی ضرورت کا اشتہار دیا گیا۔ فن باغبانی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ویسے ہی اس ریاست میں کمی تھی۔ کئی پشتوں سے اس ملک کے باشندوں نے کھانا پکانا ترک کر کے اس اہم ذمہ داری کو نانبائیوں، بقالوں کے سپرد کر رکھا تھا۔

میر محمد مصطفیٰ کو جو ریاست کی اسمبلی کے ممبر کا برادر نسبتی تھا، مجبور کیا گیا کہ اگر وہ اس عہدے کے لئے درخواست دے دے تو اس کے لئے اس ملازمت پر فائز ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ میر محمد مصطفیٰ حال ہی میں غیر ممالک سے واپس آیا تھا جہاں اس نے Botany کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی تھی اور اسے اس بات کا ہرگز یقین نہ تھا کہ وہ بحیثیت ماہر زراعت اپنے فرائض اچھی طرح انجام دے سکے گا۔ کیونکہ باہر کے دوران قیام میں اسے سفید اقوام کا یہ اصول بہت پسند آیا تھا کہ انسان کو ایک ہی شعبۂ علم میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ لیکن میر محمد مصطفیٰ کے بہنوئی میر احمد علی نے یہ سن کر غصہ سے کہا:

"تم نے اپنے والدین کا روپیہ برباد کر دیا ہے! ایک ماہر نباتات اور ماہر زراعت میں آخر فرق ہی کیا ہوتا ہے؟ دونوں کا تعلق پودوں سے ہوتا ہے۔ اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم کیوں اس عہدے کے اہل نہیں ہو سکتے؟"

میر محمد مصطفیٰ کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنے بہنوئی کے گھر مفت کی روٹیاں کھاتا رہے، اس لئے اس نے مجبوراً اس ملازمت کیلئے درخواست دینا منظور کر لیا۔

اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ انٹرویو میں وہ اکیلا ہی امیدوار تھا اور چند دن بعد ہی اس کو ڈاک میں ایک خط بھی ملا جس میں یہ لکھا تھا کہ اس کا تقرر محکمۂ زراعت میں بحیثیت ماہر زراعت کیا جاتا ہے۔

میر علی احمد نے اپنے برادر نسبتی کے اس تقرر پر ایک ڈنر پارٹی دی اور اس میں ریاست کے معزز حضرات اور سرکاری افسران کو مدعو کیا۔ اس کے ساتھ ہی گھر کی عورتوں نے بھی ایک پیر کی درگاہ پر جا کر نذر و نیاز چڑھائی اور غریبوں کے بچوں میں مٹھائی بھی تقسیم کی گئی۔

محکمۂ زراعت کے دفاتر چونکہ ریاست کے مرکزی شہر جام جہاں نما میں تھے اس لئے میر محمد مصطفیٰ اپنے بہنوئی میر علی احمد سے بغل گیر ہو کر جس کے منہ سے پیاز کی بو آ رہی تھی، رات کی گاڑی سے جام جہاں نما کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچتے ہی ایک شاندار ہوٹل میں اس نے قیام کیا اور اپنے بہترین سوٹوں کو دھلوا کر ٹیلی فون کرنے میں تیزی سے مصروف ہو گیا۔ تاکہ وزیر زراعت سے شرف ملاقات کے لئے وقت طے کر سکے۔ لیکن تین روز کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے پتہ چلا کہ یہاں ہر چیز میسر ہو سکتی ہے بجز شرف ملاقات کے۔ بہرحال پانچویں روز تقریباً بارہ بجے پھلوں کی ایک ٹوکری نذر کرنے کے بعد میر محمد مصطفیٰ کی ملاقات وزیر زراعت سے ہو گئی۔

نیچی آنکھوں اور شرمیلے تبسم کے ساتھ وہ وزیر زراعت کے سامنے بیٹھا تھا اور منتظر تھا کہ عزت مآب سلسلۂ گفتگو شروع کریں؛ اور اسے ہدایات بھی دیں کہ بحیثیت ماہر زراعت اسے کیا کیا فرائض انجام دینے ہیں۔ میر محمد مصطفیٰ ایک کمزور سا پستہ قد انسان تھا جس کا سینہ تنگ اور چہرہ بھی گوشت سے خالی خالی سا تھا۔ احساس کمتری کے باعث اس کی پیشانی کا پسینہ اس کے بالوں کو تر کر رہا تھا۔ اس کے برخلاف وزیر زراعت کافی صحت مند انسان تھے جن کی بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ سرخ سی رنگت ایک طرح کے وقار و تمکنت کا پتہ دے رہی تھی جو دوسروں کو بہت کچھ متاثر کر سکتی تھی دونوں کچھ عرصہ تک خاموش رہے اس کے بعد بڑی ہمت سے کام لے کر میر محمد مصطفیٰ نے کہنا شروع کیا۔

میں اس لئے حاضر خدمت ہوا ہوں کہ حضور والا سے اپنے فرائض کی انجام دہی سے متعلق ہدایات حاصل کروں۔ غالباً حضور والا کو اس کا علم ہو گا کہ حضور نے فدوی کو بحیثیت ماہر زراعت مقرر کرنے پر اظہار خوشنودی فرمایا تھا:

"آں ـــ ہاں ـــ میں تمہارا نام بھول چکا ہوں خیر فائلوں میں ضرور موجود ہو گا!" اس قدر کہہ کر وزیر زراعت نے فائلوں کو الٹ پلٹ کرنا

شروع کردیا جو اُن کے سامنے بکھری پڑی تھیں۔

"خادم کا نام میر محمد مصطفےٰ ہے اور جناب والا میں ممبر اسمبلی میر علی احمد کا رشتہ دار ہوں۔"

"آں ـــ میر محمد مصطفےٰ! اب سمجھے یاد آیا۔ اچ ـــ چھا۔ اچھا۔ میر علی احمد کے برادر نسبتی۔ ٹھیک ہے۔ میں آپ کو اس جگہ کے تقرر پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ فن زراعت میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتے تھے۔ امید کہ آپ اس عہدے پر اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیں گے۔ ہماری اس نومولود قوم کو آپ جیسے ذہین نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

وزیر زراعت کی اس گفتگو کے باعث میر محمد مصطفےٰ اپنی اہمیت کو محسوس کرنے لگا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے اپنی گردن کو اُوپر اٹھایا، اور نہایت ادب سے پوچھا۔

"حضور والا، میرے فرائض کیا ہیں اور میں بہ حیثیت ماہر زراعت کس سکریٹریٹ سے منسلک رہوں گا؟"

وزیر صاحب نے اس مخصوص سوال پر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ انہیں اس قسم کے اچانک سوال کی توقع نہ تھی یا شاید ان کا ذہن کسی اور اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

"میں اپنے سیکریٹری سے بذریعۂ فون کہہ دوں گا کہ وہ زراعت کے ڈائرکٹر سے کہہ دے تاکہ آپ کو ضروری ہدایات مل جائیں۔" اور پھر کرسی سے اٹھ کر انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف مصافحہ کے لئے بڑھا دیا۔ "خدا حافظ۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ اپنی ذہانت وصلاحیت سے اس نو مولود ریاست کی ترقی میں یقیناً "نمایاں" حصہ لیں گے۔"

میر محمد مصطفےٰ نے اپنی چھوٹی چھوٹی نازک انگلیوں پر وزیر زراعت کے بھاری بھر کم ہاتھ کا وزن محسوس کیا، اور اسے ایسا لگا گویا وزیر زراعت کی سخت اور اعلیٰ شخصیت، تجربہ اور اہلیت کا نمونہ ہے جس نے گرم جوشی اور تعریفی کلمات کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا گیا۔ اس سے وہ بہت خوش ہوا اور یہیں اسے یہ بھی احساس ہوا کہ دراصل وہ اب تک احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ ورنہ وزیر زراعت کے خیالات بالکل صحیح ہیں۔ وہ رسمی انداز احترام کے ساتھ چند قدم پیچھے ہی پیچھے روانہ ہوا۔ اور کمرہ کے باہر نکلنے کے بعد اس نے ڈائرکٹر زراعت کے دفتر کا رخ کیا۔

حکومت کے دفاتر کے سامنے سنہری کام کئے ہوئے سرخ کوٹوں میں ملبوس چپراسیوں کو دیکھ کر اسے اکثر یہ احساس ہوتا تھا کہ ان میں اس کے مقابلہ میں مردانگی کی قدرے کمی ہے۔ اور جب وہ دفتر کے روشن اور طویل برآمدہ سے گذرا جو اپنے شکار پر نظر رکھنے والے باز کی طرح بلند و بالا عمارت کا ایک جزو تھا۔ تو اسے انسانیت کس مپرسی کی گہرائی میں گرتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اس کا خوب صورت انگریزی سرج کا سوٹ اس کی افسریت کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس لئے اسے کوئی چپراسی بھی روکنے کی جرأت نہ کرسکا۔ جب وہ ڈائرکٹر زراعت کے دفتر کے سامنے پہونچا تو اس نے نہایت بے نیازی کے ساتھ اپنا ملاقاتی کارڈ سیدھے ہاتھ سے نکال کر چپراسی کی طرف بڑھا دیا۔

چپراسی مرعوبیت کے عالم میں کارڈ لے کر قدرے جھکا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔

برآمدے میں اسے کوئی کرسی نظر نہیں آئی جس پر ملاقاتی انتظار کی گھڑیاں کاٹ سکتے۔ اس لئے میر محمد مصطفےٰ نے برآمدے کی کھڑکی پر جھکنا مناسب خیال کیا، اور نیچے کی منزل کی طرف اُچٹتی سی نگاہیں ڈالنی شروع کردیں۔ یکایک اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ عزت مآب وزیر زراعت کی گفتگو میں جو ٹال مٹول کا انداز تھا، اس کی وجہ غالباً اپنی کم علمی کو چھپانا مقصود تھا کہ ایک ماہر زراعت کے کیا فرائض ہوسکتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میر محمد مصطفےٰ کے ذہن میں یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اس کی موجودہ حیثیت بھی ایک فریب ہے ـــ ایک دھوکہ ہے کیونکہ اس نے نباتیات میں ڈگری حاصل کی تھی اور اس کے ذمہ ایک ماہر زراعت کے فرائض سونپے جارہے ہیں، حالانکہ وہ خود اس لفظ کے لغوی معنوں کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا۔ وقت گزرتا گیا اور وہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے اپنے بہنوئی کا کہنا مان کر غلطی کی ہے۔

جو زمینوں کو زیادہ پیداوار کے قابل بنانے اور پھلوں کی نشوونما میں بہتر طریقوں کو اپنانے۔ لہٰذا اس مشیر خاص کے تجربات و اخراجات بڑھنے ایک ماہر زراعت کی ضرورت ہو گئی تھی۔ دیا گیا۔ فن باغبانی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی ویسے ہی اس ریاست میں کمی تھی۔ کئی پشتوں سے اس ملک کے باشندوں نے کھیتی باڑی ترک کر کے اس کام کو بنیوں بقالوں کے سپرد کر رکھا تھا۔

میر محمد مصطفٰے کو جو ریاست کی اسمبلی کے ممبر کا برادر نسبتی تھا، مجبور کیا گیا کہ اگر وہ اس عہدے کے لئے درخواست دے دے تو اس کے لئے اس ملازمت پر فائز ہونے کے قوی امکانات ہیں۔ میر محمد مصطفٰے حال ہی میں غیر ممالک سے واپس آیا تھا جہاں اس نے Botany کی اعلیٰ ڈگری حاصل کی تھی اور اسے اس بات کا ہرگز یقین نہ تھا کہ وہ بحیثیت ماہر زراعت اپنے فرائض اچھی طرح انجام دے سکے گا۔ کیونکہ باہر کے دوران قیام میں اسے سفید اقوام کا یہ اصول بہت پسند آیا تھا کہ انسان کو ایک ہی شعبۂ علم میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ لیکن میر محمد مصطفٰے کے بہنوئی میر احمد علی نے یہ سن کر غصہ سے کہا:

"تم نے اپنے والدین کا روپیہ برباد کر دیا ہے! ایک ماہر نباتات اور ماہر زراعت میں آخر فرق ہی کیا ہوتا ہے؟ دونوں کا تعلق پودوں سے ہوتا ہے۔ اور میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تم کیوں اس عہدے کے اہل نہیں ہو سکتے؟"

میر محمد مصطفٰے کو یہ اچھا نہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنے بہنوئی کے گھر مفت کی روٹیاں کھاتا رہے۔ اس لئے اس نے مجبوراً اس ملازمت کیلئے درخواست دینا منظور کر لیا۔

اُسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ انٹرویو میں وہ اکیلا ہی امیدوار تھا اور چند دن بعد ہی اس کو ڈاک میں ایک خط بھی ملا جس میں یہ لکھا تھا کہ اس کا تقرر محکمۂ زراعت میں بحیثیت ماہر زراعت کیا جاتا ہے۔

میر علی احمد نے اپنے برادر نسبتی کے اس تقرر پر ایک ڈنر پارٹی دی اور اس میں ریاست کے معزز حضرات اور سرکاری افسران کو مدعو کیا۔ اس کے ساتھ ہی گھر کی عورتوں نے بھی ایک پیر کی درگاہ پر جا کر نذر و نیاز چڑھائی اور غریبوں کے بچوں میں مٹھائی بھی تقسیم کی گئی۔

محکمۂ زراعت کے دفاتر چونکہ ریاست کے مرکزی شہر جام جہاں نما میں تھے اس لئے میر محمد مصطفٰے اپنے بہنوئی میر علی احمد سے بغل گیر ہو کر جس کے منہ سے پیاز کی بُو آ رہی تھی، رات کی گاڑی سے جام جہاں نما کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہونچتے ہی ایک شاندار ہوٹل میں اس نے قیام کیا اور اپنے بہترین سوٹوں کو دھلوا کر ٹیلی فون کرنے میں تیزی سے مصروف ہو گیا۔ تاکہ وزیر زراعت سے شرف ملاقات کے لئے وقت طے کر سکے۔ لیکن تین روز کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے پتہ چلا کہ یہاں ہر چیز میسر ہو سکتی ہے بجز شرف ملاقات کے۔ بہر حال پانچویں روز تقریباً بارہ بجے پھلوں کی ایک ٹوکری نذر کرنے کے بعد میر محمد مصطفٰے کی ملاقات وزیر زراعت سے ہو گئی۔

نیچی آنکھوں اور شرمیلے تبسم کے ساتھ وہ وزیر زراعت کے سامنے بیٹھا تھا اور منتظر تھا کہ عزت مآب سلسلۂ گفتگو شروع کریں اور اسے ہدایات بھی دیں کہ بحیثیت ماہر زراعت اسے کیا کیا فرائض انجام دینے ہیں۔ میر محمد مصطفٰے ایک کمزور سا پستہ قد انسان تھا جس کا سینہ تنگ اور چہرہ بھی گوشت سے خالی خالی سا تھا۔ احساس کمتری کے باعث اس کی پیشانی کا پسینہ اس کے بالوں کو تر کر رہا تھا۔ اس کے برخلاف وزیر زراعت کافی صحت مند انسان تھے جن کی بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ سرخ سی رنگت ایک طرح کے وقار و تمکنت کا پتہ دے رہی تھی جو دوسروں کو بہت کچھ متاثر کر سکتی تھی دونوں کچھ عرصہ تک خاموش رہے اس کے بعد بڑی ہمت سے کام لے کر میر محمد مصطفٰے نے کہنا شروع کیا۔

میں اس لئے حاضر خدمت ہوا ہوں کہ حضور والا سے اپنے فرائض کی انجام دہی سے متعلق ہدایات حاصل کر دوں۔ غالباً حضور والا کو اس کا علم ہو گا کہ حضور نے فدوی کو بحیثیت ماہر زراعت مقرر کرنے پر اظہار خوشنودی فرمایا تھا:

"آں ___ ہاں ___ میں تمہارا نام بھول چکا ہوں خیر فائلوں میں ضرور موجود ہو گا!" اس قدر کہہ کر وزیر زراعت نے فائلوں کو الٹ پلٹ کرنا

شروع کردیا جو اُن کے سامنے بکھری پڑی تھیں۔

"خادم کا نام میر محمد مصطفےٰ ہے اور جناب والا میں ممبر اسمبلی میر علی احمد کا رشتہ دار ہوں۔"

"آں ـــ میر محمد مصطفےٰ! اب مجھے یاد آیا۔ آج ـــ چچا۔ اچھا۔ میر علی احمد کے برادر نسبتی۔ ٹھیک ہے۔ میں آپ کو اس جگہ کے تقرر پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ فنِ زراعت میں ایک ماہر کی حیثیت رکھتے تھے۔ امید کہ آپ اس عہدے پر اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیں گے۔ ہماری اس نو مولود قوم کو آپ جیسے ذہین نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

وزیرِ زراعت کی اس گفتگو کے باعث میر محمد مصطفےٰ اپنی اہمیت کو محسوس کرنے لگا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے اپنی گردن کو اُوپر اٹھایا، اور نہایت ادب سے پوچھا۔

"حضور والا، میرے فرائض کیا ہیں اور میں بہ حیثیت ماہر زراعت کس سکریٹریٹ سے منسلک رہوں گا؟"

وزیر صاحب نے اس مخصوص سوال پر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنا شروع کیا۔ انہیں اس قسم کے اچانک سوال کی توقع نہ تھی یا شاید ان کا ذہن کسی اور اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے کہا:

"میں اپنے سیکریٹری سے بذریعۂ فون کہہ دوں گا کہ وہ زراعت کے ڈائرکٹر سے کہہ دے تاکہ آپ کو ضروری ہدایات مل جائیں۔" اور پھر کرسی سے اٹھ کر انہوں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف مصافحہ کے لئے بڑھا دیا۔ "خدا حافظ۔ اور مجھے امید ہے کہ آپ اپنی ذہانت و صلاحیت سے اس نو مولود ریاست کی ترقی میں یقیناً نمایاں حصہ لیں گے۔"

میر محمد مصطفےٰ نے اپنی چھوٹی چھوٹی نازک انگلیوں پر وزیر زراعت کے بھاری بھرکم ہاتھ کا وزن محسوس کیا، اور اسے ایسا لگا گویا وزیر زراعت کی سخت اور اعلیٰ شخصیت، تجربہ اور اہلیت کا نمونہ ہے جس گرم جوشی اور تعریفی کلمات کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا گیا۔ اس سے وہ بہت خوش ہوا اور ہیں اسے یہ بھی احساس ہوا کہ دراصل وہ ابتک احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ ورنہ وزیر زراعت کے خیالات بالکل صحیح ہیں۔ وہ رسمی انداز احترام کے ساتھ چند قدم پیچھے ہی پیچھے روانہ ہوا۔ اور کمرہ کے باہر نکلنے کے بعد اس نے ڈائرکٹر زراعت کے دفتر کا رخ کیا۔

حکومت کے دفاتر کے سامنے سنہری کام کئے ہوئے سرخ کوٹوں میں ملبوس چپراسیوں کو دیکھ کر اسے اکثر یہ احساس ہوتا تھا کہ ان میں اس کے مقابلہ میں مردانگی کی قدرے کمی ہے۔ اور جب وہ دفتر کے روشن اور طویل برآمدے سے گذرا جو اپنے شکار پر نظر رکھنے والے باز کی طرح بلند و بالا عمارت کا ایک جزو تھا۔ تو اسے انسانیت کس مپرسی کی گہرائی میں گرتے ہوئے محسوس ہوئی۔ اس کا خوب صورت انگریزی سرج کا سوٹ اس کی افسریت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس لئے اسے کوئی چپراسی بھی روکنے کی جرأت نہ کرسکا۔ جب وہ ڈائرکٹر زراعت کے دفتر کے سامنے پہونچا تو اس نے نہایت بے نیازی کے ساتھ اپنا ملاقاتی کارڈ سیدھے ہاتھ سے نکال کر چپراسی کی طرف بڑھا دیا۔

چپراسی مرعوبیت کے عالم میں کارڈ لے کر قدرے جھکا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔

برآمدے میں اسے کوئی کرسی نظر نہیں آئی جس پر ملاقاتی انتظار کی گھڑیاں کاٹ سکتے۔ اس لئے میر محمد مصطفےٰ نے برآمدے کی کھڑکی پر جھکنا مناسب خیال کیا، اور نیچے کی منزل کی طرف اُچٹتی سی نگاہیں ڈالنی شروع کر دیں۔ یکایک اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ عزت مآب وزیر زراعت کی گفتگو میں جو ٹال مٹول کا انداز تھا، اس کی وجہ غالباً اپنی کم علمی کو چھپانا مقصود تھا کہ ایک ماہر زراعت کے کیا فرائض ہوسکتے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میر محمد مصطفےٰ کے ذہن میں یہ حقیقت بھی واضح ہوگئی کہ اس کی موجودہ حیثیت بھی ایک فریب ہے ـــ ایک دھوکہ ہے کیونکہ اس نے نباتیات میں ڈگری حاصل کی تھی اور اس کے ذمہ ایک ماہر زراعت کے فرائض سونپے جارہے ہیں، حالانکہ وہ خود اس لفظ کے لغوی معنوں کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا۔ وقت گذرتا گیا اور وہ یہی سوچتا رہا کہ اس نے اپنے بہنوئی کا کہنا مان کر غلطی کی ہے۔

انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وہ ڈائرکٹر زراعت کے آفس میں داخل ہوا۔ یہ حضرت اسی کی طرح کمزور اور منحنی سے آدمی تھے۔ اس لئے اسے جسمانی مماثلت کے باعث ان سے بے خوف گفتگو کرنے میں آسانی محسوس ہوئی۔ اور جب ڈائرکٹر زراعت نے مسکراہٹ کے ساتھ خالص لکھنوی انداز میں اس سے مصافحہ کیا تو میر محمد مصطفیٰ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنے اس افسر بالا سے بآسانی دوستی پیدا کر سکے گا۔ اس لئے کہ اس کا خیال تھا کہ ایک ماہر زراعت کو براہ راست ڈائرکٹر زراعت کے تحت ہی ہونا چاہئے۔ لیکن بدقسمتی سے اچھے اخلاق کا مظاہرہ ہم خیالی کی ضمانت نہیں ہوتا، بلکہ اکثر و بیشتر گفتگو کے بعد دوستی کے منافی تصورات پیدا ہو جاتے ہیں۔

"میں عزت مآب وزیر زراعت کے ایماء پر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ حال ہی میں میرا تقرر ماہر زراعت کی جگہ پر ہوا ہے......"

میر محمد مصطفیٰ اسی حد تک کہنے پایا تھا کہ ڈائرکٹر زراعت نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

"معاف فرمایئے، میر صاحب، مجھے کبھی یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ آپ جیسا مشہور سائنس داں میرا ماتحت بھی ہو سکتا ہے۔ ہم اپنی اس نئی جمہوریت میں سب کے سب مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور یقین مانئے اگر میں یہ کہوں کہ میں زراعت میں یورپی ڈگریاں رکھنے والوں کی بہت عزت کرتا ہوں۔ میرے والد کی کافی جائداد اودھ میں تھی، لیکن وہ سب اس لئے برباد ہوگئی کہ ہمارے خاندان کا ایک بھی فرد زراعت کے اصولوں سے واقف نہ تھا۔ عزت مآب وزیر صاحب نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے لیکن اس محکمہ کا چارج میں نے ایک ہفتہ قبل ہی سنبھالا ہے۔ اور مجھے اس کا مطلق علم نہیں کہ میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کو اس محکمہ کا کافی طویل عرصہ کا تجربہ ہو چکا ہے۔ میں ان کے نام ایک تعارفی خط لکھے دیتا ہوں، آپ ان سے کل ملاقات کرلیں۔

میر محمد مصطفیٰ پر ان الفاظ سے سکتہ کا عالم طاری ہو گیا، اور وہ یہ سوچنے لگا کہ ڈائرکٹر کا یہ مہذب انداز بیان صرف افسرانہ شان کا غماز ہے۔ جو ایک ایسے شخص میں پیدا ہونا فطری ہے جو اپنی لاعلمی دوسرے پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا —— یا پھر اس کے پس پردہ پیشہ کا حسد پنہاں ہے؟ بہر حال وہ کوئی قطعی رائے قایم نہ کر سکا۔ ڈائرکٹر نے البتہ دیانت داری سے کام لیتے ہوئے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ اس محکمہ سے متعلق زیادہ معلومات نہیں رکھتا۔ اسی لئے آخر کار میر محمد مصطفیٰ کو اس خیال کو صحیح سمجھنا پڑا۔ اس نے ڈائرکٹر کی بات ختم ہونے پر صرف اتنا کہا:

"جی —— بہت بہتر۔"

میر محمد مصطفیٰ کو دوسرے دن دفتر کے برآمدے میں پھر انتظار کی گھڑیاں گزارنے کے تصور سے کوفت ہونے لگی۔ اور اس کو سرج کے سوٹ کے اندر پسینے کی بوندیں سی محسوس ہونے لگیں۔ وہ اب تک یہ طے نہ کر سکا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اگر وزیر زراعت اور ڈائرکٹر زراعت کی طرح یہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھی ٹال مٹول کرنے والا نکلا تو پھر وہ کیا کرے گا۔

جب ڈائرکٹر نے تعارفی خط ختم کیا، اور میر محمد مصطفیٰ کو دیا، تو اس نے ایک سوال کرنے کی ہمت کر ہی ڈالی۔

"کیا —— کیا میں آج ہی اسسٹنٹ ڈائرکٹر سے مل سکتا ہوں؟ آپ —— آپ کی کیا رائے ہے؟"

"ہاں —— شاید —— کوشش کر دیکھئے، ممکن ہے وہ آج ہی آپ سے مل سکیں۔"

میر محمد مصطفیٰ نے مصافحہ کیا، اور ڈائرکٹر کے دفتر سے باہر آکر دوبارہ برآمدے میں قدم رکھا۔ اور دوبارہ چپراسی کو اپنا ملاقاتی کارڈ حوالے کرنے کے بدلے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے دفتر کے سامنے انتظار کرنا پڑا۔ لیکن اس کی قدرے ڈھارس اس امید سے بندھی کہ اس کی قسمت کا فیصلہ کم از کم اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے ساتھ لازماً ہو جائے گا۔ اس لئے متوقع ملاقات سے کچھ گھبراہٹ بھی محسوس ہونے لگی۔ لیکن بدقسمتی سے اسے کافی طویل عرصہ تک انتظار کرنا پڑا۔ غالباً اسسٹینٹ ڈائرکٹر بہت مصروف تھا جس کا اندازہ اسے دفتر میں جانے والے اور وہاں سے فائل لے کر نکلنے والے ماتحت عملہ کے افراد سے ہو رہا تھا۔ اس انتظار سے اسے ایسا محسوس ہونے لگا گویا اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی نظر میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔

وہ انہیں تصورات میں محو تھا کہ اس کے ہاتھ کو کسی نے کھینچا۔ جب وہ مڑا تو چپراسی نے اسے اندر چلنے کا اشارا کیا۔ مجبوراً اسے چپراسی کی اس حرکت کو برداشت کرنا پڑا۔ اور وہ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے دفتر میں داخل ہوا۔

اس افسر کی شخصیت اسے بڑی پراسرار سی محسوس ہوئی۔ وہ نہ مہذب تھا اور نہ غیر مہذب۔ لیکن اس کے انداز سے اس کی چستی کا ضرور پتہ چلتا تھا۔ اس نے میر محمد مصطفےٰ سے کاروباری لیکن ماہرانہ انداز میں مصافحہ کیا، اور اس کے بعد اس کی آنکھیں پھر سامنے بکھرے ہوئے فائلوں پر گڑ گئیں اس کے بعد اچانک اس نے کھڑے ہوئے میر محمد مصطفےٰ کی طرف دیکھا، اور ہاتھ کے اشارے سے اسے کرسی پر بیٹھنے کو کہا، اور بڑی تیزی سے یہ الفاظ اس کی زبان سے ادا ہوئے۔

"فرمایئے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں ؟"

اس کی گھنی بھنویں اور تیز آنکھیں میر محمد مصطفےٰ کی طرف سوالیہ نشان بنی ہوئی دیکھ رہی تھیں۔ میر محمد مصطفےٰ نے اس کی طرف تعارفی خط بڑھا دیا جو اسے ڈائرکٹر زراعت نے دیا تھا، اور خاموشی سے انتظار کرنے لگا۔

"اچھا ـــ اچھا، آپ ہیں ہمارے نئے ماہر زراعت !" بڑی حیرت و مسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے کہا۔ "میں کسی روز آپ سے اپنے ملک کی زراعتی حالت پر طویل گفتگو کرنا چاہتا ہوں، تاکہ آپ کے مشورے سے مستفید ہو سکوں۔"

"جناب والا، میں اپنے عہدے کا چارج لینے آیا ہوں، اور یہ بھی معلوم کرنے حاضر ہوا ہوں کہ میں کس دفتر میں اپنا کام شروع کروں" میر محمد مصطفےٰ نے کہا "تاکہ پھر ہم ایک روز مل کر مختلف مسائل زراعت پر گفتگو کر سکیں۔"

"اوہ ـــ لیکن" اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے کہا ـــ "میرا خیال ہے کہ سکریٹریٹ کی عمارت میں مزید جگہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اور ـــ اور شاید میں چند ماہ تک آفس کے لئے ایک کمرہ بھی نہ دے سکوں۔ مجھے اس کا بھی علم نہیں ہے کہ آپ کے قطعی فرائض کیا ہیں۔ مشرقی علاقے میں کئی ٹریکٹر ایسے پڑے ہوئے ہیں جنہیں درست کرنے کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پہلے ان کی درستی کا کام اپنے ذمہ لے لیں۔"

"لیکن جناب، میں یہاں ـــ میرا مطلب ہے کہ میرا تقرر دراصل غلط جگہ پر ہوا ہے۔ میں نے ڈگری نباتیات میں حاصل کی ہے، اور میرے برادر نسبتی نے مجھے مجبور کیا کہ میں ماہر زراعت کی نوکری کے لئے درخواست دوں۔ میرا خیال ہے کہ میں تھوڑی کوشش کے ساتھ زراعت کے فن کو سیکھ سکوں گا لیکن میں انجینئر نہیں ہوں اور ٹریکٹر کی مشینری سے تو قطعی ناواقف ہوں۔"

"ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ" ـــ اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے کہا ـــ "اگر آپ چند ماہ کی محنت کے بعد فن زراعت کو سیکھ سکتے ہیں تو ٹریکٹر کی درستگی کے کام پر نگرانی کرنے کے فن کو بھی کسی مستری سے چند ماہ میں سیکھ سکتے ہیں۔ انسان کو ہر کام سیکھنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔"

"لیکن جناب۔ مشینری سے میرا تعلق کبھی نہیں رہا!"

"ہم ایک نئی مملکت کے باشندے ہیں" ـــ ڈائرکٹر نے کہا ـــ "اور ہمیں جس حد تک ممکن ہو بہتر طریقے سے فرائض انجام دینا چاہئیں، اور پھر اب آپ سے چھپانا کیا۔ دراصل بات تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ ایک "ماہر زراعت" کے فرائض میں کیا چیز داخل ہے ؟"

"مجھے یہ توقع تھی کہ میں زراعت کے متعلق کافی معلومات حاصل کر کے اس لائق ہو جاؤں گا کہ حکومت کو مشورہ دے سکوں، اور اسے بتاؤں کہ کس طرح اچھی فصلیں حاصل کی جا سکتی ہیں۔ اور خاص طور پر "اناج زیادہ اگاؤ" کی مہم کو کس طرح کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ایک "تجرباتی فارم" بنایا جا سکتا ہے جو بطور نمونہ ہوگا۔ اور اس میں مخصوص لوگوں کو ملازمت بھی دی جا سکتی ہے۔ تاکہ اس کے باعث ٹھوس نتائج پیدا ہو سکیں۔"

"اور ہاں ـــ مجھے ابتدا سے ہی اپنی روئداد سنانی چاہئے۔ میرا تقرر بھی آپ کی طرح غلط جگہ پر ہوا تھا۔ اور جس طرح آپ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص کے

دستے وہی کام ہونا چاہئے جس میں وہ ماہر ہے ۔۔۔ ایسا اس محکمہ میں کبھی نہیں ہوا۔ آپ کی تنخواہ کے لئے بھی گنجائش نکالنا بڑا مشکل مسئلہ تھا لیکن
ہم لوگ آپ کے عزیز میر علی احمد صاحب کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے اس ملازمت میں آپ کو مزید معلومات بھی حاصل کرنی ہوگی۔
پاس ایسے آدمیوں کی کمی ہے جو یہ مشورہ دے سکیں کہ پھلوں کی بیماریوں کا تدارک کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام بھی آپ کے
کردوں ۔

"لیکن جناب"۔ میر محمد مصطفےٰ نے احتجاجاً کہا۔ میں پھلوں کے امراض کی الف ب بھی نہیں جانتا؟"

"دیکھئے میر صاحب، آپ کو روزی پیدا کرتی ہے"۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر نے کہا۔ "فروعی باتوں میں جانے سے کیا فائدہ؟ آپ کے لئے بہتر
راہ یہی ہے کہ آپ مشرقی علاقہ میں چلے جائیں، اور چھ سات ماہ تک وہاں کے حالات کا جائزہ لیں۔ جب تک آپ مجھے وہاں کے حالات سے متعلق کچھ
رپورٹ ڈائرکٹر صاحب کی تسلی کے لئے بھیجتے رہیں گے، اس وقت تک ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ یہ مدت آپ کے "ماہر زراعت"
بننے کے لئے کافی ہے۔ اب آپ ہی بتلایئے۔ میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ کی اس ہمدردی کا دلی شکریہ"۔ میر محمد مصطفےٰ نے کہا۔

اور اس نے اپنا رخ باہر کے دروازے کی طرف اس طرح کیا، گویا اس نے اپنے ضمیر کی سلطنت کو فتح کر لیا ہے۔ اور مشرقی علاقہ میں جانے
کا فیصلہ کر لیا۔ تاکہ وہاں جا کر وہ فن زراعت کا مطالعہ کر سکے۔

"بہت اچھا، تو میں ہوائی جہاز سے آپ کی روانگی کا انتظام کردوں گا۔ آپ وہاں جا کر ہمارے دفتر سے ہدایات حاصل کریں۔ شہر سے
آپ کے لئے وہاں ایک شاندار ڈاک بنگلہ میں قیام کا انتظام ہوگا، تاکہ آپ اطراف کے ہرے بھرے کھیتوں کا بآسانی مطالعہ کر سکیں"۔

"بہت اچھا جناب"۔ میر محمد مصطفےٰ نے کہا۔

"اچھا تو کل میں آپ کے کاغذات آپ کی قیام گاہ پر بھیج دوں گا۔ خدا حافظ"۔

میر محمد مصطفےٰ اسسٹنٹ ڈائرکٹر کے کمرے سے نکلا، اس کا چہرہ عجیب متغیر سا تھا۔ گویا وہ خود ایک سوالیہ نشان ہے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد
اس کے چہرے کا سوالیہ نشان مسکراہٹ میں بدل گیا ۔۔۔

خواجہ احمد عباس

ایک سفر نامہ

میں اس مضمون کا عنوان "ہم نے سوویت دیس تلاش کرلیا"، رکھنا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اس حیرت انگیز اور ہیجان خیز سفر کے متعلق ہمارے تاثرات اس عنوان سے اچھی طرح نہ تو واضح ہوں گے اور نہ ہی یہ ان کا لب لباب ہوگا۔ دراصل ہم میں سے بیشتر کے لئے جو روسی کلاسکی ادب اور جدید سوویت ادب سے واقفیت رکھتے ہیں، جنھوں نے ہندوستان میں دکھائی جانے والی تمام سوویت فلمیں ایک بار نہیں بلکہ بار بار دیکھی ہیں اور جنھوں نے اپنے دوستوں سے گھنٹوں باتیں کی ہیں، اس سفر کی حیثیت "سفر تلاش" کی نہیں بلکہ تلاش مکرر کی تھی یہ پہلا سفر نہیں بلکہ دوسرا سفر تھا ہمیں ایک نئے اور اجنبی ملک میں کھو جانے کا احساس نہیں ہوا بلکہ پرانے دوستوں سے ملنے اور مانوس مقامات کی سیر کا احساس ہوا!

ماسکو میں ہم تھیٹر اور فلم کے جن ممتاز فنکاروں سے ملے اُن میں سے کچھ ہمارے پرانے دوست تھے اور ہم ایک دوسرے سے اسی طرح ملے بھی۔ کیونکہ وہ ہندوستان گئے تھے تو وہیں اُن سے ہماری ملاقات ہو چکی تھی۔ ان کے علاوہ بہت سے ہمیں اس لئے مانوس نظر آئے کہ اُن کے پیکر ہم سوویت فلموں میں دیکھ چکے تھے۔ زبان بھی ناقابل عبور رکاوٹ نہ رہی۔

ہمارے نہایت کارگزار اور محنتی ترجمانوں کے جتھے کے علاوہ ہمیں ہر جگہ غیر ملکی زبانوں کے علمی اداروں کے نوجوان مرد اور عورتیں ملیں وہ ہم سے یا تو انگریزی میں یا پھر خود ہماری کسی نہ کسی زبان میں ـــــ ہندوستانی، بنگالی اور کم از کم ایک بار لینن گراڈ میں پنجابی زبان تک میں گفتگو کرتے!

مجھے شک ہے کہ مہمانوں سے مروت کا سلوک کرنے کی کوشش میں رسمی اخلاق سے پیش آنے کی وجہ سے اس قدر ہر دلعزیزی اور عوام الناس میں جوش و خروش کا اتنا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے جو کہ ہمارے وفد کے فنکاروں کے پہنچنے پر ہر جگہ دیکھنے میں آیا۔ یہ فلمی ستاروں کے شائقین کا معمولی اظہار پسندیدگی نہ تھا جو کہ ہمیں ان ملکوں میں نظر آتا ہے۔ جہاں تجارتی مقاصد کے لئے ستارے بنائے اور اچھالے جاتے ہیں۔ فلمی فنکاروں کی تعریف اور اظہار پسندیدگی سے بھی یہ کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس "کچھ" کی جھلک بعض اوقات کسی بوڑھے کے ہاتھ اٹھانے کے انداز میں نظر آتی جو "انڈو سوویتکی ناردوی" کہتے ہوئے اپنے ہاتھ باندھ کر اتحاد کا واضح اشارہ کرتا۔

ہندوستان سے سوویت عوام کی والہانہ محبت کا راز یہ ہے کہ وہ وزیر اعظم نہرو کی امن کی پالیسی پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ماسکو میں یا سوویت یونین کے کسی اور شہر میں عام اجتماعات میں یا نجی گفتگو میں ان کا نام لیتے ہی لوگوں کے چہرے مسرت سے کھل اٹھتے ہیں۔ جلسوں میں، استقبالیہ دعوتوں اور ضیافتوں میں بارہا ایسا ہوا کہ نہرو کا نام آتے ہی تالیوں کا ایک طوفانی شور بلند ہو جاتا ـــــــ جو ایک بار تو پانچ منٹ تک رہا۔ ان کے اعزاز میں داد کا کے بہت سے جام خالی ہوئے اور تبلیسی (طفلس) میں جب سوویت یونین کے دوست، امن کے دوست نہرو کا جام صحت تجویز کیا گیا تو عورتوں نے روائتی لوک گیت گانا شروع کر دیا جس میں انہیں ہزاری ہونے کی دعا دی گئی۔

عوام!

سوویت عوام! سب سے زیادہ عوام ہی نے ہمارا شوق جستجو ابھارا۔ ہماری دلچسپی کا مرکز بنے، ہمیں مسحور کر دیا ـــــــ پارکوں اور محلوں سے زیادہ، تھیٹروں اور سنیماؤں، فیکٹریوں اور فارموں سے بھی زیادہ کیونکہ عوام ہی فیکٹریاں ہیں، عوام ہی فارم ہیں، عوام ہی سوویت یونین ہیں۔ ہم مختلف مقامات کو نہیں بلکہ عوام کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اور انہیں ہم نے دیکھا بھی ہزاروں کی تعداد میں، سنیما کے تماشائیوں سے میل جول کے جلسوں میں ـــــــ دوستوں کا ایک جم غفیر ہوتا۔ ان کے طوفانی نعرہ ہائے تحسین ہمیں تند و تیز شراب کی طرح مخمور کر رہے تھے جس کے اثر سے رخسار دہکنے لگتے ہیں اور دماغ پر سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن ہم انہیں کام کرتے، اپنی فرصت اور آرام کا وقت گذارتے دیکھنا چاہتے تھے ماسکو میں ہم نے انہیں کام پر جاتے ہوئے دیکھا، میٹرو (زیر زمین ریل) اسٹیشنوں اور ریل گاڑیوں کی بھیڑ میں دیکھا، دینامو اسٹیڈیم میں ہم ایک لاکھ کے مجمع میں ان کے ساتھ بیٹھے اور سوویت یونین اور ہنگری کے درمیان فٹ بال کا میچ دیکھا۔ یہ فٹ بال کے شوقینوں کا ہنسوڑ، مسرور لوگوں اور کھلنڈروں کا مجمع تھا جو دنیا میں ہر جگہ آپ کو نظر آئیگا، بمبئی کے دلبھ بھائی پٹیل اسٹیڈیم میں، لندن کے لارڈز کرکٹ گراؤنڈ میں یا نیویارک کے ہاکی بیس بال اسٹیڈیم میں۔ ماسکو والے یقیناً کھیلوں کے بڑے ہی شوقین ہیں اور اپنی ٹیم کی بڑے جوش و خروش کے ساتھ مست ہو کر حمایت کرتے ہیں۔ لیکن ماسکو کا یہی مجمع بالشوئی تھیٹر کی گیلریوں میں ٹھسا ٹھس بھر کر پشکن کے رومانی قصے پر مبنی اوپیرا "لدمیلا اور روسلان" میں گلنکا کی موسیقی اسی جوش اور جذبے کے ساتھ سراہتا۔

آہستہ آہستہ عام مجمع سے افراد ابھرنے لگے، سوویت زندگی کی تیز رو مگر واضح جھلکیاں ہمیں نظر آنے لگیں ـــــ ہوٹل کی ایک خادمہ ان کی ڈیوٹی پر پشکن کا کلام پڑھ رہی ہے، فولاد کے کارخانے کے مزدور ماپاکووسکی کے ڈرامے کی ریہرسل کر رہے ہیں، ایک جفت ساز کی لڑکی جوتے کی فیکٹری سے نئی تہذیب محل میں بیلے رقص کا شاندار مظاہرہ کر رہی ہے، رات کے وقت مزدور اپنے کلب گھر کی لائبریری میں فلسفہ، اقتصادیات، عمرانیات اور سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کر رہے ہیں، ایک ٹیکسی ڈرائیور ادبی رسالہ "نئی دنیا" کا مطالعہ کر رہا ہے اور اپنے مسافروں سے بیلے رقص کرنے والی فنکار اولانودا اور مایا پلیسیکایا کے فن رقص کا مقابلہ کرتے ہوئے بحث کر رہا ہے۔

ماسکو سے ہم لینن گراڈ گئے جو یقیناً سوویت یونین کا سب سے زیادہ دل کش حسین شہر ہے۔ لیکن کسی شہر کو خوبصورت بنانے والے وہاں کے مقامات یا پارک نہیں بلکہ عوام ہوتے ہیں۔ اور یہ دیکھ کر ہم بہت ہی متاثر ہوئے کہ لینن گراڈ کے لوگوں نے اپنے شہر اور خود اپنے چہروں پر سے جنگ کے نشانات مکمل طور سے مٹا دیئے ہیں۔ مشکل ہی سے کسی کو یقین آئیگا کہ یہ وہی شہر ہے کہ جنگ کے دوران میں طویل محاصرے اور مسلسل بمباری کی وجہ سے جس کی تباہی نہایت شدید اور بھیانک تھی اور "باغ فتح" کے نوخیز درخت وجہ لوگوں نے اسی جگہ لگائے ہیں جہاں تباہی سب سے زیادہ شدید تھی، لینن گراڈ کے عزم کی علامت ہیں کہ جنگ کی تباہ کاریوں کے تمام نشانات مٹا دیئے جائیں۔

اور پھر ہم سوویت یونین کے شمالی علاقے سے پرواز کر کے جنوبی خطے میں پہنچے۔ تاشقند میں ہمارا پہنچنا کئی اعتبار سے گویا اپنے گھر میں پہنچ جانا تھا۔ ذاتی طور پر اس علاقے سے میری خاندانی وابستگی ہے کیونکہ سمرقند کے آس پاس کے علاقوں سے ہی میرے آبا و اجداد کئی صدیوں قبل ترک وطن کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ لیکن ازبکستان کی فضا اور کلچر میں ہم سب کے لئے اپنے پن کا لمس تھا۔ تاجکستان سوویت یونین کا وہ حصہ ہے ہندوستان کی سرحد [illegible] ریاست پر کچی راستوں کی دریافت کی

وجہ سے گہن لگنے سے پہلے ازبکستان اور ہندوستان کے درمیان باقاعدہ تجارتی اور تہذیبی تعلق قائم تھا۔ شیریں فرہاد، اور لیلیٰ مجنوں کی عالی
داستانیں ہندوستانی ادب اور ازبکستانی ادب کا مشترک ورثہ ہیں۔
قدیم تہذیبی تعلق اور قربت کا اظہار اُن ہزاروں الفاظ سے ہوتا ہے۔ جو ازبیک اور ہندوستانی میں مشترک ہیں۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ
زندگی کی اہم ترین ضرورتوں کا اظہار کرنے کے لئے میں وہی الفاظ استعمال کر سکتا ہوں جو تاشقند میں اتنے ہی عام ہیں جتنے کہ دھلی میں ـــــ
روٹی نان ہے، ازبیک کا نشیش کباب، ہندوستان کا سیخ کباب ہے، نفظ، انقلاب، دمحنت، اور شرکت، دمعنی اجتماعی، دونوں قوموں کی
زبانوں میں مشترک ہیں۔ ازبیک زبان میں بول چال کے سب سے زیادہ عام الفاظ رحمت اور مرحمت سے ہندوستانی کان نا آشنا نہیں۔
تاشقند میں ہم نے نوائی اوپیرا ہاؤس دیکھا جو فن تعمیر کا ایک ایسا پیکر ہے جس کا حسن حیران و ششدر کر دیتا ہے، جو ایک مثال ہے کہ
فن تعمیر کی قومی روایات جدید زندگی کی ضرورتوں میں سموئی جا سکتی ہیں ہم نے ازبکستان کے مشہور فنکاروں کے گیت سُنے اور رقص دیکھے۔
خوبصورت نوجوان گلنار خوش گلو حلیمہ ناصروا، گا لیا اسما علیوا ـــــ اور پھر ہماری پرانی دوست مکرم ترغون بائیوا جن کے ہندوستانی رقصوں
نے انہیں ہمارے ہم وطنوں میں خاص طور پر مقبول کر دیا تھا جبکہ وہ سوویت کلچرل ڈیلی گیشن کے ساتھ ہندوستان گئی تھیں۔
تاشقند ہی میں ہم نے سب سے پہلا پنچایتی فارم ـــــ استالن کولخوز دیکھا جو تاشقند کے قریب ہی واقع ہے۔ دہاں ہم نے
دیکھا کہ اجتماعیت کے اصولوں نے کس طرح ان پڑھ اور پسماندہ کسانوں کو باشعور، مہذب، مشینوں سے مانوس سوویت ـــــ
شہری بنا دیا۔ دراصل چونکہ ہمیں اس علاقہ کی انقلاب سے پہلے کی عام پسماندگی کا علم تھا وہی حالت ـــــ
تھی جو افغانستان، ایران اور ہندوستان کے اُس سے لمحقہ خطوں میں پائی جاتی تھی، اس لئے ہم سوویت ازبکستان کی ترقی کی رفتار پر اظہار حیرت
کئے بغیر نہ رہ سکے۔
۳۵ برس ہوئے کہ اس پورے علاقے میں ایک بھی تعلیمی ادارہ نہ تھا جبکہ آج وہاں ہزاروں اسکولوں کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے ۳۴ ادارے
ہیں جن میں ایک یونیورسٹی، آرٹس اور سائنس کالج، سائنس اکاڈمی اور غیر ملکی زبانوں کا ایک علمی ادارہ بھی شامل ہے۔
تاشقند ہی نے ہمیں تمام جمہوریتوں کی قومی تہذیب کے ارتقاء کے سوویت نظام سے روشناس کرایا کیونکہ ہم نے دیکھا کہ ازبکستان
کے لوگ یونیورسٹی تک کی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کر رہے ہیں، ازبیک قومی رقص اور موسیقی کو ترقی دی جا رہی ہے، اُن کی
قومی طرز تعمیر جدید عمارتوں میں بھی برقرار رکھی گئی ہے
تبلیسی کے لوگوں کی محبت کی گرمجوشی اس شہر کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رکھیگی۔
انگور کے کولخوز میں گذارے ہوئے چند گھنٹوں کی یاد اب بھی تازہ ہے جبکہ ہم نے انگور کے چمن میں رسدار انگور کے خوشوں میں
کھانا کھایا اور جارجیا کے لوک باجوں کی دھنیں سُنیں۔ جارجیا کے لوگ یقیناً سنگیت کے رسیا اور سر تال کی سوجھ بوجھ رکھنے والے معلوم
ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی تمام کیفیتیں ـــ حتیٰ کہ پیغام تہنیت بھی ـــــ دعوت کے وقت گیتوں اور ناچوں کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں
ہم اُن بیحد حسین اور کومل نوجوان لڑکیوں اور بانکے سجیلے نوجوانوں کو جو سب کے سب کولخوز کے کاشتکار تھے ـــ کبھی فراموش نہیں
کر سکتے جو گاتے اور ناچتے انگور کی بیلوں کی اوٹ سے نکل کر ہمارا خیر مقدم کرنے آئے اور بعد میں ہم میں بہتوں کو اپنے ناچوں میں شریک ہونے کو
راضی کر لیا۔ یہ جارجیا کے کسان کی ایک حسین قومی روایت کا اظہار تھا ـــــ لیکن اس کی پر مسرت تکمیل خوش حالی اور آزادی کی فضا
ہی میں ممکن تھی جس کی ضمانت محنت کش عوام کو سوویت نظام کرتا ہے۔
تبلیسی ایک خوبصورت شہر ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ کسی پہاڑی کی چوٹی سے دیکھا جائے۔ جارجیا کے دیہاتی مناظر خوبصورت
ہیں، خزاں میں بھی جبکہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تانبے کا ملمع کر دیا ہو۔ بہار میں تو حسن دوبالا ہو جاتا ہوگا۔ ایسے دلکش کوہستانی مناظر سے
لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم استالن کی جائے پیدائش گوری پہنچے تاکہ اس انسان کی یاد کو خراج عقیدت پیش کریں جس نے لینن کے ساتھ

سوویت یونین کی شاندار تعمیر شروع سے لے کر آخر تک مکمل کی۔ ہم نے عجائب گھر دیکھا جہاں نوجوان انقلابی کی حیثیت سے جارجیا میں استالن کی زندگی سے متعلق یادگاریں محفوظ ہیں۔ بعد میں ہمیں زمین دوز چھاپہ خانہ اور مشین دیکھنے کا ہیجان خیز تجربہ ہوا جسے کسی زمانے میں استالن چلایا کرتے تھے۔

اور پھر اسی طرح ہم بہاڑی و ساحلی صحت گاہ سوچی پہنچے جہاں ہر آئے ہوئے خوش و خرم لوگوں کے مجمعے نظر آتے ہیں۔ ہم نے کانکنوں، کارخانوں کے مزدوروں اور سرخ فوج کے سپاہیوں کو اپنی چھٹیاں گذارتے اور سینیٹوریموں میں اپنی صحت بحال کرتے دیکھا جو بقول ہمارے وفد کے ایک رکن، زار کے محلوں سے کچھ کم پر تکلف نہیں ہیں

استالن گراڈ میں ہم نے اپنا سفر سوویت یونین ختم کیا۔

ہم نے اس تباہی و بربادی کے متعلق سب کچھ پڑھا تھا جو استالن گراڈ کی لڑائی کی وجہ سے ہوئی تھی بلکہ ہم نے خبروں کی فلموں میں اس تباہی کے مناظر دیکھے بھی تھے لیکن وہاں پہنچنے سے پہلے ہم اس نقصان کی پوری کیفیت کا کبھی تصور تک نہ کر سکتے تھے بم گرنے کی وجہ سے زمین پر پیدا ہونے والے بڑے بڑے شگاف تو ہمیں استالن گراڈ کے ہوائی اڈے پر اترنے سے پہلے ہوائی جہاز سے ہی نظر آ رہے تھے۔ شہر سے باہر گرد و نواح میں لکڑی کی بنی ہوئی عارضی جھونپڑیوں کی میلوں لمبی قطاروں اور خود شہر کی ہر عمارت کے حیرت انگیز نئے پن سے اس زمانے کی بھیانک یاد تازہ ہو رہی تھی جبکہ استالن گراڈ میں کوئی ایک عمارت بھی ایسی نہ بچی تھی جو کھنڈر نہ بن چکی ہو۔ استالن گراڈ کے تاریخی اور بہادرانہ معرکے کی۔ داستان جہاں سوویت فوج نے ہٹلریوں کے بے پناہ اور بے مثال حملوں کا مقابلہ کیا اور انہیں پیچھے ڈھکیل دیا، جنگ کی ان مختلف یادگاروں میں نظر آتی ہے جو پورے شہر میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔

مسرور و شادماں تبلیسی اور فکر و تردد سے آزاد سوچی سے آنے کے بعد استالن گراڈ ہمیں سوویت یونین کی باقی تمام جگہوں کے لوگوں سے نسبتاً زیادہ پرسکون اور شکل و صورت میں زیادہ سنجیدہ نظر آیا اور خوشحال بھی نسبتاً کچھ کم۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں ہے۔ کیونکہ استالن گراڈ کا ایک کنبہ بھی ایسا نہیں ہے جس کا ایک نہ ایک فرد جنگ میں کام نہ آیا ہو۔ ایسے تو بہت ہیں جن کے ہاں سب لوگ ـــــــ اور جن کا سب کچھ ختم ہو گیا۔

استالن گراڈ میں تعمیر بڑی تیز رفتار سے انجام دیا جا رہا ہے لیکن پھر بھی اس بہادر شہر کو جنگ کے تمام نشانات مٹانے میں اب بھی کئی برس لگ جائیں گے۔ ہم دریائے والگا کے ساحل پر مامائیف پہاڑی پر پہنچے جہاں سب سے زیادہ گھمسان کا رن پڑا تھا۔ گیارہ برس گذر جانے کے بعد آج بھی وہاں بموں کی کرچیاں زمین پر پڑی مل جاتی ہیں۔ یہاں زمین پر فولاد کے اس قدر ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے کہ کئی برس تک تو اس پہاڑی پر گھاس بھی نہ اگ سکی۔ لیکن اب ہم نے دیکھا کہ آخر کار موت کی پہاڑی، پر بھی گھاس اگنے لگی ہے ـــــــ اور جلد ہی پھول بھی کھلنے لگیں گے کیونکہ استالن گراڈ شہری سوویت اسی جگہ باغ فتح، لگانے کا منصوبہ بنا رہی ہے ـــــــ تباہی اور موت سے ٹکرا کر زندگی اور خوبصورتی ابھر رہی ہے۔

اور پھر واپس ماسکو۔ سوویت یونین میں بنائے ہوئے ہنگامہ خیز مہینے کی پر مسرت یاد لے کر ہم واپس جا رہے ہیں: ان خوبصورت مقامات کی یاد جو ہم نے دیکھے، فن کی حیرت انگیز تخلیقات کی یاد اور سب سے زیادہ دوستدار گرمجوش اور امن پسند لوگوں کی یاد جو ہمیں ہر جگہ ملے اور ہم واپس جا رہے ہیں اس مکمل یقین کے ساتھ کہ سوویت عوام تہہ دل سے امن کے خواہشمند ہیں اور ہندوستان کے عوام کے وہ سچے اور مخلص دوست ہیں۔

سودا نگاہِ دیدۂ تحقیق کے حضور
جلوہ ہر ایک ذرہ میں ہے آفتاب کا

قرۃ العین حیدر

امبوا تلے ڈولا رکھ دے مسافر

سورج جس سمے جامنوں کے پیچھے پہنچتا تب گھوڑا گاڑی اپنی پنچ تلی رفتار سے جلتی ہوئی ندی کے پل پر آجاتی تھی۔ یہ وقت عموماً جھٹ پٹے سے ذرا بعد کا ہوتا۔ اِکّا دُکّا راہگیر۔ بیل گاڑیاں۔ اکّے۔ زرد اور اُودے ہنگے پہنے عورتیں۔ یہ سڑک اس راستے سے مختلف تھی جس پر ہمیشہ طویل کاریں اور سائیکلوں پر سوار لڑکیوں کے غول گذرا کرتے تھے۔ ادھو نشاد گنج کی بستی تھی جو سول لائینز کے کنارے ہونے کی وجہ سے تقریباً مضافات میں شامل تھی۔ یہاں سے گنے اور ارہر کے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے شفاف تالاب، اور امرودوں کے جھنڈ۔ پیپل تھی۔ اس کے آگے انگریزوں کا قبرستان۔ اس کے آگے جدھر ندی اپنا رُخ تبدیل کر کے بل کھاتی دوسرے ضلع کی سمت روانہ ہو جاتی تھی وہاں شمشان گھاٹ تھا۔

گھوڑا گاڑی شام کے کاسنی، گلابی، نارنجی روشنی میں خراماں خراماں جلتی ندی کے پل تک پہنچتی۔ اس کے آگے سڑک بڑی بڑی، سفید پھولوں والی جھاڑیوں سے گھر گئی تھی۔ یہاں اُدھر اُدھر بڑے درختوں کی کوٹھیاں درختوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ پل سے اتر کر کول تار کی سیدھی شفاف سڑک پر جانے کے بجائے گاڑی واپس لوٹتی میں فٹن اس سڑک پر اتر آتی گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھا مزے میں سر جھکائے چلا جاتا۔ بٹیا سنگھار کے والی کوٹھی پر ٹھہرے گا؟ وہ جھک کر دریافت کرتا۔

یہ کہانی اب یہاں سے میں سنا رہی ہوں۔ داستان گوئی کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ میری سمجھ میں ایک طریقہ بھی نہیں آرہا کون کردار زیادہ اہم ہیں۔ قصہ شروع کہاں سے ہوا۔ کلائمیکس کہاں تھی۔ ہیروئن کا انجام کیا ہونا چاہئے تھا۔ کماں ایک زمانہ میں کہا کرتا تھا کہ وہ ایک روز بیٹھ کر سب طے کرے گا۔ کماں اب تک یہ طے نہیں کر پایا پھر چمپا باجی سے پوچھنے بھلا کون جائے۔ کل کماں کی چھوٹی بچی اپنی ماں سے دریافت کر رہی تھی۔ ممی۔ پھوپی بیگم کہتی ہیں کہ چمپا باجی ہر سنگھار اور ٹیسو کے پھولوں میں دوپٹے رنگا کرتی تھیں۔ اور جب بسنت آتی تھی تو ———— ممی یہ بسنت کیا ہوتی ہے۔ چمپا باجی اب ذرا تم اس بچی کو آکر بتلاؤ وہ بسنت کیا ہوتی تھی۔ بچے جو یہاں پیدا ہوئے ہیں۔ بڑے ہوتے ہیں ان کو یہ معلوم نہیں بسنت کیا ہے۔ ساون بھادوں کی جھڑیاں کیسے پڑتی ہیں۔ گڑیوں کے تہوار کا مطلب کیا تھا۔ چمپا باجی کیا مجھے افسوس کرنا چاہئے کہ ہر سنگھار کے اور ٹیسو کے سارے سرخ پھول غائب ہو گئے۔ سرسوں کے کھیت جھکے ہوئے سناٹے۔ جامنوں کے باغ پر امنڈنے والے بادل، پالا۔ دور

دراز ترائی کے جنگلوں میں سیٹیاں بجاتی ہوائیں۔ سڑکوں کی ٹھنڈی کیچڑ پر سے گذرنے والی بیل گاڑیاں۔ کھرنیوں کے جھنڈ سب گم ہوگئے اب محض خلا ہے؟ خلا میں کیا تم کو اپنی آواز بازگشت سنائی دیتی ہے؟ یہ اجنبی شور جو چاروں طرف مچ رہا ہے اس میں میری آواز بھی کہیں ڈوب گئی ہے۔

ہاں چلیں گے۔ میں گنگا دین کو جواب دیتی اور گھوڑا گاڑی آہستہ آہستہ پل پر سے اتر کر ندی کے کنارے والی سڑک پر آجاتی۔ یہاں ہو کا عالم تھا، مکمل، ابدی، سناٹا، ندی کے پانی میں موتی محل کی روپہلی عمارت کے سائے لرزا کرتے۔ دوسرے پل کے ادھر چھتر منزل کا سنہرا گنبد لہروں پر پڑا جھلملاتا۔ اس سے آگے نجف اشرف کا امام باڑہ تھا۔ دریا ان عمارتوں کی سیڑھیوں کے نیچے مؤدبانہ بہتا رہتا۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں پانی کی موجیں گہری سبز دکھلائی پڑتیں۔ کبھی کبھی اس ہریالی میں سے تیرتی ہوئی کوئی ڈونگی گذر جاتی۔ سنگ سرخ کے پل کے نیچے مندر کے چبوترے پر بندروں کا اکھاڑہ جمع رہتا۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کی سیڑھیاں بھی پانی میں اترتی تھیں۔ کوٹھی کی ہشت گوشہ برجیاں کائی کی وجہ سے گہرے ہرے رنگ کی ہو چکی تھیں۔ برسات کے مہینوں میں یہ کائی پانی اور آسمان اور سبزہ پس منظر کا ایک لازمی جزو معلوم ہوتی۔ اس میں گھل مل کر رہ جاتی۔ جاڑوں میں یہاں ہلکی زرد کہر آلود روشنی پھیلی رہتی۔ جامنوں کے پیچھے سے سورج نکلتا اور اس کی پیلی پیلی لکیریں سارے میں تیرتیں۔ جن میں آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھو تو رنگ برنگے ذرے اڑتے نظر آتے چاند باغ جاتے ہوئے اوور کوٹوں میں ناکیں چھپائے لڑکیاں جلدی جلدی قدم اٹھاتیں کوٹھی کے کھنڈر کی اونچی گھاس پر شبنم کے بڑے بڑے قطرے پیروں کے نیچے آکر ادھر ادھر لڑھک جاتے۔ شام کو سورج جلد غروب ہوتا تھا چنانچہ گھوڑا گاڑی بڑھتی ہوئی مدھم خنکی میں چھ سات بجے پل پر آجاتی بٹیا۔ سرلا بٹیا کے یہاں نہیں چلے گا—؟ گنگا دین کوچ بکس پر بیٹھے بیٹھے کاہلی سے پوچھتا۔ چلنا کا ہے نہیں— اسے جواب دیا جاتا۔ گاڑی سنگھاڑے والی کوٹھی کے سامنے نشیب میں پہنچ کر ایک دھچکے کے ساتھ پھاٹک میں داخل ہوجاتی۔

یہ لو شنکر تمہارا "آمدنامہ" دے گیا ہے۔ سرلا برآمدے میں سے آواز لگاتی۔

شنکر سریواستوا یونیورسٹی میں تھا۔ اور فارسی میں ایم۔ اے کر رہا تھا سروج اندر کمرے میں کتھک کا کوئی نیا توڑا شروع کر دیتی ان کی اماں چراغ جلانے کے بعد آنگن میں سے چلاتیں۔ اری باولیو۔ پہلے کھانا تو ٹھونس لو۔

سرلا اطمینان سے آلتی پالتی مار کے برآمدے کے فرش پر بیٹھ جاتی اب یہ تبلاؤ کہ گیان نے تسم کو کیا جواب دیا۔

میرٹھ کالج کی سیاست شروع ہو جاتی۔ سرلا اب وہاں نہیں جاتی تھی۔ پچھلے مہینے اس کا بیاہ ہوا تھا۔ اب اس کا گونا ہونے والا تھا۔ لہذا وہ بڑے بزرگانہ انداز میں بیٹھی لیمپ شیڈ بنایا کرتی۔

راجکماری شیو پوری لاہور جا رہی ہیں۔ میں منہ لٹکا کر اطلاع دیتی

لاہور——؟ ارے باپ رے باپ

لاہور بہت دور تھا۔ بالکل دوسرا کرہ کہیے۔ ایسا ہی تھا جیسے کہہ دیتے کہ راجکماری سنگاپور جا رہی ہیں

اوفوہ—— سروج کہتی

کتنی عجیب بات یعنی ہم میں سے ایک لاہور جا رہا ہے۔ ارے واہ۔ میرا بھی بڑا جی چاہتا ہے کہ انوکھی انوکھی جگہیں دیکھوں۔ سروج گویا اپنے خطرناک ارادوں کا اظہار کرتی۔

پنجاب ہے نا—— وہاں ان کی کوئی یونیورسٹی بھی ہے۔ اس میں وہ ہو گیا ہے۔ وہ کیا ہوتا ہے۔ ارے بھئی اس میں میوزک کی کلاسیں کھل گئی ہیں— میں تبلاتی۔ اس میں راجکماری اپنے پڑھایا کریں گی۔

یونیورسٹی صرف ایک تھی۔ بھٹکنڈے یونیورسٹی۔ باقی یہ جو انورسٹی ٹیچنگ کالج تھا جس میں ہم سب کے بڑے بھائی اور بہنیں پڑھا کرتی تھیں وہ تو ایک قسم کا دیولوک تھا۔ جہاں اپنا دماغ ہی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ الجبرا پر سے سر اٹھا کر اکثر ہم لوگ حساب لگاتے ایک دو تین۔ چار۔ پانچ— پورے پانچ سال بعد ہم اس دیولوک میں پہنچ سکیں گے۔ ابھی تو ہم نے ہائی اسکول بھی نہ کیا تھا۔

بڑے آغا صاحب نے آج تھرڈ ایر کلاس میں گائتری نگم کو پھر ڈانٹ پلائی۔

تصویری کی کلاس میں لیلا دیدی آئی تھیں؟

چنے اب کے سے فورتھ ایر کے امتحان کے لئے

وناگک راؤ پٹوردھن آئیں گے یا نہیں۔

میرس کالج کی سیاست پھر شروع ہو جاتی سارے ہندوستان میں اس کالج کی طرح کا اور کوئی ادارہ نہ تھا۔ پانچ سال کا اس کا کورس تھا۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس نہ کیجئے، بیچلر آف میوزک کی ڈگری لے لیجئے۔ اور اس کے لئے کیا کیا لوہے کے چنے چبانے پڑتے تھے۔ اب اس کالج کو یونیورسٹی کا درجہ مل گیا تھا۔ یہ ملک کی واحد میوزک کی یونیورسٹی تھی۔ گیان، راج۔ لیلا یہ سب پاس کر کر کے اب اسٹاف پر آ چکی تھیں سال بھر قبل ریڈیو اسٹیشن کھلا تھا۔ یہ سب لوگ وہاں جاتے۔ کلاسیکل موسیقی کے ایک سے ایک بڑھیا پروگرام ہوتے۔ گوہر سلطان ایک نئی دریافت تھی۔ یہ ایک پیاری سی نازک اندام قصباتی لڑکی تھی جو کوئل کی ایسی آواز میں گاتی تھی۔ نیاز فتحپوری کے داماد مجید دیناز ہی تھے۔ طلعت محمود سے ابھی کوئی واقف نہ ہوا تھا۔ گویہ بھی گانا شروع کر چکے تھے پھر ارچنا لہری تھی۔ سورج بخش سریواستوا تھے۔ پرنسپل رتن جھنکر ستار بجانے والے الیاس خاں۔ کتھک کے استاد شمبھو مہاراج اور اچھن مہاراج۔

یونیورسٹی میں عسکری بلگرامی مرحوم اور ان کے ساتھیوں کا بول بالا تھا۔ چند نوجوان نے مل کر ایک رسالہ نکالا تھا جس کا نام "نیا ادب" رکھا گیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر رشید جہاں مضمون لکھتیں۔ ڈاکٹر علیم۔ علی سردار جعفری۔ سجاد ظہیر۔ ہری شنکر اور کمال چوبیس گھنٹے ان ہی سب قصوں میں جٹے رہتے۔ آج یہ جلسہ ہو رہا ہے۔ کل وہ ہنگامہ ہے۔ جلوس نکال رہے ہیں۔ تقریریں ہو رہی ہیں۔ رسالے چھاپے جا رہے ہیں عجب ہڑبونگ تھی

پر راجکماری ہم سب سے الگ اتنی دور جا کر بور نہیں ہو جائیگی؟ سرلا فکر مند ہو کر پوچھتی۔

جب بھیّن اسٹوڈینس فیڈریشن کے جلسے کے لئے کراچی گئے تھے مجھے بھی سنگ لے گئے تھے۔ یاد ہے؟ سروج کہتی۔ لاہور تو اتنا دور بھی نہیں ہے۔

مجھے بھی دنیا گھومنے کا بہت شوق ہے۔ میں فوراً اپنی سمندری سفروں کا حوالہ دیتی۔ مگر بھیّن کے ساتھ کراچی کی سیاحت کی بات ہی اور تھی۔ میں رشک کے ساتھ سروج کو دیکھتی۔ تم کو کیا پتہ اونٹ کیسے چلتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے۔ سروج رعب سے مطلع کرتی۔

ندی میں ڈوبتے سورج کی کرنیں اب رنگ برنگی لہروں پر چم چم کرتیں۔ ساری دنیا، کائنات، ساری زندگی کے پس منظر کا جو دھندلا سا۔ اٹکل پچو ایسا خاکہ ہمارے ذہنوں میں تھا۔ وہ ہمارے سامنے ان لہروں پہ ناچتا رہتا۔ شاہی زمانے کی عمارتیں، سنگ سرخ کا پل، درخت بوٹ کلب کی ڈونگیاں۔ شدید سبز گھاس۔ سنگھاڑے والی کوٹھی کی محفوظ کائی آلود سیڑھیاں، جغرافیہ کے ماہرین کی طرح ہم دماغ پر زور ڈال کر سوچتے اس کے آگے کیا ہے، اور کیا کیا ہوتا ہے۔

اپّی بیاہ ہو کر کہاں جائیں گی ــــ؟

اکثر سروج کچھ سوچتے سوچتے عجیب سے سوال کر اٹھتی۔

وہیں جائیں گی جہاں بھیّا صاحب لے جائیں گے۔ میں جھنجھلا کر جواب دیتی۔

بھیّا صاحب کہاں جائیں گے ــــ

کیا معلوم ــــ میں سٹ پٹا جاتی۔

بھیّا صاحب جو میرے چچازاد بھائی تھے۔ میرے بہنوئی بھی ہو سکتے تھے۔ بچپن سے میں یہی سنتا آیا تھا۔ بھیّا صاحب جب جوان ہو کر پڑھ لکھ بڑے آدمی بن جائیں گے تب اپّی کو بیاہ کر لے جائینگے میرا کوئی سگا بھائی نہ تھا میں بچپن سے بھیّا صاحب پر عاشق تھا وہ میرے ہیرو تھے۔ میرے لئے گرڈی کو پیرا در اشوک کمار سے اونچا درجہ رکھتے تھے۔ بھیّا صاحب نے مجھے بار بار کر سنیر کیمبرج میں ریاضی پڑھائی تھی۔ ان کے دل سے اتری ہوئی ٹائیاں میں بڑے چاؤ سے خود پہن لیتا تھا۔ بھیّا صاحب جو کتابیں پڑھتے وہی میں بھی پڑھتا۔ ان کو بیٹی ڈیوس سے نفرت تھی۔ میں نے بھی بیٹی ڈیوس کے فلم دیکھنے سے توبہ کر لی۔ پہلے وہ فارورڈ بلاک میں تھے۔ مجھے نیتا جی کا فلسفہ سمجھایا کرتے۔ پھر پارٹی میں شامل ہو گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ جلسے جلوسوں سے واپس آکر رات کو سوتے میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگایا کرتا۔ پھر بھیّا صاحب نے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنا شروع کیا۔ میں نے اس کا اہتمام کیا کہ کوئی ان کی پڑھائی میں مخل ہو۔ ان کے کمرے کی طرف کوئی نہ جائے۔ وہ عموماً لان پر بیٹھ کر پڑھا کرتے سیل کے درخت کے نیچے۔

بھیّا صاحب برسوں سے ہمارے یہاں رہتے آئے تھے۔ دراصل کسی کو اس کا احساس بھی نہ تھا کہ وہ ہمارے یہاں رہتے ہیں

یعنی "ہمارے یہاں"، "اُن کے یہاں" سے مختلف کوئی علیحدہ چیز ہے جب چچا ابا کا سوئٹزرلینڈ میں اچانک انتقال ہوگیا وہ بھیّا صاحب سے ملنے کے لئے وہاں گئے ہوئے تھے۔ اس وقت بھیّا صاحب لوزان کے ایک اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ ان کو سوئٹزرلینڈ سے فوراً ہمارے یہاں بلا لیا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ بھیّا بمبئی سے سیدھے ہمارے یہاں رانی کھیت پہنچے تھے۔ برساتی میں وہ فل بوٹ پہنے کھڑے تھے۔ اپنے اسکول کے سبز اور سیاہ دھاریوں والے مفلر میں ان کا چہرہ تقریباً چھپا ہوا تھا۔ ان کی آنکھوں کے پپوٹے روتے روتے سوج گئے تھے۔ اور ان کی ناک سرخ ہو رہی تھی۔ اپنے اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر انہوں نے مجھے اور اپّی کو اپنے قریب بلایا اور ہم دونوں کو اپنے بازوؤں کے حلقے میں لیکر پھوٹ پھوٹ رونے لگے۔

اس کے بعد سے بھیّا صاحب مستقلاً ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ بابا ان کو دیکھ کر جیتے تھے۔ ممّی ان پر عاشق تھیں۔ بھیّا صاحب کی مرحومہ امّی اور ہماری ممی بھی آپس میں خالہ زاد بہنیں تھیں۔ سارا کنبہ، ساری برادری، سارا قصبہ بھیّا صاحب کے نام کی مالا جپتا تھا بھیّا صاحب چچا ابا مرحوم کی اکلوتی اولاد تھے۔ موروثی جائداد میں بھی ان کا کافی حصّہ تھا اور انکو لئے انکے بابا بھی بہت سارا روپیہ چھوڑ گئے تھے۔ ہمارے آبائی قصبہ میں تالاب کے کنارے ایک پھونس کا بنگلہ تھا جس میں چچا ابا کبھی کبھی آکر رہتے تھے بھیّا صاحب نے یورپ سے واپس آکر پہلی بار اپنے وطن کو قریب سے دیکھا۔ قصبہ کی گلیوں میں گھومے۔ کچّی دیواروں والے مکانوں میں جاکر اپنے کسانوں سے دوستی کی۔ ان کو تالاب والا بنگلہ جو چھوٹی بارہ [illegible] کہلاتا بہت پسند آیا گھنٹوں وہ اس کے برآمدے میں بیٹھے موٹی موٹی کتابیں پڑھا کرتے۔ بابا نے اب کے سے ان کو سوئٹزرلینڈ واپس نہیں بھیجا۔ طے کیا گیا کہ چند سال بعد بھیّا کیمبرج چلے جائیں گے۔ یہ گرمیوں کی چھٹیوں کے لا مارٹینز کالج میں داخل کر دئے گئے۔ وہاں سے سینئر کیمبرج پاس کر کے نکلے تو انٹرمیڈیٹ کے لئے کالون تعلقدار کالج میں آگئے یہ گویا ہمارا خاندانی کالج تھا۔ چچا ابا، بابا خالو میاں سب نے یہیں پڑھا تھا سال بھر بعد بھیّا صاحب سڑک عبور کر کے کیننگ کالج میں آگئے اور کئی سال تک متواتر یونیورسٹی کے ورندابن کے کنہیا بنے رہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قصے کے ہیرو کیا بھیّا صاحب ہیں؟ میں کہانی سنانے بیٹھتا ہوں۔ تو کرداروں کے متعلق بھی تو فیصلہ کرتا چلوں۔ سوچتا ہوں کہ بھیّا صاحب میں ہیرو والی ساری خصوصیات موجود تھیں اب تک جو کچھ میں نے آپ کو تبلایا ہے آپ سمجھدار ہیں خود ہی آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ بھیّا صاحب ہی ہیرو ہیں۔ ایسا رومانی پس منظر اور کس شخصیت کا ہو سکتا ہے۔ اوپر سے حسین اور وجیہہ الگ۔ لازمی بات ہے کہ ہیرو لوگ بالکل چارلس بوائر ہوتے ہیں اگر آپ قدامت پسند قاری نہیں ہیں تو آپ کو یہ جان کر بہت جھنجلاہٹ ہوگی کہ بھیّا صاحب بھی بہت خوبصورت تھے مجھے ڈرتے ڈرتے نہایت افسوس کے ساتھ اطلاع دینی ہے کہ بھیّا صاحب عین مین چارلس بوائر تھے۔ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے اسکولوں میں پڑھتے رہنے کی وجہ سے شروع شروع میں ان کا لب و لہجہ بالکل فرانسیسیوں کا ایسا تھا۔ جب وہ 'ت' اور 'د' کے تلفظ کے ساتھ ذرا رک رک کر انگریزی بولتے۔ تو آہ ناظرین نہ پوچھئے۔ اپّی اور سرلا کی سہیلیوں اور ازابلا تھوبرن کالج کی لڑکیوں کے نرم و نازک دلوں پر چھریاں چل کر رہ جائیں۔

رہیں اپّی۔ تو وہ ان افسانوی قسم کی عم زاد بہنوں میں سے نہیں تھیں جو اپنے اس طرح کے کزن لوگوں کے لئے اتوار کی سہ پہر کو پکوان تیار کرتیں ان کے پل اوور بنتیں۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے مشغلے میں نے افسانوں میں پڑھا ہے کہ عم زاد بہنوں کے ہوتے ہیں، اپّی لا مارٹینز گرلز اسکول میں پڑھتی تھیں۔ ندی کے دوسرے کنارے پہاڑی کی بڑی ڈھلوان پر بھورے رنگ کا، اونچے اونچے کنگوروں والا فرانسیسی قلعہ سال کے بارہ مہینے پھولوں اور درختوں کی ہریالی میں چھپا رہتا۔ گہرے نیلے آسمان کے مقابل میں اس کے بلند و بالا کنگوروں اور برجیوں کی لکیریں دور سے بڑی واضح نظر آتیں۔ اور ایسا جان پڑتا جیسے اٹھارویں صدی کے کسی برطانوی مصوّر کی مدھم، خوشگوار۔ شفاف رنگوں والی بڑی سی پینٹنگ منقش چوکھٹے میں جڑی سامنے دھری ہے اکثر جب میں نبارسی باغ کی اور جاتے ہوئے اس اسکول کے سامنے کی خاموش خوبصورت سڑک پر سے گذرتا تو مجھے اپّی اس قلعہ کے کسی دریچے میں کھڑی کسی لڑکی سے باتیں کرتی نظر آجاتیں۔ اس منظر میں کتنا اور کیسا ناقابل بیان سکون رچا تھا

میں خوفزدہ ہوکر آنکھیں بند کرلیتا۔

بھیا صاحب ہرے بھرے کنجوں اور خاموش سایہ دار سڑکوں کے اس سلسلے کی دوسری طرف لڑکوں کے لا مارٹینیئر کالج میں پڑھتے تھے۔ اس کی قدیم یورپین طرز کی اونچے اونچے گنبدوں والی عمارتوں کا عکس سامنے کے بڑے تالاب پر لرزتا رہتا۔ بھیا صاحب اپنے انگریز ہم جماعتوں کے ساتھ تالاب کے کنارے کوئی کتاب ہاتھ میں لئے آہستہ آہستہ فرانسیسی لہجے میں باتیں کرتے ادھر سے ادھر گذر جاتے کبھی کبھی کسی بات پر کھکھلا کر ہنس پڑتے۔ بھیا صاحب کے انداز میں ان کی طبیعت میں جو دھیما پن تھا کھوئی کھوئی اداسی تھی۔ اس نے ان کو اور زیادہ رومنٹیک ایسا بنا دیا تھا

دیکھئے میں عرض کردوں۔ مجھے اس لفظ رومنٹیک سے نفرت ہے۔ میں یہ کوئی خواتین کے رسالے کے لئے بالاقساط ناول نہیں لکھ رہا جس میں سوا چاندنی راتوں اور گلاب کے شگوفوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اور جن کا ہیرو اچھا خاصا ہیا لونی بُل فائیٹر نظر آتا ہے۔ لے حسن اتفاق کہیے اور بحیثیت قصہ گو میری بدقسمتی کہ بھیا صاحب فرانسیسی لہجے میں بات کرتے تھے اور لا مارٹینیئر میں پڑھتے تھے اور دھیمی دھیمی آوازمیں ہنستے تھے۔

اپّی اور بھیا صاحب ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ ان دونوں کی الگ ٹیمیں تھیں۔ اپّی بھیا صاحب کے دوسرے دوستوں میں کیڑے ڈالتیں۔ یہ اپی کی سہیلیوں کی نقلیں اتارتے۔ ان دونوں میں ہمیشہ اوپر تلے کے بہن بھائیوں کی طرح لڑائی ہوا کرتی۔ اپّی کی سب سے پیاری گوئیاں سرلا تھی۔ یہ میرے جیتے جان کے ٹکڑے دوست ہری شنکر کی بہن تھی۔ جانے کیوں۔ پراکثر ایسا ہوا کہ چمپا باجی کا ذکر سنتے ہی سرلا ایکدم چپ ہو جاتی۔ اپّی بے پروائی سے بیٹھی ہنستی رہتیں۔ ہری شنکر بیوقوفوں کی طرح سگریٹ سلگانا شروع کردیتا۔ چمپا باجی ہم میں سے کسی کی ٹیم میں شامل نہ تھیں یہ سب سے الگ تھیں۔ جب بھیا صاحب ایم۔ اے میں پہنچے اس وقت چمپا باجی نے الٰہ آباد سے آن کر یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔

وقت یونہی نرم نرم سرسراتا ہوا بہتا گیا۔ اپّی لا مارٹینیئر اسکول سے ازابلا تھوبرن کالج میں آگئیں، بھیا صاحب ایک کے بعد ایک معرکے سر کرتے رہے۔ یونیورسٹی کا ہیا سی اکھاڑہ۔ ادبی محفلیں۔ سوسائٹی کے ڈرائینگ روم، ہر میدان میں ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی میں ان کے اے ڈی۔ سی کی طرح ساتھ ساتھ لگا رہتا۔ نہایت عقیدت کے ساتھ ان کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ جس سال بھیا صاحب مقابلے کے امتحان میں آئے اسی سال اپّی نے بی۔ اے کیا تھا۔ چمپا باجی نے ایم۔ اے کے بہت سے ریکارڈ بھی اسی سال توڑے تھے میں یہ داستان سناتے سناتے من میں ایک بات سوچ رہا ہوں وہ بات یہ ہے کہ جس طرح تفصیل اور وضاحت سے میں اس زمانے کی یہ کہانی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں کامیاب نہ ہوسکوں گا۔ بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ بادشاہ باغ کا شاہی وقت کا پھاٹک جس میں یونیورسٹی کا ڈاکخانہ تھا۔ پھولوں کے تختے، سڑک پر سے گذرنے والی کہارنیں۔

ان سب چیزوں کی میرے لئے بے اندازہ اہمیت ہے۔ آپ کو یہ تفصیلات بے معنی اور مضحکہ خیز معلوم ہوں گی جبھی تو کہانی سنانا کوئی آسان کام نہیں پلاٹ کا توازن، مکالمات کی برجستگی غیر ضروری جزئیات سے احتراز۔ یہی سب تو فن افسانہ نگاری کی تکنیک کہلاتا ہے۔ اور کیا تکنیک میں کوئی ہاتھی گھوڑے لگے ہوتے ہیں۔

پر میں چاہتا ہوں کہ یہ ساری باتیں آپ کو ایک ایک کرکے اس طرح سناؤں کہ اس فضا اس ماحول اس کہانی کی ساری کیفیت۔ سارا شدید تکلیف دہ، خواب آگیں خوبصورت تاثر پورا پورا کسی طریقے سے آپ کے ذہن میں منتقل ہوجائے۔ یہ دیکھئے۔ میں بینٹ ہال کے اوپر ایک برجی میں بیٹھا ہوں۔ اور ریڈیو کے لئے اپنے کانوکیشن کی کمنٹری سنا رہا ہوں۔ نیچے وسیع و عریض کواڈرنیگل پر سیاہ کیپ اور گاؤن والی مخلوق ادھر ادھر چل پھر رہی ہے۔ تیز سبز گھاس کے قطعے اور کینیا کے سرخ اور زرد پھولوں کے تختے، اور سنگ سرخ کی فلک بوس عمارات کے سائے ساریوں اور سیاہ چوغوں اور فیکلٹی کے زرتار نقش لبادوں کے سارے رنگ آپس میں گڈمڈ ہوگئے ہیں۔ وقت تیزی سے اڑتا جارہا ہے۔ اس کے سنسناہٹ کی آواز میرے کان کے قریب سے ہوکر گذر رہی ہے شہ نشیں میں ہمارا پورا گروہ جمع ہے۔ بھیا صاحب اپنے ضلع سے آئے ہوئے ہیں۔ اس وقت وہ نیچے سرخ قالینوں کے طویل راستے کے کنارے کنارے ٹہلتے ہوئے چمپا باجی کے ساتھ باتیں

کرتے دوسرے کو اوڈر ٹیگل کی طرف جا رہے ہیں جدھر ہیٹ ہوم کے لئے سفید میزیں بچھی ہیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر کلچنت نیو تھیٹرز کا کوئی پیارا ریکارڈ لگا دیا گیا ہے۔ پہاڑی سانیاں کی آواز سارے میں گونجی جا رہی ہے۔ پہاڑی سانیاں بھی اپنا بادامی ریشمین کرتا پہنے دھوتی کا لمبا پلّو ہاتھ میں لئے شال لپیٹے میرس کالج والوں کے ساتھ ایک طرف کو بیٹھے ہیں اور ہنس ہنس کر کسی سے باتیں کر رہے ہیں وہ سامنے سے وائس چانسلر حبیب اللہ چلے آ رہے ہیں ان کے ساتھ ساتھ سائنس والوں کے دو تین جغادری بنگالی پروفیسر ہیں۔

اب میں مائیکروفون اپنے پوجیہ متر ہری شنکر کے ہاتھ میں دیتا ہوں۔ ہلو۔ ہلو ——— سن رہے ہو ——— میری آواز آ رہی ہے۔ ——— ہلو۔

ہلو۔ ہاں۔ میں ہری شنکر، اب آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہری شنکر، کمال کا ہمزاد، سرلا سروج کا اکلوتا بڑا بھائی، چمپا باجی کا کامریڈ ——— میرا کردار بھی خاصا اہم ہے۔ میرے کردار کے بہت سے پہلو ہیں۔ میں کہانی میں یہ اتنے سارے مختلف رول ادا کر رہا ہوں۔ میں بات کس طرح شروع کروں۔ اسٹیج پر کیسے داخل ہوں یہ بڑا گھپلا ہے۔

سامنے وسیع سبزہ زار ہے۔ ہزاروں لاکھوں پھول گھاس پر کھلے ہیں۔ درختوں کی ہری اور نارنجی پتیاں جاڑوں کی خوشگوار دھوپ میں بڑے سکون کے ساتھ جھلملا رہی ہیں۔ اپّی اپنا گاؤن پہنے اپنے ساتھ کی لڑکیوں کے ساتھ اگلی قطار میں جا بیٹھی ہیں۔ بھیّا صاحب اور چمپا باجی آم کے سایہ دار درخت کے نیچے کھڑے بڑی مصروفیت سے کسی دوست سے گفتگو میں محو ہیں۔ اب مجمع کم ہوگا۔ پھر تمام کو ڈرکیول کے غول حضرت گنج اپنی تصویریں کھنچوانے جائیں گے۔ لڑکے قہوہ خانے میں اکٹھے ہوں گے۔ یہ یہاں کی پرانی ریت ہے۔ ہر سال یہی سب ہوتا ہے ——— کمال نے شاید آپ کو بتلایا ہوگا۔ میں اس کا بڑا چہیتا دوست ہوں۔ اس کی بہن سے بھی مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی سرلا اور سروج سے۔ لیکن میرا اور کمال کا رتی کے لئے دوڑ بھاگ کرتے کرتے ناک میں دم آ جاتا ہے۔ اللہ ہری شنکر ہمرے لئے باٹا کی دوکان سے جوتا بدلوتے لانا۔ اے میاں ذرا آج امین آباد جاؤ تو حلجی صاحب سے کہنا ابھی تک ساری رنگی کہ نہیں ——— اے جناب حضرت گنج

جا رہے ہیں؟ ذری ہمارے اور سرلا کے لئے "واٹرلو برج" کے دو ٹکٹ خرید لیجئے گا۔ خدا کے لئے۔ اپّی آخر تمہاری وہ سائیکل کس مرض کی دوا ہے۔ ایسی کاہلی بھی کس کام کی۔ میں بعض دفعہ جھنجھلا کر کہتا۔ اور اتنی بڑی جہاز کی جہاز موٹر گیراج میں پڑی جھک مارتی ہے گھام میں ایسی ایسی بیگار کروا کے ہم دونوں مزدوروں کا خون پسینہ ایک کراتی ہو۔

اے بھیّن۔ میرس کالج جا کر گیان سے ملنا اور اس سے کہنا "نیڈل ورک" کا وہ والا نمبر بھجوا دے جس میں ——— سرلا کھڑکی میں سے سر نکال کر حکم چلاتی۔

لاحول ولا قوۃ۔ غصے کے مارے دل چاہتا ہے ان دونوں چڑیلوں کو چٹیا پکڑ کر گھسیٹتا ہوا ندی تک لیجاؤں اور پانی میں ڈبو دوں اگر مر گئیں تو دونوں کے بھوت آ کر "نیڈل ورک" کے رسالوں کی فرمائشیں کیا کریں گے۔

میں ایک پیر سائیکل پر رکھتے ہوئے دوسرا برساتی کی سیڑھی پر ٹکا کر سگریٹ جلاتا اور اداسی سے دونوں کو دیکھتا رہتا۔

میرا لائبریری کارڈ ہی کہیں گم گیا۔ شنکر میاں ذرا جا کر ——— اپّی اطمینان سے گھاس پر بیٹھے بیٹھے آواز دیتیں۔

بھیّن۔ آج شام کو پکچر نہیں دکھلاؤ گے؟

سرلا اپّی کی سفارش کرتی۔

چپ رہ چڑیل ——— میں غرّاتا۔

اچھا ہے۔ ڈانٹ لو غریب کو۔ بچاری چاروں کے لئے نیہر میں مہمان ہے۔ اپّی بڑی رقت خیز آواز میں کہتیں۔

اور کیا ——— کر لو کمینہ پن ——— سرلا حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر پیر ہلاتے ہوئے سوں سوں کرتی ہم کوئی چمپا باجی تھوڑا ہی ہیں جو ہم کو کانی ہاؤس لیجا کر آئس کریم کھلاؤ۔ ہم تو بچاری سرلا اور اپّی ہیں ———

چمپا باجی ——— ان کا کون ذکر ہے۔ میں بڑبڑا کر کہتا۔ اور پیڈل پر زور سے پیر مار کر زناٹے سے پھاٹک کے باہر نکل آتا۔

اکثر شام کو اپّی اور کمال کی چھوٹی خالہ زاد بہن میرس کالج سے لوٹتے میں میرے گھر پر رک جاتی۔ میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے فٹن کو اپنی کوٹھی کی سمت بڑھتا دیکھتا۔ سڑک پر عمیق سناٹا ہوتا۔ اور اداسی۔ اور موسم کے سارے پھولوں کی مہک۔ ندی کے پانی کی پرسکون لرزہ خیز موسیقی میرے کانوں میں پہنچتی۔ اور جاڑے کا

ہے کے ڈر سے میرا دل دھڑک اٹھتا۔ میرا ہمزاد کمال کہتا تھا کہ کبھی کبھی وہ بھی چونک پڑتا ہے اسے بھی بہت ڈر لگتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ہم دونوں کے دماغوں کی ایک ایک چول ذرا ڈھیلی ہے۔

میں دروازے میں بیٹھے بیٹھے فٹن کو باغ میں آتا دیکھتا اور پھر دروازہ بند کر کے پلنگ پر گر جاتا۔ چمپا باجی۔ دیبی — تم ہم لوگوں کو اسی طرح سکون سے زندہ رہنے دو۔ ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے — میں دل ہی میں کہتا — اندہ اللہ میاں۔ تم نے بھی کیا گھپلا کر رکھا ہے

بگھی موڑ پر سے اتر تی سڑک کے گڑھوں پر سے گذر کر ایک دھچکے کے ساتھ سنگھاڑے والی کوٹھی کے سامنے آن رکی۔ دھچکے کی وجہ سے تان پورہ اور ستار ایک دوسرے سے زور سے ٹکرا گئے۔ گنگا دین دھیرے نہیں ہانک سکتے ہو؟ میں نے چلا کر کہا۔

سرلا اندر سے نکل کر آئی اس نے زعفرانی ساری باندھ رکھی ہے۔ پیروں میں بچھوے پہنے ہے۔ اپی اس کے ساتھ ساتھ برساتی میں آگئیں۔ داپی نے ابھی بچھوے نہیں پہنے۔ صرف وہ لڑکیاں جن کا بیاہ ہو جاتا ہے۔ یہ زیور پہن سکتی ہیں، جب رپی کا بیاہ ہوگا اور یہ بچھوے پہنا کرینگی تو ان کے چھوٹے چھوٹے پاؤں کتنے خوبصورت لگیں گے۔ برآمدوں کے ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں، ساری کا پلو آگے ڈالے کنجیوں کا گچھا ہاتھ میں لئے وہ مصروفیت، تمکنت اور تمجھرتا کے ساتھ ادھر ادھر کام میں مشغول نظر آیا کرینگی۔

جب بھیا صاحب سے ان کا بیاہ ہوگا۔

میں گاڑی میں سے کود کر اندر بھاگی۔ رپی آج بھیا صاحب بھی سلطان پور سے آگئے۔ کمال بھیا مسوری سے لوٹ آئے ہیں نا ابھی میں نے دونوں کو چمپا باجی کے گھر کے لان پر بیٹھا دیکھا ہے چھتریوں کے نیچے۔ وہ املتاس کا درخت ہے نا ان کے گھر میں! وہیں۔ چمپا باجی بڑے زوروں سے کسی بات پر ہنس رہی تھیں ہمیں سڑک پر سے گذرتا دیکھ کر انہوں نے دور سے ہاتھ ہلایا۔ اور مسکرائیں۔ میں نے بہت مستعدی سے اطلاع دی۔

اپی اور سرلا خاموشی سے روش پر سے گذرتی برساتی کی اور بڑھتی گئیں۔ جیسے انہوں نے میری بات ہی نہیں سنی۔ مجھے بڑا غصہ آیا۔ جب یہ بڑی بڑی لڑکیاں اکٹھی ہوتی تھیں تو مجال ہے جو ہم چھوٹی امت والوں کو ذرا بھی گھاس ڈالی جاتی ہو جاؤ باہر جا کر کھیلو۔ دکھیلو گویا ہم گلی ڈنڈا یا اونچا نیچا ٹیلہ کھیلتے تھے! جاؤ۔ باؤ دیکھو سروج دروج سب باہر بلا رہی ہیں۔ یا پھر سرپرستانہ انداز میں پوچھ لیا جاتا۔ کہو بیٹا آج کالج میں کون سی گت سیکھی۔ کون توڑا۔ کون والا لکشن گیت — یا پھر اپنے ساتھ کی لڑکیوں کی خیریت دریافت کر لی جاتی۔ راجکماری کے کیا احوال ہیں آج کل — وغیرہ۔ یا یہ کہ آج کل تمہارا "گڑیا گھر"، کیسا چل رہا ہے — دیہ "سہیلی بوجھ پہیلی" کے عنوان سے ہفتے میں ایک بار لڑکیوں کے لئے پروگرام شروع کیا گیا تھا جس میں گیان، دتی کی چھوٹی بہن راج بھٹناگر اور میں نہایت مستعدی سے اناؤنس کرتے۔ ہم ریڈیو اسٹیشن کے گڑیا گھر سے بول رہے ہیں —) کیا کسمپرسی کا عالم تھا نہ داد۔ نہ فریاد۔

سینٹ جمیلی کی جھاڑی پھلانگ کر سروج کی اور جلدی۔ وہ اور مالتی رائے زادہ ندی کے رخ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔

بھتین ابھی تک نہیں پہنچے — سروج نے دریا کے پل کی اور دیکھتے ہوئے کہا۔

بھتین تو مرزا پور گئے تھے نا؟ مالتی نے پوچھا۔

ہاں پر اس سمے تو چمپا باجی کے وہاں ڈٹے ہوں گے۔ سروج نے جواب دیا۔

چمپا باجی کو اس روز میں نے گائتری کے گھر پر دیکھا تھا لال ہری لہریے کی ساری پہنے اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ کیا بتاؤں مالتی نے کہا۔

بھتین تو ہمارے لئے بھی اس قدر پیاری جے پوری چنری لائے تھے کہ بس۔ پچھلے سال جب کمال بھیا کے ساتھ اجمیر گئے تھے۔ تب سروج نے رعب ڈالا۔

چنریاں میں تو پہننا چھوڑ چکی ہوں۔ میرا جی اوبھ گیا ہے۔ مالتی نے سرلا اور اپی کے لہجے کی تقلید کرتے ہوئے کہا۔ میں نے ایسا سمندر لہنگا بنوایا ہے۔ دیوالی کے لئے پسیر تو اس پر گوکھرو رہی ہوگی۔ للو لال جگل کشور کے ہاں سے۔ سروج نے اطلاع دی۔

میں اشتیاق اور رشک سے ان لوگوں کی چنریوں اور گوٹے ٹھپے کے ملبوسات کا تذکرہ سنتی رہی۔ یہاں یہ زرق برق پوشاکیں

صدیقہ بیگم سیوہاروی

بیمار

یوں تو زمینداری ختم ہوگئی تھی لیکن زمیندار نصرت علی کے ٹھاٹ باٹ میں رتی بھر فرق نہ آیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ سارے دن بیکار بیٹھک میں بیٹھنے کا سلسلہ ضرور ختم ہوگیا تھا کیونکہ اور سب زمیندار اپنے اپنے کام سے لگ گئے تھے اور کسی کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ پہلے کی طرح بیکار باتوں میں اپنا وقت ضائع کرے اور نصرت علی نے بھی آٹا پیسنے کی ایک چکی لگائی تھی اور یہی نہیں انھوں نے تو بیس بائیس بھینسیں پال لی تھیں اور دودھ کا اچھا خاصہ کاروبار شروع کر دیا تھا۔ اب وہ تمام دن اِدھر اُدھر کے چکر کاٹتے اور نئے کاروبار کے منصوبے بناتے۔ یہی وجہ ہے کہ تین گاؤں نکل گئے تھے لیکن ان کے تیور ابھی جوں کے توں تھے۔ مزاج کچھ نرم ضرور ہوگیا تھا لیکن ہمیشہ بڑے حصّے کی حیثیت ہی کیا تھی۔ ہاتھی کتنا ہی گرے لیکن ٹٹو رسے کے برابر تو رہتا ہی ہے۔ اب بھی دونوں وقت آدھا آدھ سیر گوشت آتا اور کبھی کبھار مرغی چرغی بھی پک ہی جاتی تھی۔ ان کا دستر خوان دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ زمینداری ختم ہوگئی ہے اور ان کے تین گاؤں نکل چکے ہیں پھر یہ بھی تو ہے کہ نصرت علی کا کام کچھ برا نہیں چل رہا تھا۔ انھوں نے کافی زمین نکال لی تھی جسے وہ اپنی کاشتکاری میں لئے ہوئے تھے اور یہی وجہ ہے کہ اب بھی فصل کے فصل اتنا غلّہ آجاتا تھا کہ گھر کا خرچ الٹے لٹتے چلتا۔ سچ ہے کہ اللہ ایک دروازہ بند کرتا ہے تو دس کھول دیتا ہے اور یہی دس کھلے ہوئے دروازے تو تھے جو نصرت علی کو نئی شادی کا خیال آیا ورنہ ان کی پہلی بیوی کو مرے ہوئے چھ سات سال ہوگئے تھے اور انھوں نے تین لڑکے اور دو لڑکیاں چھوڑی تھیں۔ لڑکے اپنے اپنے کام سے لگ گئے تھے۔ شادی بیاہ بھی ہو چکا تھا اور وہ دوسرے شہروں میں رہتے تھے اور کبھی کبھار اپنے بیوی بچوں کو لے کر آجاتے تو گھر میں رونق ہو جاتی تھی مگر یہ رونق چند روزہ ہوتی اور پھر ان کے جاتے ہی وہی نصرت علی ہوتے۔ دونوں لڑکیاں شاہدہ اور خالدہ ہوتیں اور اتنا بڑا سا گھر۔

گھر کے کام کاج کے لئے ایک ملازمہ لگی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی کہیں گھر کا کام ملازمہ کے سمیٹے سمٹتا تھا۔ شاہدہ اور خالدہ کا کیا؟ ایک چودہ سال کی تھی تو دوسری گیارہ سال کی۔ کام کاج میں دونوں ہوشیار تھیں لیکن پھر بھی بچیاں تھیں۔ اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق بس بھر کام کر لیتی تھیں۔

یہی وجہ ہے کہ بیوی کے مرنے کے بعد سے نصرت علی جب بھی اپنے گھر پر نظر ڈالتے وہ انھیں سونا سونا نظر آتا اور ہر چیز تتر بتر۔ ویسے دیکھنے میں ہر چیز اپنی جگہ پر ہوتی لیکن پھر بھی گھر میں ایک سلیقے کی کمی تھی جسے صرف گھر کی بیوی ہی پورا کر سکتی تھی۔ یہ سوچ کر بیٹھے بیٹھے نصرت علی کے جی میں آیا کہ لگے ہاتھوں ایک

اور شادی کر ڈالیں ۔ کم سے کم اپنا گھر تو گھر معلوم ہوگا اور اپنا دکھ سکھ کہہ کر جی ہلکا کر سکیں گے ۔ اب ان لڑکیوں سے کون بات کرے ۔ لڑکیاں لڑکیاں ہی ہوتی ہیں ۔

جب نصرت علی کی بھاوج کو ان کی یہ خواہش معلوم ہوئی تو انھوں نے پلک جھپکتے اپنا کام شروع کر دیا ۔ وہ نہ جانے کتنے بیاہ منگنے کر چکی تھیں ۔ ان کے لئے تو گویا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ۔ بائیں ہاتھ کا ہی نہیں بلکہ گڑیا گڈوں کا کھیل ۔ انھوں نے جھٹ منگنی پٹ بیاہ کر دیا اور دیکھتے دیکھتے چاند سی دلہن لا کر گھر میں بٹھا دی ۔

نعیمہ ویسے تو اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی ۔ اور اس کے ماں باپ کی یہی خواہش تھی کہ اس کی شادی اپنی مرضی کے مطابق کریں ۔ اس کی منگنی ہو بھی چکی تھی لیکن وقت کو کس نے دیکھا ہے ۔ شہزاد حسین نے نوکری کے لئے اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارے اور جب بالکل نا امید ہو گیا تھا پاکستان کی راہ لی لیکن نعیمہ پھر بھی آس لگائے رہی ۔ نعیمہ کے والد میر محمود علی — اور ان کی بیوی کو یقین تھا کہ وہاں ملازمت ملتے ہی شہزاد حسین ضرور شادی کرنے کے لئے ہندوستان آئے گا لیکن شہزاد حسین کا خط آیا کہ وہ نعیمہ کو پاکستان بھیج دیں ۔ میر محمود علی پہلے تو خط پڑھتے ہی بپھر گئے اور گھر میں چیختے چلاتے گھسے ۔ "ارے سنتی ہو اب میں لڑکی کو شادی کے لئے اس کے سسرال بھیجوں گا ۔ اب ہماری خاندانی غیرت اتنی بھی نہیں رہی ۔ افسوس تو اس کا ہے کہ لڑکے کی اتنی ہمت کیسے ہوئی ہمارے منہ پر جوتا مارنے کی ۔ اب دنیا کا دستور بدل گیا کہ لڑکے کے یہاں نکاح کیلئے لڑکی جائے گی ؟"

اور نعیمہ کی امی کا پارا تو اور بھی چڑھ گیا ۔ " جب یہ نوبت آئے گی تو لڑکی کو کنوئیں میں دھکیل دوں گی ۔ میں نے اسی دن کے لئے تو پالا تھا کہ باپ دادا کی عزت کو مٹی میں ملا دوں گی "

لیکن یہ تو اس وقت کی بات ہے جب نئی نئی بات تھی ۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور گرہ جمتی گئی ، میر محمود علی اور ان کی بیوی کا غصّہ بھی کم ہوا ۔ اس کے علاوہ دوراندیشی تھی جس نے انھیں سوچنے پر بھی تو مجبور کر دیا ۔ یہی دوراندیشی تو تھی ہی کہ ایک دن میر محمود علی نے بڑی سنجیدگی سے کہا " لاؤ شہزاد حسین کو لکھ ہی دوں کہ لڑکی کو بلانے کا کوئی انتظام کر لیں ۔ کیونکہ ٹھیک ہے نا ۔ نعیمہ دراصل شہزاد حسین ہی کی امانت ہے ۔"

اور ان کی بیگم نے کہا " ہاں اور کیا — جس دن منگنی کر دی ۔ سچ تو یہ ہے کہ اُسی دن وہ دوسرے کی ہو گئی ۔ پھر اس میں ہرج ہی کیا ہے ۔ میں سمجھتی ہوں کہ لڑکا برا نہیں ۔ ہماری لڑکی کی تقدیر بھی اچھی ہے ۔ بے شہزاد حسین بھی کیا کرے ۔ آجکل کے زمانے میں یہاں آنا کچھ آسان بھی تو نہیں ہے ورنہ لڑکا برا نہیں ہے — وہ خود نکاح کے لئے آتا ۔"

لیکن ابھی اس بات کو ہفتہ بھر نہ ہوا تھا کہ معلوم ہوا کہ شہزاد حسین نے راولپنڈی میں شادی کر لی ۔ کہتے ہیں کہ شہزاد حسین — نوکری کے چکر میں تو تھے ہی ، ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے ۔ آخر انھیں ایک دفتر میں سوا سو روپئے کی ملازمت ملی بھی تو اس شرط پر کہ دفتر کے افسر کی لڑکی سے شادی کر لو ۔ اب شہزاد حسین کے سامنے دو راستے تھے ۔ یا تو بیکار جوتیاں چٹخاتے پھرتے یا پھر شادی کا سودا کر کے ملازمت کرتے ۔ یوں بھی اس شادی میں ترقی کے امکانات تھے ۔ شہزاد حسین نے ایک ہاتھ سے نوکری اور ایک سے بیوی لی ۔ اور نعیمہ کی منگنی کی کہانی ختم ہو گئی اور اس کے خوابوں کا محل اڑا اڑا دھم کر کے گر پڑا ۔ وہ نہ جانے کتنے ارمان دل میں لئے تھی اور سب ایکدم تاش کے گھر کی طرح گر گئے

نعیمہ کی شادی کو کئی روز ہو گئے تھے لیکن وہ اسی طرح گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی ۔ گویا ابھی ابھی پالکی سے اتری ہو لیکن یہ شک تو محض گھونگھٹ دیکھ کر پیدا ہوتا تھا ۔ ورنہ تو وہ مسہری پر اکیلی بیٹھی رہتی ۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جو آکر اس کے پاس کھڑا ہو جاتا اور نئی نویلی شکل دیکھنے کے لئے اصرار کرتا ۔ کبھی کبھار زمیندار نصرت علی منہ میں پان کا ایک بیڑا دبا کر آ جاتے اور رنو کے سر پر ہاتھ پھیر دیتے اور نعیمہ کی کمر پر ایک ہلکا سا تھپڑ لگا دیتے ، لیکن نعیمہ تو اچھل کر ایک طرف ہو جاتی اور اپنے گھونگھٹ کو اچھی طرح سنبھال لیتی کہ کہیں غلطی سے گھونگھٹ نہ سرک جائے ۔ پھر نصرت علی اس سے کوئی ایسی ہی بات کہہ دیتے جو ان کو کسی طرح زیب نہیں دیتی اور شاید یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی اپنے جملے کی تاب نہ لا سکتے تھے اور ایک طرف کو چل دیتے اور رنو پہلے کی طرح تنہا ہوتی

مگر پھر بھی وہ اطمینان کا سانس لیتی — جب زیادہ دیر ہو جاتی تو وہ اپنے خیالوں کی بستی میں کھو جاتی ——

وہ بارات آرہی ہے اور دھوم دھڑکے سے شہنائیاں بج رہی ہیں۔ ڈھول تاشے بج رہے ہیں۔ عورتیں سہاگ گا رہی ہیں اور ان سب کے درمیان بات کی بات میں سرخ جوڑا پہنا دیا گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک سنہری ہو گئی اور پھر شہزادہ حسین مہرا باندھے داخل ہوا۔ گورا چٹا رنگ، بھرے بھرے گال، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا چکلا سینہ۔ وہ ایک لمحے کے لئے جیسے کسی دوسری دنیا میں پہنچ گئی لیکن پھر بھی فوراً ہی جیسے منوں پتھروں کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ یہ زیور اس کو لوہے کے بڑے بڑے کندے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے ایک چیخ نکل جائے گی۔

"میں زندہ ہوں، مجھے کیوں دفنا رہے ہو" لیکن اس کی آواز گھٹ کر رہ گئی اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ وہ مر گئی۔ اس کی آواز کوئی بھی نہ سن سکے گا۔

"ننو — ننو —" اس نے آہستہ سے کہا لیکن پھر کوئی جواب نہ پاکر وہ اپنے پیر کے ناخن کریدنے لگی اور ابھی وہ ناخن کرید رہی تھی کہ زمیندار نصرت علی کی چھوٹی لڑکی نے پاس آکر کہا "اماں — اور یہ لفظ سنتے ہی پہلے تو وہ شرما گئی لیکن پھر فوراً ہی اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور اس نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس لڑکی کو ایک مرتبہ ڈانٹ دے لیکن پھر وہ اپنی تقدیر پر غور کرنے لگی۔ اس کے سامنے نصرت علی کی شکل پھر گئی جن کو شادی کے پہلے ہی روز سے اپنی نئی نویلی دلہن کی تندرستی کا بہت خیال تھا اور شادی کی پہلی ہی رات کو انھوں نے اسے آرام کرنے کے لئے کہا تھا اور پھر اس کو اچھی طرح حکلا بھی دیا تھا۔

اور اب تو ان کا ہر وقت کا دستور تھا، جب بھی آتے اس کا ہاتھ دیکھتے، ماتھے پر ہاتھ رکھتے کہ کہیں بخار تو نہیں ہو گیا اور حکیم کی طرح نبض پر ہاتھ رکھ کر کہتے "حرارت ہے ہلکی ہلکی، تم رات کو جاگتی ہو اور یہی وجہ ہے کہ اتنے دن کے اندر اندر جیسے اس کا خون سُت گیا ہو لیکن اس حرارت سے اس کو اتنی تکلیف نہ تھی جتنی اس بخار سے جو اس کی ہڈی کے جوڑ جوڑ میں سمایا ہوا تھا۔ اس کا سارا جسم عینک رہا تھا اور یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ٹھنڈے پانی کی ناندیں کود پڑے

ننو کی شادی کو چار مہینے گزر گئے تھے اور نصرت علی کے گھر میں تو کب کی نئی پرانی ہو چکی تھی اور اب تو یہ کیفیت تھی کہ شاہدہ اور خالدہ اسے اماں کہتیں تو اسے ذرا بھی محسوس نہ ہوتا تھا۔ آخر وقت بھی تو کافی ہو گیا تھا۔ پتھر پر پانی کی ایک ایک بوند بھی برابر ٹپ ٹپ گرے تو بھی وہ اپنے لئے جگہ بنا ہی لیتی ہے۔ یہی حال ننو کا ہو اتھا۔ وہ ہر چیز کی عادی ہو چکی تھی۔ سوائے نصرت علی کے جنھیں ہمیشہ اس کی تندرستی کا خیال رہتا تھا۔ وہ جب آتے دوائیں لئے ہوئے آتے۔ اگر کبھی کوئی بات بھی کرتے تو اس کی تندرستی کے بارے میں۔ ننو مسہری پر پڑی ہی اینڈ رہی ہے اور باہر سے نصرت علی آگئے۔ کمرے میں داخل ہو کر ننو کی مسہری پر سرہانے بیٹھ گئے لیکن ننو کی کیفیت کچھ ایسی تھی جیسے وہ نصرت کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ کر ان کی ایک ایک ہڈی کو چور کر ڈالے گی۔ اس نے آہستہ سے نصرت علی کو اپنے دونوں ہاتھوں سے کھینچ لیا اور نصرت علی غیر شعوری طور پر اس کے پاس آگئے۔ ننو نے ان کی کمر میں ہات ڈال کر کچھ اس طرح بھینچا کہ نصرت علی کے لئے اپنے آپ کو چھڑانا مشکل ہو گیا اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ انھوں نے ننو کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ننو بیگم! تمہاری طبیعت خراب ہے۔ آرام کرو، ٹھہرو، میں دوا لاتا ہوں" اور آن کی آن میں دوا کی ایک خوراک لاکر اس کے حلق میں انڈیل دی ننو کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اس آگ پر پانی چھڑک دیا ہو۔ پانی چھڑکتے ہی اتنا دھواں اٹھا جیسے یہ دھواں ساری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور دوا کے پیتے ہی سارا دھواں اس کے ذہن میں بھرنے لگا۔ ننو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں یہ دھواں اس کی آنکھوں میں نہ گھس جائے۔

تھوڑی سی دیر میں نصرت علی ڈاکٹر کو لے کر آموجود ہوئے۔ ڈاکٹر نے فوری آرام کے لئے انجکشن دیئے اور نسخہ لکھا اور بولے کہ مریضہ کو آرام کی ضرورت ہے اور نصرت علی کی ہدایت کے بموجب ڈاکٹر نے ننو کو خود ہدایتیں دیدیں کیونکہ نصرت علی کا خیال تھا کہ ننو پر ان کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا۔ اسی لئے ڈاکٹر صاحب نے کہا" بیگم صاحبہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ البتہ احتیاط کی سخت ضرورت ہے۔ آپ قطعی آرام کریں اور بستر سے بالکل نہ اٹھیں"

ڈاکٹر کے چلے جانے کے بعد نصرت علی نے دونوں لڑکیوں کو حکم دے دیا کہ وہ ننو کا خیال رکھیں۔ ذرا سے کام کے لئے بھی اسے اٹھنا نہ پڑے۔

اس طرح نمّو سارے دن بستر پر پڑی رہتی اور نصرت علی دن میں بیسیوں بار چکر لگاتے لیکن بیوی کے پاس بیٹھنے سے کتراتے اور اگر کبھی غلطی سے بیٹھ بھی جاتے تو بیگم کا ہاتھ لگتے ہی اچھل پڑتے اور ایک طرف جا کر کھڑے ہو جاتے جیسے بجلی کا دھکا لگا ہو۔ کتنا ہی نمو انھیں اپنے پاس بلاتی لیکن وہ دور دور ہی رہتے اور یہی کہتے کہ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بس کچھ دن اور آرام کرلو۔ اس کے بعد کوئی بات نہیں۔ ساری زندگی ساتھ گزارنی ہے۔"

یہ سنکر نمو کا چہرہ اور تمتمانے لگتا۔ وہ چیختی۔ " مجھے کوئی بیماری نہیں ہے۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ میرا علاج کرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" لیکن اس کی چیخ سنتے ہی نصرت علی دوالے کرہ دوڑتے اور اپنی جان کی قسمیں دلا دلا کر دوائیں پلاتے اور پھر اسے لٹا دیتے اور زور سے کہتے "بیٹی شاہدہ! تم اماں کے پنکھا جھلو۔ دورا پڑا ہے" اور شاہدہ ڈری سہمی اماں کے کمرے میں داخل ہوتی اور آہستہ آہستہ ڈرتے ڈرتے پنکھا جھلتی لیکن دل میں یہی سوچتی کہ اچھی بھلی تو ہیں کیسا دورا پڑا ہے اور وہ دالان میں آکر خالدہ سے کہتی "اماں بھی کیسا بہانہ کرتی ہیں، بھلا ایسے بھی کہیں دورے پڑتے ہیں۔ مجھے تو ذرا بھی بیمار نہیں معلوم ہوتیں اور خواہ مخواہ کے لئے انجکشن لگاتی ہیں اور دوائیں پیتی ہیں۔"

لیکن اس کے باوجود نصرت علی جب بھی نمو کا بخار دیکھتے اس کے جسم پر ہاتھ رکھتے تو اس طرح گویا وہ کسی چھوٹی موٹی کی ڈالی کو چھو رہے ہوں یا انھوں نے اپنے ہاتھ میں کوئی تتلی پکڑلی ہو اور وہ آہستہ سے کہتے "کتنا تیز بخار ہے" اور جب نمو آنکھیں پھیر کر ان کی طرف دیکھتی تو اس وقت نصرت علی کو ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے وہ چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔ " سو جاؤ، تمہیں مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

نمو کی بیماری کی خبر اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ میر محمود علی اور ان کی بیگم اپنی بیٹی کو دیکھنے کے لئے داماد کے گھر پہنچے اور نمو کو دیکھ کر تو جیسے ان کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ نمو کی ماں نے کہا "ہائے اللہ! اچھی بھلی لڑکی تھی نہ جانے اسے کیا ہو گیا کہ آدھی ہو گئی۔ سارا خون ست کر رہ گیا چہرہ دیکھو کیسا ہلدی سا ہو رہا ہے۔"

لیکن میر محمود علی چپ چاپ اپنی بیٹی کو دیکھتے رہے۔ انھوں نے آہستہ سے نصرت علی سے پوچھا "کیوں بھائی ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس کا کیا خیال ہے"

نصرت علی نے بڑی سنجیدگی سے کہا " علاج پابندی سے کر رہا ہوں۔ روزانہ پابندی سے انجکشن لگ رہے ہیں۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ شاید بخار ٹھہر گیا ہے۔"

یہ سنکر تو میر محمود علی کا رنگ فق ہو گیا۔ آئے تو ہنس جاتے رہے اور وہ کرسی پر اس طرح سر جھکائے بیٹھ گئے اور بیگم نے نمو کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اس کی آنکھ میں آنسو چھلک پڑے لیکن انھوں نے منہ پھیر کر دوپٹے سے پونچھ لیا کہ کہیں ان کی بیٹی کی نظر ان آنسوؤں پر نہ پڑے اس لئے کہ انھوں نے اپنی لاڈلی کو آنسوؤں سے بچا بچا کر قہقہوں اور مسرتوں کی گود میں پالا تھا۔ نمو نے بڑی حسرت سے ماں کی طرف دیکھا اور پھر نصرت علی کی طرف ایک اچٹتی نظر ڈالی۔

کمرے میں نہ جانے کتنی دیر خاموشی رہی کہ اتنے میں اس خاموشی کا سلسلہ ملازمہ کی آواز سے ٹوٹا۔ "میاں ڈاکٹر صاحب آئے ہیں" — نصرت علی ڈاکٹر کو لینے باہر گئے اور نمو نے ماں سے کہا " اماں مجھے یہاں سے لے چلو۔ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ بالکل اچھی، مجھے ذرا سا بھی بخار نہیں ہے، مجھے ڈاکٹر سے بچاؤ۔ دواؤں سے بچاؤ، سیب، سنترے اور انگوروں سے بچاؤ۔ بس مجھے اکیلے چھوڑ کر مت جاؤ، اپنے ساتھ گھر لے چلو۔ میں بالکل اچھی ہوں" — وہ اس لمحے نصرت علی کو بالکل بھول چکی تھی اور چیخ چیخ کر رو رہی تھی جس وقت نصرت علی گھبرائے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے انھوں نے اپنی ساس سے کہا "بس یہی کیفیت ہے۔ ایسا ہی دورہ پڑتا ہے، آپ دوسرے کمرے میں چلی جائیے۔ ڈاکٹر آرہا ہے انجکشن دے گا۔ ٹھیک ہو جائیں گی۔

بیگم دوسرے کمرے میں گئیں۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگایا۔ دوا دی اور ہدایت کی "ان کے سامنے پریشانی کی کوئی بات نہ کی جائے۔ یہ کہہ کر ڈاکٹر اپنی فیس لے کر چل دیا اور شاہدہ نے آکر پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔

میر محمود علی اور ان کی بیگم نے پہلے تو یہی سوچا کہ وہ چند روز کے لئے نمو کو اپنے گھر لے جائیں۔ جگہ بدلنے سے شاید کچھ فائدہ پہنچے لیکن نصرت علی کے یہاں کے ٹھاٹ باٹ اور ان کے یہاں کا علاج معالجہ دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی۔ انھوں نے سوچا کہ اپنی حیثیت کہاں کہ اس مرض کا علاج کریں۔ اچھا ہے جو زمیندار نصرت علی کے یہاں ہی علاج ہو جائے۔ پھر یہ بھی کہ نصرت علی اور ان کی اپنی حیثیت تو راجا بھوج اور منگوا تیلی کی سی تھی اس لئے اور بھی انھوں نے نمو کو اپنے گھر لے جانے کی ضرورت نہ سمجھی اور خاموشی سے اپنے گھر چلے آئے۔

ادھر نمو کی طبیعت روز بروز گرتی چلی جا رہی تھی۔ جتنا زیادہ علاج ہوتا اتنی ہی اس کی طبیعت اور خراب ہوتی گئی اور یہی وجہ ہے کہ کچھ روز میں وہ بالکل چارپائی سے لگ گئی۔ آخر نصرت علی کی پریشانی بھی بیگم کی بیماری کی طرح بڑھتی رہی اور وہ مسلسل گھر میں آ کر نمو کو ہدایت دیتے رہے اور ایک دن وہ نمو کے کمرے میں داخل ہوئے۔ نمو نے ان کی طرف بڑی حسرت سے دیکھا۔ گویا کہنے والی ہو کہ "آپ بے فکر رہیں۔ میں پابندی سے دوا پی رہی ہوں۔ پھل کھا رہی ہوں"۔

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہے نصرت علی نے بڑے تشویشناک انداز سے کہا "بھئی پھل تو کھا رہی ہونا۔ ہاں ملنا جلنا مت۔ جس چیز کی ضرورت ہو شاہدہ یا خالدہ کو آواز دے لینا۔ خود کوئی تکلیف مت اٹھانا"۔ اور یہ جملے سن کر نمو کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور یہ آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ اس کے جسم کی رگ رگ جلنے لگی اور خون تیزی سے دوڑنے لگا۔ اس کو محسوس ہوا کہ جیسے آج اس کے جسم کی کوئی نہ کوئی رگ ضرور پھٹ جائے گی اور خون کا فوارہ چھوٹے گا اور پھر ساری فضا میں آگ کی لپٹیں اور خون کے فوارے نظر آنے لگے۔ ہر طرف آگ ہی آگ اور جسم کا گرم گرم خون۔ اور خون کے ان قطروں سے شعلوں کی زبانیں پیدا ہونے لگیں۔ اور یہ زبانیں نیزے کی طرح چاروں طرف پھیل گئیں۔

نصرت علی بڑھ کر مسہری پر بیٹھ گئے۔ اور نمو کے رخسار پر ہاتھ پھیرنے لگے اور انھوں نے محسوس کیا کہ نمو کے گال تمتما رہے ہیں اور شعلوں سے دہک رہے ہیں اور ان شعلوں کی گرمی اپنے ہاتھ میں بھی لگنے لگی۔ ایک مرتبہ تو نصرت علی نے اپنے ہاتھ کو دیکھا کہ کہیں آبلہ تو نہیں پڑ گیا لیکن اس کی گرمی ان کے اپنے ہاتھ میں محسوس ہو رہی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں سے شعلے نکل رہے تھے اور یہ شعلے سانپ کے ڈنک کی طرح نصرت علی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نمو کی آنکھیں ہر لمحہ اور زیادہ دہشت ناک ہوتی جا رہی تھیں لیکن آج نصرت علی میں بلا کی ہمت تھی۔ وہ تیزی سے بڑھے اور پھر انھوں نے نمو کو سینے سے لگا لیا نصرت علی اس وقت بھول گئے تھے کہ وہ بیمار رہے ہیں لیکن دوسرے ہی لمحے ان کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے نمو کے جسم میں اینٹھن سی ہونے لگی اور پھر انھیں محسوس ہوا جیسے انھوں نے اس آگ پر پانی چھڑک دیا ہو۔ سائیں سے ایک آواز ہوئی اور فضا میں دھواں پھیل گیا اور یہ دھواں کمرے کی گھٹی ہوئی فضا میں اور گہرا ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ان کا سانس گھٹنے لگا۔ نمو نے آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کے سینے میں جیسے سانس سما ہی نہیں رہا تھا اور ذرا سی دیر میں نصرت علی کے دیکھتے ہی دیکھتے نمو نے ہچکی لی اور اس دھوئیں سے بچنے کے لئے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

زمیندار نصرت علی کا سر بھی جھک گیا اور انھوں نے آگے بڑھ کر ایک سفید چادر نمو پر ڈالی اور کمرے سے باہر نکل آئے کہ کہیں اس دھوئیں سے ان کا دم بھی نہ گھٹنے لگے ——

ابو الفضل صدیقی

ستاروں کی چال

اور گاؤں کی کنواریوں کے تو سینے دھک سے ہو کر رہ جاتے۔ ذرا گوری چٹی نوجوان بہوئیں سہم سی جاتیں۔ اور اب تو پچھلے منہ اندھیرے اجالے نکلنے والی ادھیڑ جوانیں تک ہاتھ بھر کا لمبا گھونگھٹ نکال کر چلتیں اور وقت بے وقت نکلتے بیٹھتے عورتیں اور آتے جاتے جھجکی جھجکی سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوتیں۔ کچھ ایسی دیوانی جوانی ڈالہ ہزاری لعل پر چڑھی تھی کہ ساری بستی چونک پڑی۔ علاقہ بھر کی نظریں اٹھ گئیں اور ابھی اچھی طرح مسیں بھی نہ بھیگنے پائی تھیں کہ بھونچال سا برپا کر دیا جل جل بڑھے قیامت بن کر گاؤں کی عورت پر سوار ہونے چلے گئے ورنہ ساہوکوڑی مل بیچارے اس گاؤں کے بسویا بھی نہ تھے۔ سنا کرتے ہیں کہ راٹھوروں کے گاؤں میں نمک مرچ کی دوکان تھی اور کوڑیا بنیا پکارے جاتے تھے۔ گھر میں جو ذرا ناک نقشہ لوگ باگ کی درست تھی نکلتے بیٹھتے راٹھور نگر کے ٹھاکر زمیندار کی نگاہ تلے پڑ گئی۔ بیچارہ کوڑیا بنیا ایک حد تک تو نبھاتا رہا لیکن جب زمیندار حد سے گزرنے لگا اور اس غریب کو اندیشہ لاحق ہونے لگا کہ اب عزت خطرے میں ہے اور لالائن اس کی جھونپڑی سے اچک کر ٹھکرائن بنا کر حویلی میں پہنچائی جانے والی ہیں تو بیچارا ایک رات راٹھور نگر چھوڑ کر اپنی ناک بچا کر بھاگ پڑا۔

کوڑیا بنیا جس وقت راٹھور نگر سے بھاگا تو اس کی ملکیت ایک "لدو" بھینسا اور پانچ روپیہ اور نمک مرچ ہلدی کی چند پوٹلیں اور دو تین گودڑیاں تھیں اور یہ سب اندھیری رات میں جھونپڑی کے اندر ہی چپکے چپکے بھینسے کی پیٹھ پر لادا۔ نیچے نمک مرچ ہلدی کی پوٹلیاں اور اوپر سے گودڑیاں، انٹی میں پانچ روپیہ اور چپکے سے بھینسہ ہانک کر چل پڑا۔ آگے بھینسا پیچھے خود اور برابر میں ہاتھ پکڑے جورو۔ گاؤں سے باہر نکل کر وہ بیچاری تو چلنے سے بالکل معذور ہو گئی، غریب پورے دنوں سے تھی اور ٹھاکر کی امانت کا بوجھ پیدل چلنے میں سنبھالے نہ سنبھلتا تھا اور جب دیکھا بالکل گھسٹنے ہی لگی تو مجبور ہو کر بڑی مشکل سے گٹھری کی طرح اٹھا کر کوڑیا نے اسے بھینسے کی پیٹھ پر پوٹلیوں اور گدڑیوں کے اوپر لاد دیا۔

راٹھوروں اور چوہانوں کی تاریخی لاگ ڈانٹ چلی آتی ہے اور آج تک ایک دوسرے کے مفرور مجرموں اور بھاگے ہوئے غلاموں کو پناہ دینے کی روایات موجود ہیں۔ کئی دن سے چوہان گڑھ کے زمیندار کے سامنے کوڑیا نے اپنی عرضی پیش کر دی تھی اور اس نے رہنے کو ٹوٹا پھوٹا چھپڑ اور دوکان کے نئے جگہ بنا دی تھی۔ راتوں رات دس کوس کی منزل مار کر کوڑیا چوہان گڑھ پہنچ گیا اور راٹھور نگر اجاڑ کر کوڑیا بنیے نے چوہان گڑھ بسایا۔

اور پھر دیوی تو بھی دیوی ہیں جدھر نگاہ سیدھی کر دیں اور جدھر کو بھی قدم اٹھا دیں۔ چوہان گڑھ میں کوڑیا بنیا مکھی مارتا۔ راٹھور نگر کا سناٹا ابھر گیا تاکہ

کا ان سلامت لے کر آیا اور اٹھوارے اندر حیندر مال سا پتر جنما جس پر راٹھور نگر والا مع مال کے قبضہ کیے رہتا تھا اور ہزاری مل کیا پیدا ہوئے پیدا داری پیدا وار ساتھ لائے۔ ان کی تقدیر سے دیکھتے دیکھتے سب کچھ آ گیا۔ کوڑیا بنیا جس وقت چوہان گڑھ میں آیا تو اچھا خاصہ فقطوئے کی صورت آیا۔ ڈھائی روپیہ کی مالیت کا بھینسا مع لدان کے ساتھ تھا اور انٹی میں پانچ روپیہ تھے مگر بھینسے کی پیٹھ پر جا لالا ان کیا سوار ہوئیں لچھمی دیوی آ بیٹھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بھینسے کی پیٹھ چاندی کی ہو گئی پانچ روپیہ تو انٹی میں نٹھے ہی اور بھینسا پاس۔ پینٹھوں سے نمک مرچ خریدنا اور موٹے جھوٹے اناج کے بدلے چار چار چھ چھ کوس چاروں طرف دیہات میں بیچتا۔ موٹا جھوٹا اناج یہاں سے لادتا وہاں ڈالتا۔ وہاں سے لادتا یہاں پٹختا۔ ایک جگہ سے مکائی۔ دوسری جگہ ساٹھی کے بدلے دی۔ یہاں سے باجرا بھرا وہاں جوار کے بدلے دے دیا جو خریدے اور من میں دس سیر گیہوں ملائے، گیہوں بنائی اور ڈیوڑھا کر لیا۔ سال میں دو سال میں ذرا انٹی بھی بھاری بھری روٹی پر رکھ کر روٹی بھی کھائی اور رات کو پاؤں پھیلا کر سوئے بھی۔ تجارت کا پہیہ تیز ہوا، دائرہ بڑھا، ساکھ بنی، بلا پیسے کے پہلے تو چوہان گڑھ کے جس گھر سے چاہے بھینسہ لاد کر لیجاتے اور اب تو چاروں طرف چار چار کوس بات بن گئی۔ تجارت کے ساتھ سود بیاج رہن دین کا چھوٹا موٹا سلسلہ چل پڑا۔ تجارت سود بیاج کی برکت میں تین چار برس ہی میں کوڑیا بنیا لالہ کوڑی مل ہو گئے۔ اور لچھمی دیوی تو ان سے کچھ قول سا ہار گئیں تھیں۔ چوہان گڑھ لبھانے کے بارھویں سال میں ایسے بڑھے کہ ساہو کوڑی مل کہلانے لگے دس دس کوس تک لین دین پھیل گیا۔ سینکڑوں من غلے کی بھر سال ہونے لگی اور بارھویں سال میں گاؤں کے زمیندار پر قتل کا مقدمہ پڑا۔ ساہو کوڑی مل نے قرضہ دیا اور دس ہزار روپیہ میں چوہان گڑھ ساہو جی کے پاس رہن دخلی میں آ گیا اس شرط پر کہ اصل بوں کی توں کھڑی رہے اور سود گاؤں کی آمدنی منافع سے ادا ہوتا رہے۔ پہلے کوڑیا بنیا ساہو کوڑی مل اور ساہو کوڑی مل سے چوہان گڑھ کے زمیندار بن گئے اور لین دین سود بیاج کی دھمک ہوئی کہ دور دور دیہات میں دانہ دانہ پر ان کی مہر ہو گئی۔ گنے گتے کی گانٹھ گانٹھ پر ان کا نام لکھ گیا۔ آس پاس کے دسیوں گاؤں میں ان کے لین دین سے چولھے گرم ہونے لگے یکز ار یا پار لگنے لگیں کفن پڑنے لگے۔

— ادھر ساہو کوڑی مل تو دیش تھے اور دولت کے ساتھ اپنا رشتہ ہزار ہا سال سے سمجھے ہوئے تھے مگر زمینداری یوں بے سان گمان اس طرح یکدم ہاتھ آ جانے میں انھیں بھی اب کچھ شبہ ہونے لگا تھا اور لالا ان کو تو خوب ہی معلوم تھا کہ ہزاری مل راٹھور نگر سے خون بھی ساتھ لایا ہے اور وہ راجپوت اور زمین کے رشتے کو بھی ہزار ہا سال سے سنتی چلی آئی تھیں اور خوب جانتی تھیں کہ ان کی دنیا میں تقدیر خون کا عطیہ ہے اور خون تو قدرت تقدیر والوں کو ہی عطا کیا کرتی ہے اور جب قرائن سے یہ بات کچھ کچھ لالہ ہزاری مل کے علم میں آئی تو مونچھیں خوب بڑھا کر اٹھائیں۔ سینہ بھی اچھی طرح تان کر چلنے لگے اور جیسے بالشت بھر مونڈھے اچکا کر کھڑے ہو گئے اور جوں جوں بڑھے ان کی گردن اکڑتی ہی چلی گئی اور یہ تبدیلیاں بھی ان کے آبائی خون کا روایاتی تقاضہ تھا خواہ مکر لنگوٹی بھی تباہت نہ ہوتی پھر زمین کی ملکیت اور حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں آنے کا فطری احساس جسم کے اندر ویسے ہی خون کو بالشت بھر نہ اوپر اچھالنے لگتا ہے اور ان کے اندر تو سچ مچ خالص راٹھور خون ہی مچل رہا تھا۔ بیٹے کا اٹھان اور سج دھج دیکھ کر لالا ان اپنی عنفوان شباب کی حادثاتی غلطی پر اب بڑھاپے میں پھولی نہ سماتیں اور چلتے کوئی اور کہے یا نہ کہے وہ تو فخریہ کنور جی کے ہی لقب سے پکارتیں اور نام اور لقب تو وہی قائم ہو گا جس سے ماں پکارے گی۔ لالہ ہزاری مل بچپن ہی سے کنور ہزاری مل پکارے گئے اور جوان ہونے پر تو سچ مچ راجکمار سے نکلے۔

ساہو جی ٹھنڈے دیش تھے مگر پورے بست بسوہ گاؤں کی حکومت جیسے چھپر پھاڑ کر ہاتھوں میں آ جانے نے انھیں بھی تھوڑا بہت متاثر کیا۔ زمانے کا سرد و گرم دیکھے ہوئے تھے۔ حکومت آنے سے کئی برس پیشتر چوہان گڑھ چھوڑ دور دور دیہات کے اقتصادیات پر ان کا نہایت ہی پرسکون اور منظم قسم کا قبضہ ہو چکا تھا۔ چار چار چھ چھ کوس چاروں طرف شادی بیاہ، غمی، مقدمہ بازی۔ ہر ج مرض کے اخراجات تو درکنار گھر گھر روز کی روٹی بھی انھیں کے بیوپار لین دین کے بل پر چلتی تھی اور سیکڑوں ہزاروں ایکڑ زمین پر کھیتی کیاری انھیں کے سود بیاج کے سہارے پر ہی ہوتی تھی۔ چوہان گڑھ کی زمینداری ہاتھ میں آنے کے بعد ساہو جی بیچارے بہت کچھ قابو میں رہے۔ صرف "ٹھاکر مکانی" بنکر بیٹھ گئے۔ مکان تو انھوں نے ساہو کاری بڑھنے کے ہی زمانہ میں اچھا خاصہ بنا لیا تھا مگر ٹھاکر مکانی کی روایات کے مطابق اب انھیں ترمیم کرنی پڑی۔

چوڑی سیڑھی اونچی کرسی کی چوپال، چورخی بند و بست کی حویلی، بلند ڈیوڑھی بنوائی۔ گاؤں کے روایاتی آئین کو جلد بندوبست سے باضابطہ قلم حاصل کر کے دیکھا جس کو پچھلا زمیندار بھولے ہوئے تھا اور اس کے مطابق کاشتکاروں پر اپنے حقوق قائم کیے۔ لمبے چوڑے زرخیز رقبہ میں سے کاشتکار رہے

دخل کر کے اعلیٰ پیمانے پر خود کاشت سیر پھیلائی۔ کھنڈسال کا کاروبار پروان چڑھایا، اور جب تنظیم پر پورا قابو پالیا تو ٹھاکر مکانی بن کر چوپال پر بیٹھ گئے۔ وہ بنے ٹھاکر مکانی تھے۔ زمین ٹلے آسمان ٹھہے "ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے۔ انھیں چوپال سے نیچے اترنا قسم تھی۔ کہیں شادی غمی ہو، بستی میں لڑائی جھگڑا ہو۔ چور ڈکیت پڑیں۔ آگ لگے، پچھم پورب سے جلے مگر ساہوجی کو چوپال کی بیر بھونی جاب دیکھنا حرام تھا۔ حتیٰ کہ لالائن سورگباش ہوئیں تو آگ لگنے کا حق بیٹے کو دے کر شکتی رخصت کر دی اور شمشان تک نہ گئے۔ البتہ بیچارے نے رسوئی بھی چوپال میں بنائی اور اپنے ذاتی انتظام میں لے کر ایک برہمن اور ایک کہار کے سپرد کر دی اور اس کے بعد دوپہر شام دونوں وقت بھوجن کرنے حویلی میں جو جایا کرتے تھے اس سے بھی مستثنیٰ ہو گئے۔ البتہ بیٹے کی شادی کی فکر کی مگر برہمن تو بھی کسی صورت پانچ سال تک لگن اور مہورت ہی نہ بتاتے تھے بیچارے مجبور ہو کر رہ گئے۔ ساہوجی نے اپنی تمام تر معمولات زندگی حتیٰ کہ حرکات و سکنات کچھ بہی کھاتہ جیسے اصولوں میں ڈھالے تھے۔ بااصول تو وہ خلقی طور پر واقع ہوئے تھے اور ٹھاکر مکانی بن کر تو وہ جیسے مجسم قاعدہ اور اصول بن کر رہ گئے تھے۔ زمینداری کے کام کے لیے چوپال میں علیحدہ نشست بنائی۔ ساہوکاری' کاروبار اور کھنڈسال کے حساب کتاب کی دیکھ بھال کے لئے چوپال کے دوسرے حصہ میں جگہ مقرر کی۔ آنے جانے ملنے ملانے والوں کے لئے علیحدہ جگہ بنائی اور ہر کام کو وقت کے سانچے میں ڈھالا۔ قابو یافتگی کا یہ عالم تھا کہ چوپال پر بیٹھے بیٹھے چاروں طرف پھیلے ہوئے کاروبار کی مشینری کا ریگولیٹر بنے ہوئے تھے اور پورب پچھم اتر دکھن اوپر نیچے دولت نے ان کے گھر میں اچھلنے کا ہرا راستہ دیکھ لیا تھا۔ ان کے سونے چاندی، گیہوں چنے، کھانڈ شیرہ ہر چیز میں جیسے مقناطیس کی سی کشش تھی۔

اپنے اصول کے مطابق ساہوجی روزانہ صبح سے دوپہر تک سود بیاج کی وصولیابی کرتے۔ دوپہر تک وصولیابی کا کام ختم کر کے کھانا کھاتے دوپہر ہی میں آرام کر کے سہ پہر سے پھر کام پر آ جاتے اور شام تک قرضہ بانٹتے۔ پرانی آسامیوں کا حساب بناتے اور سورج غروب ہونے کے بعد پیتل کے دیوٹ پر رکھا ہوا کڑوے تیل کا چراغ جلا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر ذرا جھکتے۔ کچھ منہ میں اشلوک بڑبڑاتے اور بہی کھاتہ کھول کر صبح سے شام تک کا حساب کتاب بھی مکمل کرتے اور رات کے کھانے کے بعد دیر تک آنے جانے والوں سے دنیا بھر کی گپ شپ کرتے۔ تجارت، لین دین، سود، بیوپار کے جوڑ توڑ ملاتے، لگاتے، بھر کی اچھی بری خبریں سنتے اور دیہات کے پوشیدہ سے پوشیدہ راز ہضم کر کے اور اپنے مطلب کی نکال کر سو جاتے۔

اور کنور جی عنفوان شباب میں تو ایسے نظر آتے کہ نام ہی نام کو بنیئے کے بیٹے ہیں اور دراصل خالص چھتری ہی نہیں چھتری۔ پورے چوہان گڑھ کی مردم شماری، چماروں، لودھیوں، بھرجیوں، تیلیوں اور جولاہوں، فقیروں، بھنگیوں وغیرہ اچھوت اقوام پر مشتمل تھی۔ ایک گھر سنار کا تھا دو بھی ذات کا مہاجن اور گاؤں کی خالص اچھوت آبادی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ چوہان راجپوتوں نے خاص اہتمام کے ساتھ آباد کیا ہے کہ اونچی ذات کا ایک فرد بھی نہیں پنپنے دیا ہے تاکہ مطلب کے مطابق نہایت کامیاب شخصی حکومت قائم رہے اور کنور جی چماروں کو ٹھٹ من مانی ٹھکرائت بجا رہے تھے ایسی کہ پچھلی سات صدی سے چوہانوں کو بھی نہ بجا ملی تھی۔

مگر ساہوجی پکے بنیئے تھے اور باوجود ان تمام راجپوتی ٹھاٹ سامان کے اور اس ہاتھی کی زرکار عماری کے جس پر وہ آج برا جمان تھے۔ انھیں وہ بھینسے کی پیٹھ بھی اچھی طرح یاد تھی جس پر لد کر وہ راتوں رات راٹھور نگر سے بھاگ کر چوہان گڑھ پہنچے تھے اور "کوڑیا بنیئے" سے ساہوکوڑی مل بنے تھے مگر کنور جی نے تو ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو لالہ جی ہو کر بھی کنور جی پایا تھا۔ کچھ تو "سرچے" ہی "چونکہ دیدہ" تھے۔ پھر باپ کی روز افزوں ترقی اور نت نئی قابو یافتگی نے پورا پورا آبائی اصل پھر پلٹا دیا۔ ماں کا ایک پر بھی نہ لاتے اور سولہ آنے راٹھور راجپوت بن گئے۔ ورنہ باپ تو بیٹھے ساہوکار تھے جن کے پاس اگر کوئی آسامی مردہ گھر میں پڑا چھوڑ کر کفن کے لئے قرضہ مانگنے آتا تو اس کے غم میں آنکھوں میں آنسو بھر کر شریک ہونے والے بڑے پر درد لہجہ اور نرم لفظوں میں تسلی دیتے مگر مرنے والے کی موت کا چلتے چلتے بھرپور فائدہ اٹھانے اور اپنی مخصوص شرح ادھنی روپیہ سود پر دوانی بیاج کی ٹھیلتے اور سوتے سے جگا کر بھی اگر پوچھا جاتا تو اپنے ہر آسامی کے کھیت کی پیداوار کا تخمینہ اور گنے کے رس کے قطرے قطرے کا وزن صحیح صحیح بتا دیتے۔ اور ہر سامی کے جمع خرچ کا میزان ہر وقت دماغ کے اندر لگائے رکھتے اور معمولات زندگی کی ہر نمد چاندی سونے کی چمک میں نگاہوں کے سامنے چمکتی رہتی اور انتظام پر قابو کا یہ عالم تھا کہ تمام سب بیٹھے ہی بیٹھے، بغیر چوپال کی سیڑھی سے نیچے قدم اتارے ہوتا رہتا تھا۔ مگر کنور جی تو چلت پھرت کے آدمی تھے۔ دس بارہ سال ہی کی عمر سے شکرے کی طرح چو طرفہ گردن گھما گھما کر نظر کی کمندیں پھینکنے لگے تھے اور چودہ پندرہ سال کی عمر میں تو اندھیر برپا کر دیا۔ شروع شروع

میں تو جنگل کی دو چار واردتوں کی اطلاع جب ساہوجی کے کان تک پہنچی تو انھوں نے تقدیر ٹھونکی "سمجھے عم کم ہے، بے عقل ہے" کڑی منا کش کی اور لمبی چوڑی اونچ نیچ دکھلائی۔ مگر ساہوجی تو ٹھاکر مکانی قسم کی چیز ٹھیرے اور کنورجی چوپال میں تو کوئی حرکت کرتے نہ تھے اور جنگل کی بات تو آدھی جنگل میں جہاں کی تہاں رہ جایا کرتی اور آدھی گاؤں تک اڑتی اڑتی پہنچی اور بدنامی کے خوف سے آدھی میں کی تہائی چہارم دوسرے ذرائع سے ساہوجی کے کان میں پہنچی اور بجز اس کے کہ ساہوجی بیٹے کو زبانی فہمائش کر دیں اور کوئی بس نہ تھا اور ساہوجی کے بس کی تو یہ بات تھی بھی نہیں کہ ان کی دم بندھے پھرتے رہیں۔ مگر جب چند ہوا خواہوں کی پھرتیلی پارٹی کنورجی کی مددمعاون ہوگئی اور جب شام کا دھندلکا چھوڑ دن دہاڑے گاؤں کی گلیوں میں بھیڑ یا بکریوں کو پکڑنے لگا اور ساہوجی کے کان میں ہر چھوٹی بڑی پہنچی تو وہ سرپیٹ اٹھے۔ نوجوان بیٹے کو بہتیرا سمجھایا کہ تم بنیے کے پوت ہو، اپنی ماں کے پیٹ میں بھینسے کی پیٹھ پر لاد کر اس گاؤں کو بھاگے تھے۔ تمہارے مائی باپ تیسرے فاقے سے یہاں پہنچے تھے۔ بھوک کے مارے تمہاری ماں کے پاؤں ڈولتے تھے۔ جس دن تم پیدا ہوئے ہمارے سر پہ اتنا پھونس نہیں تھا کہ تم کو دھوپ سے بچاتے۔ تمہاری چھٹی کے دن چھٹانک بھر تیل اور تولہ بھر سونٹھ تمہاری ماں کی کلوٹی کے لیے میسر نہ تھی۔ تم اپنی اصل کو مت بھولو۔ جس چوپال پر آج تمہارا باپ بیٹھا ہے کل یہیں پر اس کی دو گز لمبی چوڑی نمک مرچ کی دکنیا تھی اور یہ گاؤں تمہارے باپ کی پونی نہیں ہے۔ اگر آج یہ زمیندار دس ہزار روپیہ دے دے تو کل چھوٹ جائے۔ تم بنیے کے بیٹے ہو تمہارا دھرم پیسہ ہے۔ یہ تمہاری ٹھاکروں کے لونڈوں جیسی حرکتیں تمہارے سارے کاروبار کو مٹی میں ملا دیں گی"......

ساہوجی سمجھاتے ہی رہے مگر عشق کا بھوت نصیحتوں سے کب اترتا ہے۔ مجبوراً ساہوجی نے اپنے دوستوں سے مشورہ کیا۔ بیموں نائی نے فوراً شادی کرنے کی رائے دی۔ نبی بخش جولاہے نے کاروبار کی ذمہ داری اور بوجھ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ یہ دونوں باتیں ساہوجی کے دماغ میں پہلے سے تھیں لیکن شادی تو وقت کا بندھن تھی۔ پانچ برس تک برہمن شادی کی لگن مہورت ہی نہ بتاتے تھے اور پانچ سال میں سے دو سال تو کٹ چکے تھے اور تین باقی تھے اور تین سال میں تو ساہوجی کو ہر سال میں تین سو پینسٹھ مرتبہ زمین اپنی کیلی کی حرکت سے بھٹک کر خلا بازیاں کھاتی معلوم ہو رہی تھی۔ ساہوجی نے اصرار کیا تو برہمن بیچاروں نے بہت سادا ان بن کرانے کے بعد بیاہ کی لگن نکال ہی دی۔

اور لالہ ہزاری لعل کا بیاہ رونا گونا جلدی جلدی بغیر ہی لگن کے ایک ساتھ ہوگیا۔ رسوئی چوپال سے اٹھ کر پھر حویلی میں پہنچ گئی۔ کنورجی نے بھی حویلی کی تشکیل بچی۔ ساتھ ہی ساتھ کاشت اور کھنڈسال کی ذمہ داری سر ہوگئی۔ فطری طور پر ان بوجھوں سے کنورجی کی حرکات کو ایک جھٹکا سا لگا۔ مگر جلد ہی ان کی رفتار کا رخ بدل گیا اور منزل جہاں کی تہاں رہی۔

کاروبار اور خانگی زندگی کی تنظیم نے ان کے مشاغل میں بھی نظام سا پیدا کر دیا اور اب اپنے راستہ پر نہایت سلامت روی کی چال چلنے لئے۔ اب تک مطلب براری کے لئے باپ کا قابو و اقتدار تھا۔ اب وہ اقتدار ان کے اپنے پاس آ گیا۔ ہزاروں من غلہ اور سینکڑوں من شکر کا کام تھا۔ سینکڑوں مزدوروں، بیسیوں ملازموں کی رسی تھی اور وہ نوکری خوب سب سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ پہلے سے کہیں زیادہ آسانی اور بالکل خاموشی کے ساتھ کام نکلنے لگے۔ ساہوجی بھی مطمئن ہو گئے کہ اس ہائے ہائے سے نجات ملی کہ شام کو گوبانے کھیتوں میں چماری پکڑی۔ پہر بھر رات گئے جنگل جھاڑے (رفع حاجت) کے وقت ارہر کے کھیت میں بھنگن دبوچ لی۔ رات کو جولاہوں کے گھر پر چھاپہ مارا۔ صبح ہوتے کولیوں کے جھونپڑوں پر جا پڑے۔ جنگل سے لکڑیاں لانے میں لکڑہارنیں تالاب کے کنارے پکڑ لیں۔ دن دہاڑے پنگھٹ پر سے پانی لیجاتے بھرجن گھسیٹ لی۔ آم کے باغ میں گنے اور سرسوں کے کھیت میں گھوروں کے ڈھیروں پر بھوکے شیر کی طرح شکار کھیلا۔ کپاس چننے والیوں کے غول میں تیندوے کی طرح آ گرتے۔ کوئی روتی بسورتی چپکی چلی آئی تو خیر اور کسی نے شور مچایا تو اپنا گاؤں چھوڑ چار گاؤں بدنامی کی چھینٹیں اڑیں۔ کوئی خاموش گھونگھٹ نکالے بھی چلی آئی تو بھی گاؤں میں آرے آرے ہوگئی۔ انگلیاں اٹھ گئیں اور کچھ نہیں تو کنورجی کے ندیموں میں سے کسی نے فقرہ چپت کر دیا۔

اور اب تو یہاں تک آزادی بھی کہ عورتیں جنگل جھاڑے (رفع حاجت) کے لئے غول بنا کر بھی نہ جایا کرتیں۔ کنورجی کے اندر سے رفتہ رفتہ دلیری کا عنصر بالکل معدوم ہو گیا اور یہ دیکھ کر ساہوجی نے قلم دان اور بہی کھاتہ تو اپنے ہاتھ میں رکھا۔ باقی لین دین کا عملی کام بھی کنورجی کو سونپ دیا اور بیٹھکر

کھنڈسال کا کاروبار نفع یا لگان بشرح سود۔ معافی متوسی بھینٹ بیگار سانڈ سولیانی جنس، بیسیوں طریقوں پر پیٹ کی بھوک جنسی بھوک کے ساتھ سمجھوتہ کرنے لگی۔ کنورجی کی آہنی کلائیوں میں لالہ جی کا طلائی پنجہ فٹ ہوگیا اور ایسا خوبصورتی کے ساتھ فٹ ہوا کہ گھر گھر کنورجی کی واہ واہ ہوگئی۔ اور چین کی بنسی بجنے لگی۔ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے کنورجی کی عملی پالیسی میں شامل ہوگیا۔ اور اب تو لالہ جی جیسی مٹھاس پیدا ہوگئی تھی اور کھنڈسال کے کام میں تو بالکل گھی اور شکر بن کر رہ گئے۔ اچھوت اور مفروض طبقہ کی نفسیات کے بڑے پورے محرم نکلے اور مٹھائی کو درمیان میں لگا کر جنسی تعلقات قائم کرنے میں راب کھانڈ اور شکر کی شیرینیوں کے خواص کے بھرپور شناور بن گئے اور کنورجی کا شباب پہلے سے کہیں زیادہ کامیابی کے ساتھ گاؤں کے اندر ہر نوجوانی کو خوش آمدید کہتا رہا اور نہایت ہی سبک دہنی کے ساتھ خوشہ چینیاں ہونے لگیں اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ہی کھاتہ کے انداز میں طرح طرح کے حیلوں کے ہتھیاروں سے کنورجی کا شکار ہونے لگا۔ اور ہر نوجوان بیٹی کا باپ، ہر نئی بیوی کا شوہر اور ہر جوان ماں کا بیٹا جو ہمیشہ سے کنورجی کا شاکی تھا آج ان کی تعریف کے گن گانے لگا اور راب تو ساہوجی کے کان میں بھی تعریفیں پہنچنے لگیں۔

اور جب جاڑوں کی لمبی راتوں میں کھنڈسال کے بوجھل دھوئیں اور کولہوؤں سے اٹھتی ہوئی نم گرد اور اوپر سے گرتے ہوئے کہرے سے چھائے بیٹ کالے خیموں میں ڈھکی ہوتی تو کنورجی کو اپنی کھنڈسال کے بنے ہوئے شیرہ راب کھانڈ اور گڑ کی شیرینیوں کی طاقت کا اندازہ ہوتا جب بھٹی جھونکنے والے چماروں کوان کی نوجوان بیویاں، نوخیز لڑکیاں اور نوعمر بہنیں رات کا کھانا لے کر آتیں اور کنورجی کھنڈسال کی نیچی دیوار کی منڈیر پر آکے وقت سے پیشتر کلسی (کھانڈ کا مٹی برتن) کے ٹھیکرے میں کھانڈ بھر بھر کر رکھ دیتے اور روٹی کھلا کر چماریاں ادھر ہو کر نکلتیں اور کھانڈ کا بھرا ٹھیکرا اٹھاتیں اور کنورجی مٹی کے تیل کی ڈبیہ کی روشنی میں بھانپ لینے اور جھپکے سے جس پر نظر پڑ جاتی اس کے پیچھے ہو لیتے اور کھنڈسال کے کمپاؤنڈ سے باہر ہو کر گنے کے رقبہ میں پہنچ جاتے اور گنے کا کھیت تو کنورجی کا محفوظ قلعہ تھا جس کے اندر وہ نہایت ہی بے فکر ہو کر اپنے کھانڈ سے بھرے ہوئے ٹھیکرے کی قیمت کا حساب کتاب چکاتے۔

اور یہ بھٹی جھونکتے ہوئے چمار دن سے چند ہی قدم کے فاصلے پر ہوتا اور گنے کے کھیت میں کہیں کہیں پر آہستہ آہستہ ٹہال کھڑکھڑاتیں اور پھنگیاں جھوم اٹھتیں تو چمار یہ سمجھتے کہ گیدڑ گنا چبا چبا کر رس چوس رہا ہے اور جب ادھر سے کنورجی آتے دکھائی دیتے آہستہ آہستہ سلامت روی کی چال، نیچے کو سر ڈالے، ہونٹ چاٹتے تو انھیں آتا دیکھ کر جلدی جلدی جھونک ڈالنے لگتے۔

ورنہ جب چماریاں جمع ہو کر برتن لئے واپس جاتی ہوتیں اور کنورجی کھنڈسار کے دروازے پر آہستہ سے مٹھارتے اور ان میں سے جس کو چاہتے اشارے سے بلا لیتے اور اب تو یہاں تک مانوس ہوگئی تھیں کہ ایک تو چلی آتی بقیہ اور سب کھل کھلاتی، ہنستی اٹھلاتی چلی جاتیں اور پیچھے سے چمار بڑے زور سے بھٹی جھونکتے ہوتے۔ کڑھائیوں سے یکساں رفتار کے ساتھ میٹھی میٹھی بھاپ کے بغارے ساون بھادوں کی گھٹا کی طرح اٹھ کر لوٹتے ہوتے۔ نیچے سے ابلتا ہوا رس گرجتا ہوتا۔ بھاپ کے بوجھل بادل کھنڈسال کے چھپر کی بلند چھت سے ٹکرا ٹکرا کر برستے ہوتے اور پرمٹی کے تیل کی بتیاں بجلی کی طرح لہراتی ہوتیں۔ بڑے کڑھاؤ میں نل کے ذریعہ بہہ بہہ کر رس پڑتا ہوتا اور آخر کی چھوٹی کڑھائی سے کھانڈ تیار ہو ہو کر پرنالے کی راہ ناند دل میں کو چلتی ہوتی اور بغل میں کنورجی کی کوٹھری بند ہو چکتی۔ چمار لہرا لہرا کر گاتے جاتے جھونک ڈالتے جاتے اور صبح کو چمنی کے دھوئیں کی دیوار کی آڑ آڑ کھنڈسال کے دروازے سے کچی کھانڈ سے گودی بھرے چماری نکل جاتی۔

(۲)

ماگھ پوس کی طویل برف میں ڈوبی راتوں میں کھنڈسال کی بھٹی بھڑکتی رہی۔ گرم رس کے ابال چڑھتے رہے۔ پھاگن چیت کی حیات بیز حرارتوں میں متوالی جھومتی سنہری راتوں کے اندر کھیت سے کھلیان تک نیچے سے گیہوں چنے کی اشتہی خوشبوئیں اڑ اڑ کر اوپر آم کی بور کی مہک کے ساتھ ملتی رہیں، اور کھانڈ راب اور روٹی سے لے کر کچی کنبڑیوں کی چٹنی اور آم کے رس تک بھوک اور ذائقہ، ذائقہ اور بھوک میں پیارے پیارے جماعتی دار اور چٹپٹے سمجھوتے ہوتے رہے۔ اساڑھ ساون میں آم کے باغوں کے اندرون دہاڑے کالی کالی اندھیرے بڑے ماحول میں نرم رو چیدوانی لہرا لہرا کر آم کو رس میں شراب کی تندی اور شہد کی مٹھاس بھرتی رہی اور برسات کی نمناک اندھیریوں کا پردہ ان چڑھا نشہ نثرت پورنما کی سیمیں

کرنوں کے پکائے دھان کے سنہرے خوشوں کی خوشبو سے مستا رہا ـــ اور کنور جی کو جیسے دائمی سرور کے عالم میں خم پر خم چڑھائے رنگا رنگ رس پاشیاں اور خوشہ چینیاں کرتے برسیں گزر گئیں۔

ہندوستانی دیہات کا مزاج سخت قسم کا روایاتی ہوتا ہے کسی نئی روایت کو لانا پتھر میں جونک لگانے کے مترادف ہوتا ہے۔ کنور جی کے باپ کے ہاتھ میں گاؤں آیا تو انھوں نے دستور دیہی واجب الارض کے روایاتی آئین میں تھوڑی بہت ترمیم و تنسیخ کر کے گاؤں کو سود بیاج کے راستہ پر لگا لیا۔ ورنہ ٹھاکر زمانے میں تو بھینٹ بیگار ہی چلا کرتی تھی اور جب کنور ہزاری مل کے ہاتھ میں عنان حکومت پہنچی تو انھوں نے علاوہ سب پچھلے استحصالوں کے اپنے مطلب کے راستوں پر لگا لیا اور یہ مزاج بھی پیدا کر لیا جو بالعموم دیہات کی خاموش روشن فضا میں مفقود ہے اور جہاں سب

کر دار عام طور پر ایک ہی خمیر اور وضع کے تعمیر ہوتے ہیں اور اب تک تو یہاں تک کہ دیگر استحصال کی طرح کنور جی کو یہ استحصال بھی خیر مادر معلوم ہونے لگا اور جب کنور جی کی عمر بتیس سے متجاوز تھی اور اپنے جدید طریقہ استحصال کو جاری کئے ہوئے سولہ سترہ سال گزر چکے تھے۔ گاؤں بھی اسے ان کا جائز اور فطرتی حق سمجھنے لگا تھا اور بھوک کے دباؤ میں چنے جو مٹر کی طرح حیا و شرم بھی بھون بھون کر کھاتے۔ چوپان گڑھ کو برسیں گزر گئی تھیں۔ جس طرح جنگل میں گیہوں چنے جو گنے کا ہرا لودا کنور جی کے لئے پروان چڑھتا اسی طرح گاؤں کے اندر باہر بیٹی بہن اور بہو ہر کنور جی کے لئے بہار آتی ....

اور گاؤں میں ایک گھر سنار کا تھا اور بالعموم جس طرح دیہاتی سناروں کے گھروں کی جائے وقوع ہوا کرتی ہے۔ یہ بھی گاؤں کے بیچوں بیچ زمیندار کے پچھواڑے زیر دیوار واقع تھا اور ریوتی سنار کا گھر ہر اعتبار سے مختصر ہی تھا۔ تنگ سا گھر تین سمت سے زمیندار کی حویلی، چوپال اور مویشی خانہ سے گھرا ہوا اور ایک جانب پتلی سی گلی جس میں دروازہ تھا اور دروازے کے برابر ایک چھوٹی سی کوٹھری جس میں ریوتی کی دوکان تھی۔ گھر کیا تھا جیسے دانتوں بیچ زبان۔ پھر ریوتی سنار اور اس کی عورت! نہ کوئی بال بچہ اور نہ کوئی عزیز رشتہ دار فقط دو دم۔ اور ریوتی تو بہت بڑا تھا، کنور جی کے باپ نہ سہی تو چچا کی عمر کی حد تک کنور جی سے بڑا۔ اور ریوتی کی بیوی ریوتی سے ہی چار چھ سال عمر میں چھوٹی رہی ہوگی اور وہ بھی کنور جی سے دس بارہ سال عمر میں بڑی تھی لیکن چونکہ اولاد کی نعمت سے محروم رہی تھی لہذا ناک نقشہ رنگ ڈھنگ تھوڑا بہت اخیر عمر تک بنا رہا اور اپنے خاص وقت پر کنور جی کی نگاہ التفات سے نہایت کامیاب گزر چکی تھیں۔ اب بڑھاپے میں کنور جی اور ریوتی سنار میں بجز اس کے اور کوئی تعلق نہ رہا تھا کہ کبھی کبھی جب کوئی آسامی زیور گروہ کرنے آتا اور پرکھنے میں کنور جی اور ساہو جی دونوں کو شبہ رہتا تو ریوتی سنار سے کسوٹی پر رکھوا کر دیکھتے اور پھر بھی شبہ رفع نہ ہوتا تو تپوا کر پرکھواتے۔ اور آج اسی قسم کی پرکھ کے لئے کنور جی ریوتی سنار کی دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ دروازے پر ایک بیل تانگا رکا۔ ریوتی سنار تو زیور کی پرکھ کے سلسلے میں دھونکنی اور بھٹی میں سر غپ تھا اور دھریوں ہی چھچلتی سی نگاہ اٹھا کر سمجھ لیا مگر کنور جی نے بڑے غور سے دیکھا۔ حالانکہ اس نے تانگے سے اترنے سے قبل ہی اندر نہایت اہتمام کے ساتھ سر سے پاؤں تک چادر سنبھال لی تھی اور لمبا سا گھونگھٹ نکال کر آ رہی تھی۔ مگر کنور جی اب عمر اور تجربے کے اس دور سے گزر رہے تھے جب خط کا مضمون لفافہ دیکھ کر ہی بھانپ جایا کرتے ہیں اور یہاں تو مضمون کے عنوان میں مرمریں انگلیاں اور ہتھیلی سے پاؤں چادر سے باہر سامنے تھے اور دبیز چادر کی تہوں میں سے کنور جی نے جیسے اس کے باریک سے باریک خد و خال تک پڑھ لئے اور پھر کچھ نہ سہی ہمارے کنور جی کو مورنی کی سی چال اور قیامت کی موزونی قد ہی سب کچھ بتانے کے لئے بہت کافی تھی اور جب تک وہ تانگے سے اتر کر پائل کے گھنگھروں کے ساز کے ساتھ رقص کرتی دروازہ کے اندر گئی اس وقت تک کنور جی سے چادر کے اندر سبھی کچھ کہہ گئی اور ریوتی سنار تو بکتے سونے کو بھٹی میں تپا کر پرکھتے رہے اور کنور جی نے اتنے فاصلے سے کچی چاندی پرکھ لی۔

پیچھے ہی بیٹھے تانگے سے اتر کر ریوتی کا سالا آیا اور کنور جی سمجھ گئے کہ ریوتی کی چھوٹی سالی مہمان آئی ہے۔ پہلے والا زمانہ ہوتا تو کنور جی کو ایسی فتوحات میں کئی دن لگتے اور موقع تلاش کرنے کے بعد ایک مہم سی سر کرنی پڑتی لیکن کامیابی یقینی تھی مگر اب تو جب سے ذرا مزاج میں ٹھنڈک اور ہاتھ پاؤں میں ٹھہراؤ پیدا ہوا تھا تو مدتوں سے سانپوں پر سانپ مارتے چلے آ رہے تھے اور لاٹھی ٹوٹنے کا تو نہ جب سوال تھا اور نہ اب، مگر یہاں پر آج بغاوت ان کے حیلے اور فریب کے دباؤ والے قسم کے ہتھکنڈوں میں سے کسی کی کامیابی محال تھی اور دلیری کی پٹے بازیاں مدتوں سے بھول سی گئے، اس

زیور کی جانچ کر کر وہ دکان سے چل دیئے لیکن سوچتے سوچتے تھک گئے اور کوئی تدبیر تقدیر کے ساتھ ہم آغوش ہوتی ہوئی سمجھ میں نہ آئی اور تیسرا پہر ہو گیا۔

مجبور ہو کر مدت کے بعد انھوں نے اپنے پرانے دست راست کنھیا چمار سے مشورہ کیا اور کنھیا "جوڑ توڑ میں" دلیری کے زمانہ میں کنورجی کا دست راست رہ چکا تھا اور اب "غریب" کے دور میں بیکار سا ہو گیا تھا۔ اس وقت اس نے تو اپنے پرانے معیار پر مشورہ دیا اور رات بھی کچھ دور نہیں تھی" تیسرے پہر کا وقت تھا۔ سب کنھیا کے مشورے سے طے ہو گیا اور رات کی مہم میں کنھیا کی ڈیوٹی بھی اہم تھی اور کنھیا نے نہایت ہی آسان گزار راستہ بتایا

خوش نصیبی سے رات اندھیری تھی، یخ بستہ تھی، اور ایسی راتیں تو گاؤں کے اندر بلا کی سنسان ہوا کرتی ہیں، سردی کے مارے دیہاتی کتے بھی میدان چھوڑ کے کونوں کھدروں میں مونہہ دم میں دبائے اور دم منہ پر لپیٹے دبکے پڑے تھے اور گاؤں کے آدمی بیچارے "ماگھ ننگے" جیسا کہ جو کے "ہند منڈیوں اور جھونپڑیوں میں ایک ایک گدڑی کے سہارے ایک ایک پیال کے ڈھیر کے اندر ایک ایک پورا خاندان دبکا پڑا تھا اور کہیں کہیں الاؤ کی آنچ کے توسل میں ایک ہی چادر میں ہی چھ چھ، پندرہ پندرہ گھنٹے کی لمبی رات کی کوہ کنی ہو رہی تھی۔ کنورجی خلاف معمول آج ذرا دیر سے حویلی میں کھانا کھانے آئے اور بہو جی کی آنکھ بچا کر نکلنے ڈیوڑھی کے راستہ باہر جانے کے بجائے چپکے سے حویلی کے زینے پر چڑھ گئے اور حویلی کی چھتوں چھتوں سنار کے چھپر کی منگری پر سے بلی کے سے قدم ڈالتے سنار کی کوٹھری کی چھت پر پہنچے اور چھت سے گھر کی چار دیواری پر اترے اور چار دیواری کی منڈیر پر سے گھر کے صحن میں کود پڑے ـــ ریوتی سنار کا چھوٹا سا گھر بھی اسی وسیع تاریکی اور بھیانک سناٹے میں گم تھا جو ساری بستی کو نگلے ہوئے تھا۔

کنورجی کو سرِ شام ہی ان کے جاسوس کنھیا چمار نے بتا دیا تھا کہ ریوتی اور ان کا مہمان باہر دکان میں سوئیں گے اور ریوتی کی بیوی اپنی بہن کے ساتھ زنانہ مکان میں کوٹھری کے اندر سوئے گی۔ صحن میں پہنچ کر کنورجی نے جیسے تاریک ماحول کو ایک نظر پر تالا، پھر دبے پاؤں دروازے کی جانب گئے اور کنڈی دیکھی کہ اندر سے چڑھی ہوئی ہے؟ پھر پلٹے اور صحن میں گزرتے چھپر میں کو بڑھے، چھپر کے پیچھے کوٹھری تھی اور ریوتی سنار کا کل زنانہ مکان یہی چھپر اور کوٹھری تھا۔ آہستہ سے کوٹھری کے کواڑ ٹٹولے، دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک گہری سی سانس لے کر دو منٹ توقف کیا اور بند دروازے کی جانب اندھیرے میں ٹکٹکی لگائی اور بڑھ کر کواڑ دل سے بالکل چمٹ گئے اور دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ ایک کواڑ کی چینی پکڑ کر زور دیا، آہستہ سے کواڑ چرچرایا اور چول سے اتر گیا اور دونوں کواڑوں کے درمیان چوڑی جھری ہو گئی اور جھری میں سے پنجہ کلائی اندر ڈال کر زنجیر کھول لی۔ دروازہ کھل گیا اور اندھیرا تو یکساں تھا، جیسا چھپر پر ویسا ہی صحن اور چھپر میں اور ویسا ہی یہاں۔ اور گھپ اندھیرے ہی میں کنورجی نے اندازہ کر لیا کہ ایک جانب کو پیال کا موٹا بچھونا پڑا ہوا ہے جس پر دونوں بہنیں ساتھ سو رہی ہیں اور شب تو ویسے ہی اندھیرے اجالے یکساں دیکھتا ہے اور اس وقت تو شکار پر تھا، اور شکار تو ایک ہی قسم کا تھا۔ بس اندھیرے میں نئے اور پرانے کی تمیز کرنی تھی جس میں انھیں ذرا دقت سی ہوتی مگر پرانے شکاری تھے، بڑی دلچسپی کے ساتھ کان لگائے ایک لحاف میں موٹے بھدے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ دوسرے میں سے سریلی سانسیں سنائی دے رہی تھیں مخصوص انداز میں حملہ کرتے وقت ذرا تامل سا ہوا مگر پھر توکل بہ تقدیر۔ جو کچھ بھی ہاتھ آئے اسی پر اکتفا کریں گے۔ فیصلہ کر کے اندھیرے میں تیر چلا ہی دیا اور کنورجی کی مشتری زوروں پر تھی۔ خالی مٹی چھونے تو بھرا ہاتھ سونے پر پڑتا اور اس وقت تو پڑا بھی سونے پر ہی ...... !
جیسے کوٹھری کی تاریک و پست چھت کے نیچے "غاؤں غپ" ایک ہلکی سی آواز گونج کر یکدم جہاں کی تہاں گھٹ گئی اور جیسی کی تیسی خاموشی کچھ پیال کی سرسراہٹ البتہ ہوئی اور جیسے لحاف کچھ سمٹا جھلّا سا ...... اور پھر بدستور خاموشی۔

اور ریوتی کی بیوی تو جہاندیدہ عورت تھی۔ سوتے میں بھی ہوش و حواس درست رکھے۔ اپنے وقت پر کنورجی کی چیرہ دستی کا تجربہ کر چکی تھی اور گھر گھر کے تجربات دیکھ چکی تھی۔ نہایت سبک رفتاری سے پیال کے دوسرے سرے پر کو کھسک گئی، اتنی آہستہ کہ پتہ بھی نہیں ہلا۔ مگر پیال کے نرم نرم گرم گرم بچھونے میں تو زندگی کلبلا اٹھی، آتشیں زندگی! تنکے تنکے میں روح سی دوڑ گئی۔ شعلہ ساماں روح! اور پھر چٹ چٹ چٹاچٹ چنگاریاں سی چھٹ اٹھیں ـــــ اور تیس سی تھرتھرا کر جیسے ذرا دیر میں آگ بجھ گئی۔

اور ساری بستی سوتی رہی اور ساری بستی سے زیادہ بے خبر مٹی کا تودہ بنی ریوتی کی بیوی سوتی رہی۔ تاریک فضا میں بدستور سناٹا رہا

اور کوٹھری کے اندر پیال کے بستر پر چلے تو سانسوں اور خراٹوں کی آوازیں سنائی بھی پڑتی تھیں مگر اب تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ فرش پر تنکا تنکا آسودہ تھا اور فرش سے چھت تک طوفان کے بعد دالاسکوت طاری تھا۔ جھینگر میں اندھیرے کی سن سناہٹ اور صحن میں رات کی جھنجھناہٹ تک بند تھی۔ جیسے ساری کائنات دم بخود ہو کر رہ گئی۔ اور کنور جی نازل تو اوپر سے ہوتے تھے مگر واپس نیچے سے ہوئے۔ آہستہ سے صحن میں سے گذرے، دروازے کی زنجیر کھول کر مکان سے باہر تنگ گلی میں آگئے جہاں دوکان کے سامنے دروازے کے عین برابر کنھیا چمار ہاتھ میں لٹھ لئے پہرے پر چوکس کھڑا تھا۔ دوکان کی زنجیر احتیاطاً باہر سے لگادی تھی مگر دوکان کے اندر ریوتی اور اس کا مہمان سالا لحافوں میں منہ دبائے بے خبر گہری نیند سو رہے تھے ایسی گہری کہ ساری بستی چیخ اٹھتی تو بھی شور ان کے کانوں تک پہنچنے کی کوئی صورت نہ تھی، دوسری بغرض محال اگر گھر کے اندر کوئی شور بھی اٹھتا اور ان کے کان تک آواز پہنچ بھی جاتی تو زنجیر تو باہر سے بند تھی ور اگر اس کے باوجود اندر سے کواڑ اتار کر نکل بھی آتے تو آخر تھیار بند کنھیا چمار تو انھیں روکنے کے لئے ہی کھڑا تھا کنور جی کے باہر نکلتے ہی کنھیا نے آہستہ سے دوکان کی باہر سے لگائی ہوئی کنڈی اتار دی اور کنور جی کے ساتھ ہولیا۔

اور کنور جی مدتوں سے جاڑوں کی طویل سرد راتیں گنے کے ربیتے کے درمیان چلتی ہوئی کھنڈسال میں گزارا کرتے۔ جہاں طرح طرح کی مٹھاس کنور جی کے رونگٹے رونگٹے میں بس جاتیں۔ بہار کی سنہری رنگیلی راتیاں کھلیان میں بسر ہوتیں۔ جہاں پکے ہوئے اناج کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ بھانت بھانت کے کھلتے ہوئے جنگلی پھولوں کی مہک مل مل کر اور کنور جی کے رگ وپے میں حلول ہو ہو کر انھیں خسم دامان گلفروش سا بنائے رکھتی اور برسات کی نم گرم کالی کالی راتیں، جب آسمان سے شراب برسا کرتی ہے اور زمین سے خم اٹھا کرتے ہیں اور مست ہوائیں نشیلی تاریکیاں اور سلونی نمناکیاں زندگی میں رس ہی رس بھر دیتی ہیں۔ کنور جی بستی سے ملحق اپنے آم کے باغ میں گذارتے جہاں کتنی آمنوں سندریوں کے رس چوس جاتے۔ شاید انہیں بھی شمار نہ تھی۔ اور ریوتی سنار کے دروازے سے نکل کر سیدھے کھنڈسال جانے کا ارادہ کرکے چلے۔ چند قدم ساتھ چل کر کنھیا چمار اپنے گھر کی جانب جاتی ہوئی گلی میں کٹ گیا۔ کنور جی کو بستی سے باہر ہوتے ہی یاد آیا کہ کھنڈسال میں صرف ایک کمبل ہے اور وہ رضائی جو وہ لپیٹے ہوئے کھانا کھانے چلے آئے تھے حویلی میں ہی رہ گئی لہذا رضائی لینے کے لئے پلٹے۔ دبے پاؤں چوپال کی سیڑھیاں چڑھتے حویلی کی ڈیوڑھی کے دروازے پر پہرے جو چوپال کے چبوترے کے اوپر کھلتا تھا، دروازے کے عین برابر متھوا چوکیدار کی کوٹھری تھی، اوپر کی سیڑھی پر پہنچ کر کنور جی نے دیہاتی قاعدے کے مطابق کھنکار کر مطلع کیا کہ "میں ہوں" مگر جواب نہ ملا۔ "ایں کیا متھوا آج سو کر رہ گیا؟" انھوں نے دل میں خیال کیا اور بجائے دروازہ کھٹکھٹانے کے کوٹھری میں کو جھانکا۔ لالٹین ٹمٹما رہی تھی اور متھوا پیال پر لحاف میں منہ ڈھانکے بے خبر سو رہا تھا اور انھیں حیرت ہوئی مگر آہستہ آہستہ پکارا مگر وہ کم بخت ٹس سے مس نہ ہوا۔ اندر بڑھے اور لحاف کھینچا تو بھونچکا سے رہ گئے۔ بستر خالی تھا اور لحاف کے نیچے متھوا کی لاٹھی اس طرح سے لمبی رکھی تھی کہ بظاہر دیکھنے والے کو یہ معلوم ہو کہ متھوا لحاف میں سو رہا ہے۔ انھوں نے لحاف کو پاؤں سے ہٹایا تو متھوا کی جگہ اس کی لاٹھی لمبی لمبی بستر پر رکھی ہوئی پائی جو بادی النظر میں اوپر سے ایسی معلوم ہو رہی تھی کہ جیسے اس میں کوئی سو رہا ہے تو انھوں نے دل کو سمجھایا "وہ کوئی بات نہیں، متھوا پہرے پر ہے پچھواڑے۔" مگر پچھیت کی جانب سے تو وہ خود ہی آ رہے ہیں اور آواز بھی نہ سنی! اور انھوں نے دو منٹ سکوت کیا اور گہری سانس لی۔

"اونہہ ہے نا لونڈا ـــــ تنہا اندھیرے میں پہرے پر چل دیتا ہے" انھوں نے اپنے پشتینی وفادار باڈی گارڈ کی لاٹھی اور لالٹین بحال ہونے کا جواز اپنے دل میں پیش کیا اور جیسے نہایت آہستہ سے کہیں کواڑ کا کھٹکا سنائی دیا اور پھر جیسے کسی بند جگہ میں کنڈی چڑھانے کی آواز سنی وہ کوٹھری سے باہر آئے اور جیسے ڈیوڑھی کے کواڑوں کے سامنے اور پشت دروازے کی زمین پر متھوا چوکیدار ایک دم آگ سا تا یا اور کواڑ تو جوں کے توں بند تھے۔ انھوں نے متھوا کو سر سے پاؤں تک پرتالا اور کہاں تھا کا رسمی سوال ان کے منہ سے نکلا۔ اور سوال تو رفع اجنبیت کے سلسلے میں یوں ہی بے معنی سا تھا مگر جواب میں نوجوان خام کار بھنگی کی آواز گلے میں پھنس کر رہ گئی اور کنور جی کی باصرہ تو رات کی تاریکیوں میں بھی دن کی روشنی سے کچھ کم نہ دیکھتی تھی اور کنور جی تو مدتوں سے متھوا کے پہرے کا راستہ بھانپے ہوئے تھے اس وقت اس کی ناگفتنی کیفیت دیکھ کر گھتنی و ناگفتنی بغیر اس کے کہے گویا سب کچھ سمجھ گئے مگر جیسے ان کے اندر ریوتی سنار کی بیوی سی کروٹ لے گئی انھوں نے اس کے حلق سے نکلتی ہوئی پہلی آواز کی کلام موزونی کی جانب خود ہی رہنمائی کر دی

"ہوں" پچھواڑے پہرے پر جایا کرو تو لالٹین اور لاٹھی لے کر جایا کرو" اور یلیے تڑنگے بھنگی کو جیسے نصیحت اوپر سے نیچے تک ۔ "لالا اور دل کو سمجھایا کہ بھنگی تو نمبدار کے بڑے جاں نثار ہوتے ہیں —— اور بڑے معتمد ! نمک حلال ۔ اور ایسی سردرات میں کیسا پہرہ دے کر رہا ہے ان کا بلہار" (باڈی گارڈ) اور بت بنا ہرٹ سن کر بوڑھے ساہو جی چوپال میں سے کھانسے ۔ کنور جی کی توجہ ادھر گئی ۔ سوچے اب کون ڈیوڑھی کے چکواڑ کھلوا کر رضائی لینے اندر جائے اور بیچاری بہو جی کو سوتے سے جگائے ۔ شرابی کے سے قدم ڈالتے چوپال میں گھس گئے اور الگنی پر پڑے چوپال کے لحافوں میں سے ایک لحاف اتار کر کھنڈسال کی جانب جھومتے گنگناتے چلے گئے ۔ سیڑھیوں سے اترتے وقت متھو سے کہہ کر ہوشیار رہنے کی رسمی ہدایت دے کر چلے گئے

کھنڈسال پر کام بڑھ چکا تھا ۔ مزدور اور کاریگر اپنی اپنی منڈیوں اور مڑھوں میں دبک چکے تھے اور مکمل سناٹا تھا ۔ ان کی کوٹھری میں لالٹین ٹمٹما رہی تھی ۔ کنور جی اپنے بستر میں دبک گئے اور لحاف کی گرم گرم نرم نرم سانولی سلونی لوریاں سی دیتی لہروں تلے نیند کے گنگا جمنی تھپیڑوں میں جب انھوں نے آج کے لین دین کا حساب لگایا تو میزان میں نفع ہی نفع آیا اور کچھ بھی ہو" بہو جی نے تو خیر بہو جی مگر بیگن کی بیاہی ! اور برہمن کھینچ تان کر لگن مہورت نکال دیں تو کیا ہوتا ہے ۔ ان کے ستارے اپنے راستہ پر چلیں گے ان کے ستارے اپنے راستے پر چلیں گے .... اور ستاروں کی چال پر نہ انھیں کا بس تھا اور نہ بہو جی کا ہی" اور یہ بھی ستاروں کی چال کی بات تھی کہ تمام دن بول و براز سے دست و گریباں رہنے والے اچھوت کی تقدیر ساری رات ایسی چمکتی کہ سونے اور چاندی پر لوٹا کرتی ۔

——(۳)——

چھوٹی بہن پر تو خیر نئی گذری ہی لیکن بڑی کے نزدیک تو وہی ہوئی جو اس سے دس بارہ سال پیشتر بیت چکی تھی ۔ اور چھوٹی بہن پر تو خیر بڑی خیریت سے بیتی ایک چوں بھی نہ سنائی دی ورنہ ریوتی کی بیوی پر تو اپنے وقت میں ایسے زور و شور سے بیتی تھی کہ سارا گاؤں گونج اٹھا تھا اور ریوتی سنار تین دن گھر سے نکل کر دوکان تک نہ آئے تھے اور بیچارے منہ چھپائے پڑے رہے تھے ۔ مگر ریوتی کی بیوی جانتی تھی کہ رات پھر آنے والی ہے اور روز روز خیریت تھوڑی بیت سکتی ہے اور کچھ نہ ہوا اور کتا ہی بھونک پڑا تو اس کی تو کچھ نہیں تھی ۔ چار ہاتھ کا خصم بیٹھا تھا ۔ چند روز گاؤں والے سرگوشیاں کر کے چپ رہے تھے اور اس بیچاری کنواری لڑکی کی تو بڑی بدنامی ہو جائے گی ۔ ناک کٹ جائے گی ۔ پرایا دھن اپنی امانت میں رکھنے کی گنجائش نہ دیکھی اور دوپہر کو ہی الٹے پاؤں رخصت کر دیا ۔

اور کنور جی اور بہو جی دونوں آج کی شب ایک ہی تقدیر سے دوچار ہوئے اور اب تک تو متھو کا چچا جودھا چوکیداری پر تھا اور متھو نے تو ابھی ہفتہ عشرہ سے ہی چچا کی عیوضی لی تھی اور بہو جی کے پاس تو کنور جی جیسے چھ فٹے ستون سے شوہر کی آڑ تھی اور اس کی آڑ میں بیٹھ کر خواہ صبح کا کام والا پچاس سالہ چمار کنہیا ہو یا دوپہر کا کام والا جوان مسٹنڈا رمضانی جولاہہ ہو یا رات کا چوکیدار بوڑھے جودھا کے بجائے نوخیز متھو ۔ آنکھ بند تو اندر سب تمام کنار کرے ۔ سب کی کارگزاری کنور جی کے ہی حساب میں درج ہوتی مگر چھوت تو چھوت ہے ۔ نہ لگے تو بھنگی چمار جولاہا سر سے پاؤں تک چمٹا رہے اور نہ لگے اور لگے تو برہمن چھتری ویش پاس سے چھوکر نکل جائے تو چمٹ کر رہ جائے ۔ بہو جی کو تو بھنگی کی چھوت لگ کر بھی نہ لگ سکی اور سنارن کو کنور جی کی چھوت ایسی چمٹی کہ غریب ناک کان کے ساتھ ہاتھ پاؤں سے بھی نہ چھوٹ سکی ۔ کنور جی کے بائیں ہاتھ کا کرتب اندر ریوتی کی بیوی کے دائیں پہلو کی کروٹ رنگ لے آئی ۔ بیچاری کے پیٹ میں ہیضہ کا کیڑا بیٹھ گیا ۔ تیسرے ہی مہینہ میکے سے خبر پاکر ریوتی کی بیوی پہنچی ۔ دیہاتی دائیوں کے علاج کے ذریعے کنور جی کی زندہ شرارت کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ۔ شہر تک سے دوائیں منگائیں مگر مرض پرانا گیو ما جڑ پکڑتا گیا ۔ اور یہاں تک کہ وہ شوہر جو نو ماہ پیشتر بیاہی گئی بیوی کروٹ بدل کر اور ریوتی کی سالی دم سادھ کر بچ گئی بیٹھی پڑ کر ہی رہا مگر شوہر تو اپنی پنچایت کے زند سے اپنی بڑی سے بڑی لغزشوں کا ازالہ کر لیتے ہیں ۔ اس کے ازالے میں ریوتی کی بیوی ناکام رہی تو پنچوں نے بروقت دستگیری کی ۔ مہاجن سناروں کی دیہاتی پنچایت نے تاوان ڈال کر قصور معاف کر دیا اور نومولود کو ریوتی سنار کا بیٹا قرار دے کر اس کے سر منڈھ دیا اور لڑکی کو پھر سے کنواری مان کر ایک نوجوان مہاجن سنار کے ساتھ اس کا بندھن کر دیا ۔ بیٹا لے کر ریوتی کی بیوی گود بھرے خوشی خوشی گھر آئیں اور بہن کا گھر بھی بنا آئیں ۔ اور ریوتی سنار کو اگرچہ بیمار بہت زیادہ کھلا ۔ مدتوں سے سگی جورو کو بھی نہ پہچانتے تھے چہ جائیکہ بچوں سے بچے ۔ زہر دیں اس پہ یہ تاکید کہ بیٹا ہوگا ۔ بڑھاپے میں سالی سے جہنم کو کے اقرار کر لیا اور خود آگے دیتے نہ سہی انہیں کے دھرے پہ ریوتی کے کندھے بھاری ہو گئے اور ریوتی بیٹے والے کہلائے ۔

اور حادثہ کی ستم ظریفی! — عین اسی ساعت کی مٹھو چوکیدار کے پہرے کی کارگزاری کنورجی کے گھر میں راجکماری کے روپ میں چہک اٹھی۔ خیر بوجی کو تو علم تھا ہی اور کنورجی کے یہاں بھی پشتوں سے حساب کتاب ہی پیشہ چلا آرہا تھا اور ان کے اور بوجی کے درمیان حساب کتاب کی عمر بھر کی میزان انگلیوں پر تھی اور آج کی رات تو آج کی رات۔ آج کی رات کے اردگرد دور دور کوئی رات نہ رکھی تھی نہ ہی ہیں۔ پھر کنورجی میزان کی بیٹھی کی اصلیت کیوں نہ سمجھ گئے ہوں گے اور یہ تو اسی سال کے اندر کی بات تھی۔ انھیں تو سالہا سال کی ایک ایک یاد تھی اور جن تاریخوں میں بوجی کے لڑکی ہوئی انھیں کے اردگرد سنا کہ ریوتی کی سالی کے لڑکا ہوا اور ان دونوں ان ہونیوں کے وہ اور ریوتی سنار دونوں بیچارے جتنے قصور وار تھے اس کا بھی انھیں خوب اندازہ تھا اور ریوتی سنار کے لڑکے اور اپنی لڑکی کے رشتہ کے میزان میں انھیں صفر کرنے کا حساب بھی معلوم تھا اور ریوتی سنار اور کنورجی اور مٹھو تینوں حساب دوستاں دردل کر کے رہ گئے۔ اور ساہو جی کے گھر کا راستہ تو مدتوں سے اوروں کی ہی کمائیاں دیکھے ہوئے تھیں اور مٹھو کی محنت کے ستاروں نے بھی ادھر رخ کر دیا اور بھولی وتی کے روپ میں ان کے گھر چہک گئے۔ مثل مشہور ہے کہ شودر کے گھر میں پدمنی جنم لیتی ہے مگر یہاں ستاروں کی چال دو ویشت سے الٹی تھی۔ چھتری ویش کی کوکھ میں جا براجا اور شودر نے پدمنی کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے..........

اور ریوتی بیچارے کی بھی ساری عمر تیر امبر اسونا چاندی بناتے سنوارتے گذری تھی اور ہمیشہ اوروں ہی کے مال سے ان کے ہاتھ پیلے رہے تھے اور ریوتی کی کھیتی بلا جوتے بوئے کنورجی کی ایک ہی جست کے طفیل ہری ہو گئی اور ان کے گھر کا بے آب و گیاہ ویران میدان بیٹے کی آواز سے چہک اٹھا۔

دنیا میں ہر پرشاد کا وجود کالی رات میں چھت پر سے پھاند پڑنے کے حادثہ کی صورت میں نازل ہوا تھا۔ ماں کے پیٹ میں پھوڑا سے بن کر عالم وجود میں آئے اور باپ کی گردن پر رسولی بن کر سوار ہوئے۔ اور ریوتی کے سامنے اس کے تجاہل عارفانہ کی زندہ تشکیل۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ جبریہ بیٹا بن کر کھڑے ہو گئے..........

——(۴)——

وقت گزرتا گیا اور وقت تو بڑا اندمال کرنے والا ہوتا ہے۔ ریوتی سنار کے بدن پر ہر پرشاد کا وہ وجود جو یکدم ناسور بن کر رد تما ہوا اور بدگوشت بن کر بڑھا سچ مچ ان کا کار آمد عضو سا بن گیا۔ اور چاہے دنیا نے یاد رکھا ہو مگر ریوتی سنار تو اپنی اس خود فریبی کو بھول گئے جو بھری پنچایت میں ہر پرشاد کو اپنے سر لیتے وقت انھوں نے اپنے اوپر طاری کی تھی اور ان کا وہ زبردستی باپ والا بہروپ آج سچ مچ باپ سا بن کر رہ گیا۔ اور ریوتی سنار کی بیوی تو موں سی تھی اور موں ہی تو ویسے ہی ماؤں سی ہوتی ہے وہ ماں بن کر رہ گئی تو کیا تعجب تھا۔

اور ہر پرشاد ریوتی سنار کے گھر میں اکلوتے لاڈلے بن کر پلے مگر اپنی اصل نسل نہ جانتے ہوئے بھی گئے اپنی اصل کو۔ صورت شکل کے اعتبار سے ماں باپ کا متناسب امتزاج۔ عادت و خصلت کے لحاظ سے باپ کی زندہ تشکیل۔ مہاجن سنار کے گھر کا تربیتی ماحول بہت ہی کم اثر انداز ہو سکا۔ بچپن ہی کے چال ڈھال انگلین کا اندازہ کر کے ماں باپ نے پیار میں بابو بابو پکارنا شروع کیا جس کو شروع میں گاؤں والوں نے طنزیہ پکارا مگر سن شعور کو پہنچتے پہ ہر پرشاد غائب ہو گئے اور بابو بنتے گئے اور جوان ہوتے ہوتے بابو ہی رہ گئے اور ہر پرشاد فراموش ہو گئے۔

ریوتی سنار نے اپنے بڑھاپے کے وقت کا خیال کر کے انھیں بچپن سے کام پر لگایا اور جوان ہوتے ہوتے بابو بڑے ہنرمند قسم کے سنار بن گئے اور ریوتی بیچارا تو پرانی چال کا دیہاتی سنار تھا اپنی ڈھنگ پر بیٹھ کر باپ دادا کے موٹے جھوٹے نمونے گڑھنے والا مگر بابو سنار تو نئی دنیا سے متاثر ہوئے۔ نہایت چکدار سجی ہوئی سائیکل خریدی جس میں خوب چمک دار رنگین کپڑے کا بڑا سا بکسونہ تھیلا لٹکایا اور نئی وضع کے اوزاروں سے بھرا۔ سر پہ انگریزی فیشن کے چمکدار بال رکھائے۔ سرخ بنیر کا چمکدار بٹنوں والا شارٹ کوٹ پہنا۔ سیاہ مخملی کنارکی باریک دھوتی باندھی۔ پاؤں میں سیاہ پیٹنٹ لیدر کی گرگابی پہنی اور جو بال گڑھ سے دس دس میل چاروں طرف جو گاؤں میں گاؤں گاؤں سائیکل پر پھیر پھیر الٹتے۔ کام لاتے لیجاتے نپٹا کرتے۔ اور معمولی مرمت کا کام اپنے تھیلے کے جدید اوزاروں سے جہاں تہاں کر کے دینے لگے۔ شروع شروع میں تو گاؤں کے بڑے بوڑھوں نے ناک بھوں چڑھائی کہ ہوگئی ہے اس لونڈے کو۔ مگر تھوڑے دنوں گاؤں گاؤں گھر گھر گھومنے پھرنے کے سبب بابو سنار اپنے حلقہ میں مخصوص اہمیت کے حامل ہو گئے۔ کام اور آمدنی کہیں سے کہیں جا پہنچی جو گانی کا پرانا روایاتی حلقہ بڑھ کر بہت وسیع ہو گیا۔ ہر کھاتے پیتے گھر کی نوجوان اور بوڑھی عورت کے محرم راز بنگر سے بن گئے۔ کہ جن کی حس خفیہ محبت اور دو مرے خاموش ذرائع سے آیا ہوا مال نہایت ہی رازداری کے ساتھ زیور کی شکل میں

تبدیل کر دیتے ۔ اور یہ تو خیر چوری چھپے کی بات تھی اور اس کا حساب کتاب بابو سنار ہی کے دل میں رہتا تھا۔ یوں بھی سیدھی سادی زیور کی تیاری میں یلتے دیتے روپیہ میں چار آنہ بھر کاٹنے کی تول میں ان کے پلے رہ جاتا اور چار آنہ بھر گلاوٹ میں ان کی بھٹی کی راکھ میں مل جاتا۔ چار آنے بھر ملاوٹ ٹانکے بٹہ میں رہتا اور بقیہ چوتی بھر تو شہور بات ہے کہ نوائی میں جایا کرتا ہے بعوض من میں چالیس سیر پانی باقی دودھ ہی دودھ تیار کر کے مالک کے ہاتھ میں دیتے۔

بابو سنار کی سائیکل کی سریلی گھنٹی بجتے ہی گاؤں کی ابھرتی ہوئی کنواریاں، شوقین بہوئیں اور منچلی بیاہیں اٹھلاتی ہوئی دروازے پر آجاتیں۔ ٹوٹے پھوٹے چھلے ۔ بالے بالیاں پتے، کہیں کہیں کڑے چھڑے پتے جھانجن رام جھول اور چھاگل پائل نکل پڑتے ۔ کہیں تو بنے بنائے نئے چمک دار نئی وضع کے زیوروں سے جو بابو سنار کے تھیلے میں رنگین ڈبوں کے اندر بند ہوتے ۔ الہ دین کے پرانے چراغ سے نئے چراغ بدل جایا کرتے اور کہیں نکھار اور کہیں جگہ ٹوٹ پھوٹ کی مرمت کا فوری کام ہوتا کہیں نتھ بلاق نئے نمونے کے بندوں میں اور جھومکے سہارے انگریزی نمونے کے پھولوں میں مسخ کرنا ہوتے اور جو ہے دیتوں اور پہنچیوں مانند بندوں کو توڑے اور برسلیوں میں قلب ماہیت کرنا ہوتا اور کبھی کبھی گلے کا ہار پاؤں کے کڑے اور ہاتھوں کی کنگھنیاں توڑ کر نگڑی کی تعمیر پیش نظر ہوا کرتی اور ڈیں بیس ملکا اور منڈے (ایڈورڈ) شاہی روپو میں کنڈے لگا کر اور ہنسلی کا تعویذ بنا کر ہمیل بنانے کا آرڈر ملتا اور یہ سٹے بٹے بابو سنار کے اس کانٹے میں چڑھتا اترتا جو لیتے وقت تولہ کا گیارہ ماشہ تول کر دکھاتا اور طیاری کے بعد نہایت ایمانداری کے ساتھ تولہ کا تیرہ ماشہ تول دیتا ۔ اور شوہروں، بیٹوں اور بھائیوں کی نظر سے بچا کر جمع کی ہوئی چاندی چپکے سے بابو سنار کے تھیلے کے بلیے چوڑے پیٹ میں اتر جاتی اور بابو سنار اپنی کیمیا گری کے زور سے دھڑیوں کانسے — اور جستن سلور کو ایسا چمکاتے کہ کچی چاندی شرما دیتے اور پیتل پر وہ سہاگا چڑھاتے کہ پکا سونا ماند کر دیتے۔

اس کے علاوہ بابو سنار کی پوزیشن اپنے حلقۂ اثر میں MOVING BANK جیسی تھی ضرورت مند عورتوں کے زیورات ادھنی روپیہ ماہوار سود در سود پر گروہ رکھ کر چپکے سے بچاری کا کام نکال دیتے اور اپنا اصل د سود وصول کر کے جوں کا توں زیور واپس کر دیتے ایسا جوں کا توں کہ عمر بھر استعمال کرنے والی مجال کیا جو ذرا بھی شناخت کر سکے کہ یہ زیور اس کا اپنا ہے یا نقل مطابق اصل ۔

اور سونے چاندی کو آخیر منزل تک پہنچانے میں بابو سنار کا فیض عام تھا ۔ اور اپنے حلقہ اور اپنے حلقہ کے حلقۂ اثر کے کالی راتوں میں سر ہتھیلی پر رکھ کر کمائی کر کے لانے والے جیوٹ جوان سب سے پہلے اپنی کمائی بابو سنار کے ہاتھ پر لا کر دھرتے کیونکہ انھیں بابو سنار کی ایمانداری پر اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا کہ تھانے دار کی بے ایمانی کا اندیشہ اور سب گروہ بابو سنار کے اتنے معتقد تھے کہ خاص بابو سنار کے ہی ہاتھ سے تھانہ دار کے حق کا تہائی علیحدہ کرا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔ خیر یہ کام تو بابو سنار بڑے اطمینان سے کرتے لیکن جس مال میں تھانہ دار کا "دھرم کا حق" نہ ہوا کرتا اس کی قلب ماہیت میں بابو سنار بڑی سرگرمی اور شدید سوز گداز کا مظاہرہ کرتا اور جب تک تھانہ میں رپورٹ اوّل درج ہوتی دیو میں مال ان کی بھٹی سے گزر کر دھونکنی کے زور سے جدید سے جدید تر شکلیں اختیار کر جاتا اور تعزیرات ہند اور ضابطۂ فوجداری کے آہنی پنجے سے کوسوں دور ہو جاتا ۔

اور پھول وتی تو گاؤں کے زمیندار کی بیٹی تھی اور بابو سنار تو اپنے گاؤں کا سنار تھا، علاقہ بھر کی ٹھکرائنوں، برہمنوں، جاٹنوں اور بنینیوں کا کھلونا بنا ہوا تھا۔ بھلا پھول وتی کی جوہر شناس نگاہیں بابو کے آرٹ پر کیوں نہ پڑتیں اور پھر اپنے گاؤں کا اور ٹرے دس کا لڑکا۔ ساتھ کا کھیلا گھر کا پلا بڑھا، معتمد جس کا باپ پھول وتی کے باپ دادا کا کھرے کھوٹے سونے چاندی کی پرکھ میں معتبر مشیر تھا اور پھول وتی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ دادا کو بابو کے باپ کی تعریف کرتے سنا تھا لہٰذا پھول وتی کے دل میں بھی اس کی جانب سے ایک مخصوص قسم کی دلچسپی اور عزت تھی جو ہوش سنبھالتے ہی شعور میں رچ گئی تھی ۔

اور پھول وتی تو خیر سچ مچ پھول تھی ۔ اسم بامسمیٰ، اور پھول بھی کھلتا ہوا گلاب — اور بابو سنار بھی ہو اگبرو جوان نکلا تھا، پھر تمٹر ابیشہ، باتوں میں بلا کا رس، آواز میں چاندی کی سلاخ کی سی سریلی جھنکار اور طرز گفتگو اور لہجہ میں سونے کی سی لچک۔ آنکھوں میں سچے موتیوں جیسی آب وتاب، متناسب جلد زیب جسم، اچھا موزوں لباس اور چال ڈھال میں فولاد کی سی لچک جھانکتی اور ہونٹوں کی مسکراتی ساخت، اور مخصوص انداز میں ہنستا تو ہونٹوں کے ساتھ آنکھیں بھی کھل کھلا پڑتیں اور جب جلترنگ کی سی بجاتی ہنسی ختم کرتا تو گھنی پلکوں کی چھاؤں میں سے ہرن کی طرح سے تیز تیز کن دریں پھینک کر حاضرین کا جائزہ لیتا۔ گاؤں کے ہر طبقہ اور ہر عمر کی عورتوں کی نفسیات کا شناسا تھا اور فرداً فرداً ہر ایک کی افتاد طبع کا ان کے شوہروں سے زیادہ محرم راز۔"

ہو جی اپنے "نجی تنظیم زر کے سلسلے میں کبھی کبھی چپکے سے بابو سنار کو گھر کے اندر بلا کر کام دے دیا کرتیں۔ مگر پھول وتی کی تو ٹھسّہ ماں سے

علیحدہ تھی پھر ابھی زیور سنگار کا شوق نیا تھا اور لڑکی تھی۔ یوں بھی دیہات میں بہوئیں گھروں میں بیٹھتی ہیں اور لمبے گھونگھٹ نکال کر چڑی چڑی دبکی دبکی خاموش گلیوں میں ضرورتاً نکلتی ہیں لیکن لڑکیاں تو لڑکوں کی طرح منہ کھولے دوپٹوں کے پھریرے اڑاتی کودتی پھرتی ہیں لہٰذا پھول ونی کو کوئی دن ہی ایسا ہوتا ہو جس روز دو ایک مرتبہ کسی نہ کسی زیور کی تیاری، مرمت اور نمونے پسند کرنے کے سلسلے میں بابو سنار کی دوکان میں نہ جانا پڑتا ہو اور کسی نئے نمونے کی تیاری کے زمانے میں تو دو تین مرتبہ گھنٹہ گھنٹہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ جا کر بیٹھنا پڑتا اور شوق کے ساتھ تیاری کے جملہ مدارج آنکھوں کے سامنے طے ہوتے۔ اور نئی وضع کے ہندول، نئے نمونے کے جھالوں چوڑیوں اور انگریزی طرز کے ٹاپس اور نیکلس کے سیٹ کی تیاری کے دوران میں تو بابو کو شہر کے کاریگروں کی مدد لینے کئی بار شہر جانا پڑتا اور شہر سے ٹسیس لا لا کر نمونہ پسند کرانا پڑتا۔

گھر میں سونے کی کمی نہ تھی۔ نئے شوق میں بالیدگی تھی بارھوں مہینہ "سہالگ" چلتا ہی رہتا۔ اگر کچھ دنوں کے لئے اگر پھول ونی سست سی ہو جاتی تو بابو کوئی نہ کوئی نیا نمونہ شہر سے لا کر شوق تیز تر کر دیتے اور سونے چاندی کی چمک دمک کے ساتھ محبت جلا پاتی رہی اور ساخت اور نکھار کے سلسلے میں عشق کی تعمیر کی منزلیں اوپر اٹھتی رہیں۔ پینگ بڑھتے رہے اور بابو سنار کا ستھرا آرٹ پھول ونی کے حسن میں خود ہی چار چاند لگا کر خود ہی تماشائی بنا رہا اور پھول ونی کو کندن کی طرح دمکاتا رہا۔ اور کنور جی جاڑوں کی دعوت دیتی راتوں میں کھانڈ اور رس کی شیرینیوں سے معلوم کتنی شیرینیاں پیدا کرتے رہے اور برسات کی اندھیریوں میں معلوم کیسے کیسے سرخوں اور سندریوں کے رس چوستے رہے۔ ساہو جی ٹھاکر مکانی بنے اپنے ہی کھاتے کے صفحوں پر شیر قالین کی طرح شکار کھیلتے رہے اور سود بیاج لابھ بٹہ "نقد جنس" کی لہروں میں زیر و زبر ہوتے رہے۔ ڈیوڑھی پر مٹھو بھنگی چوکیداری کرتے کرتے نوجوان سے ادھیڑ ہوتا گیا۔ اور اس کی پاسبانی کے طفیل حویلی کے اندر ہو جی کی جوانی پچاس کے پیٹے میں پہنچ کر بھی نوجوانی ہی بنی رہی اور آج تک آدھی رات گئے تاریک آسمان میں جب کوئی ستارہ شہاب ثاقب بن کر چھوٹتا تو مٹھو بھنگی کی تقدیر کا ستارہ نابدان میں سے اچھلتا۔ اور جیسے گندی کیچڑ میں سے جل کر دمکتے آسمان پر زہرہ مشتری کی طرح چمکنے لگتا۔ ڈیوڑھی کی زنجیر اندر سے سرکہ ہند کی طرح آپ ہی آپ کھل جاتی اور بہتی ہوتی نالی کی لہریں پگھلے ہوئے سونے چاندی کی موجوں سے مل کر ایک نئے مرکب کی ترمینی بہانے لگتیں اور اسی ترمینی کی تو ہیں لہروں کی ابھری ہوئی جل پری پھول ونی تھی جس کے پھول ہر صبح شوخ رنگ اور ہر شام تیز مہک کے ساتھ کھل رہے تھے اور ہر شب بابو سنار کے گلے کا ہار بن کر نت نئی جلا پا رہے تھے اور کنور جی کا سولہ سترہ سال پرانا اترا ہوا ستہ بابو سنار نے چڑھنے کے بعد یافت کر لیا تھا اور اس پرانی گنگا بہہ رہی تھی اور بابو سنار اپنی ماں خالہ کا کھایا قرضہ معہ سود در سود ادا کر رہے تھے۔ اور کنور جی اگر بنیے تھے تو بابو سنار بھی مہاجن تھے اور خوش معاملگی میں کوئی کسی سے کم کب تھا؟ ....

— (۵) —

اور دونوں پارٹیاں ریلوے جیسے ڈسپلن کے ساتھ ایک دوسرے کا سامنا بچائے اپنی اپنی راہ پر چلی جا رہی تھیں۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہوئے انجان بنی ہوئی تھیں اور جب مٹھو چوکیدار کھیت کی جانب پہرہ پر پہنچ جاتا اور رات کی خاموشی میں بابو سنار ڈیوڑھی کے کواڑوں کا مخصوص کھٹکا سن لیتے تو اپنے باپ کے نقش قدم پر الٹے دوڑتے۔ اپنے گھر کے صحن میں سے چار دیواری کی منڈیر پر بندر کی سی جست لگاتے۔ چھپر کی کوگری پر بتی کے سے قدم ڈالتے کوٹھری کی چھت پار کر کے حویلی کی چھتوں پر ہوتے ہوئے زینہ میں اتر جاتے۔ اور اتنی دیر میں ہو جی کے دالان کی کنڈی بند ہو چکی ہوتی اور چراغ بھی گل........ صرف بل ونی کی کوٹھری میں لالٹین ٹمٹماتی ہوتی اور زینہ سے پھول ونی کی کوٹھری تک صحن میں ایک سایہ سا چلتا اور پھر نہایت آہستہ سے صحنچی میں آہٹ سنائی دیتی اور کواڑ بند ہونے کا کھٹکا ہوتا اور کوٹھری میں گھپ اندھیرا...... اور حویلی میں مکمل سناٹا اور جب دن نکلتا اور بستی کا چپہ چپہ حویلی کا گوشہ گوشہ جگمگا اٹھتا تو دونوں ماں بیٹی کے چہرے تجاہل عارفانہ کی معصومیت اور رازداری کے اطمینان سے چمک اٹھتے۔

کون نہیں جانتا کہ لڑکی ذات پرایا دھن اور اسے بابو سنار بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ پھول ونی جلنے والی چیز ہے اور پھول ونی کو بھی اندیشہ تھا کہ بابو سنار چھوٹنے والا عنصر ہے۔ اور نہ معلوم دونوں میں سے کس کے دماغ میں یا دونوں کے ساتھ ساتھ یہ سودا سوار ہوا کہ اگر وہ مکمل طریقے سے ایک دوسرے کو حاصل کر سکتے ہیں تو اپنی بامرضی کے زور سے، سماج، رواج اور قانون سے ایک ٹکر لے کر۔ ورنہ بابو خود سنار اور پھول ونی ویش زمیندار۔ ویسے بابو اپنا گاؤں چھوڑ چار چار چھ چھ کوس آس پاس چار پیسہ والے گنتی شمار کے لوگوں میں سمجھے جاتے تھے اور پھر منہ در منہ ہر جگہ قدر تھی اور لوہے کی ہتھوڑی ٹھنکنے سے

چاندی بنانے والے —— گاؤں میں کوئی زمین دھیلا کی موروثی نہیں۔ بڑا سا مکان نہیں۔ لمبا چوڑا کنبہ نہیں۔ بیوتی کی بڑھیا بھی مر چکی تھی۔ باپ بیٹے فقط دو دم۔
ہستی سے زیادہ آمدنی اور خرچ ندارد۔ جو کچھ خرچ کر لیتا ہو اپنے ملنگ ٹیم کپڑے لتے ٹیپ ٹاپ رکھنے میں یا بابو ہی کر لیتا ہو۔ اور جب پھول وتی نے ایک آدھ مرتبہ
اصرار کیا تو بابو نے یہ کہہ کر سمجھایا کہ آج ہم پر ایسی کیا بپتا پڑ گئی ہے۔

لیکن جب ساہو جی نے پھول وتی کے رشتہ کی تلاش شروع کی اور چاروں طرف بسیٹھ دوڑا دیئے تو پھول وتی نے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے پر شدید
اصرار کیا جو ان کے دماغوں میں مدت سے ایسے وقت کے لئے محفوظ تھی مگر بابو نے شروع اصرار پر ٹالا مگر تابکے! اور وہ تو ایک دن ہونی ہی تھی اور جب تک
گاؤں میں پے خرچے گذر رہی تھی گذر رہی تھی۔ بابو سنار تھوڑی سی بہت سلسلہ جنبانی تو شہر کے اندر مدتوں سے کر رہے تھے اب دوڑ دھوپ شروع کر دی۔
بیوتی سنار کی ساری عمر کی جمع جوڑ یا اپنی ساری کمائی اور پھول وتی نکال کر چکی "ایسے ہی وقت کے لئے بابو سنار کے قبضہ میں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ
یہ سرمایہ دیہات میں بڑے سے بڑا کاروبار کرنے کے لئے تو بہت تھا مگر شہر میں ایک چھوٹی سی دوکان جمانا بھی مشکل تھی اور کم سے کم اتنے ہی سرمایہ کی اور ضرورت
تھی جس کو پورا کرنے کا وعدہ پھول وتی نے کیا۔ اور پوس کی اماوس کی رات کا اپنے اقدام کے لئے تعین ہو گیا۔ سچ پوچھئے تو مٹھوا بابو کو اور بابو مٹھوا کو اور ساہو جی پھول وتی کو
اور پھول وتی ساہو جی کو اتنی ہی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ جتنے خود اپنے آپ کو لیکن ہر ایک کو نا سمجھ بن کر اپنے کام سے کام تھا اور دوسرے کا راز اپنا راز تھا لہذا ان چاروں میں سے کسی کی ذات
سے انتشار ہونے کا امکان نہ تھا حتی کہ ایک دوسرے کی تفاصیل میں جانے کا خیال بھی دل میں نہ لاتے اور ایک دوسرے کی جانب سے گونگے بہرے اور اندھے
بنے رہتے ہیں۔

اور رات کا محرم راز چوکیدار (ملا) کا جاسوس قسم کا مٹھوا! مٹھوا کچھ تو قرائن سے اور کچھ بابو کی روز روز شہر کی دوڑ دھوپ دیکھ کر شبہ میں پڑ گیا اور آج کی
رات تو بلا کی اندھیری تھی اور اگرچہ ان کے درمیان بغیر بات چیت ہوئے از خود یہ خاموش معاہدہ سا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے معمولات میں مخل نہیں ہوں گے پھر بھی مٹھوا
نے خلاف معاہدہ اقدام کیا اور جس وقت ڈیوڑھی کی زنجیر اندر سے بند کر کے حویلی میں آیا تو آج ایک قفل مزید لگاتا آیا اور جس وقت صحن میں سے گذرا تو چپکے سے زینہ میں
ایک قفل بھر دیا اور کنجی انٹی میں لگا کر خاموشی کے ساتھ حسب معمول اپنے شبستان عشرت میں چلا گیا۔

اور حویلی میں سناٹا تھا، ساہو جی کے دالان میں چراغ گل ہو چکا تھا اور خاموشی تھی ——— پوس کی اماوس کی رات! اور آج کی رات تو بڑے ڈھب کی
تھی۔ اور ماحول اور وقت کا اچھی طرح اندازہ کر کے پھول وتی دبے پاؤں اٹھی۔ صحنچی میں سے گذرتی سامنے کوٹھار (گودام) میں پہنچی۔ ایک کونے میں غلہ کا
ڈھیر پڑا تھا۔ اسے ایک جگہ سے کریدا اور قریب ہی پڑی ہوئی ایک کھرپی اٹھا کر مٹی کھودنا شروع کی۔ تقریباً ایک بالشت کھودنے پر ایک تختہ نکلا اور تختہ اٹھانے
پر زمین کے اندر سے تھوڑی کوشش کے بعد پیتل کی مٹکی برآمد کی اور مٹکی بغل میں دبا کر نکل آئی۔ صحنچی میں سے اپنی اونی چادر اٹھا کر اچھی طرح لپیٹ لی اور زینہ کی جانب
چلی ——— مگر زینہ تو آج بند تھا۔ اور مقفل! ——— اور پھول وتی کے دماغ میں بگولے سے گھومنے لگے۔ آج خلاف معمول زینہ میں بھرا ہوا تالا اس کی آئندہ زندگی
کے دروازے میں بھرا ہوا تھا! ——— اور بس آج ہی کی تو رات تھی اور کل تو سب راز افشا ہو جائے گا۔ اور اس پر اور بابو سنار پر قیامت برپا ہو جائے گی اور
بڑے بڑے پہرے لگ جائیں گے۔ اور زینہ کے دروازے پر دو منٹ سکوت کر کے وہ بگولے کی طرح ناچتی ہوئی ڈیوڑھی کی جانب پلٹی مگر آج تو ڈیوڑھی کا دروازہ
بھی اندر سے مقفل تھا اور وہ صحن میں پلٹ آئی۔ حویلی میں بلا کا سناٹا تھا اور ماحول میں مہیب تاریکی اور اس کی نظریں اپنی خوابگاہ کی جانب گئیں۔ صحنچی میں
لالٹین ٹمٹما رہی تھی جو اس نے ابھی ابھی گودام سے واپس آ کر چادر لپیٹنے میں چھوڑ دی تھی اور کوٹھری میں دھندلی دھندلی روشنی پڑ رہی تھی۔ وہ کوٹھری جو تین
سال سے ہر رات کی ایک نئی رنگین روشنی کی امین تھی۔ جہاں نوجوانی ہر صبح ایک نئی نیرنگی لئے طلوع ہوتی رہتی تھی۔ اس وقت اسے کال کوٹھری دکھائی دی جیسے اس
کے اس تین سال کے شبستان عشرت میں مستقبل کے سارے ہرے بھرے سپنے چکنا چور ہو گئے اور پوری زندگی کی محرومیاں سمٹ کر آ گئیں ——— "ابھی وقت
بھی نہیں!" کو وہ اچھی طرح سمجھ گئی مگر حویلی تو ابھی اس کے لئے چوہے دان کی شکل میں تھی ——— وہ ننھی سی جس کے اندر اس کے مستقبل کی ساری سنہری امیدیں بند تھیں
بدستور اس کی بغل میں دبی تھی ——— اور ساہو جی تو روزانہ اصول کے مطابق اپنے دفینہ کی جگہ کا جائزہ لیتے ہیں ——— اور اس نے دائیں بائیں دیکھا جیسے بغلیں جھانک گئی
یا اپنے چاروں طرف لپٹی ہوئی تاریکی سے مشورہ کیا۔ ایک اطمینان کا سانس لیا۔ مٹکی بغل سے اتار کر نیچے رکھی اور پھر گودام کی جانب لپکی۔ اندھیرے میں ٹٹول کر رسی
کا ایک مضبوط ٹکڑا لائی اور اس میں مٹکی کا منہ باندھا اور صحن میں کھڑے ہوئے نیم کے تنے کے قریب کھڑے ہو کر جڑ سے اوپر تک دیکھا۔ اور اس نیم کے درخت پر اس

کی بچپن سے بندر کی طرح چڑھنے اترنے کی مشق تھی۔ اس نے دس بارہ سیر وزنی مٹکی رسی میں باندھ کر اپنے گلے میں لٹکائی۔ جیسے پھولوں کا ہار پہن لیا۔ اور پیٹ پر بچہ چپکائے بندریا کی طرح ایک سانس میں اوپر دکھائی دی اور اوپر نیم کی ایک موٹی شاخ پر سے رینگتی کھسکتی چھت کے اوپر کود گئی۔ زینہ اور ڈیوڑھی کے تلے خاموش لٹکتے رہے۔ مٹھو اچو کیدار چھت پر پہرہ لگاتا ہی رہا۔ ساہو جی ٹھاکر مکانی نے چوپال میں لیٹے کھانستے ہی رہے اور کنورجی کھنڈسال میں رس اور کھانڈ کے ابال اتار چڑھاؤ میں زیر و زبر ہی رہے .... اور پھول وتی سماج کی بلند دیوار ایک جست میں پھاند گئی۔

اور چھت والے راستہ کے تمام پیچ و خم اور نشیب و فراز تو پھول وتی کے شعور میں اس کی آفرینش سے بھی پہلے کے موجود تھے۔ حویلی کی چھتوں پھلانگ کر بنول چھپر کی منگری اور پھر پونی سنار کے کوٹھے کی چھت اور پھر چار دیواری کی منڈیر! اور منڈیر کے نیچے بابو سنار ہمہ تن انتظار بنے کھڑے تھے۔ پھول وتی نے منڈیر کے اوپر سے پہلے رسی پکڑ کر مٹکی نیچے لٹکائی اور بابو سنار نے ہاتھوں میں لے کر نیچے رکھ دی۔ اور پھول وتی کی تو ساری طاقت جیسے بابو کو دیکھ کر سلب سی ہو گئی اور یا تو بارہ سیر وزن گلے میں ٹانگ کر نیم پر بندر کی طرح چڑھتی چلی گئی تھی اور شاخ پر سے چھپکلی کی طرح رینگتی لنگور کی طرح جست لگا کر پھاند پڑی تھی یا اس وقت پانچ فیٹ اونچی چار دیواری پر ہانپ ہانپ کر ہمک رہی تھی۔ بابو نے بڑے اشتیاق کے ساتھ اتارنے کے لئے کیا بڑھائے کود پھیلا دی اور پھول وتی پروانے کی طرح ٹوٹ کر آغوش میں آپڑی اور بابو نے سنبھالتے ہوئے زیر لب کہا "ہانپ گئیں"؟ اور پھولی ہوئی سانس سے تھرتھراتی آواز میں پھول وتی نے سرگوشی میں کہا

"اوں ہوں اوں۔ اس بھنگی بچے مٹھو نے آج زینہ اور ڈیوڑھی میں تالے بھر دیئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ شبہ گزر گیا"

"چلو اچھے ہیں صبح تک بے بھرم پڑا رہیگا" اور پھر جلدی سے کمل لپیٹا، مٹکی بغل میں دبائی، پوٹلی ہاتھ میں لٹکائی اور آہستہ سے بڑبڑاتے: اور گاڑی تو چار بجے چھوٹتی ہے۔ چار کوس ایک سپاٹا ہے"۔ اور چل پڑے اور پھول وتی چادر سنبھالتی ساتھ ہولی۔

سردی کا شباب، آدھی رات۔ آسمان سے بوجھل کہر اگر رہا تھا۔ زمین سے غلیظ ابخرات اٹھ رہے تھے۔ فضائے بسیط میں سرد و نم تاریکیوں کے تودے کے تودے سلوٹتے بھرتے تھے جیسے اندھیرے میں سیاہ مست ہاتھی کشتی لڑ رہے تھے۔ گاؤں کی گلیاں تاریک تھیں خاموش تھیں۔ بھیانک تھیں۔ تو وہ سے کھسکتے پر شیر کی طرح جھپٹ کر ٹانگ لینے والے کتوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اور چند منٹ میں وہ گاؤں سے باہر ہو گئے۔ جنگل کی روشن وسعتیں تاریکیوں میں گم تھیں۔ کسی کسی وقت دور کہیں گیدڑ ہوک پڑتے۔ باغ کے گھنے درختوں کے جھنڈ میں سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد الو کے کڑ کنے کی آواز سنائی دیتی اور پھر تاریک کائنات کا دم سا گھٹ جاتا۔ ہوا بھی ساکت تھی اور اگر حرکت کا احساس تھا تو کہرے اور ابخرات کے سیاہ تودوں کا جو دیکھے تو نہ جا سکتے تھے۔ مگر سیاہی کے زیر و بم میں محسوس کئے جا سکتے تھے اور ان دونوں نے دنیائے ظلمات میں اپنا سفر جاری رکھا۔ مہیب سنگ اسود کا چار کوس موٹائی کا بستہ پہاڑ، جس کے سینہ کو چیر کر اس پار پہنچنے کے بعد رنگین روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔ آبادیاں ہی آبادیاں تھیں۔ نغمہ ہی نغمہ تھا۔ اور اس کو کاٹ کر ادھر پہنچنے پر ان کا عارضی ملاپ دائمی بن جاتا اور اس تاریک ترین رات کی صبح ان کی زندگی کی روشن ترین سحر میں طلوع ہونے والی تھی۔ سلونی سلونی، گرم گرم ابدی صبح!

اور وہ اسٹیشن کے راستے پر پڑ لئے۔ بستی سے ایک فرلانگ بھر دور ہوتے ہی بابو نے پھول وتی سے کہا

"اچھا تم سیدھی رستہ رستہ چلو اور میں تو کو رستہ کھیتوں کی منڈیروں منڈیروں تمہاری سیدھ میں بڑھوں گا"۔

"کیوں؟" پھول وتی نے جیسے ڈر کے احساس سے چونک کر کہا اور بابو کے کمل کا دامن مضبوط پکڑ لیا۔

"کوئی پیچھا کرے تو میں تمہارے ساتھ نہ پکڑا جاؤں"۔

"پیچھا پیچھا کون کرے ہے، مٹھوا۔ ساہو جی تو دالان میں پڑے سوتے ہیں"۔

"ارے اس سے کیا۔ پھر بھی تو احتیاط کرنا ہے"۔

"اوں اوں۔ آں۔ تو رات بڑی اندھیری ہے۔ ڈ۔ ڈر ڈر لاگت ہے"

"ڈر کاہے کا ہے۔ سیدھا رستہ لگا ہے، اور میں ساتھ ساتھ چلوں گا اور تم میری مٹھار پہ مٹھار دیکھیو"

اور وہ چل پڑی، اور وہ چل پڑی تھی اور بابو راستہ سے کٹ کر اس کے بائیں جانب محاذ میں اسٹیشن کی سمت نم کھیتوں کی منڈیر منڈیر پڑ لیا۔ بغل میں ہنگی دبائے۔ سر سے پاؤں تک کالا کمل لپیٹے گیہوں اور سرسوں کی فصل کے درمیان دس قدم چل کر آہستہ سے بیٹھ گیا ہوا۔ اور اس کی ٹھاڑ پر مٹھاتی ہوئی پھول وتی تند قدم ڈالتی اندھیری کا دامن کاٹتی، پچھم کی سرد ہوا کے ہلکے ہلکے چلتے تھپیڑوں کے سامنے سینہ سپر وندناتی چلی جا رہی تھی۔

۶

اور مٹھوا چونکنا تو پہلے سے ہی تھا۔ عیش کے نشہ کے باوجود شبستان عشرت میں اس نے نیم کی شاخ پر سے دالان کی چھت پر کودنے کا دھماکا سن لیا۔ وہ بستر سے تڑپ کر جا پڑا اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا "چوری ہو گئی"! اور دروازہ کی جانب لپکا۔ بھوجی نے اس کا دامن پکڑ لیا اور زیر لب کہا۔

"ٹھہرو، وہ ہوئیگا، بیوا آیا ہوئے گا"

"اور میں نے تو آج زینہ کے کواڑوں میں تالا بھر دیا ہے۔"

"کیوں؟ —— تو پھر آپ مونڈ (مر) مار کے لوٹ جائے گا"

"مگر مجھے تو ایسا سنائی دیا کہ کہیں اوپر سے کوئی چھت پہ کو پھاندا۔" مٹھوا نے گہری سوچ کے انداز میں کہا اور بھوجی نے قدرے تمسخرانہ سنجیدگی سے کہا

"اوپر سے چھت پہ کون پھاندا؟ اوپر کہاں سے کیا آسمان پہ سے؟ اور پھر سنجیدگی کے ساتھ کہا "ڈیوڑھی کی کنڈی تو بھیتر سے چڑھا آئے ہو؟"

"کنڈی! میں تو آج بھیتر سے ڈیوڑھی کی کنڈی میں بھی تالا بھر آیا ہوں" پھر ایک گھونٹ سا لیا اور جیسے چونک کر دائیں بائیں دیکھا اور بولا "اوں، ہیں جانے کے دیکھ نہ آؤں کیسا کھٹکا تھا؟"

"بڑے کوئی وہ ہو، لونڈیا لونڈا کھیلت ہونگے۔ سامنا مت کرو، اور کوئی دن کی بات رہ گئی ہے۔ پھول وتیا اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ اور تمہیں آج سوجھی کیا ہے کہ ڈیوڑھی زینہ دونوں میں تالا بھر آئے؟ ایں؟ سو وہ چھت پہ بولایا بولایا پھرتا ہوئیگا اور یہ نیچے چکراتی ہوئے گی۔ اور میں تو جے کہت ہوں کہ تمہیں تالا بھرن کی کیا ماری جات تھی؟!"

"بات جے ہے کہ میں آج آٹھ دس دن سے بابو کو دیکھ رہا ہوں، بڑی بھاگ دوڑ میں ہے۔ پاؤں گاڑی کا پہیہ تھمتا نہیں ہے۔ کل دوپہر ریتی کو نمعلوم کہاں پہنچانے آیا۔ اور کل سے گھر بالکل خالی ہے اور یہ بالکل اکیلا ہے۔ نہ معلوم کس چکر میں ہے اور حویلی میں ہر رات کا آنا جانا ہے"

"تو پھر تمہیں کیا، اور پھر تم کہتے ہو کہ دونوں تالے بھرے ہیں تو آئے گو کدھر سے جائیگا اور نکل کدھر سے جائیگا۔ اور بابو کی بھاگ دوڑ سے تمہیں مطلب؟ اور وہ تو سارے سارے دن گاؤں گاؤں پھرتا ہی رہتا ہے، اور روز زینہ میں سے حویلی میں آنے جانے کا کھٹکا نہیں سنتے ہو"

"نہیں، جس دن سے پھول وتی کی منگنی پکی ہوئی ہے یہ روز شہر جاتا ہے۔ نمعلوم کس چکر میں ہے" اور یہ کہتے ہوئے مٹھوا کا اندر والا چوکیدار اچھل سا پڑا اور اس نے ایک ترنگ لگائی اور دالان کے دروازے کے قریب جا گرا، اور زنجیر کھولنے لگا۔ بھوجی "ٹھیرو ٹھیرو" مٹھو شانت ہو رہ "سنو تو، لونڈیا لونڈا کھیلت ہیں آج تمہیں کیا ہو گیا، ایسی مت کرو" کہتی ہی رہ گئیں اور مٹھوا دوسری ہی جست میں باہر والے دالان کی چوڑائی پھاند کر صحن میں کھڑا دکھائی دیا۔ اور مخصوص چوکیدارانہ سنجیدگی سے نہایت سنگین قسم کی نظریں حویلی میں چاروں طرف پھینکیں۔ کل حویلی اندھیرے میں غائب تھی البتہ پھول وتی کی خواب گاہ سے روشنی دکھائی دے رہی تھی، ادھر کو آہستہ سے بڑھا۔ کوٹھری میں لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ ایک کواڑ پورا بھڑا ہوا تھا۔ دوسرا نصف سے زیادہ، درز میں سے روشنی نکل کر چھنی چھنک رہی تھی۔ دو قدم دبے پاؤں اور بڑھا اور کان لگائے "پھر کھسکا" ٹھنکتا ٹھنکتا ٹھنکتا "کچھ اچھا"، بھانپتا سا کہ کہیں بھوجی کا خیال صحیح ہو اور لونڈیا لونڈا کھیلت ہوں۔ تو مفت میں انھیں تکلیف ہو اور مجھے گالی، اور پھر ساری عمر کی بنی بنائی بات بگڑ جائے۔ بڑی احتیاط سے اس نے کوٹھری کے اندر جھانکا۔ لالٹین ٹمٹما رہی تھی اور کوٹھری خالی تھی۔ اندر گیا، لالٹین اٹھا کر بتی تیز کی اور صحن میں سے گذرتا زینہ تک پہنچا۔ تالا بدستور تھا، پلٹ کر ڈیوڑھی کا تالا دیکھا اور صحن میں آ گیا اور ذرا گھبرائی ہوئی سی آواز میں کہا "دیکھو مجھے دھماکے پر کھٹک گئی تھی۔ پھول وتی چھت پکو نیم پہ چڑھ کے پھاند گئی۔"

"اور میں تو کہتی ہوں کہ تم نے تالے کیوں بھرے تھے لونڈیا لونڈے کے اتنے سر مت چڑھو، اب چلے آؤ زینہ کا تالا کھول دو، گھڑی دو گھڑی میں کھیل کود کے آ جائے گی" بھوجی نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا

مگر تجربہ کار چوکنے چوکیدار نے گہری سانس لی اور لالٹین چاروں طرف گھما کر مشتبہ نگاہوں سے حویلی کے حدود کا چپہ چپہ جائزہ سا لیا اور نیم کی جڑ کے قریب سے ذرا سی مٹی اٹھائی اور چٹکی میں لے کر مسلی اور کوٹھار کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے کہا "تم حویلی پر تال لیجیو' وہ آئے تو جائے گی' کوٹھار تو جا کے دیکھو - یہ ہی کھدی مٹی کہاں سے جھڑی ہے؟ یہاں نیم تلے"

اور بہو جی کا ماتھا تو مٹھو کے کوٹھار کی جانب دیکھنے پر ہی ٹھنک گیا تھا اور کوٹھار کا نام سن کر تو وہ دیوانہ وار دوڑیں اور مٹھو کے ہاتھ سے لالٹین جھپٹ کر سیدھی اندر پہنچیں۔ انھیں تو پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ ان کے دفینہ کا کوئی بھول دتی بھانپ گئی ہے اور وہ کئی دن سے جگہ بدلنے کی سوچ رہی تھیں' اندر تازہ کھدی ہوئی مٹی کا ڈھیر دیکھ کر ان کے سینہ میں کبوتر پھڑپھڑا اٹھے۔ ہائے کر کے پچھاڑ کھائی۔ اور دوسری ہائے کے ساتھ منہ سے پھٹی ہوئی آواز نکلی "ڈھائی سیر لیکا سونا! دو دھڑی چاندی!!" اور تیسری ہائے کے ساتھ اس سے زیادہ پھٹی ہوئی آواز بلند ہوئی "لٹ گئی! لٹ گئی! لٹ گئی! سب لے گئی' ستت پیڑھی کی کنائے گی! بھنگی کی ....!! مٹھو نے پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور آہستہ سے چور دلے انداز میں کہا "شانت ہو' مجھے تو باہر جان دیو' جاگ ہو جائے گی باہر گیا' مجھے پکڑوائے دیوگی؟!" اور مٹھو کے کہے پر بہو جی آپے میں آئیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا اور کونے کے قریب جا کر کھدی ہوئی مٹی پر پھر پچھاڑ کھائی۔

اور پشتوں کا چوکیدار' ساہوجی کی ڈیوڑھی اور چوپال کا رات کا حوالدار مٹھو اپنی ذمہ داری اور جواب دہی کے احساس سے تڑپ سا اٹھا۔ واردات کا سونے چاندی کی چوری والا پہلو تو بڑا نازک تھا گرم دودھ نہ اگلنے کا نہ نگلنے کا' نہ کسی سے کہہ ہی سکتے ہیں' نہ چھپا ہی سکتے ہیں' اگرچہ کا مال تو عورت ستر سے زیادہ چھپاتی ہے - یہ تو چوری میں موری ہو گئی' بہو جی کو وہیں چھوڑ کر باہر کو بھاگا - اور جھپٹ کر زینہ کا تالا کھول کر پھینک دیا - اور کواڑ کھول کر چوپٹ کر دیئے - پھر نہایت پھرتی کے ساتھ ڈیوڑھی کا قفل کھول کر باہر آگیا اور چبوترے پر کھڑے ہو کر خطرے کے سگنل والی آواز میں متھارا - چوپال کے اندر سے بوڑھے ساہوجی نے متھارا پر متھار دی اور مٹھو اپنے آقا کی خواب گاہ میں جھپٹ گیا - اس جواب دہی کے لئے خود کو بے بس کہنے کہ "لڑکی گئی' نقدی گئی" اور قدرے منہ رنگیا' نمک حرام تو مٹھو نے ساہوجی کے پلنگ کے قریب کھڑے ہو کر دبی لفظوں میں کل روئداد سنا دی کہ بٹیا رانی بھاگ گئی!" اور نقدی والی بات دبا گیا کیونکہ وہ تو چوری در چوری والی قسم کی چیز تھی اور دفینہ تو بہو جی کا اپنا علیحدہ کا تھا -

ٹھاکر مکانی بیچارے لحاف میں سے اچھل کر جا پڑے اور کس وقت اور کتنی مدت بعد اور چوپال کی چودھوں سیڑھیاں اتر گئے اور انھیں پتہ بھی نہ چلا' آگے آگے خود بیکنے اور دوڑنے کی درمیانی چال چلتے ہوئے پیچھے مٹھو لپو قدم ملتا ہوا ایک آن میں کھنڈسال پہنچ گئے اور سیدھے بیٹے کی کوٹھری میں جا کھڑے ہوئے' کنورجی گرم گرم خلوت میں تھے اور اس برزخ میں آج پچاس سال کی عمر ہونے کو آئی باپ کا سامنا نہ ہوا تھا' بھوچکا سے رہ گئے - مگر مجبوری تھی' کوٹھری میں دروازہ تو درکنار کوئی اور کھڑکی بھی نہ تھی' مجبوراً لحاف میں سے نکل کر الٹی سیدھی ساڑی سر سے پاؤں تک لپیٹ لپاٹ کر جاری بیچاری کو بھی منہ ڈھکے اسی دروازے سے باہر جانا پڑا' جس کے بیچوں بیچ ساہوجی کھڑے تھے اور ذرا پیچھے کو مٹھو بھنگی لالٹین اور لاٹھی لیے تعینات تھا لیکن شاید اس وقت ساہوجی کو دکھائی بھی نہ دیا اور اگر دکھائی دیا تو غالباً وہ یہ سمجھ نہ سکے کہ یہ سفید بھورا بھورا سایہ سامنے سے پاؤں تک کفنی پہنے کیا برابر سے نکلا چلا گیا اور نہ چوڑیوں کی چھن چھن ہی ان کے کان میں گئی -

اور سب روداد چپکے چپکے باپ نے بیٹے سے بیان کی اور مٹھو بھنگی نے اپنا قوی شبہ بالو پر ظاہر کیا اور اسٹیشن کے راستے کی جانب مخصوص توجہ دلائی - کنورجی نے کھنڈسال کے سب نوکر چاکر جگائے - کل پندرہ آدمی تھے - گاؤں سے چاروں طرف چار راستے جاتے تھے' پانچ پانچ آدمی تین راستوں پر خاموشی کے ساتھ پکڑ کر دلیں لے آنے کی ہدایت دے کر دوڑا دیئے اور اسٹیشن والے راستہ پر جس پر ملنے کا زیادہ امکان تھا صرف مٹھو کو ساتھ لے کر خود دوڑے -

اور لڑکی کی چال خواہ کتنی ہی تیز کیوں نہ ہو لڑکی ہی کی چال تو ہوتی ہے' آدھے راستے جا لیا - اور اندھیرے کے سہارے نہایت ہی خاموشی کے ساتھ حویلی میں لے کر آگئے' اور بکھو دھکو کی' تھوڑی بہت ہائے توبہ کی آواز سن کر پہلے تو بالو وہیں سرسوں کے کھیت میں دو سو گز کے فاصلے پر برابر دبک گئے اور پھر جو بستی کی جانب دلکی اٹھے تو کنورجی اور مٹھو کے پہنچنے سے قبل اپنے گھر میں پہنچ گئے اور سوتے بن کر پیال میں دبک گئے - اور بات بڑی گا ایسی بن گئی اور ابتک تو مٹھو' بہوجی اور بھول دتی کے درمیان خاموش سمجھوتا چلا آرہا تھا - آج کنورجی بھی اس میں شریک ہو گئے - مٹھو اور کنورجی راستے سے حویلی تک

پھول کنور کو اتنی خاموشی سے لائے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی اور پھول وتی کو حویلی میں پہنچا کر دونوں نے سب کے سامنے خوب قہقہے اڑائے اور گھنڈسالی کے سب نوکروں پر حتیٰ کہ بڈھے ساہو جی تک پر یہ ظاہر کیا کہ پھول وتی حویلی میں نکلی اور وہ کپاس کے گودام میں ڈھیر پر سو کر رہ گئی تھی۔ بہو جی کو دھوکہ ہوگیا۔ حویلی کی ہر ممکن جگہ تلاش کرنے کے بعد انھوں نے شور مچا دیا اور جب کسی راستہ پتہ نہ ملی تو کپاس کے گودام میں دیکھا تو سوتی ہوئی ملی۔

اور سب کو مطمئن کر کے رات کے اخیر حصہ میں حویلی میں پھر گئے کیونکہ بیٹی کو فہائش کرنی ضروری تھی۔ مگر انھوں نے پھول وتی کو تو اوندھے منہ پڑا پایا لیکن بہو جی کو انتہا سے زیادہ بیتاب دیکھا، یہاں تک کہ انھیں ایک دو مرتبہ بیوی کو سکون کی ہدایت کرنی پڑی اور یہ سمجھانا پڑا کہ لڑکی کی منگنی ہو چکی ہے' بدنامی کا اندیشہ ہے اور لگی لگائی شادی اکھڑ جانے کا ڈر ہے۔ خیر تھوڑا بہت بیوی کو خاموش کر کے بیٹی کی جانب متوجہ ہوئے' نہایت تلخ انداز اور پست آواز میں سمجھاتے رہے اور سمجھاتے سمجھاتے یہاں تک سمجھا دیا کہ بابو سنار کا اور اپنا رشتہ بھی سمجھا گئے — بابو سنار اس کا بھائی!! اس کے باپ کی جوانی کی لغزشوں کی زندہ تکمیل!! اور یہ سمجھ کر تو پھول وتی اچھل سی پڑی — جیسے کوئی مضبوط اور تنی ہوئی رسی یکدم قینچی کے چلتے ہوئے پھلوں کے درمیان آجائے'— وہ نیم سی ہو کر ادھر ادھر جا پڑی۔ ماضی حال مستقبل کے سب ہنستے کھلکھلاتے رشتے منقطع ہو کر خفت' رنج اور خشونت میں تبدیل ہو گئے —

اور صبح کو ماں بیٹی میں منگنی واپس لانے کے مسئلے پر تبادلہ خیال ہوا۔ مگر رات کے جدید ترین انکشاف نے صبح تک غور کرتے کرتے اسے مفلوج سا کر دیا تھا — بابو سنار اس کا بھائی!! اف ماضی تجھ پر تف! اے حال تجھ پر خاک!! اور اے مستقبل تجھ پر موت!!! — اور ماں بڑی بے چین تھی اور ترکیب کتنی سیدھی سادی بتلائی تھی کہ جس راستے کل لے کر گئی ہے اسی راستے آج لے کر پلٹ آ — اور ماں کے زیادہ اصرار پر بیٹی سے نہ رہا گیا اور بڑے بیباکی کے انداز میں بولی' اور ماتا جی' دیکھو تو پتا جی بابو کو میرا بھائی بتاتے ہیں اور تم مجھ سے کہتی ہو کہ آج رات اس کے پاس جاؤں"!

"ایسی تیسی اس بابو کی جو تیرا بھائی بنے اور جب مٹھو اجنگی یہاں تھا تو بابو تیرا بھائی کون سے رشتہ سے بن گیا نگوڑا۔ اور کنور جی کے بیٹے تو ایک بابو چھوڑ گھر گھر ساری بستی میں کھیلتے پھرتے ہیں' اور مٹھو بیچارے کو تو ساری عمر رات بھر ڈیوڑھی سے لیکر پچھیت تک پہرے پر گزر گئی ہے" ماں نے بیٹی پر انکشاف کیا اور اب کی مرتبہ پھول وتی بڑے زور سے اچھل پڑی' اور ماں کا بشرہ غور سے دیکھنے لگی۔ اور ماں نے ایک گھونٹ سالے کر سلسلۂ کلام جاری کیا" اور وہ جو کہلاتے ہیں تیرے پتا جی بڑے حسابی کسے تکے بنے پھرتے ہیں۔ انھیں کچھ اپنا تا نا بانا معلوم ہے اور انھوں نے تیرے سمجھانے کو یہ بات کہدی۔ کیا وہ نہیں پہچانتے ہیں مٹھو اچوکیدار کو" اور پھر بڑی گہری ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں' ہائے میری بیٹی — میری عمر بھر کی جمع جوڑیا۔ ڈھائی سیر پکا سونا۔ دس سیر چاندی۔ آہ۔ ہائے بس اب تو تیرے ہاتھ ہے۔ اور اگر میں کنور جی کو بتا دوں گی تو وہ مگوڑی کے چھٹے انس میں بابو سے گردن پکڑ دھروا دیں گے۔ پھر میرے ہاتھ کچھ تھوڑی آجائیگا۔ بس آج کی رات اور۔ وہ تیرا ہی باپ ہو" بے تاب ہو گئیں مگر پھول وتی کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا — اور جس دودھ میں مکھی پڑ جانے کا شبہ ہو گیا اسے اب کوئی کیسے پینے لاکھ اس کی ماں یقین دلائے۔ جہاندیدہ محرم راز ماں نے ڈری ڈری چری چری نظروں سے بیٹی کا بشرہ بھانپا اور لوری دیتے ہوئے انداز میں کہا" اور میں تو اپنی بیٹی کا بیاہ اس شہر پر کروں گی کہ گھر جائی رہے اور وہ تو تیرا سیدھا لڑکا ہے' بالکل گئو۔ چاہیں جیسے رکھو اور ایسے تو یہ تیرا دیا بابو کا لڑکپن تھا۔ یہ بیل منڈھے نہ چڑھتی۔ شہر تو شہر آسمان پہ بھی تم دونوں چلے جاتے تو تیرا باپ دادا چین سے نہ بیٹھنے دیتا اور جیسے میں بتاتی ہوں ویسے تو بابو بھی اپنی جنم بھوم پہ بنا رہیگا اور میری بیٹی میری آنکھوں کے سامنے جیسے کھیلتی چلی رہی ہے کھیلتی رہے گی"؛ مگر یہ سب کچھ پھول وتی کو بے معنی معلوم ہوا —

تمام دن سبھلتے گزرا۔ اور پھر رات جا چکی تھی۔ مٹھو اچوکیدار پہرے پر ٹھہارا۔ پھول وتی کے کان اس ٹھہارے سے زندگی کے ہر حصہ میں آشنا رہے تھے اور آج بقول اس کی ماں کے اس آواز میں ماضی کی عظمت' حال کی گرفت اور مستقبل کی امیدوں کا عجب مثبت منفی امتزاج سنائی دیا جیسے اس کی ماں کے قول پر مہر ہو۔ پہلے سے مٹھو کی ہمہ گیر آواز مہر ضمانت ثبت کر رہی تھی اور رات بھر تو اندر سے لیکر باہر تک اور باہر سے اندر تک مٹھو اور بہو جی ہی کی تو فرمانروائی رہتی تھی مگر اس کے باپ کے انکشاف کے آگے یہ سب ضمانت اور وعدے بے معنی تھے۔ اور اس کی ماں نے سونے چاندی جیسی چمک چھوڑتی آنکھوں سے اس کے بشرہ پر غور کیا اور پھر پینترا بدلا" اور میری بیٹی یہ ڈھائی سیر سونا اور دس سیر چاندی کیا میں اپنے سینے پر دھر کے چتا میں لے جاؤں گی۔ اور یہ سب کچھ تیرا ہی مال تو ہے اور بس آج کی رات ہے۔ اگر تو نہیں گئی تو باولے کر چل دیگا اور پھر کبھی گاؤں میں منہ بھی نہ دکھلائے گا"؛

اور آخر جلتے پر پھول وتی کے دماغ میں جھن سے اجالا ہو گیا۔ دس سیر چاندی اور ڈھائی سیر سونے کی پوٹ اس کے اپنے کھچے کی

بھی تو بابو کی تحویل میں ہے۔ اور بابو تو لیون گیا اور یہ لیون جائے گا۔ اس نے لڑکھڑاتی زبان سے پھر لجائے لجائے شرمائے انداز میں جواب دیا "تو ماتا جی اب میں کیسے جاؤں بابو کے پاس۔ پتاجی تو اسے بھی بھائی بتاتے ہیں۔"

"ایسی تیسی تیرے پتاجی کی۔ پہلے آپ کو تیرے پتاجی تو بنا ئیں۔ ارے یہ تو میں بتا چکی تجھے وہ کیا جانیں، یہ تو میں جانتی ہوں کون کس کا پتاجی ہے۔ کنور جی چاہیں سارے گاؤں کے پتاجی ہو جائیں پر تیرے پتاجی نہیں ہو سکتے۔ اور جب کنور جی بابو مہاجن کے پتاجی ہو سکتے ہیں تو بھول وتی متھو کی بیٹی کیوں نہیں ہو سکتی"

مگر بھول وتی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اور بسورتی ہوئی بولی "ناہیں، ماتاجی اب میں رات میں نہیں۔ اوں ہوں۔ ہوؤں ناہیں" ——

"تو بیرسن بھنگی کی جیتی ساری عمر کی جمع جوڑ یا سندی بھی گئی اور میری تو گئی ہی ہے۔ پھوٹی کوڑی تیری گانٹھ میں بھی نہیں رہی" بھوجی نے غصہ میں لال تال ہو کر کہا اور پھر لب بسورہ کھا نیا اور نرم لہجہ میں کہا "آج کی رات اور مت بٹو سیتا ستی، کل کی رات تک نہ وہ تیر آگوئی اور نہ تو اس کی سگی ہوتی آج کی رات اور نہ سہی بھائی بہن۔ اپنا مال نکال لاؤ اور کل سے جاہیں بھائی بٹیو یا باپ" اور بھوجی نے تاجرانہ تیور دل سے بھول وتی کو دیکھا اور بات تو نہایت دوکاندارانہ قسم کی تھی، آج کی رات اور سہی، اور اب اسے اپنا ڈھائی سیر سونا اور دس سیر چاندی یاد آئی۔

اور کبھی کبھی وہ چیز بھی دوا کے طور پر لگنا پڑتی ہے جس سے متلی ہوتی ہے اور ماں کی بیتابی دیکھ کر وہ اپنے سونے چاندی کی محبت میں بیتاب ہو گئی۔

اور ساہو جی کے مال میں تو مقناطیس کی کشش تھی۔ خوب سوچ سمجھ کر بھول وتی تیزی کے ساتھ زینہ پر چڑھ گئی اور بھوجی کے ڈھائی سیر سونے اور دس سیر چاندی نے بھول وتی کے ڈھائی سیر سونے اور دس سیر چاندی کو بھی کھینچ لیا اور سونے چاندی نے تو ساہو جی کے گھر میں کو آنے کے معلوم کتنے سیدھے راستے دیکھے تھے اتنے کہ شاید ساہو جی کے اپنے علم میں بھی نہ تھے اور کل کی رات کا نیم پر سے پھاند کر گیا ہوا سونا چاندی بابو سنار کے پاس سے بھول وتی کے اس سونے چاندی کو بھی کھینچ لایا جو مدتوں سے اس کے پاس امانت تھا اور نہایت سلامت روی کی چال زینہ کی سیڑھیوں سیڑھیوں آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے کو اترتا ہوا آ گیا۔

اور صبح صادق کے سپیدے میں جب آسمان سے چاندی کے آبشار پھوٹ رہے تھے اور مشرقی افق میں سنہری کلیاں دمک رہی تھیں۔ بھول وتی تمام رات کے تپائے ہوئے سونے کی مانند سچ مچ کندن سی دمکتی زینہ سے برآمد ہوئی اور فتحمندانہ انداز میں ماں کی تھیلی جوں کی توں ہاتھ میں دیدی۔ اور ساری رات کی منتظر ممتا کی ماری ماں نے پیار بھری نظروں سے مٹکی کے اندر جھانکتے ہوئے نرم نرم ہاتھوں سے بیٹی کی بلائیں لے لیں اور بھول وتی اپنی پوٹلی بغل میں دبائے تیزی کے ساتھ اپنی کوٹھری کی طرف لپک گئی..........

انور عظیم

ایک نام دو تلواریں

"میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔"
جب کبھی مولوی سید فرقت علی کو غصہ آتا تو وہ اپنی کھچڑی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر یہی ایک جملہ کہتا اور اپنے موٹے بھدے ہونٹ چبانے لگتا جو پان کی پیک سے لہولہان ہوتے۔

گاؤں والے سبھی جانتے تھے کہ مولوی سید فرقت علی نے اپنی قسمت آپ بنائی تھی۔ وہ زمانہ کس کو یاد نہیں تھا جب اسی گاؤں میں آج کا مولوی سید فرقت علی صرف فرقو کہلاتا تھا۔ جو بعد میں ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے، فرقو میاں بنا اور آخر میں مولوی سید فرقت علی ہو گیا۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ سرکاری کھیت سے بھرتے کے لئے بینگن چراتا تھا اور ایک ایک بینگن کے لئے اسے دو دو گھنٹے کھیت کے چاروں طرف ہیرا پھیری کرنی پڑتی تھی اور کبھی جب وہ اپنی بے پروائی اور جلد بازی سے کھیت کے رکھوالے کے ہتھے چڑھ جاتا تو ایسی درگت بنتی تھی کہ وہ دو دو ہفتے ادھر کا رُخ نہ کرتا تھا۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ جوانی کا دریا جب فرقو پر پوری تندی سے چڑھ آیا تھا ایک دن وہ موقع پاکر مؤذن کی لڑکی سے جونک کی طرح چمٹ گیا تھا۔ بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ ہنگامے کا فائدہ یہ ہوا کہ مؤذن کی توبہ شکن سانولی لڑکی پرانی کلکتیا سلیپر سٹر پٹر کرتے ہوئے اس کے ڈھیتو ہوئے گھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آن بسی۔ اور جس گھر اور وں کے سناٹے میں الو بولتے تھے وہاں چھما چھم سی مچ گئی۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی بچپن میں بھی ایک بار جب اس نے تام چینی کی رکابی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا تو سزا کے طور پر اس کی ماں نے وہ رکابی اسی کے لئے ریزرو کر دی تھی۔ لیکن وہ مؤذن کی بیٹی تھی تام چینی کی رکابی نہیں تھی۔ اس کے لئے کپڑے کی ضرورت تھی، تیل بھی ہونا چاہئے سر میں ڈالنے کا، کنگھی چوٹی بھی اور مہندی سیندور بھی، کلکتیا سلیپر اور چھ مہینے میں دو ساریاں اور دو شلوکے بھی۔ وہ پیسے کے پیچھے بھاگا۔ کشتی ڈوب جائے تو بیچ منجدھار میں تیراک تو تیراک اناڑی بھی بے بسی میں ہاتھ پیر تو مارتے ہی ہیں۔ فرقو بھی ہاتھ پیر مارنے لگا ساحل دور تھا ـــــ لیکن اسے تیرنا آ گیا اور وہ کچھ دنوں میں فرقو سے مولوی سید فرقت علی بن بیٹھا ـــــ اور لوگوں نے دانتوں تلے انگلی دبا کر بڑے عاقلانہ اور حاسدانہ انداز میں کہا "کیا ایل دہنار ہیں۔ خدا جس کو دیتا ہے چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ سو برس میں کوڑے کے بھی دن پھرتے ہیں بھائی۔"

کوڑے کے دن پھرے اور بار بار پھرتے رہے۔ برکت کسی گھر کا راستہ دیکھتی ہے تو کب پیچھا چھوڑتی ہے۔ اب تو مولوی سید فرقت علی کی اپنی ڈیوڑھی تھی۔ ایک بڑا سا احاطہ تھا ڈیوڑھی کے آگے۔ اس میں چاروں طرف، مہندی کی سہ طرفہ باڑھ لگی ہوئی تھی، گھنی اور سرسبز۔ ایک طرف کیلے

کے پیڑ تھے دو تین شریفے اور امرود کے پیڑ بھی تھے جو دوسرے کونے میں نظر آتے تھے۔ بیلے اور جوہی کے پھول دھما دھم خوشبو دار آتے تھے۔ پتہ نہیں کسی آسیب کی کارستانی تھی یا مٹی کی سازش مولوی سید فرقت علی کی اس پھلواری میں رات کی رانی دو تین بار لگائی گئی اور ہر بار جل کر پیلی ہو گئی آخری بار تو جب اس نے اپنی محنت سے اگی ہوئی رسی کی طرح زرد بیلوں کو انگلیوں سے چھو کر دیکھا تو اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ "مؤذن کی بیٹی کی طرح یہ زمین بھی بانجھ ہے۔" مہندی کی باڑھ تلے مولوی سید فرقت علی کی مرغیاں کبھی ایک ٹانگ پر کھڑی کھڑی سو جاتی تھیں اور کبھی کسی جانباز مرغے کی رومان پرستی سے گھبرا کر چیخنے لگتی تھیں۔ اس وقت مولوی چیخ اٹھتا "چیل چیل! ــــ کمبختو میری مرغیاں چیل کوؤں کے لئے ہیں کیا؟" لیکن جب اصل معاملہ سمجھ میں آجاتا تو دوبارہ تیمم کر کے کان پر ہاتھ رکھتا اور نماز کی نیت باندھنے لگتا۔ بیچ احاطے میں چبوترہ کبھی مغلیہ دیوان عام کا کام دیتا اور کبھی دیوان خاص کا۔ وہیں بیٹھ کر وہ اپنی رعیت کی فریاد سنتا، ان کے مقدموں کے فیصلے کرتا، ان کے کھیت چھینتا۔ ان کو آدھ بٹائی پر کھیت دیتا، بیج دیتا اور کبھی کبھی یہ سب کچھ نہیں صرف گالیاں دیتا۔ رات کو اپنی حوروں پر ہوتا۔ مولوی سید فرقت علی کے یاروں کا دائرہ پھیل گیا تھا وہاں ٹھنڈی ٹھنڈی تاڑی بڑے سے مٹکے میں رکھی جاتی جس کا منہ باریک ململ سے بندھا ہوتا ــــ کباب اور مسالے دار چنے کی رکابیوں سے مرچ کی جھانس نکلتی رہتی اور گاؤں کے آٹھ دس چنے ہوئے دوست تاڑی کا پیالہ خالی کرتے جاتے اور اپنی رانوں پر ہاتھ ہاتھ مار مار کر گاؤں کے زمیندار محمد قلی کی زیادتیوں کی داستانیں بیان کرتے اور دانت پیستے جاتے۔ مولوی سید فرقت علی ان کے غصے کو ہوا دیتا اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی داڑھی کے جنگل میں اپنی مسکراہٹ کو دفن کرتا رہتا۔ اور اس وقت ہوا کے تیز جھونکوں میں اور تاڑی کے نشے میں کس کو کیا پتہ چلتا کہ کون سی مسکراہٹ کہاں دفن ہو گئی اور کون سا اندھیرا کہاں ابھرا اور چھا گیا۔ روشنی اور تاریکی۔ دونوں دلوں میں اسیر اور یہ باغوں، جھونپڑوں اور کھیتوں سے چل کر وہاں آئی تھیں۔ مولوی سید فرقت علی کی تاڑی سے اپنی پیاس بجھاتے۔

کوئی کہتا "سید صاحب ذرا ہوشیار رہئے۔ محمد قلی کے سلام کے چکر میں نہ آئیے اس حرامزادے کے کاٹے کا منتر نہیں۔ وہ کب سے آپ کی تاک میں ہے"

ایک گرجدار آواز چبوترے سے بلند ہوتی اور کھلیان سے جا ٹکرائی ــــ

"ارے میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ دیکھتے جاؤ۔ ہاں میاں کیا مذاق ہے اپنا پیالہ تو خالی کرو ــــ میں گاؤں کا حلیہ بدل کر رکھ دوں گا سمجھا کیا ہے خبیث"

وہ دیر تک بڑبڑاتا رہتا کہ مٹکا خالی ہو جاتا۔ رکابیاں خشک ہو جاتیں اور محفل درہم برہم ہو جاتی۔ وہ دو تین چکر اپنے احاطے کے لگاتا اور بیروں سے شبنم اڑاتا اپنے گاؤں تالے کی طرف دیکھتے ہوئے دیر تک سوچتا رہتا اور پھر اچانک مڑتا اور بلغم تھوکتا اور کھانستا ہوا زنانخانے میں چلا جاتا "محمد قلی کہتا ہے ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ٹھیک کہتا ہے حرام الدہر"

زنان خانہ کیا تھا، اچھا خاصا حرم سرا تھا۔ اب مولوی سید فرقت علی کی عمر پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ پچھلے پچیس برس میں جبکہ مؤذن کی الھڑ بیٹی اس کے گھر ڈال دی گئی تھی۔ اس نے بڑی ترقی کی تھی۔ اس کا ایک ثبوت یہ تھا کہ وہ ایک تباہ حال نوجوان سے بدل کر ایک با اثر بڑا کاشتکار بن گیا تھا جس کے اپنے کھیت تھے، اپنا گھر، اپنے کھپریے، اپنے مویشی، اپنی آنکھیں، اپنا سرمہ نئی پرانی ملا کر اس کی چار بیویاں تھیں۔ وہ زنان خانے میں رہتی تھیں۔ اس نے صرف ایک شادی اپنی مرضی سے یعنی دل بیتاب کی بدتمیزی کی بنا پر کی تھی۔ مؤذن کی بیٹی کے بعد اس نے مختلف مصلحتوں اور ضرورتوں سے مجبور ہو کر تین شادیاں اور کیں۔ آدمی شرعی تھا اور دنیا میں اتنا کار خیر کر لینا چاہتا تھا کہ آخرت میں پانچوں انگلیاں گھی میں ڈبوئی جا سکیں۔ جنت میں سیٹ ریزرو کرانے کا قاعدہ اسے پسند تھا۔ لوگ اس سے خواہ مخواہ جلتے تھے بات صرف اتنی تھی کہ گاؤں کی بیوہ کلثوم کو اپنی کانی بیٹی کے لئے کوئی بر نہ مل سکا تو ایک دن وہ فرقو کے پاس بیٹھ کر اتنا روئی اتنا روئی کہ اس کا دل پگھل گیا ــــ اور جب اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ میری بیٹی کے ہاتھ کبھی پیلے نہیں ہوں گے تو اس کا دل کانپ گیا۔ مؤذن کی بیٹی بانجھ تھی اور وہ اپنے اندھیرے گھر کو بے چراغ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ اس دن اس نے مؤذن کی بیٹی کو کلیجے سے لگا کر رات بھر پیاری پیاری باتیں کیں۔ اور صبح ہوتے ہوتے مؤذن کی

بیٹی نے جائے نماز بچھانے سے پہلے آنکھیں پھیلا کر کہا تھا۔ بیکار سوچتے ہو تم سنجیدہ سے شادی کر لو۔ کلثوم بوا کے دل کا بوجھ بھی ٹل جائیگا اور ہمارے دل کی کلی بھی کھل جائیگی"۔ ایک جوت سے دوسری جوت جلانیکا خیال کتنا پاک اور نیک خیال تھا۔ فرقو اس میں دیر کیوں کرتا۔ جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہو گیا۔

کلثوم بوا کی چھوٹی موٹی جائداد تھی۔ فرقو نے بیوہ کی جائداد اور لڑکی دونوں کو سنبھال لیا اور گاؤں میں ایک پنساری کی دوکان کھول لی کام چل نکلا۔ یہ شادی اسے بہت راس آئی۔ تین برس پورے بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ دو بچیوں کا باپ بن گیا۔ یہ رفتار اس وقت اور تیز ہو گئی جب دو بیٹیوں کی تمنا پوری ہونے کے بعد قریبی گاؤں سے اچھے جہیز اور زیورات کے عوض ایک نوجوان بیوہ کو بیاہ لایا۔ اس کار خیر سے اس کو بڑا فائدہ ہوا۔ جب سال نکلتے نکلتے اس کو اس بیوی سے بھی بچی ہی ملی تو اس نے اپنا منہ بنا لیا۔ اس غصے کی تلافی کرنے کے لئے اس کی تیسری بیوی نے اپنے سارے زیورات اس کی نذر کر دیئے اور کہا "گھر میں برکت ہو رہی ہے۔ ہاتھ پاؤں بڑھیں تو چادر بھی پھیلنی چاہئے۔ جاؤ ان زیورات کو بیچ کر نیلام میں کھیت خرید لو"۔ حالانکہ اس رات مؤذن کی بیٹی کی باری تھی۔ تیسری بیوی ہی کے کمرے میں سو گیا اور کالی کلوٹی پوپلی سی چیں چیں کرتی ہوئی بچی کو پیار بھی کیا۔

وہ ذات کا جلاہا تھا اور کسی زمانے میں اس کے گھر میں کرگھا بھی تھا جسے اس نے اپنے باپ کے مرنے کے بعد کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کی بوڑھی ماں اس کو ڈانتی پھٹکارتی تو وہ بس اتنا کہتا" بنتے بنتے ہم مر بھی جائیں تو اس سے نہ تیرا بھلا ہو گا نہ میرا۔ ہم تو کچھ اور کاروبار کریں گے"۔ وہ ڈٹ کر پہر تمالی بھات اڑا جاتا اور تاروں بھرے ننگے آسمان کے نیچے ایک کھری چارپائی پر گرمی دانوں سے چھلنی پیٹھ کو رگڑتے ہوئے زور سے نعرہ لگاتا "کھینچ مولا چھین کر دڑکی چوتھائی"۔

جب تک اس کی ماں زندہ رہی وہ اپنے شوہر کے پسینے میں ڈوبے ہوئے کرگھے کو صاف رکھتی رہی اور اس کوٹھری میں چراغ اور دوہان جلاتی رہی۔ لیکن جب وہ بھی اس کے باپ کے پاس چلی گئی تو اس نے کفن دفن کے بعد پہلا کام یہ کیا کہ کرگھے کو اپنے چولہے کے ہاتھ ادنے پونے بیچ دیا۔ کچھ دنوں تو وہ درختوں کے جھنڈ تلے ان کو کچے دھاگوں سے کھینتے اور حقہ پیتے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ جیسے بالکل اندھا ہو گیا۔ اسے یہ سب کچھ نہ سوجھتا۔ وہ کہیں سے گنا پار کر دیتا اور کہیں سے بیگن۔ کچھ دنوں اس آپا دھاپی میں بیت گئے۔ مگر ایک وقت ایسا آیا کہ اس نے پتمار کے گاؤں کے زمیندار کے کہنے پر پڑھنے لکھنے میں جی لگایا اور دو تین برس میں مولوی بن گیا۔ اس کے دل و دماغ کی جولانی نے وہ گل کھلائے وہ معجزے دکھائے کہ چند برسوں میں اس کا ناتا جلاہے ٹولی سے بالکل ٹوٹ گیا اور ادھیڑ عمر کو پہنچنے سے بہت پہلے ہی مولوی سید فرحت علی بن کر گاؤں کا چودھری نمبردار بن بیٹھا۔ پاکستان کے بننے سے اسکا اور بھی بھلا ہوا اس نے بھاگنے والے مسلمانوں کی لنگوٹی ہی نہیں بلکہ ان کی ٹوپی، اچکن اور پاجامے تک اتار لئے۔ اس کے پاس اچھی خاصی جائداد ہو گئی اور اسے ایک بیٹے کی فکر اور ستانے لگی۔ وہ سفر حج پر جانا چاہتا تھا لیکن اپنا نذر وارث چھوڑے بغیر وہ سمندر کا سفر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سمندر کا سفر کرنا اور کیلے کے چھلکوں پر دوڑنا برابر تھا۔

اس کے ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے۔ باغوں پر ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤشالے میں تگڑے مویشی جگالی بھر رہے تھے۔ گھر میں تین بیویاں تھیں۔ ان میں سے دو کی گودیں ان ہی کھیتوں کی طرح لہلہا رہی تھیں۔ البتہ پہلی بیوی کی گود خالی تھی۔ لیکن وہ اپنے سوکنوں کی بچیوں کو اپنے دل کا ٹکڑا بنائے رہتی۔ جب اس سے بھی گھبرا جاتی تو وعائے گنج العرش پڑھنے لگتی اور شام سے صبح تک نفلیں ڈھالنے میں بھی اس کے کلیجے کو خاصی راحت ملتی۔ گھر میں بڑا سکھ تھا باہر چبوترے پر بھی تاڑی اور دوستوں نے ایک جنت بسا دی تھی۔ اور کیا چاہئے "اور تو کچھ نہیں بس ایک بیٹا چاہئے"۔

وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے ہوشیاری سے کام نہیں لیا تو خون پسینہ ایک کرکے اس نے جو عمارت بنائی ہے، بیٹیوں کو سنبھالی سنبھلیگی محمد تقی موقع کی تاک میں ہے وہ سب کچھ ہڑپ کر جائے گا۔ اور اگر داماد آ بھی گئے تو جائداد کا تکا بوٹی کر دیں گے اور اس سلئے محمد تقی کی گاؤں کی اجارہ داری کی جڑیں کھوکھلی کریگا اور اس کا تختہ الٹنے کا اور اس طرح اس سے اپنے باپ دادا کا انتقام لینے کا جو بیڑا اٹھایا ہے، ادھورا رہ جائے گا اور قبر میں بھی اس کی روح کو چین نصیب نہ ہو گا۔

"عمر کا سورج ڈھل رہا ہو تو ایسے میں ایک اور جوانی کو اپنے گھر میں لا کر بسا لینا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ اور وہ بھی جبکہ اپنی بچیاں بھی ماشاء اللہ سیانی ہو

رہی ہوں۔ اللہ بیٹی بھی کیا چیز ہے جنگلوں بیلوں کی طرح سنسنا کر بڑھتی ہے لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ اگر میں نے اس سیدانی لڑکی سے شادی کر لی تو آیندہ نسل محض نام کو نہیں بلکہ سچ مچ میں سادات کی بوباس آجائیگی۔ اور میں نے جو چراغ روشن کیا ہے ہمیشہ منور رہیگا۔ محمد قلی کے پیچھے اس میدان میں بھی تمہاری ناک کاٹونگا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب تم مجھے مولوی بنانے کے لئے اونچی ناک کر کے وظیفہ دیا کرتے تھے۔ اور آج ذرا چہرے پر ہاتھ پھیرو، پانی پت کا میدان نظر آئیگا۔ کوسوں ناک کا پتہ نہیں۔ لا رہا ہوں سیدانی اپنے گھر میں۔ کر لو جو جی چاہے"

اس وقت سب سے پہلی بیوی، مؤذن کی بیٹی، اس کے پاؤں داب رہی تھی۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں اس کا سایہ مٹی کی دیوار پر پھیل رہا تھا۔ اس کی ناک کی بڑی سی کیل چمک رہی تھی اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ کسی دعا کا ورد کئے جا رہی تھی۔ مولوی سید فرقت علی کو اس پر بڑا رحم آیا۔ "بڑی صابر عورت ہے"۔ اس نے اس کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اس کو اپنی گود میں گرا لیا سالوں بعد بھرے ریگستان میں اس طرح جل تھل ہوتے دیکھ کر وہ حیران رہ گئی "ہائے ہائے۔ جاڑے کی رات ہے اور ابھی نفل تو ادا ہی نہیں کی"۔ "لیکن بات بنی نہیں۔ زمانہ بعد وہ اپنے میاں کی داڑھی سے چھنتی ہوئی تاڑی کی کھٹی بو سے سرشار ہوتے ہوئے اپنے بانجھ پن کا غم بھول بیٹھی اور ساتھ ہی تہجد گذاری بھی۔ وہ رات پھر پلٹ کر نہیں آئی۔ کیونکہ اس رات، اس نے، اپنی پہلی بیوی سے سیدانی کو اپنے گھر میں بسا لینے کے لئے اخلاقی ہمدردی حاصل کر لی "مری جان تمہاری گود خالی ہے تم سے، تمہارا دل اتنا ہی ہرا بھرا ہے"۔ اس نے اپنے ٹھنڈے لبوں پر پھیرتے ہوئے صرف اتنا کہا تھا "نہیں جی — بیٹے بنا کسی خاندان کا چراغ جلا ہے بھلا"۔

سیدانی یتیم تھی، اپنے چچا کے سینے پر چٹان کی طرح بوجھ بنی ہوئی تھی لیکن جب مولوی سید فرقت علی کے گھر میں داخل ہوئی تو سارے گھر پر چھا گئی۔ ایک تو سب سے زیادہ جوان تھی دوسرے سیدانی، پڑھی لکھی اور نئے مزاج اور رنگ ڈھنگ کی۔ دوسری بیویوں نے خاموشی سے اس کے سامنے سر جھکا دیا بلکہ سلمیٰ جو بادباں میں ہوا کو یوں بھرتے دیکھا تو کشتی بے تحاشا ہوا کے رخ پر چھوڑ دی۔ تھوڑے ہی دن میں اس کا سکہ چلنے لگا اور سب کے سب اس کے دیدے کے سامنے کانپنے لگے۔ اس کے سامنے مولوی سید فرقت علی بھی بھیگی بلی بن گیا تھا۔ اس نے دودھ پینے کے لئے چھینکے میں منہ ڈالا تھا لیکن وہاں تو سر ہی پھنس گیا چھینکا بہت مضبوط تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہیں اس سیدانی کا سودا مہنگا تو نہیں پڑے گا۔ لیکن وہ جلد ہی اسے ٹال جاتا — "ارے ایسا بھی کیا مہنگا پڑے گا"۔

مولوی سید فرقت علی کی دونوں جوان بیٹیاں، اپنی نئی نویلی سوتیلی ماں کی بڑی دوست بن گئیں۔ سوائے ان دونوں کے سلمیٰ اور کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ ان کے سامنے، کھڑے کھڑے، ان کے باپ پر صلواتوں کی چھاجھوں بارش کر دیتی اور کبھی کبھی تو آنکھیں نچا کر، پان کی گلوری بڑھاتے ہوئے اس کی داڑھی اور توند کا مذاق اڑانے سے بھی نہ چوکتی۔ وہ جانتی تھی اس بڈھے اونٹ کی نکیل اس کے ہاتھ میں ہے۔ "ارے مولوی صاحب مجھ سے زیٹ نہ بگھارو۔ نودولتیوں کی حرکت مت کرو۔ میرے ماں باپ زندہ ہوتے تو اس طرح کبھی بڈھے جلاہے کے پلے نہ باندھتے۔ اس بات سے ایسی بجلی لگی کہ رات بھر اس کی چارپائی پر پڑی سلمیٰ گرم گرم سانس لیتی رہی لیکن اسکی رگوں میں برف ہی دوڑتی رہی۔ اس رات کے بعد سے جب کبھی سکا ہاتھ سلمیٰ کے گرم جسم سے چھو جاتا اس کے دل پر برف کے ڈھیلے برسنے لگتے۔ اس نے اپنی کمزوری کو ضرورت سے زیادہ محسوس کیا اور شہر کے حکیم کی بن آئی معجون نے اس کی رگوں میں کتنی آگ بھری، اس کی آزمائش کی نوبت ہی نہ آتی تھی۔ اندر ہی اندر اس کا دل لادے کی طرح پک رہا تھا "عجیب مصیبت ہے میں کھیتی باڑی سنبھالوں یا سلمیٰ کے ڈنک نکالوں۔ عجیب آفت ہے"۔

سلمیٰ ان باتوں کو جان بوجھ کر ڈھٹی تنی اور بے رحمی سے نظر انداز کرتی رہی۔ اس نے اپنی دونوں سوتیلی بیٹیوں کو اپنی سہیلیوں کا درجہ دے دیا تھا۔ محمد قلی کا چھوٹا بیٹا، جو انٹرنس فیل ہو کر، کاشتکاری کے گر سیکھ رہا تھا، دور دراز کی رشتہ داری کا کچا دھاگا پکڑے ہوئے، سلمیٰ سے ملنے آتا، گپیں کرتا اور مولوی کی دونوں بیٹیوں اور سلمیٰ کے ساتھ بیٹھ کر کورٹ پیس کھیلتا۔

مولوی سید فرقت علی ان باتوں سے بہت کڑھتا تھا۔ وہ محمد قلی کے بیٹے ادریس قلی کے چال چلن اور رنگ ڈھنگ سے واقف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی جوان لڑکیاں اس کی صحبت میں خراب ہوں۔ خاص طور پر خطرہ اسے سلمیٰ کی طرف سے تھا جو اس کے سامنے ہی ادریس

قلی سے معیوب بے تکلفی سے احتراز نہ کرتی تھی۔ حالانکہ اس کی غیر موجودگی میں وہ ادریس قلی کو زیادہ بے تکلف ہونے کا موقع نہ دیتی اور موقع بے موقع جتا دیتی کہ زندگی بہرحال تاش نہیں ہے۔ وہ مولوی کی لڑکیوں اور ادریس قلی کے درمیان ایک دو دھاری تلوار بنی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ ادریس قلی نے سلمیٰ کی آنکھوں کی تعریف کر دی سلمیٰ نے تاش کے پتّے پھینک دئے۔ "جی ہاں ہیں بھینس سی آنکھیں۔ لگائیے غوطے۔ آئیے آئیے۔" ادریس قلی بڑا کھسیانہ سا ہوگیا۔ اور جب تک تاش کھیلتا رہا۔ برابر تاش کے پتّے پھینٹتا رہا۔ مولوی سید فرقت علی کے نازل ہوتے ہی اس کا رویہ بدل گیا۔ وہ ادریس قلی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگی۔ "ادریس بھائی، اگر ہمارے گاؤں میں بھی بائیسکوپ کھل جائے تو بڑا مزا رہے۔"

اس دن مولوی سید فرقت علی کا منہ معمول سے زیادہ پھول گیا۔ اس کی داڑھی کا پنکھا کافی پھیل گیا۔ اور اس کی مونچھوں سے محروم لب کے اوپر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

"چھوٹی بیگم تم کو اپنے برے بھلے کی بالکل پروا نہیں۔"

"ایسا نہ ہوتا تو میں ایک بڈھے کے پلّے کیوں باندھی جاتی؟"

"تم ہمیشہ یہی طعنہ دیتی ہو۔ میں کوئی ایسا بوڑھا بھی نہیں ہوں۔ نہیں سنا تم نے مرد ساٹھا تو پاٹھا۔"

"سنا بھی اور دیکھ بھی لیا۔"

"لاحول ولا ــــــــ"

وہ آنکھیں نیچی کئے اور تاش کے پتّوں کو بکھیرتے ہوئے بولی "میں نے مہرو اور زینو کی شادی کی بات سوچی ہے۔ بس یہ مصیبت ہے کہ دونوں لڑکوں کی تین تین بیویاں پہلے سے ہیں ان کی عمر کوئی ایسی زیادہ نہیں۔ پچاس کے لگ بھگ ہیں۔ ان کی دو تین لڑکیاں خود مہرو اور زینو کی عمر کی ہیں۔ ان کے سنگ خوش رہیں گی یہ۔ کیا خیال ہے آپ کا سید صاحب؟"

مولوی نے دو تین بار کروٹ لی اور زور سے چیخا۔

"تم دیکھتی رہو گی ـــ کتنے سیدزادے آتے ہیں ہماری دہلیز پر ناک رگڑنے۔ وہ تمہاری طرح یتیم نہیں ہیں۔ ان کا باپ صاحب جائداد ہے۔ لاحول ولا ــــــــ"

سلمیٰ اسی طرح حقارت بھری نگاہوں کا زہر اس پر برساتی رہی

"تم ادریس قلی سے اتنا میل جول نہ بڑھاؤ۔"

"میں تو بڑھاؤنگی، بڑھاؤنگی، بڑھاؤنگی۔" اس نے پاؤں ٹپک ٹپک کر دیواروں کو دہلا دیا۔

اس دن اس نے مولوی سید فرقت علی کو گھر سے نکلنے نہ دیا۔ دن بھر تاش کے نئے نئے کھیل اسے بتاتی رہی وہ جب اونگھتا اس کی ناک میں پان کی بتی بنا کر اس کی ناک کو گدگداتی۔ رات کے وقت بھی اس کو چھیڑ چھیڑ کر تھکاتی رہی۔ اس دن مولوی کو یقین ہوگیا کہ حکیم نے اس کو اتو بنایا ہے۔ معجون میں بھس بھر دیا ہوگا کمبخت نے۔ جب وہ ہانپنے لگا تو سلمیٰ نے اپنے شلوکے کے بٹن لگاتے ہوئے کہا "میں تو مہرو اور زینو کا رشتہ پختہ کئے دیتی ہوں۔" مولوی سید فرقت علی تڑپ کر اٹھا اور دیوار سے ٹنگی ہوئی زنگ آلود تلوار نیام سے کھینچ لی: "میں قتل کر دوں گا تمہیں اگر تم نے مہرو اور زینو کو بڈھوں سے بیاہنے کا نام لیا۔"

سلمیٰ سہم کر زمین پر گر گئی۔ تھوڑی دیر بعد چراغ گل ہوگیا۔ اندھیرے کمرے میں مولوی کے خراٹو بکے پٹاخے چھوٹتے رہے اور سلمیٰ کا دل ایک زہریلے پھول کی طرح مسکراتا رہا۔ اسی طرح صبح ہوگئی

اب کے ساون ایسا برسا کہ لوگ پچھلی کئی برساتوں کو بھول گئے پانی کی جھڑی اب بھی لگی ہوئی تھی۔ سامنے، مولوی سید فرقت علی کی پھلواری کے سامنے کھیتوں میں پانی بھرا ہوا تھا۔ گاؤں کے کچے اور ان کی عورتیں جھک جھک دھان کی نیریاں لگا رہی تھیں ان کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا اور

ہونٹوں سے گیت۔ وہی گیت جو آہ سے ملہے سے شروع ہوتے ہیں اور جو صدیوں سے بھوک، پیاس اور زمیندار کے ظلم کی کہانی سنا رہے ہیں اور جن میں ساس کے تیرو نشتر اور پیا پیا کانٹوں بھری دھرتی کی سیج کی کہانیاں بھی سلگ رہی ہیں۔

نیلا گگن آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس میں بادل کا ایک بہت بڑا پہاڑ شفق کی آگ میں نہایا ہوا۔ آہستہ آہستہ تیر رہا تھا۔ جیسے وہ بھی روپین میں کھوئے ہوئے مردوں اور عورتیں کی طرح تھمگ گیا ہو جو اب اپنی کمر سیدھی کر کے ایک دوسرے پر پانی پھینک رہے تھے اور جو زمیندار اور کاشتکار کے گھروں کی طرف اپنی دن بھر کی کمائی اپنے بھیگے ہوئے آنچلوں اور دھوتیوں میں سمٹنے کے لئے آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔

مولوی سید فرقت علی کا منہ اترا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں پان کے رس میں بھیگی ہوئی زبان پھیرنے سے بھی یہ پپڑیاں ترنہ ہوتی تھیں۔ وہ بہت بوکھلایا ہوا تھا۔ بوکھلانے کی بات بھی تھی۔ اس نے کہارنوں کو گھر سے اپنے آنچل میں اناج لے کر نکلتے ہوئے دیکھا اور ایک بار پھر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

پچھلے دنوں دو تین ایسے حادثے ہو گئے تھے کہ اس کی کمر ٹوٹتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

یکایک سلمیٰ پر عشق کا ایسا بخار چڑھا کہ وہ اس کے سر ہو گئی۔ یہ بخار چھوت کا معلوم ہوتا تھا۔ اس پر بھی یہ بخار چڑھا۔ لیکن کچھ ہی دنوں بعد اس کا یہ بخار اتر گیا جب اسے معلوم ہوا کہ اس کے گھر میں نیم سید خون کا چراغ جلنے والا ہے۔ ہزار سمجھانے بھی اس کا دل یہ نہ مانتا تھا کہ بعض مرتبہ عشق صادق ہو تو مرد عورت کا جسم چھو جانے سے بھی عورت کے خون میں عشق کا بیج جڑ پکڑ سکتا ہے۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کا بچہ نیم سید کی بجائے خالص سید نہ پیدا ہو۔ ادریس قلی سے اس کی نفرت اور بڑھ گئی

اس کا بس چلتا تو وہ ادریس قلی کا سر توڑ دیتا۔ مگر وہ ان دنوں اپنی لڑکیوں کا گھر بسانے کی فکر میں کھویا ہوا تھا۔ وہ سیدزادوں سے بات بھی پکی کی، ان کو علیگڈھ یونیورسٹی میں پڑھانے کا خرچ اٹھانے کا ذمہ بھی لیا لیکن منگنی سے دو تین دن پہلے ہی ان کے والدین کو معلوم ہو گیا کہ لڑکیاں جلاہن ہیں اور معاملہ وہیں ختم ہو گیا۔ اس میں بھی محمد قلی اور اس کے خاندان والوں کا ہاتھ تھا۔

وہ ان دونوں باتوں کو تاڑی میں گھول کر پی سکتا تھا۔ مگر تیسری چوٹ ایسی تھی کہ اس کو کسی کروٹ چین نہ آتا تھا۔

محمد قلی نے اس کی جڑ بنیاد کھودنے کا بندوبست کر دیا تھا۔

چند ہی دن پہلے سرکاری حاکموں نے تحقیقات کی تھی۔ پاکستانی بھائی بندوں کی زمینوں پر اس کا قبضہ غیر قانونی بتایا جا رہا تھا۔ اس نے جو کاغذات پیش کئے وہ سب جعلی اور بے معنی ثابت کئے گئے۔

محمد قلی خاندانی زمیندار تھا اور اس کی پہنچ تھانیدار سے لے کر منصف اور مجسٹریٹ تک تھی۔ اس کو محسوس ہوا کہ اب کی برسات میں دیواروں سے پانی گھس رہا ہے۔ دیواریں کسی وقت بھی سلسلا کر بیٹھ سکتی ہیں۔

تاڑی کی محفل بھی اسے بڑی ویران معلوم ہوتی۔ دو تین پیالے کے بعد اس کی طبیعت متلانے لگتی اور ڈکارے کر وہ اپنی بدہضمی کا بہانہ کرتے ہوئے ہاتھ روک لیتا۔ لوگ پیتے رہتے "سید صاحب بات یہ کہ محمد قلی بڑا کمینہ پرور ہے۔ وہی حاکموں کو الٹی سیدھی پٹی پڑھایا کرتا ہے۔"

"جی ہاں ـــــ لیکن میں بھی کوئی مٹی کا مادھو نہیں ہوں۔ طبیعت ہری نہ کر دوں تو میرا نام سید صاحب نہیں،،

اب لوگ اس قسم کی باتوں پر منہ پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے لگے تھے۔

پھر ایکبار خوشامدیوں کا گروہ محمد قلی کی ڈیوڑھی کے چکر لگانے لگا تھا۔ ان میں کچھ شریف اور نیک نیت لوگ بھی تھے جنہوں نے مولوی سید فرقت علی کا دامن اس لئے پکڑا تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ محمد قلی کی طرح اپنے پڑوسیوں اور گاؤں والوں کو لوٹ کر موٹا نہیں ہو گا۔ وہ تو غریب سے امیر ہوا تھا لیکن کچھ ہی دنوں بعد معلوم ہو گیا کہ وہ محمد قلی سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں تھا۔ صرف فرق اتنا تھا کہ محمد قلی کا سلسلہ نسب ہی بے ایمانیوں اور مکاریوں کی بنیاد پر قائم تھا اور مولوی سید فرقت علی ان ہی باتوں کو اکیلا پورا کر رہا تھا کیونکہ اس کے اجداد سوت اور کرگھے میں الجھے رہے تھے

وہ بہت ہی دل برداشتہ ... تاڑی ... [illegible] ... میں گیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا

پھواریں برس رہی تھیں۔ اس کی پہلی بیوی جائے نماز پر ہاتھ باندھے کھڑی تھی پچھلی گلی کی زنجیر بجی۔ وہ دوڑ کر پھسلتا ہوا صحن سے گذر کر وہاں پہنچا۔ اس نے کواڑ کھولے تو گلی میں سناٹا تھا۔ البتہ دور مارچ جل اور بجھ رہی تھی۔

وہ واپس سلمی کے کمرے میں آیا۔ وہ زرد ہو رہی تھی۔ مولوی سید فرقت علی نے سلمی کے کانپتے ہوئے لب دیکھے اور خاموش کھڑا ہو گیا

"کیا تم کو کسی کا انتظار ہے،، اس نے اپنے بھیگے کپڑے اتارنے اور دوسرے کپڑے پہنے ہوئے پوچھا۔

"ہاں،،

"کس کا،،

"موت کا،،

"کیوں،،

"مجھے تمہارا بچہ نہیں چاہئے،،

"اچھا تو کل حکیم صاحب سے اسقاط حمل کی دوا لادوں گا،،

سلمی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور وہ مولوی کو زہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

مولوی نے چراغ بجھا دیا اور اسکے پاس ہی لیٹ گیا۔ وہ اس کے پورے جسم پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ جب اس کا ہاتھ گردن پر پہنچا اس کی نسیں تن جاتیں۔ لیکن خود اس کی گرفت پھانسی کا پھندا بن کر اس کی نگاہوں میں جھولنے لگتی۔ اور وہ ڈر سے کانپ جاتا "واقعی میں بہت ڈرپوک ہوں اور کمینہ بھی۔ محمد قلی سے بھی زیادہ جس نے زمینداری پر جلد از جلد قبضہ کرنے کے لئے اپنے باپ کی دوا میں زہر ملا کر اس کا کام تمام کر دیا تھا اور میں اپنی عزت کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا۔ لعنت ہے مجھ پر۔"

صبح کا جھٹپٹا چھایا ہوا تھا۔ مولوی سید فرقت علی کا گورتیت دوڑا ہوا آیا۔

"سرکار اپنی پوکھر والا کھیت اجڑ رہا ہے۔"

وہ دوڑا ہوا اپنے آسامیوں اور کمیروں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ اس کے کھیت کی مٹی راتوں رات کاٹ دیگئی تھی دھان کی نرم پنیریاں بہہ گئی تھیں۔ جو رہ گئیں تھیں وہ اِکا دکا اس کی نگاہوں کے سامنے بہہ رہی تھیں۔

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنے گورتیت کا ڈنڈا چھینا اور سب کو لے کر خود گھس گیا محمد قلی کے ٹوپے میں۔ وہاں بھی پچھلی تمام بوائی تھی۔ اس نے مٹی کاٹ دی۔ پانی ڈھلان پر گڑگڑا کر بہنے لگا۔ اس نے ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر پنیریوں کو ادھ موا کر دیا۔ سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو اس وقت محمد قلی کے کھیت سے دھان کی آخری پنیری ڈھلان پر زور زور سے بہتے ہوئے پانی کے حلق میں اتر رہی تھی۔

محمد قلی کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ خاموش رہا۔ البتہ عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے سے اس کی بیل جیسی آنکھوں کی سرخی اور تیزی سے جھانکنے لگی۔

اس نے اپنے گماشتے سے کہا "ٹھیک ہے۔ دونوں میں سے ایک تلوار ٹوٹ کر رہیگی"۔ وہ مسکرایا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ مولوی سید فرقت علی لکڑی کی تلوار ہے۔

دوسری صبح مولوی کے گاؤں شالے میں تہلکہ مچ گیا۔ اس کے دو بھینسے مردہ پڑے تھے۔ اتنے کڑیل بھینسے کہ جوار میں کوئی ان کا جوڑ نہ تھا۔ مولوی سید فرقت علی نے جھک کر دیکھا ان کے منہ سے جھاگ نکل کر صابن کے پھین کی طرح جمع ہو گیا تھا کسی نے کہا "اب کے برسات میں بڑے زہریلے سانپ برسے ہیں۔ کل میرے چھپر پر دو گوہمن مارے گئے۔ اب کیا ہو گا،،

"ہو گا کیا، سانپ کا سر کچلنا ہو گا،، مولوی سید فرقت علی نے دانت پیس کر کہا۔ یہ بات محمد قلی کو پہنچا دی گئی۔ اس نے بھی دانت پیس کر کہا "ہاں سانپ کا سر کچلنا ہو گا" ـــــــــ اور اپنے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کی طرف جاتی ہوئی پگڈنڈی پر غائب ہو گیا۔

سارے داؤوں کا جواب تو مولوی سید فرقت علی کے پاس تھا۔ لیکن جب محمد قلی نے سرکاری حلقوں میں اپنے اثر و رسوخ کا سہارا لیا تو اس کا دم نکل گیا۔ اس نے کتنے جوڑ توڑ سے اپنی حیثیت بنائی تھی۔ لیکن سب کچی مٹی کے گھڑے کی طرح پگھلتا جا رہا تھا۔ لیکن شیر کے منہ کو جب ایک بار خون لگ جائے تو وہ زندگی بھر اس کا مزا نہیں بھولتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا اہنسا وادی کیوں نہ ہو۔

محمد قلی نے شروع میں ڈھیل اس لئے دے رکھی تھی کہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ ٹٹ پونجیا اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیگا۔ بڑے سے درخت کے پاس ایک چھوٹا سا پودا اگ جائے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ پودا تو بالکل جھاڑ جھنکار بڑھتا ہی جا رہا ہے اور اس کے اپنے تنوں پر پھیلتا جا رہا ہے تو وہ چونکا اور اس نے اپنے مہروں کو چلنا شروع کیا۔ لیکن مولوی سید فرقت علی میدان میں جما رہا اور اس نے لوگوں کو محمد قلی کے خلاف بھڑکانا نہ چھوڑا۔ اس نے اس کے کمیروں کو توڑ کر اپنے کمیروں میں ملا لیا۔ جب معاملہ بڑھا تو اس نے اپنے کمیرے کی طرف سے زمیندار کو مہر جانہ ادا کر دیا۔ چھوٹے بڑے جھگڑوں کی تان آکر کھیت کے ایک ٹوپرے پر ٹوٹی۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ وہ کھیت کا ٹکڑا ان کا ہے حالانکہ کھیت کا ٹکڑا اصل میں جس کا تھا، پاکستان سدھار چکا تھا۔

اس برسات میں دونوں کے ہل اس کھیت کا دل چیر چکے تھے۔ ایک نے بیج بوئے تو دوسرے نے ہل چلا دیا اور پھر خود ہی بیج بوئے جب پنیریاں لگیں تو مولوی کو کچھ اطمینان ہوا۔ لیکن محمد قلی کب صبر کرنے والا تھا۔

یہ جھگڑا گاؤں کے اقتدار کا تھا کہاں محمد قلی خاندانی سید، خاندانی زمیندار اور کہاں فرقو جلاہا جو دوسروں کے ریشم سے اپنے ٹاٹ چھیدے بھر رہا تھا۔

جب پچھلی رات اس کے گھر میں چوری ہو گئی تو گاؤں بھر میں ڈر پھیل گیا۔ اس کی بیویوں کے سارے زیورات اور کپڑے چلے گئے تھے۔ مولوی سید فرقت علی کو دکھ سب سے زیادہ منوں غلّے کے غائب ہو جانے کا تھا

سب لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ لیکن مولوی سید فرقت علی خاموش تھا وہ بار بار محمد قلی کی ڈیوڑھی کی طرف دیکھتا تھا جہاں اس کے عملے بیٹھے تھے اور اگلی فصل کے لئے بازار کا بھاؤ ٹھیک کر رہے تھے جب اس کی نظر مولوی سید فرقت علی کے پریشان چہرے پر پڑی تو وہ دوڑا ہوا آیا۔

"مولوی صاحب یہ سن کر بڑا رنج ہوا۔ یہ علاقہ چوروں اور ڈاکوؤں سے بھر گیا ہے۔ ہماری تو ناک میں دم ہو گیا ہے۔ وہ تو خیریت ہوئی جان کو کوئی نقصان نہیں پہونچا۔"

مولوی سید فرقت علی نے محمد قلی کی اس ہمدردی کا جواب ایک بھاری بھرکم چھینک اور "جی ہاں جی ہاں" سے دیا۔ وہ زمیندار کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ دیکھ رہا تھا جو اس کے باپ کی آنکھوں میں اس کو وظیفہ دیتے وقت پیدا ہوتی تھی۔

محمد قلی کی بیوی، اس کی لڑکیاں اور مامائیں، سب کی سب، اس مصیبت کے وقت مولوی سید فرقت علی کے زنان خانے میں اس کی چار بیویوں سے ہمدردی کر رہی تھیں اور حادثے کی تفصیل پوچھ رہی تھیں اور اپنی زبان سے ایسی رحم آمیز آواز نکال رہی تھیں جیسے اپنی مرغیوں کو دانہ چگنے کے لئے بلا رہی ہوں۔

سلمیٰ کے لئے ادریس قلی کی ہمدردیاں کافی نہیں جس کے ہاتھ میں اپنے باپ کی دونالی بندوق تھی اور جس کے گھنگھریلے بال پیشانی کے دونوں طرف جھک آئے تھے۔

محمد قلی کو اس کا غصہ بھی تھا کہ مولوی سید فرقت علی اپنے لڑکیوں کو ادریس قلی پر ڈورے ڈالنے کے لئے اکسا رہا ہے: "خود سیدزادی کو بیاہ لایا تو اب لڑکیوں کے لئے سیدزادوں کو پھانسنے کا جنون سوار ہوا ہے الّو کے پٹھے پر۔"

لیکن ٹھیک اس وقت جب محمد قلی کو یقین ہو گیا تھا اس دنگل میں مولوی سید فرقت علی کو پچھاڑا جا سکیگا کچھ ایسا ہوا کہ مولوی اپنے دعوٰں میں کامیاب ہو گیا اور پاکستانی حضرات کی جائداد پر اس کا حق ثابت ہو گیا۔

اس دن اس نے میلاد شریف پڑھنے شہر سے مولانا کو بلایا گاؤں کے غریب لوگ بھی مٹھائی لینے کے لئے جمع ہوئے۔ سامنے کھیتوں میں فصلیں ہوا میں جھوم رہی تھیں، گنگنا رہی تھیں صرف کہار اور ڈوم چمار دور سے ہی تماشہ دیکھ رہے تھے اور ان کے ننگے بچوں کی آنکھیں حیرانی سے پھٹی جارہی تھیں زندگی میں پہلی بار محمد قلی نے اپنی دشمنی پر سے وضعداری کا پردہ سرکا دیا اور شریک نہ ہوا

اس ہفتے، جب کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی، اور کھیتوں سے سنہری فصلیں کٹ کٹ کر اٹھ رہی تھیں، رسول اکرم کے موئے مبارک کی زیارت کی رات آئی۔

گاؤں کی ساری عورتوں کے ساتھ نہا دھو کر، عطر میں رسی بسی، مولوی سید فرقت علی کی چاروں بیویاں بھی، موئے مبارک کی زیارت کو حویلی کے صحن میں شامیانے تلے جمع ہوئیں۔

مولوی سید فرقت علی اپنے چبوترے پر بیٹھا تھا۔ اس کے ارگرد بھر مولویوں کا جمگھٹ تھا۔ مولوی تاڑی پی کر کافی سنک گیا تھا۔

"یارو تم لوگ بھی آدمی کے سائے سے کم نہیں ہو۔ رات آئی تو سب نے ساتھ چھوڑ دیا۔ اب جو سورج نکلا ہے تو سب ساتھ ہو۔ خوب" اس نے پیالہ غٹغٹا کر ادھر ادھر دیکھا۔ سب کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ "سید صاحب، سید صاحب" اس سے زیادہ اور کوئی کہتا بھی کیا۔

"محمد قلی نے میری عزت پر حملہ کیا ہے۔ میری لڑکیوں کے سہرے چھین لئے ہیں۔ اس نے۔ خدا کی قسم ــــــ" وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ "میں بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں"

"مگر وہ تو کہتا ہے آپ کو ملیامیٹ کر کے ہی دم لے گا"

"دیکھوں گا ــــ وہ اپنے باپ کا قاتل ہے۔ اور میں جانتا ہوں اس نے ڈاکٹر کا منہ کتنے روپے سے بند کیا ہے۔ پولیس والے تو اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن میں بھی دیکھو نگا ــــ"

دو تین دن بعد یہ بات عام طور پہ مشہور ہو گئی کہ گاؤں میں جنات کا حملہ ہوا ہے۔ لوگوں نے خواب میں قتل و خون کی بہت سی وارداتیں دیکھیں۔ عورتیں سہم کر رہ گئیں۔ ان دنوں ڈاکے بھی بہت پڑ رہے تھے لوگ اپنے اپنے کھلیانوں میں پہرہ دے رہے تھے۔ سب ڈرتے تھے مگر مولوی سید فرقت علی نڈر گھومتا تھا۔ ایک رات جب غضب کے اولے پڑ رہے تھے۔ الاؤ بھی بجھ بجھ جاتا تھا اور کہاروں اور گوالوں کے گیت ان کے حلق میں ہی جم گئے تھے مولوی سید فرقت علی کھلیان کی طرف گیا تو پھر نہ لوٹا۔ اس کے غلے تہس نہس ہو گئے تھے اولوں اور بارش سے بچانے کے لئے پونچوں پر جو ٹاٹ بچھائے گئے تھے وہ ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ جب دو تین دن انتظار کے بعد مولوی سید فرقت علی نہیں لوٹا تو یہ بات تھانے میں درج کرا دی گئی اور گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ جن سے ٹکر لینے کا انجام یہی ہوتا ہے۔

بیس پچیس دن بعد، مولوی سید فرقت علی کی چاروں بیویوں کو ڈولیوں میں بٹھا کر پولیس والے لے گئے۔ ان کے سامنے ایک گلی ہوئی لاش رکھی تھی جس کا سر غائب تھا، اور اس سے بڑی سڑاند نکل رہی تھی۔

تینوں بیویاں پہچاننے میں ناکام رہی تھیں اور ان کی سسکیاں بند ہی ہوئی تھیں بیلمی کی آنکھیں لاش کے داہنے شانے پر جم کر رہ گئی تھیں۔ وہاں اس کے دانت کاٹے کا نشان اسی طرح موجود تھا۔ اس کی آنکھیں پیاسے کھیت کی طرح خاموش اور خشک تھیں۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ جب اس سے دوبارہ پوچھا گیا "کیا آپ پہچان سکتی ہیں اس لاش کو؟" تو اس نے صاف اور تیز آواز میں سانس روکتے ہوئے کہا "جی نہیں!"

رات گئے، جب چوکیدار اپنی للکار سے گاؤں کی خاموشی کو چونکا رہا تھا اور آسمان دھلا ہوا چمک رہا تھا، محمد قلی اپنی حویلی میں آیا اور بہت دن بعد اپنی بیگم کے کمرے میں جا کر سیدھا لحاف میں گھس گیا جیسے تلوار نیام میں چھپ گئی ہو۔

"میری جان آج غضب کی سردی ہے ــــــ ہو ہو ہو"

عزیز اثری

چوکھٹ

میرا یار بہت مزے کا انسان ہے۔ بڑی ہی دلچسپ عادتیں ہیں اس کی۔ سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ جب وہ جوش، غصے یا خوشی کے عالم میں ہو تو انگریزی جھاڑنے لگتا ہے۔ اس وقت بھی میں جب کمرے میں داخل ہوا تو اس نے قہقہہ لگا کر انگریزی میں میرا خیر مقدم کیا۔ میں نے کہا "آج تو بڑے خوش نظر آتے ہو کیا بات ہے؟"

جواب میں اُس نے چارپائی کے نیچے سے رم کی بوتل نکال کر تپائی پر پٹک دی، اور بولا — "یس یس آج میں بہت خوش ہوں۔ آج تمہیں اپنی فیرویل کی رم پلاتا ہوں۔"

اُس نے تپائی پر پڑا ہوا دوستوسکی کا موٹا سا ناول اُٹھا کر چارپائی پر پھینک دیا، اور بولا — "یہ حرام زادی زندگی کہیں چین سے نہیں ٹکنے دیتی۔ اب مجھے یہاں سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ بیں، اور کہیں جا کر کلرکی نہیں کر سکوں گا۔"

میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی خوشی میں کچھ رخنہ پڑنے لگا ہے۔ آج اُس نے خلافِ معمول سر پر فیلٹ بھی ٹکایا ہوا تھا۔ اُس کا چہرہ بجلی کی روشنی میں مجھے کچھ عجیب، غیر مانوس اور ویران سا لگا —

"خیر چھوڑو" — وہ بولا — "کل میں جا رہا ہوں۔ آؤ میری فیرویل کی رم پیو۔"

"میں رم نہیں پیوں گا" — میں نے کہا۔

"نہیں پیوگے۔ اچھا مت پیو۔ تمہاری منتیں کون کرتا ہے؟" یہ کہتے ہوئے اُس نے فیلٹ اُتار کر چارپائی پر پھینک دیا۔ اور اس کا بے ڈول سا صاف سپاٹ سر جس پر اُسترا پھرا ہوا تھا، روشنی میں چمکنے لگا۔

"ارے یہ کیا؟" — میں نے حیرت سے کہا۔

"میں نے سر پر اُسترا چلوایا ہے اور کیا؟" — اس نے قہقہہ لگایا، پھر بولا — "زندگی بڑی ڈل ہوگئی ہے سالی۔ کسی تغیر، کسی چینج کی

اشد ضرورت ہے۔ کوئی تبدیلی کوئی نئی بات تو ہو۔ میں نے اسی لئے سر منڈا دیا ہے —— اور لڑکے ! " — اُس نے ملازم کو آواز دی "برف لیکر جلدی آؤ" ——

بوتل کا کارک ہٹا کر اس نے چند قطرے ہتھیلی پر ڈالے اور اپنے بے ڈول سر پر ملنے لگا — "آج میرا ذہن تروتازہ ہو جائے گا۔ یہ آبِ حیات مل رہا ہوں آبِ حیات !" — اُس نے زمین پر پڑے ہوئے کارک کو لپک کر اٹھا لیا۔ اسے زبان کے ساتھ لگا کر چوسا، پھر پھینک دیا۔ لڑکا گلاس میں برف لے کر آ گیا، اور تپائی پر رکھ کر واپس جانے لگا، تو وہ بولا ——

"تم کہاں چلتے ہو۔ اِدھر میرے ساتھ بیٹھو۔ پیو، نہیں پیتے ہو؟ اچھا کرتے ہو۔ خاک اچھا کرتے ہو کبھی کبھی یہ امرت چکھا کرو سالے نہیں تو مر جاؤ گے۔ خیر ویسے ہی بیٹھو، چارپائی پر نہیں، اِدھر میرے قریب کرسی پر —— میرے ہاں برخوردار کوئی فرق نہیں۔ میں چھوت چھات کا قائل نہیں ہوں"

گلاس میں رم اُنڈیلنے کے بعد اُس نے مجھے گھورا، پھر گویا مطمئن ہو کر گلاس اٹھایا۔ دو تین لمبے گھونٹ پئے۔ گلاس رکھ کر بولا — "میں کل تمہارے اس مکان سے جا رہا ہوں لیکن تمہیں کیا؟ میں وہاں جا کر کلرکی نہیں کر سکوں گا۔ میں کلرکی سے بہت تنگ آ گیا ہوں۔ اس نے میری زندگی کا رس نچوڑ لیا ہے۔ میں ایک مشین بن چکا ہوں۔ مجھے چار ماہ سے تنخواہ نہیں ملی۔ یہاں تو تمہاری وجہ سے کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو جاتا تھا لیکن میں کسی اور جگہ —— برف اور لے آؤ !" — اُس نے میرے ملازم سے کہا۔

"جی اور برف تو نہیں ہے یہ بھی مشکل سے ......"

"برف نہیں ہے کے بچے اِس آگ میں تمہارا سر ڈال کر پیوں گا !"

"آپ ہی نے تو کہا تھا —" لڑکا ڈرتے ڈرتے بولا۔

"تمہیں عقل نہیں ہے کیا حرام زادے بکواس کرتے ہو۔ اٹھو یہاں سے سؤر کے بچے۔ تم لوگوں سے ذرا ہنس کر بات کرو تو کرسی پر چڑھ بیٹھتے ہو......" اُس نے غصے کی شدت کو دبانے کے لئے گلاس منہ سے لگا کر خالی کر دیا۔

پاور ہاؤس کے اس دفتر میں ہم دو ہی کلرک تھے۔ میں گزشتہ دو سال سے یہاں ملازم تھا، اس لئے مستقل ہو چکا تھا لیکن یاور ابھی تک عارضی تھا۔ پاور ہاؤس کے ایس۔ ڈی۔ او سے میرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور میں نے یاور کو اس کے گھر اسلام پور سے بُلا کر یہاں کلرکی دلوا دی تھی۔ وہ چار ماہ سے یہاں کام کر رہا تھا لیکن یہ ریاست کے دفاتر تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ ریاستوں کا باوا آدم ہی نرالا ہوتا ہے چنانچہ یاور کو اب تک ایک ماہ کی تنخواہ بھی نہیں ملی تھی۔ میرے ساتھ رہنے کی وجہ سے اسے کھانے پینے کے لئے تردد نہ کرنا پڑتا تھا لیکن دوسری ضرورتوں خاص طور پر رم پینے کے لئے وہ ایس ڈی او سے بے تکلف قرضہ وصول کر لیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی وہ قرض کی مے پی کر اپنے تبدیلی ہونے کا جشن منا رہا تھا۔

اب اُسے ہلکا ہلکا نشہ ہونے لگا۔ نشے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے تیز لہجے میں انگریزی میں جملے کسنے لگا — "برف تو بہت تھوڑی رہ گئی ہے۔ لڑکا بے چارہ بھی کیا کرے۔ میں نے خود ہی اُسے اتنی برف لانے کو کہا تھا — میں نے اسے ناحق گالیاں دیں — لڑکے !" — وہ زور سے لڑکھڑاتے لہجے میں چلایا ——

"لڑکے — اِدھر آؤ برخوردار — اِدھر آ کر بیٹھو !"

اگلے دن وہ جہان آباد چلا گیا لیکن زیادہ عرصہ وہاں نہ رہ سکا۔ ایک روز میں دفتر سے لوٹا تو اسے اپنے کمرے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ مع اپنے ٹرنک بستر کے ابھی ابھی آیا تھا۔ ملازم لڑکا اس کا سامان اندر رکھ رہا تھا۔ یاور اس وقت کانوں تک لٹکتا ہوا وہی فیلٹ پہنا ہوا

تھا۔ اس کے کندھے پر ایک بڑا سا تھیلا پڑا تھا۔ اُس نے فوراً ہی رم کا ادھا اس میں سے نکالا۔ اسے کھول کر کھڑے کھڑے پینے لگا۔
میں نے پوچھا ــ "کیوں خیر تو ہے' یہ سازو سامان سمیت کب آدھمکے؟"
"ٹھہرو۔ ٹھہرو" ــ وہ بولا، اور پھر بوتل منہ سے لگالی۔ بوتل نیچے رکھ کر آستین سے منہ پونچھتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا ــ "میں نے ذلت کا طوق گلے سے اُتار پھینکا ہے۔ چار ماہ تک یہاں تنخواہ نہیں ملی تھی ایک ماہ وہاں اور گول کرگئے۔ میں نے بھی سرکاری روپے میں سے جو ہاتھ لگا پی گیا۔ یہ سالے نہ جانے کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو۔"
"تو کیا نوکری چھوڑ آئے ہو؟"
"وہاں کا ایگزیکٹو انجینئر مجھے بلا کر ڈرانے دھمکانے لگا۔ میں نے دفتر کے سارے کاغذات سالے کے منہ پر دے مارے۔ میں نے اپنی عزت تو نہیں بیچی ہے! یہ سرکاری نمک خوار ......"
"یہ تم نے بہت بُرا کیا۔ تمہیں نوکری نہیں چھوڑنی چاہئے تھی۔"
جواب میں اُس نے فیلٹ اُتار کر چارپائی پر پھینک دیا، اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ــ "کیا خیال ہے؟ میرے سر پر بال کچھ بڑھ آئے ہیں؟ بڑا مزہ آتا ہے کبھی کبھی میں جان بوجھ کر فیلٹ کے بغیر باہر نکل جاتا ہوں۔ گلیوں میں بچے مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور "روڈا بابو" "روڈا بابو" کہتے ہیں۔ آخر یہ کوئی چینج (Change) تو ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"
میں نے کہا ــ "روڈے بابو تم چینج کی دھن میں اپنی زندگی کی مٹی پلید کر رہے ہو۔ تمہیں ملازمت نہیں چھوڑنی چاہئے تھی۔"
"ملازمت نہیں چھوڑنی چاہئے تھی؟" ــ وہ کڑکا ــ "میں کہتا ہوں آج دنیا میں خوددار لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کلرکی نے میرا گلا گھونٹ دیا ہے۔ مجھے منجمد کردیا ہے۔ میں قلی بنوں گا۔ مزدوری کروں گا لیکن کلرکی کبھی نہیں کروں گا۔" اُس نے جلدی سے بوتل سنبھالی ــ انگریزی جھاڑی اور رم پینے لگا۔
پی کر ترنگ میں آگیا تو بولا ــ "آج یہاں کھانا نہیں کھائیں گے۔ چلو آج تمہاری دعوت کرتا ہوں۔" اُس نے میرے ملازم کو کھانا پکانے سے منع کردیا، اور مجھے لے کر بازار میں آگیا۔
ہم دونوں نے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اُس نے پُرتکلف چائے بھی پلوائی۔ بل کے پانچ روپے میں سے ساڑھے بارہ آنے بچ گئے تھے جو اُس نے بیرے کو بخش دیئے۔ پھر دوکانوں سے سوبھرانی سگریٹ ڈھونڈنے لگا۔ اُس نے مجھے یہ قیمتی سگریٹ پیش کیا۔ مزے سے کش لیتے ہوئے بولا ــ
"واہ بس نشہ آگیا ہے۔ زندگی بھی کتنی انوکھی کتنی پیاری شے ہے۔ تم نے دوستوسکی کا ناول برادر زکرامازوف پڑھا ہے؟ اس میں دمتری کا کیریکٹر ہے کتنا گریٹ کتنا ونڈرفل ......"
میں نے کہا ــ "تم بھی اسی کردار کی نقل ہو۔"
"نقل ہو؟ کیا مطلب؟ وٹ ڈو یو مین؟"
"مطلب یہ کہ اس کو بگاڑنے میں اس کے باپ کا بڑا حصہ تھا......"
"اور میں بھی تو بگڑا ہوا ہوں" ــ وہ جلدی سے الفاظ کترنے لگا ــ "میرا باپ' یہ ماحول ہے۔ یہ غلیظ اور جامد ماحول۔ مجھے یقین ہے کہ بڑا خوفناک زلزلہ آئے گا۔ جوان سب شہروں کو اُجاڑ دے گا۔ پھر نئی بستی بسے گی۔ نیا انسان ــ یس یس نیا انسان پیدا ہوگا"
وہ تین چار روز تک میرے ساتھ رہا۔ لیکن اب یہاں اس کا گذارہ ہونا مشکل تھا۔ کیونکہ میں اسے ہر روز رم نہیں پلا سکتا تھا ــ

ایک سو تیس روپے ماہانہ میں میرا اپنا گزارہ مشکل سے ہوتا تھا۔ پھر میں اس کے کھانے اور سگریٹوں کے علاوہ رم کے لئے خرچ کہاں سے لاتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ سے کھنچا کھنچا اور بیزار سا رہنے لگا۔

ایک دن کہنے لگا کہ وہ یہاں سے جا رہا ہے۔

"کہاں جاؤ گے؟" — میں نے پوچھا۔

"کہاں جاؤں گا؟ یہ پتہ نہیں۔ بس یہاں سے چلا جاؤں گا کسی اور شہر میں جا کر قلی بنوں گا۔ مزدوری کروں گا۔ میں اپنی زندگی کو تغیر کا انجکشن دینا چاہتا ہوں۔ میں اب نئی زندگی — حقیقی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔"

"زندگی جمناسٹک کرنے کو نہیں کہتے دوست! تم سوچو تو سہی کہاں جاؤ گے۔ کیا کرو گے؟"

وہ تین لمحے خاموش رہا، پھر بولا —

"میرے دل پر اتنے زخم ہیں کہ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ آج سے تین سال پہلے میں یہیں ریاست کے دیہات — میں ہیڈ ماسٹر تھا۔ میں نے بچوں میں سب تفریق ختم کر دی۔ انہیں ایک سا لباس پہنایا۔ ان کی اسمبلی بنائی۔ ان کے ساتھ دوستوں کی طرح کھیلنے، کھانے پینے اور اُٹھنے بیٹھنے لگا۔ جانتے ہو نتیجہ کیا ہوا؟ لوگوں نے میرے خلاف شکایتیں کیں کہ یہ ہیڈ ماسٹر کھڑا ہو کر پیشاب کرتا ہے۔ یہ بچوں میں لادینی پھیلا رہا ہے۔ وغیرہ۔ کتنی عجیب، کتنی تھرڈ کلاس دنیا ہے یہ۔"

صبح میں سو کر اٹھا، تو اسے سامان سمیت غائب پایا۔ میں نے لڑکے سے پوچھا تو پتہ چلا کہ یاور نے شام ہی کو لڑکے سے پانچ روپے لے لئے تھے۔ اس نے صبح لڑکے کو صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ چھ بجے کی گاڑی سے جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا۔ مجھے اُس کے اِس طرح بھاگ جانے پر بے حد افسوس ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد پتہ چلا کہ وہ واقعی "نئی" زندگی گزار رہا ہے۔ اُس کے ایک دوست نے جو اُس سے مل کر آیا تھا بتایا کہ — یاور اسلام پور میں ایک فیکٹری میں ایک روپیہ چار آنے روزانہ اُجرت پر مزدوری کر رہا ہے۔ اس کے دوست نے بتایا۔ — "یاور نے کارخانے کے انگریز افسروں کے ساتھ انگریزی میں گفتگو کی، تو انہوں نے معقول تنخواہ پر اسے کلرکی دینے کی پیش کش کی۔ لیکن اس نے کلرکی کرنے سے سختی سے انکار کر دیا۔ اور اب وہ مزدوری کر رہا ہے۔ صبح کو جب انگریزی اخبار بغل میں دبائے وہ فیکٹری میں جا کر حاضری دیتا اور اس کے بعد اڑتی ہوئی دھول میں پیٹھ پر بوریاں لاد کر لے جاتا ہے تو لوگ اسے ولایتی پاگل کہتے ہیں۔"

میں دفتر سے دو روز کی چھٹی لے کر اسلام پور پہنچا۔ شام کے وقت یاور مجھے بازار میں مل گیا۔ وہ مجھے ساتھ لے کر شہر کے گندے نالے پر واقع ایک ٹوٹے پھوٹے مختصر مکان میں آ گیا۔ اس نے مٹی کا دیا روشن کیا۔ مجھے ایک چارپائی پر آرام کرنے کا مشورہ دے کر خود دوسری چارپائی پر گر گیا۔ میں نے اس پراسرار سی روشنی میں کمرے کی غلاظت اور جناتی حُلیے کا جائزہ لیا۔ پھر اسے غور سے دیکھا۔ وہ بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کا چہرہ کافی دبلا اور زرد تھا۔ وہاں اکثر کھیلنے والی مسکراہٹ کہیں نہ تھی۔ اُس کی آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ اب اس نے مونچھیں بھی رکھ لی تھیں اور سر پہ کچھ بال بھی موجود تھے جن میں شاید کارخانے کی گرد پڑی تھی۔ میں اس کی موجودہ حالت کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسے بہت تھکا تھکا بیزار سا دیکھ کر چپ ہو رہا۔

صبح صبح میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ چولہے کے پاس بیٹھا کچھ پکا رہا ہے۔ اس کی چارپائی پر اب تازہ کھلے ہوئے پھولوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ میں نے کہا۔ "یہ صبح ہی صبح پھول کہاں سے اُڑا لائے ہو؟"

"اِن کا گلدستہ بناؤں گا۔ میں ہر صبح ان کا گلدستہ بنا کر اپنی محبوبہ کو پیش کرتا ہوں۔"

"محبوبہ کو؟" ـــــ میں اُس کے اِس انکشاف پر حیران رہ گیا۔

"گھبراؤ نہیں" ـــــ وہ بولا ـــــ "میری محبوبہ خوابوں کے جزیرے میں بسنے والی جل پری نہیں، ایک مہترانی ہے، وہ اس وقت اسکول میں جھاڑو لگاتی ہے"۔

میں ہنسنے لگا ـــــ وہ چولہے کے پاس سے اٹھ کر میرے پاس یوں آ کھڑا ہوا کہ میں نے ہنسی روک لی۔

اُس نے یقیناً میری ہنسی کا برا مانا تھا۔ میں نے بات بدلنے کے لئے کہا ـــــ "یہاں تمہارا گھر ہے۔ پھر تم اپنے والدین کے پاس کیوں نہیں رہتے؟"

"عجیب اوٹ پٹانگ سوال کرتے ہو" ـــــ وہ کڑکا اور چولہے کی طرف واپس جاتے ہوئے بولا ـــــ "میں اپنے باپ کے پاس رہ کر آزادی سے محنت مزدوری نہیں کر سکتا اور نہ ہی ......"

"اور نہ ہی مہترانی سے عشق لڑا سکتے ہو۔ ہیں؟" لیکن وہ خاموشی سے چولہے پر رکھی ہوئی دال میں تیل ڈال کر بھوننے لگا۔ پھر اُس نے تین چار کچی پکی روٹیاں گھڑ کر کھائیں اور گلدستہ بنا کر چل دیا ـــــ

"تم بازار سے ناشتہ کر آنا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، اور میری پکائی ہوئی دال روٹی تمہارے گلے میں اٹک جائے گی"۔

شام کو وہ تھکن سے چور کارخانے سے واپس آیا۔ صبح کی بچی ہوئی دال روٹی کھائی اور چارپائی پر گر گیا۔ میں نے کہا ـــــ "یاور کیا تم اپنی اس حالت میں مطمئن اور خوش ہو؟"

وہ چپ رہا۔ پھر اچانک چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا ـــــ "تمہیں کونسی فکر چاٹ رہی ہے۔ میں اپنی اس زندگی سے واقعی خوش اور مطمئن ہوں کیونکہ میں نے خوب سوچ سمجھ کر یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ میں نے زندگی کو بڑی کامیابی سے تیزر کا انجکشن دے لیا ہے۔ اب میں خوش ہوں"۔

"لیکن مجھے تمہاری بات کی سچائی پر شبہ ہے" ـــــ میں بولا۔

"کیوں؟" ـــــ وہ کڑکا۔

"کیوں کہ تم نے یہ بات انگریزی میں نہیں کہی"۔

وہ اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اب وہ زور زور سے انگریزی جھاڑے گا۔ لیکن خلاف توقع اُس نے زور سے قہقہہ لگایا۔

اگلے دن میں اسلام پور سے واپس آ گیا ـــــ کچھ عرصہ اور گزر گیا۔ اس دوران میں مَیں نے اُسے کئی خط لکھے۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر ایک دن اس کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ اس سے فیکٹری کی ملازمت چھن گئی ہے۔ کیوں کہ ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد کہا ہے کہ اسے تپِ دق ہو گئی ہے۔ اور اب وہ اپنے والدین کے گھر رہنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی مہلک بیماری کا پڑھ کر بہت صدمہ ہوا۔ انسان اپنی زندگی میں خود ہی بڑے بڑے سوراخ کر لیتا ہے۔

ایک روز میں دفتر سے گھر کی طرف آ رہا تھا کہ وہ اچانک مل گیا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوا۔ اس کے چہرے پر خون کی ایک رمق باقی نہ تھی۔ اُس کی آنکھیں اس قدر اندر دھنس کر ٹیوں خالی سی لگتی تھیں جیسے وہ آنکھوں کی بجائے بٹن بن گئی ہوں۔ اس کا منہ ذرا سا نکل آیا تھا۔ اور سارا جسم ویران اور لٹا پٹا نظر آتا تھا۔ ان دنوں میں اس نے پھر مونچھیں منڈا دی تھیں۔ میں نے کہا ـــــ "تم نے واقعی اپنی زندگی کو تیزر کا انجکشن دے لیا ہے اب تو تم پہچانے بھی نہیں جاتے"۔

مجھ سے ملتے ہوئے جو اُجڑی سی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر آئی تھی وہ غائب ہو گئی۔ اُس نے نظریں پھیر لیں ـــــ "تمہیں اس طرح دیکھ کر مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے یاور! کاش تم زندگی کی سڑک پر اس طرح سے اندھا دھند نہ بھاگتے"۔

"کیا مطلب وٹ ڈو یو مین ؟ " ـــــ اور اس نے غیر ارادی طور پر ناک کے نیچے جہاں پہلے اُس کی مونچھیں تھیں، ہاتھ پھیرا، پھر نیچے لٹکالیا، اور بولا ـــ "تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میری یہ حالت فیکٹری کی مزدوری سے نہیں ہوئی بلکہ بہت عرصہ پہلے سالی کلرکی ہی نے اس روگ کو جنم دیا تھا۔ اس حرام زادی منشی گیری نے مجھے بے جان، کھوکھلا کر دیا تھا ...."

وہ کھانسنے لگا۔ کھانسی کے باعث اس کے چہرے پر کچھ سرخی سی آئی جو فوراً تحلیل ہوگئی ـــ

میں نے کہا ـــ "تمہاری صحت آج کل کیسی ہے ؟ "

"میری صحت بس ٹھیک ٹھاک ہے۔ ڈاکٹروں کو تو سوائے ٹی۔ بی کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا !"

یاور اسی دن واپس چلا گیا۔ اور چند روز کے بعد میں جہاں آباد ایک کام سے گیا، تو اتفاق سے وہاں بھی وہ مل گیا۔

میں نے پوچھا "تم یہاں جہاں آباد میں کیسے آگئے ؟ "

"میں تین روز سے یہاں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں نے بے حد کوشش کی ہے کہ محکمۂ تعلیم میں مجھے کام مل جائے !"

"کیا پھر کہیں اُستادی کرنے کا ارادہ ہے ؟ "

"لیکن کام نہیں بنا " ـــ وہ میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے تیز لہجے میں بولا ـــ "میرے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کا ریکارڈ سالا ہر جگہ موجود ہے ـــ میں اب واپس جا رہا ہوں لیکن ـــ کہاں جاؤں گا ؟ ـــ میرا باپ مجھ سے لڑ پڑا ہے۔ سالا مجھے میری محبوبہ سے ملنے سے منع کرتا تھا ـــ کہتا ہے مہترانی سے عشق نہ کرو ـــ میں نے کہا تم نے مجھے کونسی حل پری لادی ہے عشق کرنے کے لئے ! ـــ میں اب اپنے باپ کے گھر میں نہیں رہ سکتا !"

میں نے کہا ـــ "سناؤ کچھ علاج ولاج بھی کر رہے ہو ؟ "

"علاج ؟ " ـــ وہ اُجڑی کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ بولا ـــ "میرا باپ ایک معمولی کلرک ہے۔ دو چھوٹے بھائی اسکول میں پڑھتے ہیں۔ ایک بہن بیوہ ہو کر باپ کے سر بیٹھی ہے۔ میری ماں سخت بیمار رہتی ہے اور پھر باپ سے میری لڑائی ہے۔ ڈاکٹر دودھ، گھی، مکھن، انڈے، گوشت کھانے کو کہتے ہیں مکمل آرام اور بے فکری کی ہدایت کرتے ہیں۔ بتاؤ یہ سب کیسے ممکن ہو سکتا ہے ؟ "

"تم کسی سینی ٹوریم میں کیوں نہیں داخل ہو جاتے ؟ " ـــ

اس نے مجھے گھورا۔ ناک کے نیچے خالی جگہ پر ہاتھ لے گیا، اور بولا ـــ "تم ہمیشہ اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہو" ـــ وہ زور سے کھانسنے لگا، کھانسی روکنے کے بعد بولا ـــ "میرا باپ کلرک ہے۔۔ وہ نہ دولت مند ہے نہ لیڈر، اور نہ شہر کا مانا ہوا غنڈہ کہ اس کے اثر و رسوخ سے میں داخل ہو سکوں۔ آج سے ڈیڑھ سال پہلے میرے بڑے بھائی نے سینی ٹوریم میں اپنے داخلے کی درخواست بھیجی تھی۔ اس کی موت کے چھ مہینے بعد جواب آیا کہ اس کا نام ویٹنگ لسٹ میں لکھ لیا گیا ہے !"

"تمہارا بھائی بھی تپ دق کا شکار ......"

وہ جلدی سے میری بات کاٹ کر الفاظ کترنے لگا ـــ "اب تو میرے یار دوست بھی مجھ سے کترانے لگے ہیں۔ میں باپ کے گھر نہیں رہ سکتا۔ نہ کوئی کام ہی ملتا ہے۔ میں کیا کروں ؟ ـــ کیا کروں ؟؟ ـــ وٹ شڈ آئی ڈو ؟ سالی زندگی نے مجھے مار ڈالا ہے " ـــ اس کے زرد تنگ ماتھے پر کئی لکیریں اُبھر آئیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

میں نے اسے تسلی دینے کے لئے کہا ـــ "نہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ یہ دُنیا یقیناً بدلے گی۔ یہ ماحول ہمیشہ نہیں رہے گا۔ اس کا جمود ٹوٹے گا تمہیں حوصلہ نہیں ہارنا چاہئے !"

"حوصلہ —— ؟" وہ آنسو پونچھتے ہوئے کچھ کہنے لگا۔ لیکن پھر کھانسی کا دورہ پڑا ——

میں اُسے اپنے ساتھ لے آیا ——

جہاں آباد سے لوٹتے ہی میں اپنے ایس ڈی او سے ملا۔ اُن پر زور دیا کہ اپنے اثر سے کام لے کر کسی نہ کسی طرح یاور کو کسی دفتر میں ملازم کرا دیں۔ ان دنوں جہاں آباد میں ایک نئے بنک میں کلرکوں کی ضرورت تھی۔ ہمارے ایس ڈی او نے جنرل مینجر سے مل کر یاور کے لئے کہا۔ اور اسے انٹرویو میں بلانے کا وعدہ کر لیا گیا۔

ان دنوں یاور کی طبیعت بے حد چڑچڑی ہوگئی تھی، وہ ذرا ذرا سی بات پر مجھ سے خفا ہو جاتا۔ دن بھر بات نہ کرتا۔ میرے ملازم کا تو اُن دنوں ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میں نے یاور سے بنک کے انٹرویو کے بارے میں کہا، تو اس نے سخت بُرا مانا۔ وہ کلرکی کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ انہی دنوں میرے گھر سے خط آیا کہ میری ماں اور بہنیں میرے پاس رہنے کے لئے آ رہی ہیں۔ اب میں یاور کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اسے بھی اس بات کا پتہ چل گیا۔

میرے ایس، ڈی، او نے اُسے کئی بار سمجھایا۔ اُسے بتایا کہ ملازم ہو جانے سے وہ اپنے باپ یا دوستوں کا محتاج نہیں رہے گا۔ وہ آزادی سے اپنی محبوبہ سے بھی تعلقات رکھ سکے گا۔ اس صورت میں اپنا علاج بھی کرا سکے گا۔ دوسرے کا محتاج ہونے اور بے کار رہنے سے اُس کا احساس زخمی ہوتا رہتا ہے۔ ملازمت کی صورت میں ایسا نہیں ہوگا۔

ان سب باتوں کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ آخر مان گیا۔ اُس نے خود کو ذہنی طور پر اس ملازمت کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔ وہ اپنی تنخواہ کا حساب جوڑتا۔ ایک اچھا سا مکان لینے کا ذکر کرتا۔ پھر کہتا "میں ملازم ہو کر اپنا علاج کراؤں گا۔ پھر اپنی محبوبہ سے بیاہ رچاؤں گا۔ چلو محبت کی خاطر یہ قربانی ہی سہی"۔

جس روز انٹرویو تھا میں اسے ساتھ لے کر جہاں آباد آ گیا ——

جب ہم تانگے میں بیٹھ کر انٹرویو کے لئے جا رہے تھے، تو اُس نے تمام راستہ مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ اُس کے زرد ماتھے کی شکنوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سخت ذہنی کش مکش میں مبتلا ہے۔ دفتر کے سامنے تانگہ رُکا۔ وہ تانگے سے اُتر کر بولا ——

"یہ سالی کلرکی مجھے قبر تک نہیں چھوڑے گی ——"

میں نے اُسے پھر سمجھایا۔ وہ انٹرویو دینے کے لئے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر کے بعد باہر نکلا، تو میں نے پوچھا ——

"سناؤ کام بن گیا؟" ——

اس کے ماتھے کے ساتھ ساتھ سارے چہرے پر شکنیں پڑ گئی تھیں جیسے وہ ان پندرہ بیس منٹوں میں بوڑھا ہو کر باہر نکل آیا ہے۔ میرے پاس آکر یوں کھڑا ہو گیا جیسے اپنا سانس درست کر رہا ہو۔ پھر بولا ——

"وہ مجھ سے کئی سوال پوچھتے رہے۔ میں نے ہر اوٹ پٹانگ سوال کا ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ پھر ایک نے کہا —" تم کچھ بیمار نظر آتے ہو" میں نے جواب دیا —" نہیں میں تو بالکل ٹھیک ہوں" — لیکن مجھے یوں لگا جیسے مجھے بڑا تیز بخار ہو گیا ہے۔ میرے لئے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا۔ میں دیوار سے لگ گیا۔ اور سالی کھانسی نے کام خراب کر دیا۔ انہوں نے کہا —— تمہیں پہلے علاج کرانا چاہئے۔ بہت بیمار دکھائی دیتے ہو تم آرام کرو۔ اور میں آرام کرنے کے لئے باہر آ گیا۔ بتاؤ میں اب کیا کروں — کیا کروں — کہاں جاؤں؟"

وہ رُک گیا۔ پھر یک لخت میرے اور قریب آ گیا۔ مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر بولا ——

"تم کہتے ہو یہ زندگی بدلے گی۔ یہ ماحول بدلے گا۔ لیکن — کب بدلے گا؟ — یہ تپ دق کی ماری ہوئی زندگی کب بدلے گی —؟

(باقی صفحہ ... پر ملاحظہ فرمائیں)

جیلانی بانو

دادا جان

"معلوم ہوتا ہے اس بار خوب سردی پڑے گی" وظیفوں کی کتاب بند کرکے چاروں طرف دُعا پھونکنے کے بعد دادا جان نے کہا
"اور کیا۔ جب نومبر دسمبر میں یہ حال ہے تو جنوری فروری کا اللہ مالک ہے"۔ ان کی بہو نے شوہر کی قمیض پر رفو کرتے میں جواب دیا۔
"اونہہ۔ اب جنوری فروری میں بھی کونسی قیامت ٹوٹتی ہے۔ تم لوگ بچارے کیا جانو دلّی کی سردیاں۔ ایسی سردی پڑتی تھی جناب کہ آدمی برف کی طرح جم جاتے تھے"۔ دادا جان نے جھنجلا کر کہا۔
"ہاں اب تو موسموں میں کافی فرق پڑگیا ہے —" ان کا بیٹا مضمون لکھنے میں بے پروائی سے بولا۔
"موسموں میں فرق نہیں ہوگیا ہے لوگوں کے دماغوں میں فتور آگیا ہے"۔ دادا جان کو غصہ آگیا۔
"اور خدا کی ناشکری کرو۔ دیکھو کیسے کیسے قہر ٹوٹیں گے"۔
بہو نے مسکرا کے اپنے میاں کو دیکھا اور میاں بھی مسکرانے کے علاوہ کیا کرسکتے تھے۔
بوڑھے ہونے کے بعد انسان میں صرف ایک بُرائی ہوجاتی ہے کہ وہ بکواسی ہوجاتا ہے۔ ان کے بیٹے نے اپنی نئی کہانی کا پلاٹ مرتب کرتے میں سوچا کہ کلاسیکی ادب قطعی اس احترام کا مستحق نہیں ہے جو کیا جاتا ہے۔
دادا جان ابھی کچھ اور کہنا چاہتے تھے مگر بہو کی طنزیہ ہنسی دیکھکر پیچ و تاب کھا کے رہ گئے۔
"کیوں بے تو آج اسکول نہیں گیا —؟" اپنے بڑے پوتے کی جانب مڑکر وہ سلسلۂ کلام بڑھانے کو تیار ہو بیٹھے۔ لیکن وہ جواب دینے سے بجائے بیچ آنگن میں کھڑا آسمان پر پتنگوں کے محاذ کا جائزہ لیتا رہا۔ ان کے پوتوں پوتیوں کو یوں تو دادا جان سے بات کرنے سے سخت نفرت تھی اور وہ جانتے تھے کہ اگر دادا جان کو جواب دے دیا تو پھر کسے کم دو گھنٹے تک جان چھڑانا ناممکن ہوگا۔
"آج قیصر اسکول کیوں نہیں گیا —؟" وہ بہو سے مخاطب ہوئے۔
"جشن آزادی کا جو جلسہ ہورہا ہے اس کے لئے ایک روپیہ چندہ مانگا ہے ورنہ کلاس ٹیچر حاضری نہیں لے گا"۔

" واہ یہ دوسروں کے کاندھے پر رکھ کر بندوق چلانے کا فیشن بھی خوب نکلا ہے - اچھی گھریلو قسم کی حکومت بنائی ہے - اس سے تو انگریزی بھلا تھا کہ ہر روز صبح آدھ پاؤ چنے اسکول میں ملا کرتے تھے - اور ملکہ وکٹوریہ کی تخت نشینی کے دن بہت سی مٹھائی الگ ـــ بڑی دیر تک جی کی بھڑاس نکالنے کے بعد وہ چاروں طرف کوئی اور بات ڈھونڈنے لگتے تاکہ نئی دنیا پر لعنت کا سلسلہ جاری رکھ سکیں -

اُس زمانے کی ہر چیز سے دادا جان کو نفرت تھی اور جب وہ اپنے سامنے پھیلے ہوئے زمانے کی اس بے ہنگم روش کو دیکھتے تو جی جل جاتا - رات کو اپنے پوتوں کو پڑھتے دیکھ کر اس زمانے کی جہالت پر افسوس ہوتا -

" ہم نے مڈل پاس کرکے کلکٹر صاحب کی پیش کاری کی تھی - انگریزی اخباروں میں سمن پڑھا کرتے تھے " گلستان " " بوستان " پڑھ کر لوگ منصف بن جاتے تھے مگر آجکل انٹرنس پاس لوگ تار نہیں پڑھ سکتے ـــ " ؟

ہمارے زمانے میں ـــ لیکن آگے بات کوئی نہ سنتا

بقول ان کی بہو کے دادا جان کو تو کوئی بات سننے والا ملجائے پھر ہیں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح لپٹ جاتے ہیں کہ چھڑائے نہ بنے گھر میں کوئی بات ہو، کوئی آئے سب سے پہلے دادا جان کو اس کی فکر پڑ جاتی - پھر آنے والے کا ناطقہ بند کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے -

" کیوں بھئی آپ نے یہ سفید کریپ کا جوتا کیوں لیا ہے - رنگین کیوں نہ لیا ـــ ؟ ایک دن انہوں نے توفیق کے کسی ادیب دوست سے سوال کیا -

" بس یوں ہی ـــ " اس نے معمولی سی بات سمجھ کر ٹالنا چاہی -

" یہ تو کوئی بات نہ ہوئی - آخر کسی نہ کسی بات نے تو آپ کو مجبور کیا ہوگا جو یہ جوتا خرید اگیا " - دادا جان بھلا ایسی آسانی سے کہاں چھوڑنے والے تھے -

" مجھے پسند آگیا ـــ " وہ دادا جان پر ایک مشتبہ نظر ڈال کے بولا

" واہ کیا پسند ہے آپ کی - میں کہتا ہوں میاں - جو آپ دنیا میں روز نئی نئی قیامتوں کا حال سن رہے ہیں ان کی وجہ صرف یہ جوتے ہیں - آپ پوچھیں گے کس طرح ؟ تو میں آپ کے ذہن نشین کراتا ہوں وہ اطمینان سے بیٹھ گئے -

" جب ہم لوگ اگلے وقتوں میں جوتی خریدنے نکلتے تھے تو یہی پانچ چھ آنے پیسے جیب میں ڈالتے - پچاسیوں دوکانوں پر دیکھ بھال کرتے - اس کا بھاؤ چکاتے - اس کی مضبوطی اور بناوٹ پر ـــ

لیکن توفیق کا دوست اپنے جوتے اور تیسری جنگ کے درمیانی وجہ کا سراغ معلوم کئے بغیر کمرے سے باہر نکل کر سڑک پر جا کھڑا ہوا تھا اور اس کے جاتے ہی دادا جان کے پرانے دوست حکیم امجد علی آگئے تو گویا لوہے سے لوہا کٹنے لگا - اور توفیق اپنے دوست کی توہین پر بل کھاتا رہا -

بوڑھا ہونے کے بعد انسان ایک رجعت پسند نقاد بن کر رہ جاتا ہے - اس نے سوچا تھا اور اس دن اس کی نئی کہانی میں روایت سے بغاوت کا نعرہ شدت سے گونجا تھا -

پھر جب تازہ حقّے کی پیشکش کے باوجود حکیم جی اٹھ کر چلے گئے تو راستہ ٹٹول کر آگے بڑھتے دادا جان دہلیز پر آن بیٹھے -

" آج سردی بہت ہے نیند نہیں آئے گی " انہوں نے حسب معمول اس توقع سے کہا جیسے کوئی تردید یا تائید ضرور کرے گا - لیکن اس گھر میں کسی کو ان کی نیند سے دلچسپی نہ تھی - ان کا بس چلتا تو دادا جان کو ایسی نیند سلاتے کہ حشر کے دن گھر والوں کی شکایت کرنے کو بھی نہ جاگ پاتے - دن بھر بچوں کو گھیرے سمیٹے رہنے والی بہو کو دم مارنے کی فرصت نہ ملتی - گرمیاں تو نیند یوں ٹوٹ کر آتی کہ منّی دودھ ٹھونسنے میں کئی بار پلنگ کے نیچے گر پڑی اور ابا میاں اپنے دالان سے کفن پھاڑ کے چلانے لگے -

"دلہن اٹھو بچی گر پڑی۔ لاحول ولا کیا شیطانی نیند ہے آجکل کے جوانوں کی۔"

"ہم خود ہی شیطانوں سے بدتر ہیں"۔ نیند کی مدہوشی میں بھی وہ اس بکواسی بوڑھے کو جواب دینا نہ بھولتی۔ روتی ہوئی ننھی کے منہ میں دودھ ٹھونس کر دھپا دھپ پیٹھ سہلاتے میں وہ نہ جانے کہاں پہنچ جاتی۔

یہی گھر ہوتا اگر ابا جان والے دالان میں نہ بلغم اور پیکوں کے نشان ہوتے نہ زرد کاغذوں والی خستہ کتابوں کے ڈھیر اور نماز کی چوکی۔ اس کے بچے آزادی سے دادا جان کے سفید براق بستر پر لوٹیں لگا رہے ہیں۔ وہ خود بھی سب کو مرچوں کا قیمہ کھلا رہی ہے۔ اردو کی دال۔ مگر کوئی نہیں جو انٹ سنٹ چیزیں پکانے پر احتجاج کرے۔ پندرہ برس گزر گئے ایسے ہی خواب دیکھتے ہوئے لیکن صبح اٹھو تو دیوار پر چھپے رسالے کرنے کے بعد وظیفہ پڑھتے ہوئے ابا میاں پر نظر جاتی۔ جب تک سانس زندہ رہیں اس نے تقدیر کا لکھا سمجھ کر بھگت۔ مگر ہزار منتوں مرادوں کے بعد ساس کے سرہانے رکھی ہوئی کنجیاں اور میاں کی کمائی ہاتھ لگی تو یہ سسرے پیر تسمہ پا بنے اس کے سر پر سوار رہتے۔ وہ نئے دلوں کا شوخ مزاج توفیق اب ہر وقت سوچ میں ڈوبا افسانہ نگار بنکر اس کی چھاتی پر دنیا بھر کا مونگ دلا کرتا۔ اسے ستانے جلانے کے لئے بیتیز بدصورت بچوں کی فوج تھی کہ ختم ہونے میں ہی نہ آتی۔ پہلے اناج چار سیر کا ہوا پھر دو سیر کا اور پھر غائب ہو گیا۔ میٹرک تک پڑھی ہوئی اعلیٰ تعلیم۔ کتابوں پر بیٹھے ہیں سجائے ہوئے ڈھنگ تمیز پر وہ کبھی کی خاک اور ریخ چکی تھی۔

ان دنوں جب ابا میاں اٹھتے بیٹھتے بہو کی تعریف کرتے۔ اس کے لئے پھول اور چوڑیاں خرید کر لاتے اور بیسنی روٹی کی فرمائش کرتے تھے تو اسے ابا سے بھی زیادہ پسند تھے۔ اس نے اپنے دوپٹے میں بے شمار جگنو پکڑ رکھے تھے۔ ایک ایک کر کے سب جگنو بھاگ نکلے اور وہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے لگی۔

مغرب کی نماز اور وظیفوں سے فارغ ہو کر دادا جان چوکی سے اٹھتے تو سیدھے اپنے پوتوں کی جانب لپکے۔ صرف چھوٹے بچے ہی تھے جو بڑی خوشی سے ان کی آؤ بھگت کرتے۔ ان کی باتوں پر مذاق نہیں اڑاتے تھے اور ان کی گردن میں محبت سے باہیں ڈال کر کہانی کی فرمائش کرتے تھے۔

"پہلے یہ بتاؤ ننگے پاؤں بستر پہ تو نہیں چڑھو گے — سڑک پر پتنگیں تو نہیں اڑاؤ گے۔ فاختہ کے بچے تو گھونسلے میں سے نہیں نکالو گے" انہوں نے سرد مہری سے شرائط نامہ شروع کیا۔ اس کے بعد حقہ پیا۔ پن کٹی میں کٹوا کر پان کھایا اور سب کو اپنے لحاف میں بٹھا کر بیٹھ رہے۔

پوس کی وہ ماما ئی کے برف کی طرح جمی ہوئی رات اپنے پورے نقص سمیت دادا جان کو بری طرح یاد آ رہی تھی۔ آج وہ اپنے پوتوں کے درمیان سے اٹھ کر اپنے بچوں کے درمیان جا بیٹھے تھے۔

اپنے چھوٹے پوتے وحید کو دیکھ کر انہیں وحید کے باپ کا بچپن یاد آ جاتا تھا۔ وہی تجسس بھری آنکھیں۔ وہی شوخی اور شرارت اور ہر ایک کے لئے ہمدردی کا جذبہ۔ اب چند سال سے وہ توفیق کو اتنا سخت مزاج پا رہے تھے نہ اس کی سی فراخ دلی اور خوش مزاجی ان کے دوسرے کسی بچے میں نہ تھی۔

پوس کی جمی ہوئی راتیں، جب وقت بھی سردی کے مارے ٹھٹھر جاتا تھا اور بند کمرے کے باہر دروازے بند دیکھ کر ٹھنڈی ہوائیں ضدی بچے کی طرح شور مچایا کرتی تھیں۔

اندر بیگم کے ڈر سے سہمے سہمے رہنے کے باوجود ان کے چاروں بچے دادی کے لحاف میں گھسے یوں ہی جادوگر کی کہانیاں سنا کرتے — "پھر کیا ہوا دادی —؟" توفیق آنکھیں پھاڑ کے یوں پوچھتا تھا جیسے اب توفیق کا لڑکا وحید ہر وقت دادا جان سے سوال کئے جاتا ہے۔

دادا جان فاختہ کیا کہتی ہے —! دادا جان بادل روز آنہ کہاں جاتے ہیں! دادا جان آپ کو سمجھائی کیوں نہیں دیتا —؟

لیکن بہو کی طرح بیگم کو بھی بچوں کا یہ انہماک پسند نہ تھا۔ سردیوں کی راتوں میں وہ نو بجے سے ہی ان کے گلے کا ہار ہو جاتیں —

خیر گھر بسنے کے وہ آگے کی بات کبھی نہ سوچتے - یعنی پانچ برس میں چار بچے ـــــ یہ صرف ان قواعد کی بات تھی جو بیگم نے گھر میں ہر کام کے لئے مقرر کر رکھے تھے -

اپنے پوتوں کے درمیان ختّی کی نے تھامے وہ اس وقت بہت پیچھے دیکھ رہے تھے - چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو سکیڑ کر انہوں نے بڑی دور تک ڈھونڈا مگر وہ سرا کہیں نظر نہ آیا جس پر چلتے ہوئے وہ زندگی کے ستر ویں موڑ پر آ گئے تھے - اس سفر میں بیگم نے انہیں دو تحفے دے اور ساتھ چھوڑ گئیں - مگر زمانے کی بے رحمی نے دونوں چیزیں لُوٹ لیں -

بیگم کی سکھائی ہوئی عادتیں اور بچے دونوں تتر بتر ہو گئے - لے دے کے ایک حقّہ رہ گیا تھا جسے وہ تھامے بیٹھے تھے اور ایک توفیق تھا جس کے بچوں کو کہانی سُناتے سُناتے وہ رُک گئے تھے -

بچے ہمہ تن گوش بنے لحاف سے منہ نکالے یوں جھانک رہے تھے جیسے مرغی کے پروں سے چوزے - ان بچوں کے لمس سے دادا جان نامعلوم خوشی محسوس کرتے تھے - یوں جیسے آج جسم کے سارے بکھرے ہوئے اعضاء اکٹھے ہو گئے ہوں -

بوڑھا ہو کر انسان مرتا نہیں صرف حصّوں میں بٹ جاتا ہے - حقّہ کا ایک لمبا کش لیکر انہوں نے سوچا اور کہانی کا ٹوٹا ہوا سرا ٹٹول کر اٹھا لیا -

" ہاں تو اس جادوگر نے اپنے خوبصورت لڑکے کو سورج اتار کے دیدیا - لڑکا سورج پا کے بہت خوش ہوا مگر سورج کے نیچے آنے سے دُنیا میں اندھیرا ہو گیا اور یہ دیکھ کر اس کے لڑکے نے کہا سورج کو پھر آسمان پر رکھ دو ورنہ دُنیا میں اندھیرا ہی رہے گا - لیکن جادوگر نے کہا میں دُنیا میں اندھیرا ہی رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ ـــــ

" باقی کہانی کل سُننا چلو اب سو جاؤ " بہو نے بچوں کو حکم دیا -

دادا جان یوں چُپ ہو گئے جیسے بغیر چابی بھرا ریکارڈ بیچ سے گھوم کر آہستہ آہستہ رُک جائے اور رنج کے مارے وہ بہو پر لعنت بھی نہ بھیج سکے - اس طرح بیچ میں کہانی رُک جانے سے انہیں دلی کوفت ہوئی تھی - لیکن بہو ساس کی تمام عادتوں میں بس یہی عادت اپنا سکی تھی -

حالانکہ یہ دیکھ کر دادا جان کو بڑا دُکھ ہوتا کہ ان کے بیٹے اور بہو میں وہ میٹھا خلوص مفقود تھا جیسی ازدواجی زندگی انہوں نے بسر کی تھی - ہفتے گزر جاتے توفیق بیوی سے بات بھی نہ کرتا - بیوی کی بلا سے میاں رات بھر گھر نہ آئیں دو دو دن جلسوں شادیوں کے بہانے گھر سے غائب رہیں - میاں کے دوست آئیں تو بیوی استقبال کو لپکتیں اور میاں کی مردانگی کو ذرا بھی ٹھیس نہ پہنچتی - میاں نہ جانے کس کس برکتی آوارہ عورت کو گھر لیکر آتے اور بہو کی تیوری پر بل بھی نہ پڑتا - اس گھر میں ہنسی صرف بیٹے کے شروع دنوں میں گونجا کرتی - بات کہتے کھٹ پٹ شروع ہو جاتی - دونوں ہر وقت لڑنے کو تیار رہتے - زندگی کی وہ مٹھاس وہ ٹھہراؤ آجکل کے جوانوں میں نام کو نہ تھا - لیکن موڈ بدلا یا جیب گرم ہوئی تو بچوں کی فوج سے پیچھا چھڑا بیوی کو سینما دکھا لائے - بازاروں میں ٹہلانے لے گئے -

یوں جب گھر میں ہر وقت وہ بہو کو بناؤ سنگھار کرتے سرخی پاؤڈر سے آراستہ دیکھتے تو نماز کا سلام پھیر کر بیگم کو یاد کرنے لگتے - کیا اصول پرست عورت تھی کبھی گھر کے اصولوں کو بھول کے وہ نخرے میں چور ہو کے بیگم کے شانے پر سر بھی رکھ دیتے ... تو دونوں ہاتھوں سے ہٹا دیتی " تیل سے دوپٹہ خراب ہوگا - بدل آؤں ـــــ "

گویا پیار بھی کوئی ریل گاڑی ہے کہ ہر اسٹیشن پر ٹھہرتی رہے -

لیکن تنہائی میں انہیں بیگم کا سگھڑاپا یاد کر کے تو اپنی قسمت پر خود ہی رشک آتا - آٹھویں دن ایک روپیہ بھنایا جاتا - بہو کی طرح کی طرح ہر روز پانچ پانچ روپے ختم نہ ہوتے تھے - وہ تو کسی سلطنت کا انتظام کرنے کے لئے بنائی گئی تھی - بہو کی طرح تھوڑی کہ گاجر سے روٹھی مولی سے من گئی - پچیس سال کے ساتھ میں شاید وہ مشکل سے چند بار لڑے ہوں - وہ بھی یوں کہ ڈھنڈورا نہیں پیٹا گیا -

غفلت سے چونک کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ سب بچے اس کے حکم پر سونے چلے گئے تھے۔ صرف وحید ان کی باتیں پکڑے جھنجوڑ رہا تھا۔

"اے دادا جان۔ جادوگر دنیا میں اندھیرا کیوں رکھنا چاہتا تھا ۔۔۔؟"

"تمہاری عقل پر ڈالنے کے لئے ۔۔۔" وہ بھنا گئے۔ ان کی بہو چاہتی ہی نہیں کہ بچے ذرا دیر دادا جان کے پاس بیٹھ کر عقل کی باتیں سیکھیں۔ وہ اس بلبل کی طرح اکیلے بیٹھے رہ گئے تھے جس کے ساتھی اسے تنہا چھوڑ کر اڑ گئے ہوں۔

بڑھاپے میں نیند بھی صحن میں پھدکتی ہوئی چڑیوں کی طرح اڑ جاتی ہے اور خیالات ہیں کہ ضدی کوؤں کی طرح کائیں کائیں سے پیچھا نہیں چھوڑتے۔ دادا جان کو تنہائی کا احساس مارے ڈالتا تھا۔ دن کو تو زبردستی بک جھک کر کٹ ہی جاتا مگر رات کو وہ تنہا کوٹھری میں پڑے کروٹیں بدلے جاتے۔

"ڈارلنگ آج تم کوئی ایسی ترکیب کرو کہ رات کو بچے رونے نہ پائیں مجھے بہت ضروری لکھنا ہے۔"

"تو آپ دالان میں کیوں نہیں بیٹھتے۔ میں بچوں کا حلق فریز کرنے سے رہی!"

اتنی ٹھنڈی رات میں بہو کا یہ سرد جواب سن کر دادا جان کو پھریری آ گئی۔

"اسی لئے تو دنیا میں قیامت آ گئی ہے۔ اگر ہم اپنی بیوی سے یوں کہتے تو وہ نیک بخت رات بھر انگیٹھی لے بیٹھی رہتی۔"

انہوں نے حسب عادت اپنے آپ سے کہا مگر ان کی بہو بچی کو زبردستی گود سے پٹک کر اٹھ بیٹھی۔

"بھئی آپ لوگوں میں انسانوں والی بات کہاں آ سکتی تھی۔ میں کوئی زر خرید لونڈی نہیں ہوں جو ہر وقت نواب صاحب کی خدمت کو تیار رہوں۔" وہ بڑے غرور سے کمرے میں چلی گئی۔

توفیق اس معرکے سے بے خبر ناہموار پر جھکا ہوا کاغذ الٹ پلٹ رہا تھا۔ یہ لڑائیاں اب اس کے لئے عام بات ہو گئی تھیں۔ جھکی ہوئی سفید پلکوں کو اٹھا کر دادا جان نے بڑے دکھ سے اپنے بیٹے کو دیکھا۔

آ ۔۔۔ یہ زر پرست دنیا میں جینے والا بچارا لڑکا ۔۔۔

آج کے نوجوان کتنے بدقسمت ہیں۔ انہوں نے دولت کے لئے دنیا کھو دی اور دولت پھر بھی ان کے لئے خواب ہی بنی رہی اس خواب نے ان سے ہر چیز چھین لی۔ بیوی کا پیار۔ بچوں کی محبت اور انسانیت کا جذبہ۔

"یہ ادب ودب کی باتیں چھوڑو میاں صاحبزادے"۔ ایک دن انہوں نے اپنے بیٹے کو مشورہ دیا تھا۔

"بڑے آدمی کہلانے سے بہتر ہے کہ چھوٹا انسان ہی بنے رہو"

اور یہ سنکر ان کا بیٹا باپ کے بڑھاپے پر افسوس کرتا۔

بوڑھے ہونے کے بعد انسان میں ایک برائی ہو جاتی ہے کہ نئی قدروں پر سے اس کا ایقان اٹھ جاتا ہے۔

توفیق نے اپنے مضمون کی پہلی سطر لکھی اور دادا جان سوچتے رہے۔

پہلے زر کا لفظ اتنی شدت سے کبھی نہ گونجتا تھا۔ بیویاں شوہر سے محبت کرتی تھیں ان کی کمائی سے نہیں۔ میاں صرف بیوی کو چاہتے تھے اس کے باپ کی کمائی سے کوئی سروکار نہ تھا۔

جب کبھی دادا جان کے دل پر زمانے کی چوٹ پڑتی وہ وہم سے بہت دور جا پڑتے۔ بیس برس کی ناخوشگوار یادوں کی جھاڑیاں اور تپتے ہوئے صحرا کو ایک ہی جست میں طے کر کے وہ اس گلزار میں کود جاتے جہاں زمانہ ان کی مرضی کے مطابق چلا کرتا۔ لوگ اس زمانے میں بھی فاقے کرتے تھے مگر اپنی نالائقی کو خدا کا انتقام نہ ٹھہراتے۔ بیویاں شوہر کی آمدنی دیکھ کر محبت کا بجٹ نہیں بناتی تھیں۔ اور ایسے بے غیرت شوہر تو پورے شہر دلی میں ڈھونڈے نہ ملتے جو اپنی بیوی سے ایسے

گھر۔ کھرے جواب سُنکر بھی یوں کاغذ ڈھونڈنے جاتیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

دل رکھنے کو کچھ کہو لو مگر بیوی پیر کی جوتی ہی ہوتی ہے۔ لیکن آجکل کے مرد نہ جانے عورت سے کونسا قول ہارے ہیں! ان کے سخت احتجاج پر بعض وقت توفیق آسانی سے سمجھاتا۔

"ابّا میاں ہم جتنا اپنی بیوی کو دیتے ہیں اتنا ہی لینے کا حق بھی رکھنا چاہیے۔ آخر مساوات اور انصاف بھی تو کوئی چیز ہے؟"

"یوں کہو صرف انصاف ہی رہ گیا ہے جس کے الفاظ سے تم کھیلتے ہو ورنہ تم دونوں لین دین میں تو بنیوں سے بھی زیادہ کنجوس ہو۔ جس کا دعویٰ صحیح ہوتا ہے وہ تمہاری طرح حلق پھاڑ کے ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔"

بوڑھا ہونے کے بعد انسان میں ایک اور بُرائی یہ ہو جاتی ہے کہ وہ قائل ہونا بھول جاتا ہے۔ توفیق سوچتا۔ زیر تکمیل مضمون میں وہ پُرانے ادب کی دھجیاں اُڑا دیتا۔

نہ جانے دادا جان کتنی رات تک بیٹھے یوں ہی سوچتے رہے۔

بہو نے میاں کو دالان میں نکال کر کمرہ بند کر لیا۔ دادا جان کی کوٹھری میں رہنے والی فاختہ نے اپنے بچوں کو لوریاں سُنانا بند کر دیں اور جاڑوں کے احمق سے چاند نے آدھا سفر طے کر لیا تب توفیق نے قلم رکھ کر انہیں پکارا۔

"آج کب تک دالان میں بیٹھ کر سوچنے کا ارادہ ہے۔! کیا پھر فالج گروائیں گے۔ پہلے ہی ڈاکٹر کے پندرہ روپے اُدھار ہیں وہ چونک پڑے۔ بڑی دیر کے بعد حواسوں میں آئے تو جسم ٹھنڈا ہو کر لکڑی بن چکا تھا۔ سینہ پر برف کی ایک سِل رکھی ہوئی تھی۔ بڑی دقت سے گردن موڑ کر انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا جو سردی میں کانپتا ہوا آدھی رات کو بیٹھا اخبار کے لئے مضمون لکھ رہا ہے تاکہ صبح بچوں کے کھانے کا انتظام ہو سکے۔

کیا وہ خود اپنے بچوں کے لئے اتنی محنت سے کما سکتے تھے ـــ؟ ان کا دل اس سوال پر شرمندہ ہو گیا۔

نہ جانے ہم نے کون سے گناہ کئے تھے جن کی سزا ہمارے بچے بھگت رہے ہیں۔

بڑی جلدی انہوں نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا۔ جب انسان اتنی محنت سے کمائے تو اسے اپنے باپ کا خیال نہیں آئے گا اسے صرف پندرہ روپے یاد رکھنا چاہئیں۔

ہم لوگ خوابوں میں کون نداؤ ڈھونڈتے تھے اور اب ایسے حمام بادگرد میں پہنچ گئے ہیں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اپنے جسم کو گھسیٹتے وہ راستہ ٹٹول کر بڑی مشکل سے کوٹھری میں جا کر پڑ رہے۔

پُورا جسم بجلی کے پنکھے کی طرح ہل رہا تھا۔ یہ فالج نہیں نمونیہ ہے۔ خوف کے مارے ان کا حلق خشک ہو گیا۔ انہیں اپنے بیٹے کا اُداس چہرہ نظر آیا۔ بہو کا غصہ۔ بچوں کی چیخ و پکار۔

پچھلے دنوں فالج کا حملہ ہوا تھا تو نہ جانے کتنا قرض لینا پڑا۔ توفیق نے انٹ سنٹ کہانیاں لکھ کر بیچیں۔ کئی وقت چُولہا نہ سُلگا تب جا کر وہ ٹھیک ہو پائے تھے۔

وقت کے لمحے آنسوؤں کی طرح گر رہے تھے اور طویل وقفے کے بعد چوک کا کلاک ایک گھنٹے کی موت کا اعلان کر رہا تھا۔

آج انہیں وقت کی سُست رفتاری کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ جب انسان ستر برس کا ہو جائے تو موت کو اس پر رحم آنا چاہیئے۔ مگر یہاں تو صرف بیماریوں کو ہی اُن پر دُلار آیا کرتا ہے۔

"بوڑھے سب ہی ہوتے ہیں مگر ابا میاں کی طرح جوانی کو روتے کسی کو نہیں دیکھا" بہو ہنس ہنس کر میاں سے کہتی تھی۔

جب بیوی کا انتقال ہوا انہوں نے گھر بار سب تج دیا۔ لڑکے لڑکیاں سب ہی اپنے گھر بار کی ہو چکی تھیں۔

باہر والے دالان میں وہ اپنا پلنگ اُٹھا لائے۔ نماز کی چوکی پر وظیفوں کی کتابیں۔ امیر مینائی کا دیوان اور رومی کی مثنویاں رکھ دیں۔ کپڑوں کا صندوق پلنگ کے نیچے ڈال دیا۔ پاس پھوٹی کوڑی بھی کبھی نہ رکھی تھی جو کبس میں قفل ڈالتے۔ ہر مہینے پچاس روپے پنشن لاکر بہو کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ روزانہ ایک آنے کی حقّہ کے لئے تمباکو۔ دو پیسے خیرات کے لئے اور روپے دو روپے کی دوائیں۔ بس یہی ان کے اخراجات تھے۔

زندگی بھر سخت پرہیز کیا تھا۔ اصل میں وہ بچپن سے ہی بے حد کمزور تھے کہ دوا پرہیز کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹا۔ کبھی بڑی فراخ دلی اور لاڈ سے اماں ایک پیسہ چیز کھانے کو دیتیں تو ساتھ ہی تاکید کر دیا کرتی تھیں۔

"جاؤ ایک پیسہ کا شربت گلِ بنفشہ پی لیجیو۔ میٹھا بھی ہے اور فائدہ بھی کرے گا۔"

یوں دادا جان نے بچپن ہی سے کھٹے میٹھے بیروں اور گُڑ دھانی کی پیاس "معجون جالینوس" اور گلِ بنفشہ کے شربت سے بجھائی تھی۔ یہ پرہیز بیگم نے بھی جاری رکھا۔ الم غلم چیزیں کبھی نہ کھانے دیں۔ سیر و تفریح کی فرصت بھی کبھی نہ ملی۔ پیشہ کاری کر کے کونسا آدمی زندہ دل رہ سکتا ہے۔ دفتر سے جو وقت بچتا وہ بھی فائلوں کی نذر ہو جاتا۔ کبھی کبھار عزیزوں کی خیریت پوچھ آئے۔ بیٹھک میں حقّہ لیکر آن بیٹھے تو حکیم امجد علی اور چنگی کے محرّر دلدار احمد سے دل بہلا لیا۔ پھر بیوی کی بیماری، بچوں کی پڑھائی، صاحب کی خوش اخلاقی اور بزرگوں کی باتیں چھڑ جاتیں۔ اندر آئے تو بیوی کو دوا پلا رہے ہیں۔ بچوں کو بہلا رہے ہیں۔ مرغی کے نیچے انڈے بٹھا رہے ہیں یا شلغم کا اچار ڈالنے بیٹھ گئے۔ بیوی بچوں والے مردوں کی تو یہی تفریح تھی۔ آجکل کی طرح تھوڑی کہ توفیق میاں کو یہ بھی خبر نہ تھی فلاں کپڑا اُن کا ہے۔ یا کسی اور کا۔ ان کی چھوٹی بچّی کی عمر کیا ہے اور بڑا لڑکا آج اسکول گیا یا نہیں —— جب باپ ایسے کٹھور دل ہو جائیں تو قربِ قیامت میں کیا شک ہے ——!

توفیق کا بڑا بھائی رفیق بھی اسی زمانے کا تھا۔ مگر اسے منطق نہ آتی تھی۔

اسے کھانے کمانے سے کام تھا۔ بلا سے انگریزوں کی غلامی ہو۔ ہندوؤں کی ہو یا مسلمانوں کی۔ ڈکر پیشہ آدمی کو سیاست سے کیا واسطہ —— اس نے دوسروں کے حقوق چھیننے کے لئے اپنے آپ کو خاک میں ملانا نہیں سیکھا۔ اس لئے پاکستان میں ٹھاٹ کر رہا تھا۔ دادا جان تو خود بھی کبھی کے پاکستان چلے گئے ہوتے مگر چھوٹی بہو کے آنسوؤں نے روک لیا۔ بیکاری سے تنگ آکر رفیق نے جو کہانیاں لکھنا شروع کیں تو دونوں جہاں سے مارا گیا۔ ایسے میں بہو کو ابا میاں کی پنشن کا ہی بڑا سہارا تھا۔ یوں وہ خود بھی بڑھاپے میں ویس بدیس جاکر اپنی مٹی خراب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

"اب وہ زمانہ آن لگا ہے وحید بیٹے، جب لوگ خود ہاتھ پاؤں ہلانے کی بجائے دُوسروں کی دولت چھیننے کو شرافت سمجھتے ہیں" وہ اپنے چار برس کے پوتے کو سمجھاتے۔

"دادا جان دُوسروں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آتی ہے ——؟"

اس سوال پر توفیق خوش ہو گیا تھا۔ جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ ہر بات کا جواب نہیں دے سکتا۔

ہمیں اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے ہر بات کے لئے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ وہ ایک نئے مضمون کا آئیڈیا ڈھونڈھنے لگا۔ دروازے کے سامنے دُھوپ کے رُخ پلنگ ڈالے دادا جان پڑے رہتے اور پتّہ بھی کھڑکتا تو اس کے محرکات پوچھے بغیر نہ چھوڑتے مگر کوئی ان کی نہ سُنتا اور سنتے بھی تو کہنے کا حکم کب تھا۔ وہ جو بات بھی کہتے اس پر سب کو ہنسی آجاتی توفیق سے لیکر کلّو ڈرائیور تک کو ان کی کھانسی، ناک، تھوک سے ہر ایک کا جی متلاتا۔ کبھی کھنکھتے کراہتے پانی پینے اُٹھتے تو صراحی اوندھا دی۔ کھانا کھاتے وقت پوری رکابی بیچ ہاتھ گھنگول ڈالتے۔ گھر میں کوئی مہمان آئے۔ ان کی حرکتیں لعنت پھٹکار بند نہ ہوتی۔

بہو نے پہلے تو سسرے کے پاؤں [illegible] پھر انہیں کھانا بھی [illegible] ہی بھیجا جانے لگا۔

کبھی روٹیاں کچی تو کبھی دال پھیکی۔ کبھی سالن میں صرف مرچیں ہی جھونک دی جاتیں۔ پھر اس کا بھی کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ دوچار تقاضوں پر بہو بھنّا اٹھتی۔

"اللہ توبہ ہے۔ ابا میاں تو کھانے کے لئے بچوں سے بھی زیادہ شور مچاتے ہیں۔"

انہوں نے تیز نمک مرچ کے سالن کھانے کی عادت ڈال لی۔ یہ دیکھنا چھوڑ دیا کہ مرغی نے انڈا دیا یا نہیں۔ گھر میں فلاں آدمی کیوں آیا ہے۔ فلاں چیز بے جگہ کیوں پڑی ہے۔ بچوں کو مارپیٹ سے روکنا بھی چھوڑ دیا۔ توفیق کو سمجھانا اور اس سے خدا کے متعلق کفر سننے کا سپنا بھی چھوڑ دیا۔

بہو چاہتی تو ابھی بڑے میاں کو مزید راہ راست پر لا سکتی تھی مگر پانچوں بچے مل کر ماں کا انتقام دادا جان سے لینے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔ شروع میں جب بچوں نے ان کی عینک توڑ ڈالی، کتابیں پھاڑ دیں اور جانماز پر کیچڑ بھرے پاؤں رکھ دیتے تو انہوں نے سخت احتجاج کیا تھا۔

انہیں کیا معلوم تھا بد مزہ کھانے کی شکایت کر کے وہ خدا کی کتنی بڑی ناشکری کر رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ کچی روٹیاں بھی غائب ہونے لگیں۔ اُردو رسالوں پر برا وقت پڑا تو توفیق کی کہانیاں بھی سستی ہو گئیں اور گھر میں دونوں وقت چولہا سلگنے کا امکان بھی نہ رہا۔

صبح دادا جان کو ہوش آیا تو گرم دھوپ میں نہا رہے تھے اور پورا جسم اکڑ گیا تھا۔ خلاف معمول اتنے دن چڑھے تک سونے پر بھی کسی کو دادا جان کے متعلق تشویش نہ ہوئی تھی۔ توفیق بیوی سے گپ بجتی میں مصروف تھا اور بچے چیخ پکار کر رہے تھے۔

"توفیق بیٹے ــــ آج ہمیں حقہ بھی نہیں ملا۔" اپنی آواز کے رعشہ پر قابو پا کر دادا جان نے یوں کہا کہ بیٹا پیالی کو بھاپ سے لے۔

"انہیں ہر وقت اپنی ہی پڑی رہتی ہے۔" وہ جھنجلا کر دالان میں چلا گیا۔

"یہ نہیں سوچتے کہ ہم لوگ کیا کھا پی رہے ہیں جو انہیں حقہ بھی نہیں ملا۔"

دادا جان اس جواب سے ناراض نہیں ہوئے۔ صرف ان کا بیٹا ہی تھا جو اتنی نرمی سے جواب دیتا ہے۔ ورنہ دوسرے لوگ تو یوں ڈانٹتے کہ تسبیح ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتی اور دل اس تیزی سے بھاگتا جاتا تو اب لوٹنے کا نام نہ لے گا۔

"کون بیٹا جا رہا ہے۔ ذرا سا پانی ــ" ہاتھ کی آڑ سے روشنی روک کے آنکھیں میچ کے انہوں نے کسی مہربان کو پکارنا چاہا۔ مگر سب بچے ایک پھٹی پتنگ کے لئے آپس میں گالی گلوچ کرتے باہر چلے گئے۔

بہت دیر تک پاس سے گزرنے والے ہر شخص کی خوشامد کرنے کے بعد آخر حسب عادت وحید ہی پانی لے کر آیا۔

"دادا جان آج آپ اتنا کیوں کانپ رہے ہیں؟" پانی پلانے کے بعد اس نے غور سے دادا جان کو دیکھا اور پھر گلاس پٹک کر باپ کی طرف بھاگا۔

"ابا آج پھر دادا جان پریشان لگ رہا ہے۔ آپ جلدی حل کر دیجئے۔"

"ایں ــــ! سچ مچ ــــ؟" وہ کاغذ پھینک کر کھڑا ہو گیا۔

"آج صبح سے یوں ہی بہت خوش تھے کہ ابا میاں نے ایک اور خوشخبری کا اضافہ کیا۔" بہو طنز سے بولی۔

"ہونہہ ــــ یہاں آج صبح سے سگرٹ تک نہیں پیا۔ میں تو رات ہی جان گیا تھا۔"

ان کا بیٹا شدتِ اضطراب میں ہونٹ چبانے لگا۔

انسان بوڑھا ہونے کے بعد ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ توفیق سوچنے لگا۔

"وحید اپنے دادا جان سے کہو اب چلنے کی تیاری کریں۔ میں ابھی کہیں سے روپے اُدھار لا کر انہیں پاکستان بھجواتا ہوں۔ آخر بھائی جان بھی تو کچھ دنوں والد صاحب کی ناز برداری کریں۔"

اور وحید دلی مسرت سے یہ خبر سنانے دادا جان کی طرف دوڑا پھر فوراً ہی کمرے میں آیا۔

"آبا یہ اکنی دادا جان نے آپ کو دی ہے۔ کہہ رہے ہیں پہلے آپ سگریٹ پی لیجئے پھر باہر جانا۔"

" آبا --- دادا جان کیوں رو رہے ہیں ---؟"

" بوڑھے ہو گئے ہیں سٹھیا گئے ہیں۔ اپنی حماقتوں کو رو رہے ہیں" وہ جلدی جلدی کپڑے بدل کر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

" امی جب آبا بوڑھے ہو جائیں گے تو وہ بھی دادا جان کی طرح رویا کریں گے" وحید نے امید بھرے لہجے میں ماں سے پوچھا۔

توفیق جوتے پہننے سے رک گیا۔ اس نے گھبرا کے وحید کو دیکھا اور پھر آبا میاں سے معافی مانگنے چلا۔

ہر انسان بوڑھا ہو کر دادا جان بن جائے گا ---! اس نے خوف زدہ ہو کر سوچا۔

نیا ادیب صرف وقت کا ترجمان نہیں آنے والے دور کا نقیب بھی ہوگا۔

وہ ایک نئی کہانی کے متعلق سوچنے لگا۔

امبوا تلے ڈولا رکھ دے مسافر

(صفحہ ۱۳۳ سے آگے)

کیے نصیب تھیں صبح اٹھتے نیلا ٹیونک سرخ بیٹی والا لادکر اسکول چلے گئے۔ شام کو واپس آکر دوسرا کوئی منحوس کمبخت فراک پہنا اور تان پورہ سنبھالے میرس کالج چلے جا رہے ہیں۔ کتوں کی طرح عید بقرعید پر اس حالت پر ترس کھا کر کھڑے پائنچے کے پاجامے کا جوڑا بنا دیا گیا۔ اب اسے لادے، ہاتھوں میں ڈھیروں چھما چھم کرتی بنارس کی چوڑیاں پہنے "بیگماتوں" کی طرح ٹھٹے سے تخت پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ یہ کیا فینسی ڈریس کیا ہے۔ کمال دھاڑتا --- سنا ہے آج ہریلی میں سرت کی ساری وہ کالج کا دیوالہ پٹ گیا --- یہ کالج کی ڈیر کا ایجیٹیشن نس مقصد کے لئے ہوا ہے --- اگر ڈھیلا پاجامہ پہنتا ہے تو ترینے سے بیٹھو۔ یہ درختوں پر کیوں چڑھ رہی ہو نگجتو --- خالہ بیگم کہتیں تو تھوڑا ... اگلے روز پھر ... بیٹھے ہیں۔

سردی اور راتی جب چیزیوں کا ذکر ختم کر چلیں تو اب سرلا کے گہنوں کا قصہ نکلا۔ اس بھات پر تبصرہ کیا گیا جو پرتی ماما سرلا کے بیاہ پر لائے تھے۔ اس میں زمرد کا جگنو کیسا خوبصورت تھا۔ اپی کے ماں بھی جو بھات لے کر آئیں گے اس میں زمرد کا جگنو ہوگا میں نے مسرت کے ساتھ سوچا۔ اور پھر اپی کو زبردستی سارے گہنے پہنا دیئے جائیں گے۔ بھیا صاحب ہاتھی پر بیٹھ کر آئیں گے۔ جیسے سرلا کا میاں آیا تھا۔ اپی کے چہرے پر وہ سفید سفید بندکیوں والے نقش و نگار کتنے خوبصورت لگیں گے۔ اور افشاں اور صندل اور سیندور۔ اف وہ پھر چھاج میں سات طرح کا اناج رکھ کر اس میں دیا جلایا جائیگا اور اپی کے ہاتھوں میں چاندی کنگنا بندھے گا جیسے آمنہ باجی کے بیاہ میں ہوا تھا۔ اور بھیا صاحب دولہا بنے کیسے لگیں گے؟ بھیا صاحب کے لئے یہ تقریب بے مزہ ہوگی --- لہذا اس کے متعلق سوچنا میں نے کسی اور وقت کے لئے ملتوی کر دیا۔

اپی کے بیاہ میں پہننے کے لئے تو میں بڑی بڑھیا ساری اور کارچوبی۔ سرقوح نے کہنا شروع کیا۔

مجھے تو یہ نئی قسم کی بارڈر کی ساریاں بالکل اچھی نہیں لگتیں بالتی دے ہونٹ لٹکا بڑی بوڑھیوں کی طرح کہا بالتی رانے زیادہ سولہ برس کی تھی۔ سرفوح اس سے سال بھر چھوٹی تھی۔ ان دونوں نے سخت بزرگی کے عالم میں پھر مجھ پر رعب ڈالنا شروع کیا۔ میں بڑی عقیدت سے ان کی باتیں سنتی رہی

(زیر تصنیف ناول کا ایک حصہ)

ابن سعید

چراغ تلے

"لکھو کہ شرافت شیر خاں، جو کہ روہیلکھنڈ کے ایک معزز خاندان کا فرد ہوں اور سرکار انگریزی کا خطاب یافتہ ہوں اور اب حکومت وقت کی جانب سے پنشن پاتا ہوں، حضور ضلع کلکٹر صاحب بہادر کی خدمت میں مندرجہ ذیل درخواست پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں! —— لکھ لیا؟ —"

خاں صاحب شرافت شیر خاں جو کہ اس وقت اپنے پلنگ پر نیم دراز تھے اور اپنے گھٹنے کو سہلا سہلا کر اس کی مسلسل تکلیف کو بھلانے کی کوشش کر رہے تھے آہستہ اور نحیف آواز میں بولے۔ ان کا نو عمر نواسا جو تھوڑی دیر پہلے اسکول سے واپس آیا تھا، بادل ناخواستہ قلم کی نوک کو گھس گھس کر لکھنے لگا۔

خانصاحب کی آواز کبھی کبھی ڈوبتے ڈوبتے بالکل غائب ہو جاتی اور ان کا نواسا سوچنے لگتا کہ شاید اب وہ آگے نہ لکھوا سکیں گے، لیکن وہ پھر اپنا گلا کھنکھار کر صاف کر لیتے اور کپکپاتی ہوئی آواز میں اپنی عرضی کا مضمون املا کی طرح لکھوانا شروع کر دیتے —— اور اس کو املا سے بالکل نفرت تھی۔

خانصاحب نے عرضی لکھواتے لکھواتے اپنی ٹانگ کو سکیڑنے کی ناکام کوشش کی —— اور تکلیف کی اک لہر ان کے گھٹنے کی چپنی میں پیدا ہو کر ران اور ٹخنے تک دوڑ گئی اور چند لمحوں کے واسطے ان کا ذہن بالکل گنگ ہو گیا۔ لیکن پھر فوراً ہی ان کو اپنی عرضی کا خیال آ گیا۔ اس شاندار مقصد کا خیال آ گیا جس کے ماتحت وہ ضلع کلکٹر کی خدمت میں یہ انوکھی عرضداشت بھیجنے پر مُصر تھے۔

اور انھوں نے اپنی شدید تکلیف کو نظر انداز کر کے ایک بار پھر املا لکھوانا شروع کر دیا

"—— تو لکھو! —— میں عرصہ تین سال سے اس بلڈنگ کے فلیٹ نمبر چار میں مقیم ہوں اور اسی بلڈنگ کے متصل ایک اور بلڈنگ کے فلیٹ نمبر چار کی، الاٹمنٹ رفیوجی آفیسر صاحب بہادر نے ایک ایسی ہستی کے نام کر دی ہے جس کی موجودگی میرے لئے اور میرے گھر کی پردہ نشین خواتین کے لئے ننگ شرافت ہے —— گذارش یہ ہے کہ اس فلیٹ میں ایک ایسی خاتون مقیم ہیں، جو پردہ نشین نہیں ہیں اور بظاہر جن کا کوئی ذریعہ معاش نہیں یہ خاتون بالکل تنہا ہیں۔ ان کے ہمراہ ان کے خاندان کا کوئی مرد نہیں۔ علاوہ ازیں ایک خاص قماش کے لوگوں کا ان کے یہاں آنا جانا ہے جس کی وجہ سے صورت حال ہم لوگوں کے لئے بہت ہی ناقابل بیان ہو گئی ہے —— اس پر طرہ یہ کہ ان خاتون کے فلیٹ کی کھڑکیاں بالکل میرے فلیٹ کے مقابل کھلتی ہیں اور ظاہر ہے کہ موجودہ صورت حال میں میں نے اپنی طرف کی کھڑکیوں کو بند رکھنے کی کڑی ہدایت کر دی ہے —— بہر نوع میں فی الوقت یہ

ضروری سمجھتا ہوں کہ ضلع حکام کو ان حالات سے آگاہ کر دوں اور اس امر کی دست بستہ درخواست کر دوں کہ وہ محلے کو غلط قسم کے عناصر سے پاک کر کے اپنی انتظامی لیاقت کا ثبوت دیں اور اس ناچیز کو شکریے کا موقع عنایت فرمائیں ——— ؟"

بولتے بولتے خاں صاحب کو ایکا ایکی یہ محسوس ہوا کہ ان کی ٹانگ کی تکلیف ناقابل برداشت حد تک شدید ہو گئی ہے۔ اس بنا پر ان کے جذبات میں ایک ہیجان سا بپا ہو گیا اور وہ سوچنے لگے کہ اپنی درخواست کو اور بھی زیادہ مؤثر بنانے کے لئے ان کو اور بھی زیادہ سنگین قسم کے الفاظ استعمال کرنے چاہئیں۔ لیکن پھر ان کو خیال آیا کہ ضلع حکام کی خدمت میں نامناسب قسم کی عرضداشت پیش کرنا بھی کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ اس لئے وہ ایک ایک لفظ پرکھ کر بولتے رہے۔ اور ان کا نوعمر نواسہ قلم کی نوک کو گھس گھس کر املا لکھتا رہا۔ جب وہ اپنے مضمون کے اختتام پر پہنچ گئے تو ان کے نواسے نے غیر شعوری طور پر اطمینان کا ایک سانس لیا۔ اور وہ سوچنے لگا کہ اب خانصاحب جلدی سے لفافے کا پتہ موٹے موٹے القاب سمیت لکھوا چکیں تو وہ فلیٹ کی گھٹتی ہوئی فضا سے باہر نکل جائے۔

خاں صاحب نے جب پوری درخواست لکھوا لی تو ان کو ایک طرح کا سکون میسر آگیا۔ اس درخواست کا مضمون ایک طویل عرصے سے ان کے ذہن میں چل رہا تھا۔ جس عورت کے بارے میں انھوں نے اپنی درخواست لکھوائی تھی اس کو انھوں نے ٹھیک طور سے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن یوں اپنے کمرے میں مقید ہو کر ان میں ایک چھٹی حس پیدا ہو گئی تھی اس کی مدد سے انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ عورت قطعی خطرناک ہے۔ پھر یہ بھی تھا کہ جب کبھی ان کی لڑکی گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر ان کے کمرے میں آتی تو وہ ضرور اس عورت کے بارے میں کوئی نیا قصہ سنا ڈالتی اور یوں پچھلے چند مہینوں سے اپاہج پڑے پڑے خاں صاحب نے اس عورت کے بارے میں معلومات کا ایک دفتر جمع کر لیا تھا اور اب وہ اکثر اس مسئلہ پر غور کرتے رہتے تھے کہ وہ ضلع حکام کو کیسے اس معاملے کی اطلاع دیں اور اب جبکہ وہ پوری درخواست کا املا اپنے نوعمر نواسے کو لکھوا چکے تو ان کو ایک گونہ سکون میسر آگیا۔ پھر انھوں نے آواز دے کر اپنی بیٹی کو بلا لیا اور ان سے بلند آواز میں درخواست کا مضمون پڑھ کر سنانے کو کہا۔ ان کی بیٹی نے پوری درخواست ایک سانس میں سنا ڈالی اور سنا چکنے کے بعد ایک عجیب قسم کی جھجک کے تحت خانصاحب کے پلنگ کے قریب خاموش کھڑی رہ گئی۔

خانصاحب کی ٹانگ میں تکلیف کی کسک ایک بار پھر عود کر آئی تھی۔ انھوں نے اپنے گھٹنے کو سہلاتے ہوئے کہا۔

"میں نے درخواست لکھ دی ہے۔ اب یہ قصہ ہی ختم ہو جائے گا"

ان کی بیٹی نے کوئی خاص جواب نہ دیا۔ اور وہ ویسے ہی ایک ان کہی سی شرم کے جذبے سے مغلوب خاموش کھڑی رہی۔ خانصاحب نے کریدتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی نئی بات بتاؤ نا —— کوئی نیا قصہ —— ؟"

اور ان کی بیٹی فوراً سمجھ گئی کہ خانصاحب کا اشارہ کونسے قصے کی جانب ہے۔ وہ اور خانصاحب اب ایک طرح سے اس عورت کے بارے میں جو ان کے ہمسائے میں رہتی تھی یوں واحد غائب کا صیغہ استعمال کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ اور اس کے بارے میں مبہم سے مبہم اشارہ بھی فوراً سمجھ لیتے تھے لہٰذا انھوں نے دبے دبے لہجے میں قصہ سنانے کے انداز میں بولنا شروع کر دیا:۔

"وہ کالی بیوک رات گئے تک میدان میں پیپل کے قریب کھڑی رہی تھی پھر معلوم نہیں کہ جب وہ موٹر والے صاحب رات گئے یہاں سے باہر نکلے تھے تو اکیلے تھے یا کیا! ———"

خانصاحب اپنی بیٹی کی باتیں یک گونہ دلچسپی کے ساتھ سن رہے تھے۔ ان کو اس عورت کے بارے میں اس قسم کی کہانیاں سننے میں ایک لذت محسوس ہوتی تھی اور پھر یہ بھی تھا کہ اس قسم کی باتیں سننے کے بعد حکام ضلع کی خدمت میں عرضداشت روانہ کرنے کے سلسلے میں ان کا ارادہ اور بھی مستحکم ہو جاتا اس لئے ہمہ تن گوش اپنی بیٹی کی زبانی یہ نئی کہانی سننے میں مصروف ہو گئے اور جب وہ پورا قصہ سنا چکیں تو خانصاحب ایک گہری خاموشی میں مبتلا ہو گئے اور پلنگ پہ نڈھال پڑ گئے جیسے کسی گہری سوچ میں مبتلا ہوں یا شاید ٹانگ کی اس ہاتھی تکلیف نے ایک بار

پھر ان پر غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا تھا ۔

خانصاحب کی ٹانگ اب سے کچھ عرصے پہلے ایک حادثے میں زخمی ہوئی تھی اور تب سے وہ چلنے پھرنے سے معذور تھے ۔ بلکہ اب تو وہ بغیر سہارے کے اپنے پلنگ پر سے بھی نہ اٹھ پاتے ۔ اسی پلنگ پر پڑے پڑے اور اپنے جسم اور بچھونے اور دوائیوں سے پیدا ہونے والی ایک متعفن بدبو میں گھرے گھرے انھوں نے کئی مہینے گزار دیئے تھے یوں اپنے کمرے کی مختصر سی دنیا میں محدود ان میں ایک عجیب و غریب چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی جس کی مدد سے وہ بہت سی چیزوں اور انسانوں کو محض ان کی آوازوں کے ذریعہ جاننے پہچاننے لگے تھے ۔ یا پھر ان کو کبھی کبھی کسی چیز کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی اور وہ اس جھلک کی مدد سے ایک پوری تصویر تعمیر کر لیتے ۔ لیکن اکثر یوں ہوتا کہ خانصاحب کے ذہن میں آوازوں اور رنگوں کا یہ دھندلا دھندلا سا سمندر کچھ گڈمڈ ہو جاتا ۔ سب رنگ اور آوازیں آپس میں گھل مل جاتے اور پھر تاریکی اور روشنی کی پے در پے لکیریں خانصاحب کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتیں

اپنے جسم کی جانب سے خانصاحب کے ذہن میں ایک بے تعلقی سی پیدا ہو گئی تھی ۔ اب وہ اپنے جسم کو ایسے دیکھتے گویا یہ ان کا نہیں بلکہ کوئی اجنبی بے جان سی شے ہو جس پر وہ صرف ایک بے حسی کے ساتھ ہاتھ پھیر سکتے ہیں ۔ اپنے نوعمر نواسے کو درخواست کا املا لکھاتے لکھاتے خانصاحب نے جو اپنی ٹانگوں کو سکیڑنے کی کوشش کی تھی ۔ اس میں ان کی ٹانگیں گھٹنوں تک عریاں ہو گئی تھیں ۔ یہ دو ٹانگیں کسی درخت کے دو زرد زرد کھوکھلے تنوں کی مانند ان کی تہبند کے گھیر سے باہر نکلی ہوئی تھیں اور خانصاحب نے ان کی کھال کے کھردرے پن کو اپنی انگلیوں سے محسوس کرتے ہوئے سوچا کہ ان کی ٹانگیں شاید ہمیشہ یوں ہی بے کار رہیں گی ۔ یہ ٹانگیں اس منزل کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھیں جب وہ کئی کئی دن تک لگاتار گھوڑے پر بیٹھ اپنے ضلع کا دورہ کیا کرتے تھے اور ٹھنڈے یخ پانی کی جھیل میں مرغابیوں کے شکار کی تلاش میں گھنٹوں کھڑے رہتے تھے ۔ اور ان کو اپنی رانوں میں ایک بے پناہ پھرتیلا پن محسوس ہوتا تھا اور وہ دل ہی دل میں مسکرا کر اس زمانے کو یاد کرنے لگے جب وہ شہر سے دور کسی پرانی وضع کے ڈاک بنگلہ میں رات رات بھر ناچ اور گانے کی رنگین محفلوں میں مگن رہتے تھے اور گھنگھروؤں کی چھنک ، طبلے کی تھاپ کے ساتھ مدغم ہو کر ایک الف لیلوی فضا قائم کر دیتی تھی ۔۔۔۔۔ لیکن اب تو وہ اپاہج تھے اور ان کی ایک ٹانگ تو بالکل ہی بے کار ہو چکی تھی ۔ !

خانصاحب کے کمرے کی کھڑکیاں باہر میدان کی طرف کھلتی تھیں ۔ فلیٹوں کے اس احاطے میں بسنے والے مختلف چھوٹے بڑے سب کردار اس میدان میں سے گزرتے اور جب خانصاحب تکیئے کا سہارا لے کر اپنے پلنگ پر اونچے ہو کر بیٹھ جاتے تو وہ اس میدان میں کھیل کود میں مصروف لڑکے لڑکیوں کو اور شور مچا مچا کر سودا بیچنے والوں اور تیز تیز قدموں سے آنے جانے والے انسانوں کو ایک بڑے ڈرامے کے ان گنت کردار سمجھ کر بہت دیر تکتے رہتے ۔ اپنی درخواست لکھوا چکنے کے بعد خاں صاحب کو ایکا ایکی یہ خیال ستانے لگا کہ شاید آج اس میدان میں خلاف معمول بہت گہرا سناٹا چھا گیا ہے اور ڈرامے کے وہ سب کردار ایکا ایکی اسٹیج سے غائب ہو گئے ہیں ۔ ان کو یہ احساس کچھ بوجھل سا معلوم ہوا اور انھوں نے سوچا کہ اگر یہ سناٹا کچھ دیر اور قائم رہا تو شاید ان کے گھٹنے میں پھر وہی بے پناہ تکلیف بیدار ہو جائے گی ۔۔۔ لیکن چند لمحوں کے بعد کسی پنجابی گانے کے تیز تیز بول اس سناٹے کو توڑتے ہوئے ان کو سنائی دینے لگے ۔ گانے والی کی مہین سریلی آواز فضا کی خاموشی کو چیرتی ہوئی اوپر ابھرتی اور پھر ڈھولک اور سارنگی کے شور میں مدغم ہو جاتی ۔ اس آواز میں ایک طرح کا پھرتیلا پن تھا ۔ شاید اس میں ایک عامیانہ پن بھی تھا جس کی وجہ سے ان کے دماغ میں ایک سستی سی لذت کا احساس بیدار ہو گیا ۔ وہ لذت جو اب سے برسوں پہلے انھوں نے ان گانے والیوں کے گانوں میں ہی محسوس کی تھی جو گاتے گاتے لوگوں کی طرف ایک عجیب قسم کی بیباکی سے دیکھ لیتی تھیں اور جن کو دیکھ کر آپ ہی آپ یہ محسوس ہونے لگتا تھا کہ شاید یہ گاتے گاتے کوئی بہت ہی انوکھی سی بات کہہ دیں گی ۔

خانصاحب کو یقین تھا کہ گانے کی یہ عامیانہ آواز اس فلیٹ سے آ رہی ہے جس میں وہ عورت رہتی ہے ۔۔۔۔ لیکن پھر بھی اس گانے میں ایک انوکھی کشش تھی ۔ ایک ایسی کیفیت جو بے ہودہ بھی تھی اور دلکش بھی ۔۔۔۔ کتنی دیر تک آواز کا زیر و بم اس لذت آمیز کیفیت کو قائم کئے رہا ۔ یہ تو خانصاحب کو ٹھیک طور سے پتہ نہ چل سکا لیکن جب ایک مرتبہ ڈوبتے ڈوبتے اس عورت کی آواز بالکل ہی غائب ہو گئی

اور اردگرد کی خاموشی کا ایک جزو بن گئی تو وہ یکا یک چونک پڑے اور یوں چونک پڑنے پر ان کو اپنی تکلیف کا احساس ایک بار پھر ستانے لگ
اور انھوں نے ضلع کے حکام کے نام لکھی ہوئی اس عرضی کو اپنے تکیے کے نیچے سے نکال لیا۔ پھر انھوں نے اپنی نقاہت آمیز آواز میں اپنے نوعمر نواسے
کو آواز دے ڈالی۔ ان کی نحیف لرزتی ہوئی آواز کچھ دیر تو یوں ہی خاموش کمروں میں گونجتی رہی لیکن پھر کچھ دیر بعد ان کا نواسہ پیر پٹکتا ہوا نمودار
ہوگیا۔

خانصاحب نے کہا "بیٹا ذرا اس درخواست کو دوبارہ تو لکھ ڈالو۔ اس میں کسی مناسب جگہ ایک فقرہ اور بڑھا دو کہ اب کچھ دنوں سے ان
خاتون نے غالباً گانے اور ساز بجانے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ شریف گھرانوں کے ہمسائے میں رہتے ہوئے اس قسم کی حرکتیں
بہت نازیبا معلوم ہوتی ہیں ــــ !"

• • •

خانصاحب کی لڑکی بلقیس کی عمر تو اتنی زیادہ نہ تھی لیکن روزمرہ کے دھندوں میں الجھے الجھے اور ہر سال ایک بچہ پیدا کرتے کرتے اس کی جوانی
ایک فالج میں کئی منزلیں طے کر گئی تھی۔ جب اس کی شادی ہوئی تھی تو اس کا جسم دبلا اور کمزور سا تھا۔ پندرہ برس تک ایک گھٹی ہوئی زندگی بسر کرنے کے
بعد جیسے یہ جسم ٹھٹھر کے رہ گیا تھا۔ اور اس کی آنکھوں میں وہ پھیکا پن پیدا ہو گیا تھا جو آج تک اپنی جگہ قائم تھا۔ زندگی کی مسلسل الجھنوں میں گرفتار وہ ہفتوں
مہینوں اور سالوں کا حساب بھی فراموش کر گئی تھی۔

بلقیس کی زندگی ایک مختصر سے دائرے میں گزرتی۔ وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی جاگ پڑتی اور گھر کے کاموں میں جت جاتی اور پھر گویا گھر
بھر میں ایک طوفان بیدار ہو جاتا اور اس کے مختلف عمروں والے بچے اسکول جانے کی تیاریوں میں مصروف ہو جاتے۔ اس کے کام کاج میں اس
کی بڑی لڑکی تھوڑا بہت ہاتھ بٹاتی۔ اس لڑکی ناہید میں اس کو کبھی کبھی اپنی شادی سے پہلے کی ایک موہوم سی جھلک نظر آتی تھی اور اس جھلک کو دیکھ کر
اور اس جھلک کو دیکھ کر بلقیس کا دل غیر شعوری طور پر ڈوبنے سا لگتا۔ اور پھر بچوں کے اسکول چلے جانے کے بعد گھر میں ایک سناٹا چھا جاتا جس میں کبھی بچے
میدان میں سودا بیچنے والوں کی آوازیں اور کبھی خانصاحب کی نحیف و نزار آواز مخل ہو جاتی۔

ایک صبح ــــ

ــــ بچے اسکول روانہ ہو چکے تھے۔ خانصاحب ابھی تک سو رہے تھے اور گھر میں ایسی خاموشی طاری تھی جو طوفان سے پہلے فضا میں
قائم ہو جاتی ہے۔ گھر کے کاموں میں جت جانے سے پہلے بلقیس چند لمحوں کے واسطے اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی دن کا تھوڑا سا حصہ ہی گزرا
تھا لیکن تھکن کا ایک بوجھل احساس ابھی سے اس کے جسم کے ایک ایک حصہ میں سرایت کر چکا تھا۔

وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کو بخوبی معلوم تھا کہ خانصاحب نے اس کھڑکی کو بند رکھنے کی کڑی ہدایت کر رکھی
تھی لیکن پھر بھی اس نے یہ کھڑکی کھول لی تھی۔ وہ اس کھڑکی سے باہر پھیلے ہوئے میدان اور فلیٹوں کے سلسلے کو بآسانی دیکھ سکتی تھی اور اس فلیٹ کو بھی دیکھ سکتی تھی جس میں
وہ عورت رہتی تھی۔ بلقیس کو یوں خانصاحب کی مرضی کے خلاف کھڑکی سے جھانکنے میں ایک گونہ لذت محسوس ہوتی تھی۔ وہ سوچتی کہ اچھا
ہی ہے کہ خانصاحب اپاہج اپنے کمرے میں پڑے ہیں اور اس کو کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ وہ تو محض اپنے کمرے میں
پلنگ پر پڑے پڑے آوازیں ہی دے سکتے ہیں۔

لہذا بلقیس بڑی بے تعلقی کے ساتھ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگتی۔ باہر میدان میں سناٹا تھا کبھی کبھی کوئی خوانچے والا آواز لگاتا ہوا ادھر سے
گزر جاتا یا فلیٹوں کی اس بستی میں رہنے والے نوعمر بچے پیپل کی جڑوں میں کنکر پتھر تلاش کرتے کرتے خواہ مخواہ شور مچانے لگتے۔ اس عورت
کے فلیٹ میں اس وقت غیر معمولی خاموشی تھی جس کے بارے میں چند روز پہلے خانصاحب نے ایک درخواست ضلع کمشنر کی خدمت میں روانہ
کی تھی۔ اور بلقیس نے اس فلیٹ کی ویران کھڑکیوں کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا کہ اگر خانصاحب کی درخواست پر حکام ضلع توجہ نہ ہی کریں تو بہتر
ہے۔ اس عورت کے ہمسائے میں ہونے کی وجہ سے جیسے اس کو ایک مشغلہ مل گیا تھا۔ اس کو دیکھ کر اور اس کے فلیٹ میں یوں جھانک کر

بلقیس کو ایک خفیف لذت حاصل ہوتی تھی جس سے وہ پہلے بالکل ناواقف تھی اور جس کو اب وہ ہاتھ سے کھونا نہ چاہتی تھی۔

ایک مرتبہ خانصاحب نے کہا تھا کہ "یہ عورت تو بالکل رنڈی ہے رنڈی! ــــ نہ جانے ان بدبختوں کو شریفوں کے محلوں میں بسنے کی اجازت کون دے دیتا ہے!" اور اسی دن سے بلقیس کو اس عورت میں ایک بے پناہ دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔

رنڈی! ــــ بلقیس نے اب سے پہلے ایک جیتی جاگتی رنڈی نہ دیکھی تھی۔ جو سوں پہلے جب اس کے آبائی شہر میں کسی کھاتے پیتے خاندان میں کوئی شادی دھوم دھام سے منائی جاتی اور کسی نامور طوائف کے مجرے کا انتظام کیا جاتا تو وہ اور اس کی ہم عمر لڑکیاں بہت گہرے اشتیاق کے ساتھ مجرے کے وقت کا انتظار شروع کر دیتیں اور ان کے دلوں میں گھنٹوں ایک بے وجہ پھڑپھڑاہٹ سی ہوتی رہتی۔ لیکن ناچ کے وقت سے پیشتر ہی اس کی اماں اور خالائیں اس کو اور اس کی ہم عمر اور سب لڑکیوں کو ہنکا ہنکا کر ایک تاریک سے کمرے میں بٹھا لیتیں اور پھر اس کو محض دور سے طبلے، سارنگی اور ہارمونیم کے ملے جلے سُر مدھم مدھم سے سنائی دیتے رہتے ــــ لیکن اس وقت وہ بالکل آسانی کے ساتھ اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر اس عورت کو دیکھ سکتی تھی جس کو خانصاحب نے رنڈی کہا تھا۔

اس عورت کے گھر کا نقشہ بالکل ایسا تھا جیسا کہ بلقیس کا اپنا گھر تھا۔ پچھلی جانب سونے کا کمرہ تھا جس کی دونوں کھڑکیوں کے پٹ بند تھے۔ اس کے سامنے ایک اور کمرہ تھا جس میں ایک بڑا سا دیوان اور ایک پرانا صوفہ سیٹ تھا۔ کھڑکی کے قریب ہی ایک پیانو رکھا تھا جس پر پرانے رسالوں کا ایک بے ترتیب ڈھیر تھا۔ اور سامنے کی دیوار پر رنگین تصویریں آویزاں تھیں۔ بلقیس کو اس کمرے کی ایک ایک چیز میں ایک دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے ان میں کوئی گہرا راز مخفی ہو۔ شاید اس عورت کی قربت کی بنا پر اس کے گھر کی تمام اشیا میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی تھی جو اب سے پہلے بلقیس نے کسی اور گھر میں کبھی محسوس نہ کی تھی۔ کمرے کے آگے ایک کشادہ برآمدہ تھا جس میں دو تین بید کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کرسی کے میلے سے گدیلے پر دو موٹی موٹی بلیاں سو رہی تھیں جیسے یہ کرسیاں ان کے لئے مخصوص کر دی گئی ہوں اور وسط میں ایک نچلی سی گول میز پر پیتل کا ایک پھولدان رکھا ہوا تھا۔ اس وقت برآمدے میں بھی گہرا سناٹا تھا جیسے یہاں کی فضا کسی کی منتظر ہو۔ اور بلقیس نے اپنے کمرے کی کھڑکی میں سے اس پورے کمرے کا جائزہ لے چکنے کے بعد اپنے آپ سے کہا "نہ جانے یہ سب چیزیں کس بات کی منتظر ہیں؟ وہ عورت کہاں ہے جسے خانصاحب نے رنڈی کہا تھا ــ؟"

اور یکایک بلقیس کو اپنے گھر کے برآمدے کا خیال آیا جس میں محض دو جھلنگی چارپائیاں بچھی رہتی تھیں اور ایک کونے میں الگنی پر بچوں کے کپڑے پڑے سوکھتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ اس نے سوچا تھا کہ اس برآمدے کی ہیئت کو ذرا بہتر بنانے کی کوشش کرے لیکن پھر دو روز بعد ہی اس کی وہی درگت بن گئی تھی اور خانصاحب نے اپنے پلنگ پر لیٹے لیٹے کہا تھا "کیا ضرورت ہے ہر جگہ کو سجا کر رکھنے کی۔ رنڈیوں کے کوٹھوں کی طرح! ــــ"

رنڈیوں کے کوٹھے! ــــ ان کا تذکرہ بلقیس نے بچپنے سے سن رکھا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ اپنے آبائی شہر میں اپنی اماں اور بہنوں کے ہمراہ اس علاقے سے گزرتی جس میں رنڈیوں کے کوٹھے آباد تھے تو اس کا بے اختیار جی چاہنے لگتا کہ وہ نظر اٹھا کر ان کوٹھوں کو دیکھ لے لیکن اس کا دل بری طرح دھڑکنے لگتا تھا اور اس کی اماں تانگے پر منڈھے ہوئے پردے کو اور بھی ہموار کر دیتی تھیں ــــ اور وہ ان کوٹھوں کو دیکھنے کی حسرت کبھی بھی پوری نہ کر پائی! ــــ لیکن اب اس وقت وہ اطمینان کے ساتھ کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے ویسا ہی ایک کوٹھا تھا۔ موتیوں کے جھالردار پردوں کی جگہ گلابی پھولدار کپڑے کے پردوں نے لے لی تھی۔ اور ہارمونیم کی جگہ پیانو رکھا ہوا تھا ــــ اور ان سب چیزوں کے درمیان گھری ہوئی وہ عورت تھی جس کو خاں صاحب نے رنڈی کہا تھا۔

بلقیس نے اپنے آپ سے پوچھا "نہ جانے وہ رنڈی کہاں ہے؟" اور پھر جیسے اس سوال کے جواب میں ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں کے گلابی پردوں کے پیچھے ایک سرسراہٹ پیدا ہو گئی۔ ان پردوں کے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔ شاید یہ وہی عورت تھی لیکن اس وقت وہ محض ایک مدھم سے سلوٹ کے طور پر نظر آ رہی تھی۔ پھر بھی پردوں کے پیچھے اس کی آہٹ سن کر بلقیس کو اپنے دل میں ایک بے وجہ بے چینی محسوس ہونے لگی

اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بہت سے سوال اس عورت کے بارے میں اس کے دل میں پیدا ہوتے رہتے تھے اس وقت آپ ہی آپ حل ہو جائیں گے۔ اور بلقیس کو یہ تصور دلکش بھی معلوم ہوا اور خطرناک بھی!

"بلقیس"۔ وہ یکایک چونک پڑی۔ دوسرے کمرے سے خانصاحب اپنی مخصوص خفیف آواز میں اس کو پکار رہے تھے اور وہ اس عورت کو دیکھنے میں محو تھی جس کو انھوں نے رنڈی کہا تھا۔ ایک لمحے کے واسطے بلقیس کا بے تحاشا جی چاہا کہ وہ خانصاحب کو یوں ہی پکارنے دے اور خود خاموش کھڑی اس کھڑکی سے باہر دیکھتی رہے کیونکہ اس منظر میں اس کو ایک بے پناہ راز مضمر نظر آرہا تھا۔ اور اس کے شعور میں اس راز کو جان لینے کی زبردست خواہش بھی پیدا ہو چکی تھی۔ لیکن خانصاحب نے اس کو دوسری بار پھر پکارا۔ اور پھر تیسری بار ان کی کمزور کپکپاتی ہوئی آواز اس کے خیالات میں مخل ہو گئی۔ اور اس نے ایک للچائی ہوئی نگاہ گلابی پردوں پر ڈالی جن کے پیچھے ایک مدھم سا سلوٹ اب بھی متحرک تھا۔ اور پھر وہ دبے پاؤں خاں صاحب کے کمرے کی طرف چلی آئی۔

خاں صاحب نے کہا "ذرا اگالدان قریب کر دو" اور ان کا فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی بلقیس نے کاغذ کے ایک ٹکڑے سے پکڑ کر پلنگ کے نیچے رکھا ہوا اگالدان اٹھا لیا اور ایک مکروہ گھناؤنی بدبو کا بھبکا اس کے نتھنوں سے ہو کے ساتھ اس کے دماغ کے اندر تک پہنچ گیا یہ بدبو اب ایک عرصے سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ کئی مہینے پہلے جب خاں صاحب حادثے کا شکار ہو کر اس کمرے میں مقید ہو گئے تھے تو یہ کراہت آمیز بدبو آپ ہی آپ ہویدا ہو گئی تھی۔ اتنے عرصے میں شاید اس کو اس بدبو کا عادی بن جانا چاہئیے تھا لیکن اب بھی جب بدبو کے یہ بھبکے اس کے نتھنوں اور حلق سے ہوتے ہوئے اس کے وجود کے اندر تک سرایت کر جاتے تو اس کو غیر شعوری طور پر ایک پھریری سی آجاتی اور وہ سوچتی کہ ان گلابی پردوں کے پیچھے یہ بدبو تو نہ ہوگی۔ بلکہ شاید ان پردوں کے پیچھے تو ایک خاص قسم کی تیز سی خوشبو بسی رہتی ہوگی۔ جیسی کبھی کبھار اس کو بازار میں چلتے ہوئے کسی عورت کے قریب سے گذر جانے پر محسوس ہوتی تھی۔ خوشبو کا لطیف جھونکا جو دل اور دماغ اور روح تک پر اثر کر جاتا تھا — اس خوشبو اور خاں صاحب کے کمرے کی کراہیت آمیز بدبو کے درمیان کس قدر فاصلہ تھا اور اس وقت وہ خانصاحب کے کمرے کی بدبودار فضا میں گھری کھڑی تھی اور اس کا ذہن سرسراتے ہوئے پردوں اور خوشبو کے ان لطیف جھونکوں سے بہت دور بھٹک آیا تھا۔

اور پھر جب وہ خانصاحب کے کمرے کے باہر چلی آئی تب بھی وہ بوجھل بدبو اس کا تعاقب کرتی رہی اور جب وہ واپس اپنے کمرے میں پہنچ گئی تب بھی وہ اس کے اعصاب پر سوار رہی اور اس کے تصور کو خواہ مخواہ ایک طرح کی بے بسی نے گھیر لیا۔ وہ دوبارہ اپنی کھڑکی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی اور اب اس نے دیکھا کہ پیانو کے قریب ایک دبیز سے اسٹول پر وہی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے بال دو بھوری بھوری گیندوں کی مانند اس کی گردن کی دونوں طرف جھول رہے تھے اور ایک باریک جنت کیا ہوا دوپٹہ اس کے کاندھوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے خد و خال میں تو کوئی خاص دلکشی نہ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی چمک تھی جیسے ان میں دو ننھے ننھے قمقمے روشن ہوں۔ اس عورت کی پھرتیلی انگلیاں پیانو کے پردوں سے کھیل رہی تھیں اور ایک پرانے پنجابی گیت کی دھن پیانو کے پردوں سے نکل نکل کر تمام فضا میں پھیلتی چلی جا رہی تھی۔

اس پنجابی گیت سے تو بلقیس پوری طرح واقف نہ تھی لیکن اس کی دھن سے وہ خوب مانوس تھی۔ کبھی کبھار جاڑوں کی راتوں کے سناٹے میں فقیروں کی ایک ٹولی فلیٹوں کی اس بستی کی طرف نکل آتی۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی انگیٹھیاں ہوتیں اور سر سے پاؤں تک وہ موٹے موٹے عنابی لبادوں میں لپٹے ہوتے۔ اور پھر بیچ میدان میں پیپل کے درخت کے قریب کھڑے ہو کر وہ یہی گیت الاپنا شروع کر دیتے لوہے کے دست پنے گیت پر تال دیتے رہتے۔ اور ان کی آوازیں فلیٹوں کی اس بستی میں گونجتی رہتیں اور دیواروں سے سر ٹکتی رہتیں — اور اب اس وقت یہ عورت پیانو پر یہی نغمہ بجا رہی تھی۔ حالانکہ فلیٹوں کی اس بستی اور فقیروں کی اس دھن کے درمیان ایک ابدی خلیج حائل تھی۔

بلقیس نہ جانے کتنی دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑی رہی اور ارد گرد کی فضا سے بے خبر اور خانصاحب کی نحیف لرزتی ہوئی آواز سے بے خبر اور گھر کے لاتعداد کاموں سے بے نیاز، پیانو کے پردوں سے نکلتے ہوئے اس نغمہ کو سنتی رہی ـــــ اور پھر ایکا ایکی وہ نغمہ غائب ہو گیا۔ اس عورت نے بے دلی کے ساتھ پیانو کا بجانا بند کر دیا ۔ اور بلقیس کھڑکی کے پاس کھڑی کھڑی بالکل چونک اٹھی۔

"ناہید کہاں ہے ؟" ــ وہ عورت سامنے کی کھڑکی میں کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں کے قمقمے شاید اور بھی چمک اٹھے تھے ۔ اس کے بالوں کی گیندیں آہستہ آہستہ جھول رہی تھیں ۔ اور بلقیس کو پتہ بھی نہ چلا کہ وہ کس وقت پیانو کے پاس سے ہٹ آئی تھی۔ بلقیس نے دیکھا کہ اس کے چہرے میں ایک انوکھا بھولپن ہے ۔ ایسا بھولپن جواب سے پہلے بلقیس نے صرف بہت کم عمر لڑکیوں کے چہروں میں دیکھا تھا ۔ وہ بھولپن جو شاید اس کی اپنی لڑکی ناہید کے چہرے پر تھا ، اور اب وہ عورت مسکرا مسکرا کر اس سے پوچھ رہی تھی" ناہید کہاں ہے" ؟

ناہید جو اس کی سب سے بڑی لڑکی تھی ۔ جس کی عمر ابھی صرف پندرہ برس کی تھی ۔ اور جس کو وہ اس عورت کی پرچھائیں سے بھی دور رکھنا چاہتی تھی لیکن یہ عورت تو بے تکلفی کے ساتھ ناہید کو پوچھ رہی تھی ۔ اور بلقیس بالکل سناٹے میں آگئی ۔ خاں صاحب نے اس کھڑکی کو بند رکھنے کی سخت ہدایت کر رکھی تھی لیکن پھر بھی اس کھڑکی کو بند نہ رکھنے میں بلقیس کو ایک بے پناہ لذت محسوس ہوتی تھی ۔ اور اب وہ عورت بالکل اطمینان کے ساتھ سامنے والی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ جیسے وہ بلقیس کے دماغ میں دوڑتے ہوئے خیالات سے بالکل بے خبر ہو وہ شاید اس درخواست سے بھی بے خبر تھی جو چند روز پہلے خاں صاحب نے ضلع کمشنر کی خدمت میں روانہ کی تھی ۔ اور ان سب باتوں سے بے خبر وہ اس کے بالکل سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی، اور مسکرا مسکرا کر اس سے پوچھ رہی تھی" ناہید کہاں ہے ؟ "

بلقیس کو بے وجہ طور پر اس سے بات کرتے ہوئے ایک شدید قسم کی جھجک محسوس ہوئی ۔ اب سے پہلے اس نے کسی رنڈی سے بات نہ کی تھی اور اس عورت کو خانصاحب نے رنڈی کہا تھا ۔ اس وقت خاں صاحب اپنی نحیف اور کپکپاتی ہوئی آواز میں کھنکھار رہے تھے ۔ شاید تھوڑی دیر میں وہ اس کو پکارنے لگیں گے اور وہ ایک بار پھر ایک متعفن ' بدبودار کمرے میں مقید ہو جائے گی اور اس عورت کی مسکراہٹ سے بہت دور پہنچ جائے گی ـــــ اور بلقیس نے ایکا ایکی کسی نامعلوم جذبہ کے تحت اپنی کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے ۔ اس نے اس عورت کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا اور اس کے کمرے میں ایکدم سے گہرا سناٹا چھا گیا ۔ وہ دبے دبے قدموں سے اپنی کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی جیسے اب وہ اپنی آہٹ بھی اس عورت کو نہ سنانا چاہتی ہو اور پھر ایکدم سے اس کا دل بیٹھنے لگا جیسے وہ کسی بہت ذہنی بوجھ کے نیچے دب کے رہ گیا ہو ـــــ اور وہ اپنے پلنگ پر اوندھی گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔

● ● ●

ناہید اپنی کلاس میں بیٹھی تھی

بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے سفید سفید حروف ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے اور یوں بھاگتے بھاگتے وہ ایک بہت بڑے سمندر میں غائب ہوتے جا رہے تھے ۔

ناہید کے قریب بنچ پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں جو برابر آپس میں کھسر پھسر کئے جا رہی تھیں ۔ ان میں سے ایک کی گود میں فلمی رسالہ کھلا ہوا تھا ۔ اور ماں کی مسلسل کھسر پھسر بار بار ناہید کے دوڑتے ہوئے خیالات میں حائل ہوئے جا رہی تھی اور بلیک بورڈ پر لکھے ہوئے موٹے موٹے حروف آپس میں گڈ مڈ ہو جاتے اور اس کے شعور کے قابو سے باہر نکل جاتے ۔ لیکن اگر وہ ان کو اپنے قابو میں نہ رکھے تو وہ کبھی بھی اسکول میں کوئی سبق پورے طور سے نہ سیکھ سکے گی ۔ اور اس کی ماں کی بہت سی ان کہی خواہشیں ادھوری ہی رہ جائیں گی ۔ اور وہ پڑھ لکھ کر اس طلسم کو نہ توڑ سکے گی جس میں آج تک اس کی ماں ان کا نام گھر اور گھر کا نام ماحول نہ جانے کتنی صدیوں سے پھنسے رہے تھے ـــــ اس لئے ناہید نے اپنی پوری قوت ارادی صرف کر کے ان موٹے موٹے سفید حروف کا تعاقب کرنا شروع کر دیا اور ٹیچر کی آواز پر اپنا ذہن مرکوز کر دیا ـــــ لیکن پھر وہی اس کے برابر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کی کھسر پھسر آپ ہی آپ اس کے خیالات میں حائل ہو گئی ـــــ اور پھر وہی توجہ اور بے توجہی کا لامتناہی سلسلہ !

ناہید کے تھکے ہوئے ذہن میں ایک گیت کے الفاظ گونج رہے تھے ۔ گیت کے یہ بول بھی اس کی گرفت سے باہر تھے اور اس کی بے دلی

لمبی لمبی انگلیاں بھی اس کے قابو میں نہ رہتیں جتنیں اور پیانو کے پردوں پر تو جیسے وہ بالکل ہی اٹک کے رہ جاتیں جیسے ان کی تمام قوت کسی نے سلب کرلی ہو اور واقعی شاید باجی نے اس قوت کو ناہید سے چھین لیا تھا — اب اس نے بمشکل تمام پیانو کے پردوں کے اس تصور کو بھی اپنے ذہن سے نکال پھینکا اور ایک مرتبہ پھر بلیک بورڈ پر لکھی ہوئی عبارت پر اپنی نظروں کو گاڑ کے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ حروف اپنی اپنی جگہ قائم رہے لیکن چند لمحوں بعد وہ پھر بکھر گئے اور آپس میں گڈمڈ ہونے شروع ہو گئے — پیانو کے سفید سفید پردوں سے نکلتے ہوئے سروں کی طرح!

ٹیچر نے کہانی سنانے کے انداز میں پرانی دیو مالا میں سے کوئی قصہ سنانا شروع کر دیا اور ان کی خشک کھردری آواز کلاس روم پر حاوی ہو گئی انھوں نے کہا۔

"اگلے وقتوں میں ایک بادشاہ صاحب کی سات بیٹیاں تھیں۔ ہر ایک بیٹی اپنی اپنی جگہ چاند ستاروں سے زیادہ خوبصورت —!"

— بادشاہ کی سات بیٹیاں! — گانے کے سات سُر —! — اور پھر یہ ساتوں کے ساتوں سر ناہید کے گلے میں پھنس کر رہ جاتے۔ ایک بھی سر پورے طور سے ادا نہ ہوتا۔ ناہید اکیلی ہوتی تو آپ ہی آپ گنگنانے لگتی اور یہ سوچتی کہ شاید اب کی بار وہ ساتوں سروں کو ٹھیک طور سے الاپ لے گی لیکن پھر جب وہ عورت جو اس کے گھر کے قریب فلیٹ میں رہتی تھی اور جس کو وہ خفیہ طور پر باجی کہتی تھی اور جس کے گھر میں اس کو اپنے گھر کی کھڑکیوں میں سے جھانکنے تک کی ممانعت تھی اس سے کہتی کہ "چلو اپنا سبق دُھراؤ!" تو ایک ایک سر بری طرح اپنی جگہ منجمد ہو کے رہ جاتا اور آنسو اس کے حلق میں رندھ آتے اور وہ سوچتی کہ وہ کبھی بھی ان ساتوں سروں کو ادا نہ کر سکیگی!

ٹیچر کی آواز ایک بار پھر کلاس روم پر حاوی ہونے لگی۔" — بادشاہ کی ساتوں بیٹیاں جب جوان ہو گئیں تو اس کو ان کی شادی کی فکر پیدا ہوئی وہ دن رات اسی فکر میں کھویا رہتا! —" اور ناہید کے دماغ میں گویا یہ آواز چرکے دینے لگی۔ اس نے سوچا کہ ہر ایک کو کوئی نہ کوئی فکر رہتی ہے باجی کو، اس کی اماں کو، خانصاحب کو، خود اس کو' — باجی کو اس بات کی کہ ان کے ہمسائے تمام وقت اپنے فلیٹ کی کھڑکیاں بند رکھتے ہیں۔ اس کی ماں کو اس بات کی کہ نہ جانے ناہید اس طلسم کو توڑنے میں کامیاب بھی ہوگی یا نہیں جو کئی صدیوں سے ان کے خاندان کو جکڑے ہوئے تھے۔ اور خانصاحب کو اس بات کی کہ نہ جانے ضلع کمشنر صاحب ان کی درخواست پر توجہ بھی کریں گے کہ نہیں اور خود اس کو اس بات کی کہ گانے کے ساتوں سر اس کے حلق میں پھنس کر رہ جاتے ہیں —!

ٹن ٹن — ٹن ٹن! گھنٹی بج گئی اور ناہید ایکدم چونک پڑی۔ کلاس روم میں ایکا ایکی لڑکیوں کا شور بہت بلند ہو گیا۔ اس کے برابر بیٹھی ہوئی لڑکی نے اپنے فلمی رسالے کو لپیٹ کر اپنے بستے میں ٹھونس دیا اور وہ سب کی سب ایسے کھڑی ہو گئیں جیسے وہ ایک عرصے سے اسی لمحے کی منتظر تھیں اور ناہید نے سوچا کہ اچھا ہی ہے کہ آج کے سالانہ کھیلوں کی وجہ سے اسکول کی چھٹی جلدی ہو گئی ہے اور اب وہ دن کا باقی حصہ باجی کے ساتھ بسر کر سکتی ہے اور گھر روزمرہ کے وقت کے مطابق پہنچ جائے گی۔

باجی کے فلیٹ میں گہری خاموشی تھی۔ باجی اس کو برآمدے میں نظر نہ آئیں، وہ اس کمرے میں بھی نہ تھیں جس میں بڑا سا آبنوسی رنگ کا پیانو رکھا ہوا تھا اور وہ اس کمرے سے بھی آگے بڑھ کر باجی کے سونے کے کمرے میں پہنچ گئی۔ باجی ایک آرام کرسی میں دھنسی ہوئی آنکھیں بند کئے بیٹھی تھیں۔ بالکل ان تصویروں کی مانند جو ناہید نے اکثر فلمی رسالوں میں دیکھی تھیں اور اس نے سوچا کہ وہ یونہی آنکھیں بند کئے بیٹھی رہے تو اچھا ہے لیکن پھر فوراً ہی باجی نے آنکھیں کھول دیں اور ناہید کو ایسے دیکھنے لگیں جیسے وہ ناہید نہ ہو بلکہ کوئی اجنبی ہو۔ اور ناہید کچھ جھینپ سی گئی۔ اس نے اپنی جھینپ کو چھپاتے ہوئے کہا " اسکول میں آج سالانہ کھیلوں کی وجہ سے جلدی چھٹی ہو گئی اس لئے میں نے سوچا کہ باقی وقت مزے سے یہاں گزار سکتی ہوں!"

باجی کے چہرے پر ان کی مخصوص مسکراہٹ لوٹ آئی۔ انھوں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا:-

"تم ہمیشہ چوری سے یہاں آتی ہو۔ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو —؟!"

ناہید نے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ اس کے دل کو یقین تھا کہ کسی کو کبھی بھی پتہ نہ چل سکے گا اور وہ ایسے ہی چھپ کر باجی کے فلیٹ میں آتی رہے گی

اور اس کی بے ڈول انگلیاں، پیانو کے پردوں سے جھگڑتی رہیں گی۔ پھر وہ اور باجی اٹھ کر اس کمرے میں چلی آئیں جہاں زہبے مہنگم پیانو رکھا ہوا تھا اور باجی نے احتیاط کے ساتھ کھڑکی پر پردوں کو جما دیا اور خود پیانو کے پاس اسٹول پر بیٹھ گئیں۔ ان کی انگلیاں بے دلی کے ساتھ پیانو کے پردوں سے کھیلنے لگیں۔ ناہید کی نگاہیں خواہ مخواہ ان انگلیوں پر جم کے رہ گئیں۔

ایکا ایکی باجی نے پیانو بجانا بند کر دیا۔ اور اسٹول گھما کر ناہید کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئیں۔ انھوں نے کہا:۔

"ناہید میں شام کو یہاں سے چلی جاؤں گی!"

ناہید حیران رہ گئی۔ جب سے اس نے سنا تھا کہ خانصاحب نے ایک درخواست ضلع کمشنر کو بھیجی تھی۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں باجی ان کے پڑوس سے اٹھ کر نہ چلی جائیں اور اس نے ایک دو بار یہ بھی سوچا تھا کہ وہ ان کو درخواست کے بارے میں بتا دے لیکن پھر کسی نامعلوم جذبہ کے ماتحت وہ چپکی رہی تھی۔ اب باجی کے اس اعلان پر وہ سناٹے میں آگئی۔ اس نے پوچھا "کیوں!"

باجی نے کہا "سب باتیں بچوں کو بتانے کی نہیں ہوتیں!"

ناہید کو باجی کا یہ جواب بہت اونڈا سا معلوم ہوا اور وہ جھنجلا کر خاموش ہو گئی۔ اور باجی اس کے سامنے بیٹھی مسکراتی رہیں۔ وہ ہمیشہ باجی کی مسکراہٹ کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہتی لیکن اس وقت اس نے اپنی قوت ارادی پر پورا بھروسہ کرتے ہوئے کہا:۔

"باجی میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں!"

باجی اس کی بات سن کر سناٹے میں آگئیں۔ خود ناہید بھی اپنی بات پر سناٹے میں آگئی اور اس کے حلق میں کوئی چیز اٹکنے سی لگی پھر وہ باجی کی نظروں سے بچنے کی غرض سے ان کے سامنے سے ہٹ آئی اور کھڑکی کے قریب آن کر کھڑی ہو گئی اور پردہ کو بغیر کھسکائے باہر کی طرف تکنے لگی۔ پردے میں سے وہ اپنے فلیٹ کو مدھم مدھم سا دیکھ سکتی تھی۔

اس کی اماں کے کمرے کی کھڑکیوں کے پٹ بالکل کھلے ہوئے تھے اور کبھی کبھی کوئی آہٹ اس کو اس کھڑکی کے ذریعہ سنائی دے جاتی یا پھر کبھی کبھی کوئی سایہ اس کھڑکی کے قریب آ کر ٹھٹک جاتا لیکن ایک لمحہ بعد ہی وہاں سے ہٹ جاتا اور ناہید کچھ دیر تک سایوں کو ایسے دیکھتی رہی جیسے یہ سب کسی ڈرامے کے کردار ہوں لیکن پھر یہ ڈرامہ کچھ دھندلا سا گیا کیونکہ اس کی آنکھوں میں آنسو رندھ آئے تھے اور پھر جب باجی بھی اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئیں تو وہ بمشکل اپنے کو ان کی نظروں سے بچا سکی۔ وہ اپنی آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسوؤں کو باجی کو نہ دکھانا چاہتی تھی پھر اس نے بے وقوفوں کی طرح اپنی بات کو دہرایا "باجی میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں!"

باجی نے کہا "تم کہاں چلوگی"

اور ناہید کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ اور باجی بھی اپنی جگہ خاموش ہو گئیں جیسے وہ سوچ رہی ہوں کہ اگر وہ اس سوال کا جواب نہ ہی دے تو اچھا ہو! ــــ ناہید کو اب یقین سا ہو چلا تھا کہ باجی کو خانصاحب کی درخواست کا علم ہو گیا ہے اور اسی لئے شاید وہ آج یوں کھوئے کھوئے سے انداز میں باتیں کر رہی تھیں۔

ناہید اور باجی کچھ دیر تک خاموش کھڑکی کے پاس کھڑی رہیں اور برابر والے فلیٹ میں سایوں کو چلتے پھرتے دیکھتے رہے۔ خانصاحب کے بڑبڑانے کی آواز بھی بار بار ان کو سنائی دے جاتی۔ آج وہ کچھ معمول سے زیادہ ہی بڑبڑا رہے تھے۔ اور ان کی آواز میں ایک ہذیان کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور ناہید نے سوچا کہ شاید آج ان کی ٹانگ کی تکلیف کی شدت میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے۔

"ضلع کمشنر ــــ ضلع کمشنر! ـ شاید میری درخواست ــــ!"

خانصاحب کی آواز فلیٹوں کے سناٹے میں لرزتی ہوئی ایک دم سے غیر معمولی طور پر بلند ہو کر سنائی دینے لگی۔ وہ آواز جو اکثر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ ڈوبنے کے بعد پھر نہیں ابھرے گی اس وقت فلیٹوں کے اس سناٹے کو یوں توڑ رہی تھی جیسے اس میں ایک مافوق الانسانی قوت پیدا ہو گئی ہو اور خانصاحب کی آواز باجی کے فلیٹ تک سنائی دے رہی تھی۔

"ضلع کمشنر —— میری درخواست! میری بیٹی! اب — اب — !"

"اب کیا ہوگا؟" ناہید کے تحت الشعور میں بھی یہ سوال پیدا ہوگیا۔ اور شاید باجی کے ذہن میں بھی یہی سوال گردش کر رہا تھا کیونکہ وہ بھی معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن شاید وہ دونوں اس سوال کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں تھے

باجی نے کھڑکی کے پاس سے ہٹتے ہوئے کہا

"شاید آج خانصاحب کی ٹانگ کی تکلیف بہت زیادہ بڑھ گئی ہے!"

"ہاں شاید" ناہید نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ذرا جا کے تو دیکھو! بڑھاپے میں ایسی تکلیفیں اور بھی زیادہ ناقابل برداشت بن جاتی ہوں گی۔ بچوں کی طرح بوڑھے لوگوں کو بھی اپنی تکلیف ضرورت سے زیادہ ہی محسوس ہوتی ہو!"

ناہید جس کو ابھی تک خانصاحب کے بڑبڑانے پر محض ایک کوفت سی محسوس ہو رہی تھی باجی کی بات پر ایک کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ وہ صحیح طور پر اندازہ لگانے سے معذور تھی کہ باجی کو اس درخواست والی بات کا علم ہو گیا ہے کہ نہیں۔ اور برابر والے فلیٹ سے خانصاحب کے بڑبڑانے کی آواز چلی آ رہی تھی:۔

"کمشنر صاحب بہادر — میری درخواست' — میری بیٹی —— !"

باجی اب پھر پیانو کے پاس جا کر بیٹھ گئی تھیں اور ان کی انگلیاں بے اختیار طور پر پیانو کے سفید کالے پردوں سے کھیل رہی تھیں۔ ناہید نے سوچا کہ یہ باجی بھی عجیب آدمی ہیں۔ اگر وہ ان کی جگہ ہوتی تو ضرور کڑوی کڑوی باتیں کرنے لگتی —— اور وہ ڈرائنگ روم سے نکل کر بوجھل قدموں سے زینے کی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی نیچے اتر گئی اور پیانو کی آواز اس کا بے دلی کے ساتھ تعاقب کرتی رہی۔

اماں اور ان کے بچے سب کے سب خانصاحب کے کمرے میں جمع تھے۔ خانصاحب خود اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کئے پڑے تھے اور شاید ان دیکھے آدمیوں سے ایک بحث میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کے ماتھے پر ایسی شکنیں تھیں جیسے کہ وہ بہت تکلیف میں ہوں۔ یا شاید ان پر غصہ سوار تھا۔ وہ بار بار اپنے جسم کا زور لگا کر کہتے:۔

"تم نہیں جانتے' — تم نہیں جانتے — میں خانصاحب شرافت شیر خاں ہوں۔ گورنمنٹ پنشنر۔ میں نے صاحب بہادر کی خدمت میں ایک درخواست بھیجی تھی اور اب —— !"

اب کیا ہوگا؟ ناہید نے پھر ڈرتے ڈرتے اپنے سے یہ فضول سا سوال کیا اور پھر اپنی ماں کے پاس خاموش کھڑی ہو گئی اور بے تعلقی کے ساتھ خانصاحب کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو تکنے لگی۔ بلقیس بالکل خاموش تھی جیسے اس وقت وہ اپنے منہ سے ایک لفظ بھی نکالتے ہوئے خائف ہو اور ناہید بار بار اپنے آپ سے یہی بے معنی سوال کر رہی تھی۔ "اب کیا ہوگا؟" اس کی اماں خاموش ضرور تھیں لیکن ان کے چہرے پر ایک گہرا اضطراب تھا جیسے وہ اب بہت تھک چکی ہوں اور اس سے زیادہ تھکن برداشت کرنے سے معذور ہوں یا جیسے اب وہ خانصاحب کے پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے اگالدان اور بیڈ پین اٹھانے اور رکھتے رہنے سے بالکل عاجز آ چکی ہوں۔

خانصاحب کی ٹانگ کی تکلیف بہت شدید تھی۔ ان کے جسم میں ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی تھی اور وہ برابر ہذیان بک رہے تھے۔ پھر ایکا ایکی انھوں نے بہکی باتوں کا سلسلہ منقطع کر دیا اور پھر انھوں نے اپنے جسم کی تمام قوت صرف کر کے اپنی دونوں ٹانگیں سکیڑنے کی ناکام کوشش کی جیسے بلی کسی درخت پر سے چھلانگ لگانے کی تیاری کر رہی ہو لیکن ان کی اپاہج ٹانگ میں کوئی جنبش نہ ہوئی وہ ویسے ہی کانپ کے رہ گئی اور ان کے چہرے کے خدوخال میں ایک بھیانک کیفیت جھلک آئی۔ ناہید نے اب سے پہلے خانصاحب کو اس قدر تکلیف میں نہ دیکھا تھا بلکہ اس نے اپنی زندگی بھر میں کسی کو اتنی تکلیف میں نہ دیکھا تھا۔ اس کی اماں اور ننھے ننھے بھائی بہن خانصاحب کے پلنگ کے گرد ششدر کھڑے تھے۔ اس کو یہ تمام منظر بالکل ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا اور وہ بغیر کچھ کہے اپنے بھائی بہنوں کو ساتھ لے کر خانصاحب کے کمرے سے باہر چلی آئی۔

خاں صاحب کے کراہنے کی آواز اس کے کانوں کے پردوں پر ہتھوڑے برساتی رہی۔ اپنی اماں کے کمرے میں پہنچ کر ناہید کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس کمرے کی کھڑکیاں چوپٹ کھلی ہوئی تھیں اور باجی کے فلیٹ کے اندر تک کا حصہ کھڑکی میں سے نظر آرہا تھا اور وہ سیدھی جاکر اس کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس نے دیکھا کہ باجی نے اپنی کھڑکی کے سامنے سے پردے کو سرکا دیا تھا اور وہ بھی بالکل اس کے سامنے کھڑکی میں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کو یوں اپنے بالکل مقابل دیکھ کر ناہید تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹکی سی گئی کیونکہ اس کو خیال آیا کہ اگر اس کی اماں نے اس کو یوں باجی کے بالکل سامنے کھڑا دیکھ لیا تو نہ جانے کیا ہوگا لیکن پھر بھی بےتعلقی کے ساتھ کھڑکی کے قریب کھڑی رہی اور خاموشی کے ساتھ باجی کو تکنے لگی۔ اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ آواز دے کر باجی سے باتیں شروع کردے۔ پھر تھوڑی دیر بعد خود باجی نے ہی اس بوجھل سکوت کو توڑ ڈالا۔ انھوں نے کہا "کیوں کیسے ہیں خانصاحب؟"

"شاید ان کو بہت تکلیف ہے۔ بالکل بے حال ہوئے جا رہے ہیں — شاید وہ ——" لیکن ناہید آگے کچھ نہ کہہ سکی کیونکہ آواز اس کے حلق میں جم کر رہ گئی۔

باجی نے کہا

"تمہاری اماں تو بہت پریشان ہونگی۔ اگر وہ چاہیں تو میں آن کر ان کا ہاتھ بٹا دوں ——"

اور باجی کی یہ بات سن کر ناہید کو بےحد جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ باجی کو پہلے ہی وہ درخواست والی بات بتا دیتی تو اچھا ہوتا۔ تب وہ شاید خانصاحب اور اماں کی ذہنیت کو پوری طرح سمجھ لیتیں اور ایسا فضول سا سوال نہ کرتیں۔ بہر حال اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس وقت وہ باجی کی بات کا کیا جواب دے۔ اور وہ ہکلا ہکلا کر کہنے لگی "نہیں باجی آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں —— شاید —— اب وہ ٹھیک ہو ہی جائیں گے" اور پھر جذبات کا ایک ریلا اس کے دماغ میں اُمڈ آیا۔ اس کو یوں باجی کے سامنے بیوقوفوں کی طرح کھڑے رہنا نہایت ہی عجیب معلوم ہونے لگا اور وہ سوچنے لگی کہ شاید ان دونوں فلیٹوں کے درمیان ایک لمبا چوڑا فاصلہ حائل ہے جو وہ کبھی بھی عبور نہ کرسکے گی اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "باجی —— آپ — آپ —— یہاں سے ہٹ جائیے گا —"

"باجی تو شاید ناہید کے جذبات کے بہاؤ سے بےخبر تھیں۔ وہ ویسے ہی کھڑکی میں کھڑی مسکراتی رہیں اور ناہید خود کو ویسا ہی بےوقوف محسوس کرتی رہی۔

پھر ایکا ایکی خانصاحب کے کراہنے کی آواز بند ہوگئی اور ایک بھیانک سی تاریکی گھر بھر میں چھا گئی۔ ناہید کو خیال آیا کہ شاید ان کا درد ختم ہو گیا ہوگا یا شاید —— لیکن اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ دوسرے کمرے میں جاکر دیکھ لے کہ ان کی کیا کیفیت ہے۔ یا پھر شاید باجی کی اس معنی خیز مسکراہٹ نے اس کے قدموں کو جکڑ لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ اس قدر ساکت کھڑی تھی کہ اس کو پتہ بھی نہ چلا کہ اس کی اماں اس کے پیچھے آن کر کھڑی ہوگئی ہیں۔ وہ بھی خاموش تھیں جیسے خود سے اس مکمل سکوت کو نہ توڑنا چاہتی ہوں۔ پھر باجی نے ہی اس سکوت کو توڑا۔ انھوں نے کہا

"اب کیسے ہیں خانصاحب؟ اگر آپ چاہیں تو میں آن کر آپ کا ہاتھ بٹا دوں ——!"

اور ان کے یوں کہنے پر ناہید کو احساس ہوا کہ باجی اس سے نہیں بلکہ اس کی ماں سے مخاطب ہیں۔ اور وہ بری طرح چونک پڑی اور وہ گھوم کر اپنی ماں کو ایسے دیکھنے لگی جیسے کسی بہت ہی کم عمر بچے کو چوری کرتے پکڑ لیا جائے۔ آواز اب بھی اس کے حلق میں جمی ہوئی تھی۔ باجی کے چہرے پر ان کی مخصوص مسکراہٹ منجمد تھی اور اس کی اماں خاموش ٹھنڈی ٹھنڈی نظروں سے بغیر پلک جھپکائے اس کو اور باجی کو گھورے جا رہی تھیں۔ وہ ان کی یخ بستہ سطح کے پار دیکھنے سے معذور تھی اور بے وجہ طور پر دل ہی دل میں ایک شدید گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔ لیکن پھر اچانک جیسے اماں کی نگاہوں کی وہ یخ بستہ سطح ٹوٹ گئی۔ انھوں نے اپنی نظروں کو ناہید کے چہرے سے ہٹا لیا۔ اور ناہید نے سوچا کہ شاید اب ایک طوفان پھٹ پڑے گا۔ لیکن برخلاف توقع وہ طوفان نہیں ٹوٹا بلکہ اماں تو اب باجی کو ایسے کھوئے کھوئے سے انداز میں دیکھ رہی تھیں جیسے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوں۔ پھر وہ ایسے بولنے لگیں جیسے ایک ایک لفظ جانچ کر ادا کرنا چاہتی ہوں۔ انھوں نے کہا "نہیں — نہیں! اب آپ کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں — خانصاحب تو ——" اور پھر انھوں نے اپنا فقرہ مکمل کئے بغیر ہی کھڑکی کے پٹ آہستگی سے بند کر دیئے اور ناہید کو اپنے سے چمٹا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں —— اور ناہید نے سوچا "چلو اچھا ہی ہوا — یہ طوفان یونہی گزر جائے تو اچھا ہے ——"

محمد خالد اختر

ایک عقیدت مندانہ پیروڈی

چچا سام کے نام آخری خط

(ـــ جسے اُس کے بھتیجے سعادت حسن منٹو نے اپنے مرنے کے
چند روز بعد جنت سے دستی مکتوب ایہ کو بھجوایا ـــ)

چچا جان ـــ السلام علیکم

آپ کو یہ سن کو بیحد صدمہ پہنچیگا۔ کہ پچھلے دنوں میرا انتقال ہوگیا چچا جان وہ مرنے کی دھمکی جو میں آپ کو اپنے ہر خط میں دیا کرتا تھا۔ آخر کار سچ ہوگئی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میری موت میں آپ کی بے توجہی اور بے اعتنائی کا بھی کافی ہاتھ ہے۔ میری بار بار کی فرمائشوں، اور منتوں کے باوجود آپ نے نہ اپنے ہاں سے جان ہیگ کی وسکی بھجوائی۔ اور نہ ہالی وڈ کی کسی فتنہ سامان کی تین ڈالر ٹانگیں۔ غالباً آپنے پچھلے خط ہی میں میں نے ان ٹانگوں کو قریب سے دیکھنے کی تمنا ظاہر کی تھی۔ کیسے بے مہر نکلے آپ چچا جان۔ میری سُنی کو اَن سنی کر کے پی ہی گئے۔ ادھر میری سعادتمندی کا حال دیکھئے کہ آپ کی تعریفیں کرتے کرتے زبان تالو سے چپک گئی۔ اب آپ کے سب سے پیارے بھتیجے کا انتقال ہوگیا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اس میں قصور سراسر آپ ہی کا ہے۔ آپ تو خدا جانے انتقال کا مطلب بھی سمجھتے ہوں گے یا نہیں۔ کیونکہ آپ ٹھہرے خوش قسمتی سے لافانی۔ آپ کا کبھی انتقال نہ ہوگا چچا جان۔ واللہ باللہ آپ بھول کر بھی انتقال نہ کیجئے گا۔ جنت کے بارے میں جو باتیں سن رکھی تھیں۔ یہاں آکر سب جھوٹ نکلیں۔ یہاں نہ تو آپ کے ملک کی سات آزادیوں کے منترے ہیں اور نہ ہی ہالی وڈ ہے۔ کوئی ایسا ملک بھی تو نہیں جسے آپ فوجی امداد سے نواز سکیں یا جسے آپ اپنے ہائیڈروجن بم سے نیست و نابود کر سکیں۔ آپ کی جان ہیگ تو یہاں بلیک مارکیٹ میں بھی نہیں ملتی۔ شام کے وقت صراحیوں میں ہم جنت کے مکینوں کو شراب طہورہ ضرور تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن کم بخت میں نہ تو سرور رہوتا ہے۔ نہ نشہ آپ کی جان ہیگ کا ذکر ہی کیا۔ اس میں پاکستانی ٹھرّے کی خاصیت بھی تو نہیں۔ اس طہورہ سے تو آپ کے ہاں کا کوکا کولا جسے ایک دفعہ لاہور میں پینے کا اتفاق ہوا تھا، بدرجہا اچھا ہوتا ہے

ہاں تو چچا جان! میں اپنے انتقال پر ملال کا سانحہ آپ کے گوش گذار کر رہا تھا۔ اخباروں میں تو آپ نے اس خبر کو پڑھا ہوگا مشرق کے ایک مفلوک الحال ادیب کی اوقات ہی کیا تھی۔ کہ آپ کے اخبارات اور میگزین اسے چھاپنے کی زحمت اٹھاتے۔ انہیں تو تین ڈالر ٹانگوں والی لڑکیوں کے برہنہ فوٹو شائع کرنے سے ہی فرصت نہیں ہوتی۔ اس طرف ان کی توجہ ہوتی تو کیونکر! ہمارے ملک کے اخباروں نے البتہ اس خبر کو سیاہ حاشیے چڑھا کر ضرور شائع کیا۔ یہ ان کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ

آپ کا یہ نالائق بھتیجہ اس لائق بھلا کہاں تھا کہ اس کے مرنے کا نوٹس لیا جاتا۔ ہو سکے تو میری طرف سے ان اخباروں کے مرنجاں مرنج مدیراں کا شکریہ ادا کردیں۔ گستاخی معاف۔ آپ کی مارلین مانرو آجکل کیا کر رہی ہیں۔؟ چچا جان ان کو صرف ایک ہفتے کے لئے ان مدیروں کی دلجوئی کے لئے پاکستان بھیجدیں۔ ہو سکے تو ان مدیروں کے منہ ڈالروں سے بھر دیں بہرحال ان کو اس کرم فرمائی کا صلہ ملنا ضرور چاہئے۔

چچا جان۔ آپ کو شاید اس بات کا پتہ نہ ہوگا کہ آپ کے اس نالائق اور ناعاقبت اندیش بھتیجے کی ایک بیوی اور تین پیاری بچیاں بھی تھیں آپ کہیں گے۔ کہ بہتر ہوتا کہ وہ سب بھی میرے ساتھ انتقال کر جاتیں ارادہ تو میرا بھی کچھ اسی قسم کا تھا۔ کہ انہیں اپنے ہمراہ لیکر سدھارتا لیکن ملک الموت صاحب نے اتنی مہلت ہی نہ دی اور آناً فاناً جان قبض کرلی۔ چچا جان۔ آپ بڑے رحم دل اور بامروت مشہور ہیں۔ اس لئے یہ کہنے کی جرأت ہوتی ہے کہ ممکن ہو تو میرے بیوی اور بچوں کا کچھ وظیفہ مقرر کردیں۔ آپ کے ایک ڈالر کی قیمت ہمارے پاکستانی ساڑھے چار روپے ہوتی ہے مجھے اچھی طرح یاد نہیں، پچاس ڈالر ماہوار انہیں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہوں گے۔ چچا جان خدا کی قسم میں مذاق نہیں کر رہا۔ صرف پچاس ڈالر ہمارے غریب ملک میں پچاس ڈالر بہت ہوتے ہیں۔ اور ایک اچھا خاصہ کنبہ اس رقم میں پل سکتا ہے۔۔۔۔

لیکن میں جانتا ہوں آپ اصولاً ایسا نہیں کرینگے۔ آپ کو میرے جیسے بھک منگوں سے سخت چڑ ہے اور پھر آپ اندنوں سات آزادیوں کو روسیوں سے بچانے اور ہائیڈروجن بم تیار کرنے کے تردد میں لگے ہیں۔ ایک نادار مرتے ہوئے فنکار کی بچیاں جئیں یا مریں۔ آپ کی بلا سے آپ کے روبرو تو بڑے بڑے مسائل ہیں! اچھا چلئے چھوڑیئے اس قضئے کو۔ وہ صوبہ جہاں اس خانہ خراب کا مسکن تھا۔ وہاں کے وزیر اعظم فیروز خاں نون ہیں میرے انتقال کے وقت تو یہی صاحب اس گدی پر متمکن تھے، ان کے نام ایک سفارشی چھٹی لکھ دیں۔ اثر شاید اس کا بھی کچھ نہ ہو۔ کیونکہ نون صاحب ان دنوں ایک یونٹ کے چکر میں ہوں گے۔ خیر آپ کو اس سے کیا۔ آپ چھٹی ضرور انہیں لکھدیں۔

بہرحال میری واحد امید اب آپ کی ذات ڈالر صفات ہے۔

چچا جان ہے تو یہ سخن گسترانہ بات۔ لیکن کہے بنا رہ بھی نہیں سکتا مرتے دم تک آپ سے جان ہیگ کی وسکی بھجوانے کے لئے درخواست کرتا رہا اور آپ اسے گول کرتے رہے۔ خدا جانے آپ کیا سمجھے۔ میں تو ہر دم محفل میں آپ کی تعریفوں کے پل باندھا کرتا تھا۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میرے ہی قلم کا صدقہ تھا۔ کہ میرے ملک میں لوگ آپ کی سوجھ بوجھ اور شفقت کے قائل ہوگئے اور آپ کے اتنے سارے بھتیجے پیدا ہوگئے۔ میرے غریب ملک میں، سچ مانیئے، خدا اور اس کے رسول کے بعد جس قدر عقیدتمندی سے آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ کسی اور کا نہیں لیا جاتا۔ ہماری مسجدوں میں فقیہہ اور ملا۔ اخباروں کے ایڈیٹر اور مسلم لیگ کے لیڈر اب بھی اکثر خدا اور اس کے رسول کے نام کو زبان پر لاتے رہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں جھانک کر دیکھئے تو ڈالر کھنکتے سنائی دیں گے۔ یہ سب آپ کے اس مرحوم بھتیجے کی پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے تو آپ کے نام کو چمکانے کے لئے یہ کچھ کیا اور آپ سے اس وفاداری کے عوض میں اتنا بھی، نہ ہو سکا کہ وہاں سے کوئی سیکنڈ ہینڈ پیکارڈ ہی بھجوا دیتے۔ ملین ڈالر ٹانگیں نہیں تو ان کے پرنٹ ہی عنایت کردیتے۔ واہ بھئی۔ چچا جان واہ۔

خیر ان باتوں کو چھوڑیئے۔ یہ تو اس بدنصیب ملک کی باتیں ہیں جسے میں چھوڑ چکا ہوں جس جگہ میں اب ہوں۔ یہاں انسان کو کسی چیز کی خواہش نہیں ستاتی۔ نہ جان ہیگ کی وسکی کی نہ پیکارڈ کی اور نہ مارلین منرو کے ہونٹوں کے پرنٹ کی۔ یہاں بالکل ہُو کا عالم ہے۔ چچا جان آپ یہ سن کر حیران اور خوش ہوں گے کہ یہاں میں نے اچھی طرح داڑھی رکھ لی ہے۔ ہر صبح لب ترشواتا ہوں آٹھوں پہر باوضو رہتا ہوں۔ کوئی ناسد خیال میرے ذہن میں نہیں آتا۔ حالانکہ اپنے ملک میں فحش نگار مشہور تھا۔ وہاں میں ہمیشہ فن کی تخلیق کی فکر میں جلتا بھنتا رہتا تھا۔ یہاں آکر ایک افسانہ نہیں لکھا دراصل چچا جان لوگو آپ سے سیانے آدمی سے کچھ کہنا لقمان کو حکمت سکھلانا ہے، یہ آرٹ وارٹ سب بکواس ہے۔ چہرے پر نور۔ دل میں سرور اصل چیز ہے۔ اور اس کے ساتھ اگر جیب میں ڈالر بھی ہوں تو واللہ کیا ہی کہنے۔ کاش وہاں افسانے لکھ لکھ کر اپنی زندگی اور صحت برباد کرنے کے بجائے کھانڈ یا کسی اور جنس کی بزنس کرتا اور سٹے سے کمائے ہوئے پیسے کے بل بوتے پر دستور ساز اسمبلی کا رکن منتخب ہو جاتا۔ اور تین چار حج کر لیتا تو دنیا اور آخرت سدھر جاتی۔

چچا جان۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں اس نئی دنیا میں بڑا خوش و خرم ہوں گا۔ ہرگز نہیں۔ آپ کی دنیا کو ہائیڈروجن بم سے اڑانیکی ضرورت ہے یا نہیں۔ یہ تو آپ بہتر جانتے ہونگے۔ ہاں اگر میں آپ سے ہائیڈروجن بم

کا نسخہ سیکھ کر آیا ہوتا تو اس دنیا کو ضرور اڑا دیتا۔ دنیا میں تنگی و ترشی جو میرے نصیبے میں تھی وہ اس عیش و آرام اور نورانیت سے کہیں زیادہ بہتر تھی جو مجھے یہاں حاصل ہے۔ چچا جان! کیا آپ اپنا کوئی بمبار طیارہ ادھر نہیں بھیج سکتے۔ یا ابھی ٹھہر جائیے۔ کوبالٹ بم کو ایجاد ہو جانے دیجئے۔ آپ نے اس بم کو بنانے میں اتنی دیر کیسے کر دی ـــ مسٹر جان فوسٹر ڈلز کا کیا حال ہے۔ آپ کے بعد وہ مجھے سب سے پیارے لگتے ہیں۔

چچا جان۔ ابھی کل کا ذکر ہے، کہ حوضِ تسنیم کے پاس چہل قدمی کرتے ہوئے میرزا سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ یہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی نہیں ہیں جنہوں نے کسی زمانہ میں دعوئے نبوت کیا تھا۔ ان کا یہاں بسیار جستجو کے بعد بھی سراغ نہ پا سکا۔ یہ میرزا اور ہیں۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب۔ ان کا نام بھلا آپ نے کاہے کو سنا ہوگا۔ ان کے باپ کا نام اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے اتنا معلوم ہے کہ سو لشت سے پیشۂ آبا سپہگیری تھا۔ یہ سب ہماری بدنصیب اردو زبان کے بہت بڑے شاعر ہو گذرے ہیں۔ آدمی مزے کے نکلے۔ فوراً بے تکلف ہو گئے۔ کہنے لگے "اماں سعادت! یہ کیسی جنت ہے۔ دنیا میں تو اس کی بڑی تعریفیں سنتے تھے۔ یہاں نہ تو دور دور تک کوئی انسان نظر پڑتا ہے نہ کسی کو شعر کہنے سننے کا ذوق ہے۔ ہاں بھئی کسی سے کہلوا کر ایک بوتل اسکاچ کا انتظام تو کرا دو ـــــ اولڈ ٹام یا کسی اور کا۔ متھرا داس مہاجن کے نام تمسک لکھ دیتا ہوں۔ شراب طہورہ پی پی کر ذہن و دماغ کند ہو چکا ہے۔ اور ہاں بھئی۔ ہماری چودھویں تو کہیں نظر نہیں پڑی"

چچا جان! مجھے ان میرزا غالب کی خاطر بہت عزیز ہے۔ اس لئے میرے لئے نہ سہی۔ ان کے لئے ہی ایک کیس بڑھیا وسکی کا بھجوا دیں شمپین ہو۔ تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم دونوں کے جگر خراب ہیں۔ ضرور توجہ فرمائیں آپ کا سا غمگسار۔ اور مہربان اور کہاں ہے زمانہ میں!

ہاں چچا جان۔ میرے انتقال سے کچھ دن پہلے آپ کوئی 'سیٹو' میڈو وغیرہ بنا رہے تھے۔ امید واثق ہے کہ آپ کو اس مقصد میں کامیابی ہو چکی ہوگی۔ بڑھاپے میں بھی آپ کی ہمت جواں ہے۔ ناممکن ہے کہ آپ کسی کام میں ہاتھ ڈالیں۔ اور وہ سرانجام نہ پا جائے۔ میری طرف سے ڈلز صاحب کی خدمت میں عرض کر دیں۔ کہ اس جنت کے خطے کو بھی اپنے سیٹو یا میڈو میں شامل کر لیں۔ یہاں کے کارپردازوں کو شیشے میں اتارنا مجھ پر چھوڑ دیئے بات یہ ہے کہ حوریں تو یہاں ہم سب کے پاس بہت سی ہیں۔ لیکن ان میں وہ بات نہیں جو آپ کے ہاں کی ہالی ووڈ کی ایکٹریسوں میں ہے۔

یہ حوریں بہت زیادہ پاک و صاف اور نورانی ہیں۔ پھر اس جنت میں خدا بھلا کرے نہ اخبار ہے نہ میگزین اور نہ ریڈیو۔ اور تو اور قلم دوات تک ناپید ہے یہ قلم دوات جس سے آپ کو یہ خط تحریر کر رہا ہوں بصد حیلہ اپنے کرام الکاتبین سے مانگ کر لایا ہوں وہ ان دنوں بیکار ہیں۔ اور میرے دنیاوی اعمال کے مسودے لئے روز حساب کے منتظر۔ آپ کے بھتیجے کو جنت میں ایزم، عرصہ کے لئے رکھا گیا ہے۔ بعد میں قیاس غالب ہے کہ اسے یہاں سے منتقل کر کے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔

میری موت کا حال سنئے۔ کیا آپ معلوم ہے کہ جب میرا انتقال ہوا تو میری گھر والی کو مجھے باعزت طریقہ سے کفنانے دفنانے کی کتنی فکر لاحق تھی، گھر میں پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے چند ناشر حضرات کا کہ جنہوں اس آشفتہ حال کی کتابیں چھاپی تھیں انہوں نے کمال دریا دلی سے غسّال اور قبر وغیرہ کا خرچہ اپنی گرہ سے دیدیا۔ پھر بھی اتنے بڑے افسانہ نگار کا جنازہ جس بیکسی اور کسمپرسی کے عالم میں نکلا وہ ہرگز قابل دید نہ تھا نہ شنیدنی۔ چچا جان کاش میں آپ کے ملک کا ولی مورتی ہی ہوتا۔

چچا جان۔ آپ اکتا تو نہیں گئے۔ دراصل آپ سے باتیں کرنے میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔ یہ میرا آپ کے نام آخری خط ہے۔ جنت سے خط لکھنا اور اسے بھیجنا عجب دردِ سر ہے۔ قلم دوات کا حال عرض ہی کر چکا ہوں ڈاک کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ بلکہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ آپ کی سات آزادیوں کے ملک کی کوئی راحت بھی یہاں میسر نہیں۔ اس خط کو آپ کے دستِ مبارک تک پہونچانے کے لئے بڑی منتوں سے ایک صاحب کو بھلا پھسلا کر تیار کیا ہے۔ ان صاحب کا نام حضرت عزرائیل ہے۔ کافی مشہور بزرگ ہیں۔ بہت ممکن ہے آپ نے ان کا نام سن رکھا ہو۔ ہائیں۔ چچا جان یہ کیا۔ آپ عزرائیل کے نام پر پیلے کیوں پڑ گئے۔ یہ ہاتھوں کا رعشہ چہ معنی۔ آپ کو ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ قبلہ ام۔ آپ تو لافانی ہیں اور پھر ابھی تو آپ کو سات آزادیوں کو بڑھا کر ساٹھ آزادیاں بنانا ہے سیٹو میڈو نیٹو وغیرہ کی تشکیل کرنی ہے۔ کوبالٹ بمب ایجاد کرنا ہے۔ خدا نہ کرے۔ ابھی آپ کیسے مر سکتے ہیں۔؟

چچا جان۔ ایک اور مزے کی بات سنئے۔ ہندوستان میں ایک بزرگ مولانا عبدالماجد دریابادی ہیں پچھلے دنوں سنا ہے وہ ہمارے محترم گورنر جنرل غلام محمد صاحب سے کسی سلسلہ میں ملنے پاکستان بھی تشریف لائے تھے۔ صدق رسالہ نکالتے ہیں۔ آپ بڑے پایہ کے ادیب اور ملنے ہوئے عالم ہیں۔ اور

متعدد فاضلانہ اور عالمانہ مقالوں اور کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کی کتابوں کو وہی حضرات پڑھ سکتے ہیں جن کے دل میں تعفن اور آنکھوں میں سرور دیا اس کے برعکس، ہو۔ اور جن کی آنکھوں پر تعصب اور مذہبی دیوانگی کی پٹی بندھی ہو۔ مولانا دریاآبادی اس غم اور سوگ پر جو میرے مرنے پر ہوا بے اختیار تلملا اُٹھے اور اپنے رسالہ "صدق" میں انہوں نے اس پر سخت تعجب کا اظہار کیا کہ ایک معمولی فحش نگار کی موت کا اس قدر کیوں ماتم کیا جا رہا ہے۔

دیکھا چچا جان ہمارے ملک میں کیسے کیسے روشن دماغ اور ادیب دوست حضرات بستے ہیں۔ کیا آپ کے ملک میں بھی ارلسنٹ ہینگوے، کالڈول، ٹامس وولف اور ہر اس فنکار کو جو سچائی اور بیباکی سے جھوٹ کے پردے چاک کرتا ہے۔ اور دنیا کو آگے لے جاتا ہے۔ اسی طرح فحش نگار کہا جاتا ہے!

ہمارے ہاں تو چچا جان۔ سرے سے باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سچ مانیئے اگر نالائق بھتیجے کی ہاتھ بھر لمبی ڈاڑھی ہوتی، لب ترشے ہوتے، تین بیویوں کا خاوند اور دو درجن بچوں کا باپ ہوتا، فحش اور عریاں افسانوں کی بجائے بہشتی زیور کی قسم کی کسی کتاب کا مصنف ہوتا۔ اور اس نے پاکستان میں اگر اللہ کے فضل سے پانچ مکان دو باغ اور دس دوکانیں الاٹ کرا لی ہوتیں تو یہی مولانا آبادی اس کی موت پر بے انتہا قلق کا اظہار فرماتے۔ اور اسے قوم وملت کے لئے نقصانِ عظیم قرار دیتے۔ خیر چچا جان۔ مجھے اب اس کا غم نہیں کہ مولانا دریا بادی قسم کے لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں اس کا فیصلہ تو آنیوالی نسل کریگی۔ اور ہاں چچا جان۔ آپ کے دل میں خیال یقیناً کسی حاسد نے ڈال دیا ہے۔ کہ آپ کا یہ بھتیجہ کمیونسٹ ہے۔ آپ کی سات آزادیوں کے ملک میں ہوتا۔ تو غالب تھا کہ آپ میکارتھی صاحب کی شہادت پر مجھے سچ مچ کمیونسٹ یا ہم سفر ساتھی قرار دیدیتے۔ افسوس کہ تنگدستی اور بیماری میں گھل گھل کر مر گیا۔ آپ کے ہاں یقیناً آپ کے بہشتی نُما گھر کی اونچی آرام دہ کرسی میں بیٹھ کر بجلی کی رو کے ذریعے خوب مزے سے مرتا ـــــ ویسے تو خدا کے فضل سے ہمارے پاکستان میں بھی سات آزادیاں ہیں۔ لیکن یہاں ابھی آپ کا سا قتل گھر نہیں بنا ـــــ واللہ باللہ میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔ آپ بھی عجب سادہ لوح ہیں کہ میرے حاسدوں کی باتوں میں آکر مجھے کمیونسٹ سمجھ بیٹھے۔ خدارا اس بدگمانی کو اپنے دل سے دور کر دیجئے۔ میری بات پر یقین نہ آتا ہو تو آپ پاکستان میں اپنے قونصل خانے سے اس کی تصدیق کرا سکتے ہیں کہ آپ کے دشمن میلنکوف سے میری کبھی ایسی پیار اور محبت کی باتیں نہیں ہوئیں جیسی کہ آپ سے ہوتی تھیں

یہ سراسر بہتان ہے کہ میں نے ملینکوف کو ماموں بنا رکھا تھا۔ آپ جیسا مربی اور ہمدرد ایک چچا ہی میرے لئے کافی ہے۔ اور اب تو یہ بھی سنا ہے کہ ملینکوف صاحب نے خود اپنی نااہلی کا اعتراف کر کے روس کی وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دیدیا ہے۔ چچا جان۔ میں تو قسم ہے خدائے وحدہٗ لاشریک کی، دنیا میں صرف آپ ہی کا بھتیجہ تھا۔ اب بھی آپ ہی کا بھتیجہ ہوں۔ گو آپ اپنی بدگمانی کی وجہ سے میری ہر فرمائش اور درخواست کو مسکرا کر ٹالتے رہے۔ لیکن میری سعادتمندی اور وفاداری میں سر مو بھی فرق نہ آسکا ویسے چچا جان! آپ کمیونسٹوں سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں؟ آپ اپنی سات آزادیوں میں موج اڑائیں۔ کمیونسٹوں کو اپنے کلہاڑوں اور درانتیوں کو چلانے دیجئے۔ ان غریبوں کے پاس نہ آپ کی سی دھمکی ہے اور نہ ہی لین ڈالر ٹانگیں ـــــ کیا آپ تاریخ کے طالب علم نہیں رہے؟ کیا آپ یہ نہیں جانتے۔ کہ تہذیب اور تمدّن کبھی ایک سے نہیں رہے؟ آپ لاکھ کوشش کریں۔ ہائیڈروجن بم سے انسان ختم نہیں ہو سکے گا۔

یہ خط بڑی طوالت پکڑ گیا ہے۔ ابھی آپ سے اور باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا لیکن ادھر روشنائی ختم ہو چکی ہے۔ اُدھر حضرت عزرائیل پیر تسمہ پا کی طرح سر پر سوار ہیں کہ جلدی کرو۔ مجھے اور بھی کام ہیں۔

عزرائیل صاحب کو اس خط کا جواب لکھ کر دینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع ہوگا۔ ہاں جان ہیگ کا ایک کیس ضرور ان کے حوالے کر دیں۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کے کشید کرنے کا نسخہ ہی مرحمت فرما دیں۔ مزید برآں۔ اگر آپ ہالی ووڈ کی کسی تازہ ترین ملکہ کی رانوں کے پرمنٹ بھجوا سکیں تو ممنون ہوں گا۔

عزرائیل صاحب کو ڈلز صاحب سے ملاقات کا بڑا اشتیاق ہے۔ اپنی بیوک یا کرائے کے ٹیکسی ہی میں ڈلز صاحب کے دو ٹکڑے پر پہنچانے کا انتظام فرما دیں ـــــ ہاں یاد آگیا۔ دس پانچ نئے ڈھلے ہوئے ڈالر بھی بھجوا دیجئے۔ اب تو انھیں دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔

آپ کا مرحوم بھتیجا
سعادت حسن منٹو

دیویندر اسر

حالانکہ پریشان ہونے کی کوئی خاص بات نہ تھی۔ لیکن پھر بھی یہ سوال تہہ سمندر سے اٹھی ہوئی لہر کی مانند میرے ذہن میں جوار بھاٹا کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ مجھے مس آشا لتا کو کام سے الگ کرنا چاہئے تھا یا نہیں۔ مس آشا لتا آج سے کوئی پانچ چھ برس پہلے میرے دونوں بچوں کی گورنس تھی۔ جب مجھے شک ہوا کہ وہ تپ، دق کی مریض ہے تو میں نے اسے فوراً جواب دے دیا۔ ان حالات میں کام اور زندگی اُس کے لئے ہم معنی بن چکے تھے۔ اُسے جواب دیتے ہوئے میں نے کئی بار سوچا کہ اگر وہ کام کرے گی تو نتیجہ موت ہے۔ کیونکہ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔ اگر وہ کام نہیں کرے گی تو بھی نتیجہ موت ہوگا۔ کیونکہ اسے اچھی غذا کی ضرورت ہے۔ بے کاری اور دق اُسے جلد ہی موت کے دہانے تک کھینچ لائیں گے۔ لیکن میرے لئے اُسے کام سے الگ کرنا ناگزیر تھا۔ مگر آج رینو کی زبانی جب مجھے معلوم ہوا کہ مس آشا لتا، آشا موہن ڈے کے نام سے ابھی تک زندہ ہے تو کچھ حیرت، کچھ شرم اور کچھ خوشی کا احساس ہوا۔ میں رائے صاحب گھنشیام داس کو ملنے لکھنؤ گیا۔ چند روز ہی ہوئے ان کی چھوٹی لڑکی رینو خرابیٔ صحت کے باعث بیرول پر رہا ہو کر آئی تھی۔ میں نے سوچا اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ شام کو ہم سب لوگ چائے پی رہے تھے۔ رائے صاحب بولے۔

"دیکھئے نا ماتھر صاحب۔ میں کہتا ہوں۔ اب ذرا دھیان لگا کر پڑھ لکھ ڈالے۔ یہی عمر ہوتی ہے پڑھنے لکھنے کی۔ ایم اے کرے۔ پھر جو جی میں آئے کرے۔ مگر یہ لڑکی ایسی ضدی ہے کہ کسی بات پر دھیان نہیں دیتی۔

How painful it is to see one's daughter to associate with Zigzag elements.

رائے صاحب نے ایک رس گلا منہ میں ڈال لیا، اور پھر رینو کی طرف دیکھنے لگے۔ رینو چائے بنانے میں مشغول تھی۔ "اس نے تو اس طرح بازی میں اپنی صحت بھی خراب کر ڈالی ہے۔"

Black Magic

میں چائے میں چینی ہلانے لگا۔ درحقیقت اپنی تمام تر ذمہ داریوں کے باوجود بھی مجھے ایسی باتوں سے خاموش سی ہمدردی تھی۔ رینو نے اپنی جانب پیالی بڑھائی۔

"کیا آپ چائے میں دودھ اور شکر نہیں ڈالتیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ مجھے بلیک ٹی پسند ہے۔" رینو نے کہا۔

"ستیاناس کر لیا ہے اپنی صحت کا بلیک ٹی پی پی کر ماتھر صاحب۔ نامعلوم اُس لیکچرار نے اس لڑکی پر کیا جادو کر دیا ہے۔" رائے صاحب بولے۔

"آپ ہر بات میں آشا موہن ڈےئے کو خواہ مخواہ گھسیٹ لاتے ہیں۔" رینو نے احتجاج کیا۔

"اُس کی اپنی شکل تو دیکھو جیسے برسوں سے دق کی مریض ہو۔ معلوم نہیں کس ہڈی کی بنی ہوئی ہے کہ ابھی تک جئے جا رہی ہے۔" رائے صاحب چائے کی پیالی میں غرق ہو گئے۔

"آشا موہن ڈےئے کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی ایک لیکچرار ہے۔ مجھے تو اس کے اطوار بالکل پسند نہیں۔" رائے صاحب نے رائے دی۔

"کیا نام بتایا تھا آپ نے؟" حالانکہ میرے ذہن میں نام موجود تھا۔

"آشا موہن ڈےئے۔" رینو نے جواب دیا۔

"آشا موہن ڈےئے۔" میں زیر لب گنگنایا۔

"کیا وہ لکھنؤ کی ہی رہنے والی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ دہلی سے آئی ہیں۔ دہلی یونیورسٹی سے ہی ایم اے پاس کیا ہے۔" رینو بولی۔

میں آشا لتا کو جانتا تھا۔ جو میرے بچوں کی گورنس تھی لیکن جو محض بی اے تھی۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ آشا لتا ہی آشا موہن ڈےئے ہے۔ وہ بھی بلیک ٹی پیتی ہے اور رینو کے انداز اور طرز گفتگو بھی اس سے کچھ ملتے جلتے ہیں۔

"وہ چھریرے بدن کی سانولی سی لڑکی۔" میں نے بہت ہی آہستہ سے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"جی ہاں ۔۔۔ رینو نے سن لیا تھا، اور وہ دلچسپی لینے لگی تھی۔

"مسٹر ماتھر کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"شاید وہی ہو۔" میں سوچنے لگا۔ میرے تحت الشعور سے ایک بار پھر آشا لتا کا خیال شعور میں لپک آیا۔ اُس کی پیشانی پر کسی زخم کا نشان تھا۔

"کیا اس کی پیشانی پر دائیں جانب کسی زخم کا نشان بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں اور لطیفے کی بات یہ ہے کہ وہ زخم بھی چائے کی پیالی ٹوٹنے سے آیا ہے۔" رینو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور مجھے یقین سا ہو چلا کہ آشا موہن ڈےئے، مس آشا لتا کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔

"آپ کچھ کھوئے سے گئے ہیں۔" رینو نے میری ذہنی پریشانی بھانپ لی تھی۔

میرے ذہن میں تہہ سمندر سے اٹھی ہوئی لہر کا جوار بھاٹا پیدا ہونے لگا۔ اس بار لہر کا زوردار شور پہلے سے کئی گنا زیادہ تھا۔ جب بھی مجھے مس آشا لتا کا خیال آتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ خواب میں اس کا غمگین چہرہ اور چمکدار آنکھیں اُبھرنے لگتی ہیں۔ اور وہ آہستہ آہستہ اپنی پوری شخصیت سے واضح ہو جاتی ہے۔ ایک دم تاریکی میں اس کی مسکراہٹ روشنی کی کرن کی طرح پھوٹتی ہے۔ جب خواب حقیقت بنتے ہیں تو اچانک کوئی حقیقت خواب بن جاتی ہے۔ وہ کہہ رہی ہوتی ہے اور میرے ذہن سے غائب ہو جاتی ہے۔

"مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آشا موہن ڈیٹے کی زندگی میں کوئی بہت بڑا المیہ گذرا ہے۔ معلوم نہیں کیا؟ لیکن اُس کی زندگی پر اسرار کی جھلی سی چھائی ہوتی ہے۔" رینو نے کہا۔

میرے ذہن میں مس آشا لتا کی متحرک تصویر اُبھرنے لگی۔ وہ ایک ذہین گورنس تھی۔ لیکن میں اُس کی بیماری کے باعث مجبور تھا۔ ایک روز بارش زوروں سے ہو رہی تھی مس آشا لتا کچھ اُداس تھی۔ اُس کے چہرے پر جیسے سیاہ بادلوں کے سائے سے پڑ رہے تھے۔ اُس کے لئے اس موسلادھار بارش میں گھر واپس جانا ممکن نہ تھا، اور وہ بارش تھمنے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے چائے پر مدعو کیا۔ اس نے چائے بنائی لیکن اپنی پیالی میں نہ ہی دودھ اور نہ ہی شکر ملائی۔

"کیا آپ چائے میں دودھ اور شکر نہیں ڈالتیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ مجھے بلیک ٹی پسند ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ یہ بلیک ٹی کیوں پیتی ہیں۔ صحت کے لئے مضر ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسے ہی" اُس نے کہا۔ اس کے چہرے پر سیاہ بادل کا ایک ٹکڑا اچانک رک گیا۔

"آپ اس عمر میں ہی اپنی صحت برباد کر لیں گی" میں نے بزرگانہ نصیحت کی۔

"میرے ایک دوست تھے" — اُس نے کہا — "وہ بہت زیادہ سگریٹ پیتے تھے۔ میں نے انہیں ایک بار کہا کہ زیادہ سگریٹ پینا صحت کے لئے مہلک ہے۔ تو کہنے لگے کہ اگر کوئی آدمی چین سموکر (Chain Somoker) ہو، اور بیس سال تک لگاتار سگریٹ پیتا رہے تب جا کر کہیں خطرہ ہوتا ہے کیسر (Cancer) کا — اور پھر اچانک کہا۔ لیکن Cancer سگریٹ پینے کے بغیر بھی ہو سکتا ہے" مس آشا لتا نے یہ کہہ کر جیسے بلیک ٹی پینے کی وجہ جواز پیش کر دی۔

"بات خوب صورت ہے لیکن صحیح نہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ کی بات صحیح ہے لیکن ——"

"خوب صورت نہیں۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرائی، اور میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مجھے احساس ہوا کہ مس آشا لتا مسکرائی نہیں۔ فقط مجھے ایسا محسوس ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے چہرے پہ کرب اور غم کی ہلکی سی چادر پھیلتی جا رہی تھی۔ مس آشا لتا مجھ سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس لئے تھوڑے سے اصرار کے بعد اُس نے بات شروع کی ——

"میرے ایک دوست تھے۔ جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ مجھے اس کی زندگی سے بہت پیار تھا۔ اور اب اس کی موت پر رشک آتا ہے"

میں خاموشی سے سننے لگا —— "وہ اجنتا اسکول آف آرٹ میں انگریزی ادب کے لیکچرار تھے۔ وہ ہمیشہ بلیک ٹی پیتے تھے۔ ہم نے کئی بار پوچھا کہ آپ بلیک ٹی کیوں پیتے ہیں؟ تو وہ کہتے میں ہر چیز کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان میں کوئی خاص بات نہ تھی لیکن بات بڑی خوب صورت کرتے تھے۔ انہیں قریب سے دیکھنے کے بعد احساس ہوتا تھا کہ وہ زندگی کو ایک نئے اچھوتے سانچے میں ڈھالنے کا تجربہ کر رہے ہیں۔ آرٹ اسکول کے منتظمین ہمیشہ ان پر کڑی نگرانی رکھتے تھے۔ ان کے اطوار میں ایک ایسا لاابالی پن تھا جسے ہم سب پیار کرتے تھے لیکن منتظمین کی نظر میں اُس کی حدیں اُس مقام سے جا ملتی ہیں جہاں سے اخلاقی بے راہ روی کا آغاز ہوتا ہے۔ وہ اپنی طرز سے مجبور تھے اور منتظمین اپنے اصول کے باعث ان سے نالاں تھے۔ نتیجہ کے طور پر موہن ڈیٹے کو کام سے الگ ہونا پڑا۔ منتظمین نے مشتہر کیا۔ موہن ڈیٹے چائے پیتا ہے۔ باتیں کرتا ہے۔ گیت لکھتا ہے نظمیں سناتا ہے اور نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ——"

"گمراہ کرتا ہے"— میں نے کہا۔

"آپ انہیں جانتے ہیں؟" مس آشالتا نے اشتیاق سے پوچھا۔

مجھے موہن ڈٹے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ "تاریخ جرم و سزا کی یہ ابدی داستان ہے کہ ہر اُس انسان کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو لوگوں کو اُن کے قدموں کی رفتار سے زیادہ تیزی کے ساتھ اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا ہے۔"

میری یہ بات سُن کر مس آشالتا کے چہرے پر خوش کن یقین اور اعتماد کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے چائے کی چُسکی لی اور میز پہ جُھک گئی: "مسٹر ماتھر۔ اگر میں یہ کہوں کہ مجھے ان سے پیار تھا تو آپ کو تعجب نہ ہوگا۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ تو مجھے آغاز سے ہی معلوم تھا۔ میں نے کہا "ایسے آدمی کے ساتھ ماسوائے پیار کے کیا ہو سکتا ہے۔"

"میں کہہ رہی تھی۔ وہ بالکل بے کار ہو گیا۔ لوگ کہتے تھے۔ وہ بڑا ذہین اور باشعور آدمی ہے۔ لیکن اس کا طرز کچھ ایسا ہے کہ— معاف کیجئے— بات بلیک ٹی کی تھی۔ درحقیقت موہن ڈٹے اس سے پہلے بھی کئی بار بے کار رہ چکا تھا۔ بے کاری کے دنوں میں ہی اسے بلیک ٹی کی عادت پڑ گئی تھی۔ دراصل اس کے لئے بلیک ٹی ایک 'Economic Device' تھی جو آرٹ اسکول کے لڑکے لڑکیوں میں فیشن بن گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ بلیک ٹی پینے والے سب کے سب کچھ باغی خیال کے لوگ بن گئے۔ اسکول کے منتظمین کہا کرتے — اِن سب پر موہن ڈٹے نے جادو کر دیا ہے۔ یہ کالی چائے نہیں کالے جادو کا اثر ہے— موہن ڈٹے نے کام کی تلاش کی۔ لیکن اُسے کام نہ ملا۔ وہ نوجوان تھا۔ ذہین تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ وہ محنت مزدوری کا کام بھی کر سکتا تھا لیکن اسے کام نہ ملا۔ لوگ اُس سے پیار کرتے۔ چائے پلاتے۔ گھر لے جاتے۔ اس کے گیت سنتے۔ اس کے ساتھ رات گئے تک گھومتے۔ لیکن اسے کام نہ ملا—

وہ ہر روز رات کو ہمارے ہاں آتا۔ اُس وقت سب سو چکے ہوتے۔ مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوتی جسے عام طور پر پاگل پن بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے چائے بناتی اور اسے پلاتی۔

"موہن ڈٹے۔ مایوس نہ ہو۔ تمہیں کام مل جائے گا۔" میں اس کے دھول سے اَٹے ہوئے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہتی۔

"مایوس"— وہ ہنستا— "اگر کام مل بھی جائے تو بھی یہی حشر ہوگا۔

"وہ کیوں"— میں انجان بن کر کہتی۔

"تم نے سنا نہیں تھا۔ پرنسپل نے کہا تھا کہ اسکول کی چار دیواری میں اسکول کے ڈسپلن کے ماتحت رہنا پڑے گا۔ اس کے باہر جو جی چاہے کرو— اور یہ ممکن ہے۔"

"نہیں— ؟" میں نے کہا تھا۔

"کیوں— ؟" اُس نے پوچھا۔

"اس لئے کہ آپ کے لئے یہ ڈسپلن کا سوال ہے اور میرے لئے زندگی کا۔"

"زندگی! مسٹر موہن ڈٹے 'Businss is Business'"

"صحیح ہے۔ ایسے ہی جیسے Life is Life۔ اور زندگی تجارت سے زیادہ خوب صورت ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ مجھے خوب صورتی سے پیار ہے۔"

"خوب صورتی سے یا خوب صورت لڑکی سے—" اُس نے طنز کیا۔

"دونوں سے—"

"سوچ لیجئے مسٹر موہن ڈے۔ اس کا انجام خطرناک ہوگا۔"

"اس لئے کہ میرا اخلاق ذاتی زندگی اور سماجی زندگی میں، دو متضاد اصولوں کو قبول نہیں کرتا۔"

لہٰذا موہن ڈے نے کام چھوڑ دیا۔ اس کے دوستوں نے کام چھوڑ دیا۔ اور اُس حلقے میں ایک طوفان سا اٹھا۔ جسے ہم مذاق میں چائے کی پیالی میں طوفان کہتے ہیں۔ لیکن اس کا انجام واقعی خطرناک تھا۔ موت — موت سے بھی زیادہ ہولناک بے کاری۔ موہن ڈے، جو چائے پیتا تھا خوب صورت اور اچھوتی باتیں کرتا تھا۔ قہقہے لگاتا تھا۔ گیت گاتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ گھومتا تھا۔ لیکن اب دوستوں سے چھپ کر نکل جاتا۔ اس لئے کہ وہ اسے کافی ہاؤس لے جائیں گے۔ کافی پلائیں گے۔ لیکن ایسی کافی کتنی تلخ ہوتی جب اس کے دوست کو یہ معلوم ہوتا کہ موہن ڈے بے کار ہے اور اُس کی زندگی میں خوشی کے چند لمحے داخل کرنا کتنا ضروری ہے۔

میں اُس سے پوچھتی — "کام ملا؟"

وہ پہلے خاموش رہتا، اور پھر کہتا:

"آشا۔ میں صبح سے شام تک کام کی تلاش کرتا ہوں۔ اس حسین لمحے میں جب میرے پاس تمہاری پیاری سے بنی ہوئی چائے اور تم ہوتی ہو۔ کام کا ذکر نہ کیا کرو۔ کام کے ذکر سے ہی تمام دن کی تھکن عود کر آتی ہے۔ یہ فرار ہے آشی۔ لیکن دن بھر کی تھکن کے بعد چند لمحے کے فرار پر مجھے کوئی اعتراض نہیں —"

وہ اسی طرح کئی دن تک آتا رہا۔ ایک رات میں چائے لے کر نیچے اُتر رہی تھی کہ ممی کی آنکھ کھل گئی — "کون"؟ — وہ چلائی۔ میں گھبرائی اور ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ ٹوٹی ہوئی پیالی کا ایک ٹکڑا میرے ماتھے پر لگا۔ آپ دیکھ رہے ہیں یہ نشان اُسی زخم کا ہے۔"

"چائے۔ چائے۔ تم نے تو اپنی زندگی کو روگ لگا لیا ہے۔ اور یہ بالکل سڑی ہوئی کالی چائے۔ معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" ممی مجھے کوستے جا رہی تھی۔ اور پھر واپس لے جا کر مجھے چارپائی پر لٹا دیا۔

میرے دل میں پہلی بار اپنی بے بسی کا احساس اتنا شدید ہوا۔ موہن ڈے آیا ہوگا۔ اُس کے چہرے پر تھکن کے آثار ہوں گے۔ اُس کے بال بکھرے ہوں گے۔ دھول سے اَٹے ہوں گے۔ وہ اپنی ٹانگوں کو دونوں ہاتھوں سے مل رہا ہوگا۔ وہ انتظار کر رہا ہوگا۔ ایک پیالی چائے کا — جس میں اس کا تمام غم اور احساسِ تھکن ڈھل جائے گا —

آج وہ کیسے کہے گا — "آشی جب میں تمہیں دیکھتا ہوں تو ایسے معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کام کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس طرح کوئی اُداس تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ ابھی تمہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ دیکھو میرے بازو میں قوت ہے۔ میرے قلم میں جادو ہے —" اور اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوگا۔ "آج مجھے ایک گیت لکھنا ہے۔ شاید اس سے کچھ پیسے مل جائیں — کل سناؤں گا تمہیں — بڑا خوب صورت گیت ہے —" اور وہ چلا جائے گا۔

دوسرے روز میں نے پھر چھپے چھپائی چائے بنائی اور نیچے آئی۔ موہن ڈے نہ آیا — وقت تیزی سے گذر تا گیا۔ لیکن موہن ڈے نہ آیا۔ میں نے سوچا کہ وہ مایوس ہو گیا ہے۔ اس نے کہیں یہ نہ سمجھا ہو کہ کل میں نے کوئی بے اعتنائی کی۔ میں نے دیوار پر دیکھا جہاں موہن ڈے ہر روز ایک لکیر ڈال دیتا تھا۔ اور ہم انہیں گن کر اپنی ملاقات کے دنوں کا شمار کرتے۔ آج کوئی لکیر نہ تھی۔ میں نے لکیروں کو گنا۔ کل بھی کوئی لکیر نہ تھی۔ کیا موہن ڈے کل بھی نہیں آیا؟ کیا اُسے کام مل گیا؟ کیا وہ کہیں چلا گیا؟ — کیا وہ بالکل مایوس تو نہیں ہو گیا؟ کیا وہ — میرے منہ سے ایک پی سی چیخ نکلی۔ اُس کی طبیعت کئی دنوں سے خراب تھی۔ وہ کئی برسوں سے صحت کی خرابی کا شکار رہے۔ اس کے پاس علاج کے لئے پیسے نہ تھے۔ اس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہ تھے۔ غالباً وہ کئی روز سے بھوکا تھا۔ مجھے جیسے اچانک احساس ہوا۔ میں بے قرار ہو اٹھی۔ صبح اٹھ کر میں نے موہن ڈے کی

تلاش شروع کی۔ میں اپنے دوستوں کے پاس گئی

"تمہیں معلوم ہے موہن ڈے کہاں ہے؟"

وہ بت کی مانند خاموش تھے۔ میرے دل میں ہراس کی ایک لہر اٹھی۔

"تم خاموش کیوں ہو — موہن ڈے کہاں ہے؟"

"وہ اپنے گھر واپس چلا گیا"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے — اس نے کسی کو بتلایا نہیں۔ مجھے بھی نہیں"

"اُسے اچانک جانا پڑا"

"کب آئے گا"

وہ پہلے کی مانند خاموش تھے۔ میرے ضبط کی انتہا نہ رہی۔

"تم خاموش کیوں ہو؟ — موہن ڈے کب آئے گا؟"

وہ مجھ سے لپٹ گئے۔

"اب موہن ڈے نہیں آئے گا۔ اُس کے جسم کی کوئی نالی پھٹ گئی تھی اور زیادہ خون بہنے سے —"

"موہن ڈے —" میں چیخ اٹھی۔

انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر کہتا تھا کہ "بیماری کی حالت میں کئی دن بھوکے پیٹ تیز (Strong) چائے پیتے پیتے اس کا سسٹم خراب ہو گیا تھا"

میں نے دیکھا آشا لتا سسکیاں لینے لگی۔ وہ تھوڑے وقفے بعد بولی "اور مسٹر ماتھر لوگ کہتے ہیں کہ موہن ڈے زیادہ شراب پینے سے مر گیا ہے"

روتے روتے وہ ہلکے ہلکے کھانسنے لگی ..... اُس کی کھانسی رُکنے میں ہی نہ آتی تھی۔ میں نے اس کی کھانسی کئی بار سنی تھی۔ لیکن اس طرح لگاتار کبھی نہ سنی تھی۔

"مس آشا لتا تمہیں کوئی تکلیف ہے؟"

اس نے میری جانب دیکھا۔ میرے کانوں میں ابھی تک ہلکے ہلکے کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں اس مُسلسل کھانسی سے چونک اٹھا۔ میرے سامنے رینو بیٹھی کھانس رہی تھی۔

"رینو — تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں — آج بڑی ضروری میٹنگ ہے۔ اور میں جا نہیں سکتی۔ پابندی ہے نا — لیکن —"

"تم اتنا زیادہ کام نہ کیا کرو —" یہ میں صرف رینو کو بچانے کے لئے کہہ رہا تھا۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ کام کتنا ضروری ہے۔

کیا آشا موہن ڈے سے ملاقات نہیں ہو سکتی"۔ میں نے سوچا شاید اُس سے دق کے جراثیم کے باوجود بھی زندہ رہنے کا راز معلوم ہو سکے۔ شاید اُسے کوئی بلیک میجک آتا ہے۔

ایم عمارہ

چودھویں صدی

ٹپ ٹپ بوندیں ٹین کی چھت پر گانے لگیں۔ روحی کی نظریں دھان کے ہرے بھرے کھیتوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اس کا کوارٹر ریلوے کالونی کے آخری سرے پر تھا۔ دائیں طرف کوارٹرز تھے اور بائیں جانب سے چھوٹے چھوٹے گراموں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

روحی کے شوہر انتخار کے تبادلے کو ابھی مشکل سے ایک ہفتہ ہوا تھا اور اسی لئے یہاں اس کی ملنے ملانے والیاں سرے سے تھیں ہی نہیں۔ انتخار کے ڈیوٹی پر چلے جانے کے بعد تمام دن کی تنہائی اسے ذرا بھی نہ کھلتی تھی۔ ویسے وہ اگر چاہتی تو ملنے والیاں بہت سی پیدا ہو سکتی تھیں لیکن ڈومر میں گزارا ہوا ایک سال اسے اچھی طرح یاد تھا۔ اسی لئے تنہائی کے باوجود وہ خوش تھی اور اس زندگی کا تصور بھی اس کے لئے سوہانِ روح تھا جو اس نے ڈومر میں گزاری تھی۔

ڈومر میں اس کا کوارٹر تین طرف سے کوارٹروں سے گھرا ہوا تھا اور سامنے کی طرف ریلوے لائن تھی جہاں سے ریل گاڑیاں گزرتی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھیں۔ شروع میں جب روحی وہاں اپنے اس چھوٹے سے کوارٹر میں آئی تھی تو اس کی شادی کو صرف دو دن ہوئے تھے۔ چھوٹے سے پن میں جب وہ بغیر کسی پردہ کے صرف ایک ڈھکیا ساری میں لپٹی ہوئی انتخار کے ساتھ داخل ہوئی تھی تو ہر طرف سے اسے دیکھ کر انگلیاں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں اور بعد میں اس کا یہی بے نقاب چلنا پھرنا ان پردہ نشین بیویوں نے اس کی بہت بڑی آوارگی تصور کیا تھا۔

اپنے بارے میں ان کے عجیب و غریب ریمارک سن کر اسے بڑی کوفت ہوتی۔ پھر بھی وہ اپنی محلے والیوں کی بڑی قدر کرتی۔ ان کے دکھوں پر کڑھتی اور ان کی خوشیوں میں شریک ہوتی۔ ان سے انکساری سے ملتی لیکن بعد میں اسے پتہ چلا کہ اس کی انکساری کو یہ بیویاں خوشامد پر محمول کرتی ہیں اور اس کے لئے جو رائے ان کے دل میں قائم ہو چکی ہے وہ نہیں بدل سکتی اور اس کا ردعمل یہ ہوا کہ اسے نقاب سے چڑ سی ہو گئی اگرچہ اس سے قبل وہ پردے کی قائل تھی اور اس کے ابا میاں نے کپڑوں اور برتنوں کے ساتھ ساتھ ایک نہایت ہی فرسٹ کلاس برقع بھی جہیز میں دیا تھا جسے پہن کر وہ ڈومر کے لئے ٹرین پر سوار ہوئی تھی۔

لیکن اللہ بھلا کرے اس کے بھیا کا جس نے بڑی محنت ابا میاں کو اپنا ہمخیال بنا کر اسے بی۔ اے پاس بنگالی بابو افتخار — ریلوے میں مال بابو (Goods clerk) اور اس کا جا بھیا دوست تھا بیاہ دیا اور شادی سے پہلے اس نے روحی کو سمجھاتے ہوئے افتخار کے متعلق یہ بتایا تھا کہ وہ اچھی خاصی اردو بول لیتا ہے اور افتخار سے باتیں کرنے میں اسے کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

اچھی خاصی اردو کا پتہ تو اسے اس وقت چلا جب وہ "گم چھک گم چھک" کرتی ہوئی ٹرین میں برقع پہنے انٹر کلاس کے جنرل کمپارٹمنٹ میں بیٹھی ہوئی تھی تو افتخار نے گنگنانے کے لہجے میں کہا تھا۔

"تمار کے گورمی لاگے نائیں ابرا اتار پھلاؤ" (تمہیں گرمی نہیں لگتی۔ اسے اتار دو)

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموش رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ افتخار اچھی خاصی اردو بول کر بنگلہ کیوں بول رہا ہے

"تمی امار شونگے بولتے پاری نائیں (تم میری طرح نہیں بول سکتی ہو ؟) اس کے چپ رہنے پر افتخار پھر بولا تھا۔

"مجھے گرمی نہیں لگتی"

"کنو لاگے نا۔ امار کے اے رو کوم کاپڑ بھالو لاگے نا۔ ایرا اتار پھلاؤ امار دیر باڑی دیگے کونو مانش برقع نہیں پینتا" (کیوں نہیں لگتی گرمی سب مجھے اس قسم کا کپڑا اچھا نہیں لگتا۔ اسے اتار دو۔ ہمارے گھر پر لوگ برقع نہیں پہنتے)

یکایک افتخار کو شاید یاد آ گیا کہ اس کی بیوی اردو بولنے والی ہے۔ جگہ زبان سے اچھی طرح واقفیت نہ ہونے اور افتخار کے بنگلہ بولنے کی وجہ سے روحی کو اپنی تمام زندگی افتخار کے ساتھ بتانا کس قدر کٹھن معلوم ہوا تھا۔ ویسے وہ بنگالیوں کے بارے میں تنگ نظر نہیں تھی۔ اس کے خیالات ان کے متعلق بڑے اچھے تھے۔ اور جب اس کے بھیا نے اپنی شادی کے موقع پر اپنی ماں کی پسند کی ہوئی لڑکی سے دامن بچا کر اپنے لیئے ایک خوبصورت بنگالی لڑکی منتخب کی تھی (جو اس کے ساتھ یونی ورسٹی میں پڑھ چکی تھی) تو اسی نے سب سے پہلے اپنے بھیا کا ساتھ دیا تھا بنگالی بہاری شادی کی وہ حامی تھی ہی اسی لئے اس کے بھیا نے اسے افتخار سے بیاہ دیا تھا۔ مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی اس کے خیالات اتنے وسیع نہیں تھے جتنا کہ وسیع خیال اس کا بھیا تھا۔ اس کے دل سے اپنے ابا میاں کی بتائی ہوئی باتیں اس حد تک محو نہیں ہوئی تھیں اسی لئے جب اس نے افتخار کے کہنے پر برقع اتار دیا تھا تو اسے ہر اسٹیشن پر ایسا لگتا جیسے ہر طرف سے نگاہیں اس کے جسم میں نشتر کی طرح چبھ رہی ہیں اور لوگ اسے شادی کے بے ہنگم سرخ لباس میں بری طرح گھور رہے ہیں۔ اسے افتخار پر بہت غصہ آیا تھا جو اس کے دلی جذبات اور کیفیات سے بے نیاز تمام راستہ باہر کی طرف دیکھتا رہا تھا۔ اور تمام راستہ اسے کوفت ہوتی رہی تھی یہاں تک کہ ڈومر قریب آ گیا تھا اور افتخار اترنے کی تیاری کرنے لگا تھا۔ اس نے اپنا برقع پہننا چاہا۔ وہ اس بے ہنگم لباس میں سب کی نگاہوں کا مرکز نہیں بننا چاہتی تھی۔

"او بھائی تم یہ برقع کاہے کو پہنتا ہے۔ ہم کو پردہ ایک دم اچھا نہیں لگتا۔ تم کو تو ہمارے ساتھ ایسا ہی رہنے کو ہوگا"

افتخار کی اردو سن کر اسے بے ساختہ ہنسی آ گئی تھی اور اسے اپنے سینہ سے وہ بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا جو افتخار کے بنگلہ بولنے سے اس کے سینے پر آپ سے آپ رکھ گیا تھا

"ارے تم کاہے کو ہنستا ہے" افتخار نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا

"کچھ نہیں۔ مگر میں اس بے ہنگم لباس میں سب کی نگاہوں کا مرکز نہیں بننا چاہتی"

"ارے بابا تو پھر سادا ساری پہن لو" افتخار نے رائے دی تھی اور ساتھ ہی سیاہ کنارے کی ایک ڈھنکیا ساری اور بلوز نکال کر اس نے سر تھرپر ڈال دیا تھا اور چند ہی منٹ بعد ٹرین ڈومر کے چھوٹے سے اسٹیشن پر رینگ رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر افتخار کے ریل کے ساتھی اس کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔

سامان اترنے لگا۔ ریل کے تنوطی یار لوگ جنگلی جڑانیاں وقت سے پہلے ریل کے وزنی چکوں تلے کچلی جا چکی تھیں اور جن کے دماغ اس سوائے جرائم اور آوارگی کے کچھ نہیں بستا تھا حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ معمولی مال بابو کو حیثیت سے زیادہ سامان ملا اور جب

سب کے بعد بھرے بھرے جسم والی سانولی سی روحی اتری تو سب کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئی تھیں ۔

"ذرا سنبھال کے رکھنا یار اپنی اس تیتری کو، بڑی چوکنی دکھائی دیتی ہے" ایک بابو نے بھونڈے انداز میں مذاق کیا

"Oh very good my dear" افتخار ہنس دیا تھا ۔

اور ساتھ ہی سب نے بلند قہقہہ لگایا تھا ۔ اس نے افتخار کی طرف خفگی سے دیکھا تھا

"اونہہ گندی ذہنیت کے بدتمیز لوگ — آخ تھو" اس نے سوچتے ہوئے پلیٹ فارم پر تھوک دیا تھا اور آنچل کھینچ کر پیشانی تک لے آئی تھی ۔

اور پھر وہ اس محلے میں پہنچ گئی تھی جہاں اس نے ایک سال رو رو کر گزارا تھا ۔ کیونکہ وہ اتنی بہادر نہیں تھی کہ محلے والوں کی طنز و استہزا سے بھری ہوئی باتیں میٹھے گھونٹ کی طرح پی جاتی ۔ ویسے شروع شروع میں محلے والے کسی حد تک خاموش رہے کیونکہ انھیں پتہ نہیں تھا کہ وہ بہاری ہے کہ بنگالی لیکن رفتہ رفتہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ روحی بنگالی نہیں بہاری ہے تو مقدس اور پردہ نشین بیویوں کو جو تقریباً سب ہی اردو بولنے والیاں تھیں روحی کا بے نقاب پھرنا ایک آنکھ نہ بھایا اور اس کے بے پردہ پھرنے کو وہ آوارگی کا پیش خیمہ سمجھنے لگیں ۔ افتخار کے ساتھ شادی بھی ان کی نظر میں آوارگی کا نتیجہ تھی ۔ جدھر سے گزر جاتی کچھ اس قسم کی باتیں سنائی دیتی تھیں ۔

"چلتی کیسے ہے جیسے سڑک نہیں اس کے باپ دادا کا محل ہے ۔ قسم خدا کی بکی بدچلن دکھائی دیتی ہے" ایک آواز بلند ہوتی ۔

"توبہ کرو بہن توبہ! چودھویں صدی ہے نا ۔ اس کے بارے میں تو قرآن مجید میں آیا ہے کہ راہ چلتے بے شرمی ہوگی" دوسری آواز اپنی قابلیت جتاتی ۔

"اس سے بڑھ کر اور کیا بے شرمی ہوگی بہن دیکھو تو کس مزے سے کاندھے سے کاندھا بھڑائے چلی جا رہی ہے جیسے سب کی آنکھیں پھوٹ گئی ہوں ۔ قسم خدا کی بہن جب سے آئی ہے ۔ ہمارے مرد بھی بے ہاتھ ہوئے جا رہے ہیں" کوئی صاد کرتی ۔

"ہم سنا رہے ہوا کہ بے پردہ چلنے سے گناہ ہوئے ہے ۔ یہی سے ہم اپنی بیٹی اور بہو کو باہر نا نکلنے دے ہیں ۔ ارے ہمرا کا ہم تو بڑھیا ہیں" ۔ بوڑھی رحیمن (جو ایسی محفلوں کی جان تھی اور لوگوں کے ناکردہ گناہوں کی فہرستیں اس کی زبان پر تھیں ۔ جس نے خود روحی کے بہت ناکردہ عیب لوگوں سے بیان کئے تھے اور اسی لئے ان کے درمیان کافی مقبول تھی) آہستہ سے کہتی ۔

پہلی آواز دوسری سے مخاطب ہوتی "ارے ہاں بے پردگی ہی سے تو ساری برائیاں جڑ پکڑتی ہیں ۔ کیوں بہن ؟"

"ارے اور کیا ۔ قرآن میں آیا ہے پردہ کرو ۔ پردہ سب برائیوں سے بچاتا ہے اور بے پردگی سب سے بڑی لعنت ہے اور مثال کے طور پر مال بابو کی بیوی کو لے لو نا ۔ اگر نگوڑی پردہ کرتی ہوتی تو کبھی ان ہتھکنڈوں سے واقف بھی نہ ہوتی ۔ ہماری طرح شریف بیوی بن کر رہتی" ۔ دوسری آواز سہارا دیتی ۔

اور یہ سب باتیں سن کر وہ بے بس ہو کر رو دیتی ۔ سوائے رونے کے اسے اور کوئی راستہ نہیں سجھائی دیتا تھا ۔ اس نے محلے والوں سے ملنا ملانا ایکدم بند کر دیا ۔ اور تمام دن اپنے اجاڑ فینسنگ میں بیٹھی پھول کے پودے لگاتی اور ان کی دیکھ بھال کیا کرتی ۔ اس طرح تنہائی اسے زیادہ نہیں کھلتی ۔

شام کے وقت افتخار کے ساتھ اس کے بنگالی دوست آجاتے تو اپنے چھوٹے سے فینسنگ میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے اسے بہت بھلا لگتا تھا ۔

اسے افتخار کے یہ بنگالی دوست بڑے اچھے لگتے تھے ۔ کم از کم وہ اتنے بامروت تو تھے ہی کہ اس کے سامنے کبھی کسی قسم کی دل آزاری کی بات نہیں کہی تھی اور وہ اسے اپنے افتخار کی طرح سیدھے اور معصوم دکھائی دیتے تھے ۔ ویسے افتخار کے کئی بہاری دوست بھی بڑے اچھے ثابت ہوئے تھے جن کے تعلقات ان دونوں میاں بیوی سے بڑے اچھے تھے ۔ وہ ان کی قدر دان تھی لیکن ان سے ملتے ہوئے ڈرتی تھی کیونکہ ان کی بیویاں

اخلاق کی اس حد سے بھی گزر چکی تھیں جہاں دکھاوے کا اخلاق ہوتا ہے

روحی کو اگر اپنے شوہروں سے مسکرا کر باتیں کرتے بھی دیکھ لیتیں تو اپنے شوہروں کی عمر اور ان کی شکل و شباہت سے بے نیاز ہو کر یہ فیصلہ صادر کر دیتیں کہ یہ ہوائی دیدہ عورت اب ان کے شوہروں کو ہتھیانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور پھر چودھویں صدی کی تکرار اتنی مرتبہ ہوتی کہ وہ عاجز آ جاتی۔ اور ایسے ہی عاجز ہو کر ایک دن اس نے افتخار سے کہا تھا

"پیارے! اس محلے میں تو میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے اگر زیادہ دن اور رہی تو میری موت ہو جائیگی یہاں کی عورتوں کی نظر میں میں اخلاق سے گری ہوئی ہوں اور عورت ہونے کی وجہ سے میں ان سے دور بھی نہیں رہ سکتی۔ اور خصوصاً ان بہاریوں کی نظر میں تو —"

"اوہو، چپ رہو، ہم یہ بہاری بنگالی کا سوال سننا نہیں مانگتا" افتخار سر جھٹک کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔

"نہیں سننا مانگتے تو مت مانگو لیکن میں ان کی تہذیب سے گری ہوئی باتیں کب تک سنتی رہوں گی" وہ بڑے دکھ سے رو پڑی

"ارے ارے۔ تم کاہے کو روتی ہیں مائی ڈارلنگ۔ اتنا سا بات پر بھی کوئی روتا ہے۔ بری بات" افتخار نے پیار سے اس کا کاندھا تھپکا —

"ہاں آں۔ اتنی سی بات۔ قسم خدا کی آپ کو کوئی کہتا تو دیکھتی کیسے آپ برداشت کرتے ہیں"

"تو ہم کیا بچا ہوا ہے روحی۔ لوگ ہم کو بھی بہت بولتا ہے پر ہم ایسا ایسا بات کا پرواہ نہیں کرتا ہے۔ اے سب لوگ جاہل ہے۔ پڑھا لکھا ہوتا تو کبھی ایسے لوکرم بات نہیں بولتا"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ آپ تبادلے کی کوشش کیجئے۔ مجھے یہ سب باتیں قطعی اچھی نہیں لگتیں۔ آپ کو نہیں پرواہ ہو تو میری بلا سے لیکن میں اگر زیادہ دنوں یہاں رہی تو مجھے ٹی۔ بی ہو جائے گی" روحی جھنجلا اٹھی

"تم کیسا بات کرتا ہے۔ کیا برا بھلا سننے ہم کو اچھا لگتا ہے۔ مگر بتاؤ تو ہم کرے بھی تو کیا کرے۔ جتنا مشاہرہ ملتا ہے اتنے میں گزارا مشکل ہے۔ اسی لئے میں یہاں سے تبادلہ نہیں چاہتا تھا۔ خیر دیکھو کوشش کرے گا" افتخار نے ڈومر کی لامحدود آمدنی کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں ہاں ضرور کوشش کیجئے۔ کوشش رائیگاں نہیں جاتی ہے۔ خدا نے چاہا تو اس سے بھی اچھا اسٹیشن ملے گا"

"ہاں آگے اللہ مالک ہے"

اور اس گفتگو کے کوئی دو ہفتہ بعد اس کا تبادلہ اس بڑے اسٹیشن پر ہو گیا۔ جہاں اس کا چھوٹا سا کوارٹر ریلوے کالونی کے آخری سرے پر تھا جس کے بعد ہرے ہرے کھیتوں اور گراموں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اور اس وقت وہ کھلے ہوئے برآمدے میں ہر طرح کے پردے سے بے نیاز افتخار کے لئے بنیان بنتے ہوئے اپنے نئے پڑوسیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جو اس کے دائیں طرف بستے تھے اور جن میں سے ایک صاحب سے اس کی ملاقات صبح افتخار کے ساتھ ٹہلتے ہوئے اتفاقاً ہو چکی تھی اور ان صاحب کو اس کے اردو بولنے پر بہت تعجب ہوا تھا اور اس سے بھی زیادہ تعجب انھیں یہ سنکر ہوا تھا کہ وہ بہاری ہے۔

"اے بہن سنتی ہو۔ ایک کوارٹر سے جو اس کے برآمدے سے ذرا ہٹ کر تھا آواز آئی۔ اس نے دیکھا کھڑکی پر ایک خاتون کھڑی ہوئی اسے اشارے سے بلا رہی تھیں۔

"مجھ سے کہہ رہی ہیں آپ؟" روحی نے بلند آواز میں پوچھا

"ہاں ہاں!! ذرا سنیئے گا تو۔

اور وہ ہلکی ہلکی بوندوں میں بھیگتی ہوئی کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔

"کہاں سے آئی ہیں بہن؟"

"جی ڈومر سے" اس نے جواب دیا

"بہاری ہیں کہ بنگالی؟" اس نے اس طرح پوچھا جیسے انکوائری کر رہی ہو

"جی بہاری" اس نے سہم کر دل ہی دل میں سوچا یہاں بھی بہاری بنگالی کا سوال اٹھنے لگا

"تب نقاب کیوں نہیں اوڑھتی ہو؟"

"میرے شوہر بنگالی ہیں" اسے کوئی معقول جواب نہیں سوجھا

"بنگالی ہیں تو کیا بنگالی پردہ نہیں کرتے۔ دیکھو وہ سامنے والے مال بابو بھی تو بنگالی ہیں لیکن وہ لوگ تو پردہ کے پابند ہیں"

"لیکن میں پردے کی قائل نہیں ہوں"

"تو پھر ایسے کہو۔ یہ کیا کہ ...."

"اے بہن چھوڑو بھی، ہو گی کوئی ایسی ویسی جس کے پنجے میں بے چارا مال بابو پھنس گیا ہے۔ منے کے ابا بھی ایسا ہی کہہ رہے تھے آج ان کی ملاقات صبح ان سے ہوئی تھی نا"

اس نے گھبرا کر ادھر دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ ایک محترمہ اپنا طباق سا چہرہ کھڑکی سے لگائے گل افشانی فرماتے ہوئے اسے گھور رہی تھیں۔

"ہاں بہن ٹھیک کہتی ہو۔ جو ہو رہی تھوڑا ہے چودھویں صدی ہے نا" دوسری نے تائید کی

روحی کو ایسا معلوم ہوا جیسے پھر چولھا دہکتے ہوئے انگارے اس کے جسم پر انڈیل دیئے گئے ہوں

چوکھٹ

(صفحہ ۱۷۲ سے آگے)

بتاؤ ۔ بتاؤ مجھے ...."

مجھے اپنے بازوؤں پر شدید دباؤ محسوس ہوا۔ پھر اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ اس پر کھانسی کا لمبا دورہ پڑا۔ وہ کھانسی سے دوہرا ہو کر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ پھر تھوک کر اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ اس نے تھوک میں خون اگل دیا ہے۔ اس نے تھوک سے فوراً نظریں پھیر لیں میں نے اسے تانگے میں بٹھا لیا۔ تانگہ سڑک پر بھاگنے لگا۔

"یار ــــ" میں نے کہا۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا رہا۔ بھاگتے ہوئے تانگے میں وہ سڑک کو یوں گھور رہا تھا جیسے جگہ جگہ اس نے خون تھوک دیا ہو ـ !

علی اختر حیدر آبادی

مرے ہمدم!

مرے ہمدم یہ دُنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

یہاں اس کش مکش میں شادمانی مدّعا کیوں ہے
جفا کا یہ تصوّر اور یہ انکارِ وفا کیوں ہے
ترے دل میں تمنّائے نشاطِ غم رُبا کیوں ہے
مآلِ دہر سے تیری نظر نا آشنا کیوں ہے

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

سکوں کی زندگی میں ایک بھی ساعت نہیں ملتی
بساطِ سلطنت پر بھی یہاں عشرت نہیں ملتی
بلا سے اِن فضاؤں میں اگر راحت نہیں ملتی
تعجب ہے تجھے دنیا سے کیا عبرت نہیں ملتی

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

اِدھر آ میں بتاتا ہوں کہ رازِ آب و گِل کیا ہے
رہِ سوز و سکوں کیا ہے مقامِ عقل و دل کیا ہے
یہ وہم زندگی کیوں ہے یہ مرگِ مستقل کیا ہے
اسی صبر آزما احساسِ غم کے متّصل کیا ہے

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

سکوں کیسا جب اجزائے سکوں خود ناشکیبا ہیں

نہ جانے کتنے محشر ہیں کہ ہر ذرّے میں برپا ہیں
یہ تیری عشرتیں، منّت کشِ آب و ہوا کیا ہیں
وہی زندہ ہیں جو دنیا کے طوفانوں میں زندا ہیں

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

حریفِ خندۂ گل گریۂ شبنم نہیں ہوتا
ہوا سے برچمِ خورشیدِ خاور خم نہیں ہوتا
نہ ہو ہمت تو کارِ زندگی محکم نہیں ہوتا
یہ طوفاں تھم نہیں جاتے اندھیرا کم نہیں ہوتا

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

مجھے دیکھ اس نظامِ آب و گل کا رازداں میں ہوں
رموزِ عیش و غم کا مرکزِ شرح و بیاں میں ہوں
ربابِ عجز کے تاروں میں صوتِ جاوداں میں ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر خود اپنی ہستی پر گراں میں ہوں

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

اُٹھائی زندگی بھر نامرادی کی جفا میں نے
دیارِ صبح میں پائی یہاں شب کی فضا میں نے
نہ دیکھی ان مناظر میں اُمیدوں کی ضیا میں نے
سُنا اس بزم میں نغمہ نہ کوئی دل کُشا میں نے

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

مگر میری زباں پر شکوۂ دَوراں نہیں آیا
ڈبو دیتا مجھے ایسا کوئی طوفاں نہیں آیا
تڑپ کر ایک بھی آنسو سرِ مژگاں نہیں آیا

مجھے اتنا یقینِ پستیٔ انساں نہیں آیا

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

نہ کی میں نے اُچٹتی سی نظر بھی قصر و ایواں پر
ہوس نے اپنی چلتی یورشیں کیں عقل و عرفاں پر
میں ہنستا ہی رہا بے ربطیٔ اجزائے دوراں پر
خزاں چھائی مگر چھائی نہیں میرے گلستاں پر

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

گدا بن کر یہاں تخلیق کیں سلطانیاں میں نے
فنا ہو کر بنا ڈالے جہاں اندر جہاں میں نے
بپا اس خاک پر کی مجلسِ روحانیاں میں نے
کئے پیدا حقیقت کے ہزاروں رازداں میں نے

مرے ہمدم یہ دُنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

دیا ہے میں نے کس کس کو نہ جانے درسِ بینائی
بصیرت نے مری ذرّوں کو بخشی انجُم آرائی
مرا اک کھیل ہے یہ نیم وا غنچوں کی رعنائی
یہ برنائی، یہ رنگینی، یہ بیداری، یہ پیدائی

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

اٹھ اب اے ناتواں شرحِ مقامِ کبریا ہو جا
خود اپنی آرزو بن جا، خود اپنا مدعا ہو جا
نکل ان بندگی کے زاویوں سے اور خدا ہو جا
خُدا کی مصلحت سے ابن آدم آشنا ہو جا

مرے ہمدم یہ دنیا ہے تجھے اس سے گلا کیوں ہے

سلام مچھلی شہری

نیا اُفق، نیا جنم

(موسمِ بہار کی ایک رات)

خاوند:۔

— سو بھی جاؤ کہ اب رات ڈھلنے کو ہے
جاگنا ایسی حالت میں اچھا نہیں۔
— کتنی دلکش ہے یہ نصفِ شب کی فضا
سُرمئی اَبر کی شال اوڑھے ہوئے
نیند سے چاند کی نازنیں چُور ہے۔
اور اس کی کنیزیں — نجومِ فلک
اک حسیں بربطِ خواب چھیڑے ہوئے
اس کے چاروں طرف رقص میں محو ہیں — !
— دیکھتی ہو — وہ — بزمِ اُفق کی طرف
رنگ بھرنے کو کچھ نقش ہیں مضطرب
اک نئی زندگی
جو نئی طرح سے
بن چکی — سج چکی
وہ مچلنے کو ہے۔
سو بھی جاؤ
کہ اب رات ڈھلنے کو ہے — !
— تم سے بڑھ کر نئی زندگی کے لئے
خیر مقدم کو موزوں نہیں ہے کوئی
گود میں اِس افق کی نئی صبح ہے
اور تم نے بھی پالی ہے اک زندگی
اس افق میں نئی زندگی ہے نہاں
تم بھی پہلے پہل بننے والی ہو "ماں"
سو بھی جاؤ کہ اب صبح ہونے کو ہے
زندگی لعل و گوہر پرونے کو ہے — !!

بیوی:۔

— تم نے کیسے یہ جانا "بڑے وہ ہو تم!"
نیند؟ ہاں، جانے کیوں نیند آتی نہیں!
سوچتی ہوں کہ پہلے بھی کب خوش تھے ہم
اور اب یہ نئی زندگی کیا کریں
یہ نیا بار ہم سے نہ اُٹھ پائے گا — !
تم کہ بس ایک "خوش فہم فن کار" ہو
اپنے ہی خواب زاروں میں کھوئے ہوئے،
جس کو گھر کی ضرورت سے مطلب نہیں
زندگی کے حقائق کی پروا نہیں
حال کا غم نہیں
فکرِ فردا نہیں — !

ٹال جاؤ یہ میں نے یُونہی کہہ دیا
ورنہ ظاہر ہے، تم ایک فن کار ہو
جائزہ زندگی ہی کا لیتے ہو تم
شادمانی و غم کے ہر احساس کو
عام انسان کی طرح سے سوچ کر
کیف زا، جاوداں رنگ دیتے ہو تم۔
کیا کروں، پھر بھی یہ سوچ لیتی ہوں میں
اپنے گھر کی نجی زندگی کے لئے
کیوں تخیل کی ہی ناؤ کھیتے ہو تم
زندگی اک حقیقت ہے، سپنا نہیں
آج تک تم نے اس طرح سوچا نہیں ——!؟

خاوند:۔

—— خوب، یہ لمحۂ اولیں خوب ہے
آج پہلے پہل تم ہو گوہر فشاں
میں خدا کی قسم ہوں بہت شادماں
پھر بھی اے میری دنیا کی صبحِ جواں!
تم بہت نرم و نازک ہو، بہتر یہ ہے
اتنے گہرے مسائل نہ سوچا کرو
اور ایسے میں جب
اِن دنوں تم کو آرام درکار ہے
اک سکوں اور خوشی ہر گھڑی چاہیے
اس قدر فکر کرنا مناسب نہیں ——!
—— سوچنا یہ ہے، ہم خود غرض کیوں بنیں
اک طرف تو ہے سارے جہاں کی خوشی
اور اک سمت اپنی نجی زندگی
کس کو اپنائیں، کس کے لئے شاد ہوں
ہم اگر یہ سمجھ لیں بڑی بات ہے —— !
یوں بھی سورج نکلتا ہے —— کس کے لئے؟
چاند ہنس کر مچلتا ہے —— کس کے لئے؟
اس زمیں کے لئے،
اس جہاں کے لئے،
عام انسان کی روشنی کے لئے،
عام انساں تو کیا
سارے ذی ہوش کی زندگی کے لئے ——؟!!
—— اور جب ہم یہ رازِ خوشی جان لیں
تب شکایت تو کیا شکر کرنے لگیں ——!
—— تم کو شکوا ہے میں ایک فن کار ہوں
پھر بھی مفلس ہوں، مجبور و ناچار ہوں
اور وہ دن بھی سوچو کہ جب میرا فن
دہر کے ذہنِ بیدار کے واسطے
ایک پیغامِ عزم و عمل بن سکے
کیف زا نغمۂ کارواں بن سکے
تب تمہارے یہ شکوے نہ رہ پائیں گے
تب تمہارے یہی جذبہ ہائے حزیں
خود مری ذات پر ناز فرمائیں گے ——!
خیر، میں بھی نہ جانے بہک کیوں گیا۔
ہاں تو میرے لئے، میرے کہنے سے اب
اے مری زندگی کی خوشی! سو رہو
رات ڈھلنے کو ہے، صبح ہونے کو ہے
زندگی لعل و گوہر پرونے کو ہے
اور ہم کو نئی صبح کے واسطے
خیر مقدم کو تیار ہونا بھی ہے
سو رہو، سو رہو،
اے مری زندگی کی خوشی! سو رہو ——!

بیوی:۔

—— چاہتی تو ہوں سونا مگر کیا کروں
آج کل جانے کیوں نیند آتی نہیں۔
میں سمجھتی ہوں، فصلِ بہاراں ہے یہ

پھر بھی دل کی کلی مسکراتی نہیں ——— !

خاوند:-

نغمۂ کیف آگیں سُنا دوں تمہیں
لوریاں دے کے آؤ سُلا دوں تمہیں۔

بیوی:-

—— لوریاں؟ یعنی بچّی میں دو دن کی ہوں؟!

خاوند:-

—— نیند آئے نہ تم کو تو میں کیا کروں۔
ہاں، تو اب مُوند لو اپنی آنکھیں ذرا
اور سنتی رہو نغمۂ کیف زا ———

(یہ کہہ کر ایک گیت
گُنگُنانے لگتا ہے)

نغمۂ خواب

ہولے ہولے خوابوں کی شہزادی اُڑتی جائے
ہولے ہولے خوابوں کی شہزادی اُڑتی جائے ——
دُور ——— وہاں، تاروں کی جانب
دل کش نظاروں کی جانب
خواب جہاں ہے ایک حقیقت اُن جلوہ زاروں کی جانب
جہاں اُفق پر نیا سویرا جھوم جھوم لہرائے
ہولے ہولے خوابوں کی شہزادی اُڑتی جائے ———
پھول ہنسیں، کلیاں مسکائیں
پوری ہوں من کی آشائیں
سواگت کو اس شہزادی کی چھم چھم کرتی پریاں آئیں
آنکھ کھلے تو نیا سویرا میٹھے گیت سنائے
ہولے ہولے خوابوں کی شہزادی اُڑتی جائے ———!!

خاوند:-

(بیوی محوِ خواب پاکر)
—— مضطرب رُوح آخر سکوں پا گئی
ہولے ہولے تمہیں میٹھی نیند آگئی
وادیٔ خواب میں یوں ہی کھوئی رہو
صبح تک فرشِ راحت پہ سوئی رہو
زندگی بخش گلہائے شاداب میں
ڈوب جاؤ حقیقت بھرے خواب میں
——— دیکھو یہ ہے سجیلا، لہکتا چمن
یعنی دھرتی ——— کہ جو ہے سبھی کا وطن
ایورسٹ آج قدموں پہ ہے سرنگوں
ندیوں کا بھی باقی نہیں وہ جنوں
شہر کے صنعتی کارخانے ہیں یہ
اک نئے دَور کے تانے بانے ہیں یہ
دیکھو، یہ کامگاروں کی ٹولی چلی
ہاتھ میں لے کے موتی کی جھولی چلی
دُور ——— وہ پیپلوں کی گھنی چھاؤں ہے
ہاں، وہیں اپنا جاگا ہوا گاؤں ہے
گونج پنگھٹ سے چھاگل کی آتی ہے یہ
کوئل آموں پہ اب گنگناتی ہے یہ
یہ کسان آج کس درجہ ہیں شادماں
اب مشینیں ہیں اِن کھیتوں میں رواں
بچے اسکول جانے کو تیار ہیں
ہونے والے جہاں کے یہ معمار ہیں
گاؤں کی زندگی آج مُردہ نہیں
آج کوئی بھی بچہ فسردہ نہیں
گاؤں اور شہر، دونوں ہی بیدار ہیں
دونوں آگے ہی بڑھنے کو تیار ہیں
اک نئی روشنی، اک نئی دلکشی
چھا گئی ہے زمیں پر نئی زندگی
——— گود میں پھول اک مسکرائے گا جب
کوئی ہنس کر تمہیں بھی ہنسائے گا جب

تب سمجھ پاؤگی روشنی صبح کی
خیر مقدم کرے گی نئی زندگی
کوئی روٹھے گا اس کو مناؤگی تم
لوریاں میٹھی میٹھی سُناؤگی تم

(اب خاوند دوسرے پلنگ پر
جا کر خود سو جاتا ہے۔ اسی
وقت بیوی عالمِ خواب میں ایک
لوری گنگناتی ہے)

لوری

آجا ری نیندیا! آجا
مورے "چندا" کو آکر سُلا جا

جلدی جلدی بڑھے اور ہووے جوان
مورے چندوا میں ہے اک سپاہی کی شان
لے کے نکلے گا اک دن یہ تیر و کمان

جگ کی سیوا کا امرت پلا جا
آجا ری نیندیا! آجا
مورے چندا کو آکر سُلا جا ___!

موری چھوٹی سی بگیا کا یہ ہے گلاب
سدا قائم رہے اس کا بانکا شباب
اس کے ہاتھوں میں ہو آشتی کا رباب

"امن" کی راہ اس کو دکھا جا
آجا ری نیندیا! آجا
مورے چندا کو آکر سُلا جا ___!

بیوی:۔

(اب عالمِ خواب میں اپنے بچے
سے کھیل رہی ہے)

___ ٹھہر جا اے شریر!
اِس قدر کیوں پریشان کرتا ہے تو
ماں کو ہر وقت ہلکان کرتا ہے تو
ہائیں، یہ کیا، اُدھر جھاڑیوں میں نہ جا
کوئی کانٹا اگر پاؤں میں چبھ گیا؟
___ خوب، شاباش، تم تو سمجھ دار ہو
میری گودی میں آنے کو تیار ہو
دیر کاہے کو ہے، دوڑ آؤ نا پھر
گود میں آکے اب مسکراؤ نا پھر
___ ٹھہر، ابا کے کمرے کی جانب نہ جا
تُو یہ آفت کا پرکالا کیوں بن گیا
اُن کے خوابوں کا ایواں نہ چھونا ذرا
اُن کی غزلوں کا دیواں نہ چھونا ذرا
تیرے ابا، خبر ہے، کلاکار ہیں
ہر گھڑی محوِ گیسو و رخسار ہیں
خیر، تُو مانتا ہی نہیں ہے تو جا
اپنے ابا کو بھی جاکے نخرے دکھا
میں تو تیری شرارت سے اب تھک گئی
کب سے ہوں تیری باتوں میں کھوئی ہوئی
___ دیکھ، یہ پھول تجھ کو بھی مرغوب ہے؟
ہاں، چلا آ، تجھی سے یہ منسوب ہے!
تیرے ابا کا کہنا ہے صبحِ زمیں
لے کے آئی ہے گلہائے کیف آفریں
جن کی رنگت میں بچوں کے رُخ کی جھلک
جن کی خوشبو میں بچوں کے لب کی مہک
___ ٹھہر اے میرے غنچے پریشاں نہ کر
اس نئی صبح کے،
اس نئے دور کے
خیر مقدم کی خاطر مری گود میں
آکے اے میرے نورِ نظر! اب سنور ___!
___ ہاں، یہ کیا، پھر اُدھر جھاڑیوں میں نہ جا

ٹھہر، تو اس طرح گر نہیں مانتا
میرے غصے کا کچھ کو نہیں ہے پتہ ——

(اسی وقت خاوند
جاگ جاتا ہے)

خاوند:-

کس لئے اور کس پر ہے یہ برہمی
اٹھ بھی جاؤ مری صبحِ نو کی خوشی !

بیوی:-

(جو ابھی اچھی طرح
نہیں جاگی ہے)

خوابِ دل کش سے مجھ کو جگاؤ نہ تم

خاوند:-

جگ چکی ہو تو ناحق ستاؤ نہ تم
ہاں، مجھے بھی بتاؤ یہ کیا بات تھی —— ؟

بیوی:-

(جواب جاگ چکی ہے)

—— سامنے اک حقیقت بھری رات تھی !
غنچۂ نو مری گود میں آگیا
مانو دھرتی پہ اک چاند ہنسنے لگا
پھول بچے کی صورت میں ڈھلنے لگا
سامنے جلوۂ پیکرِ رنگ و بو
میں بھی کرنے لگی اس سے کچھ گفتگو —— !

خاوند:-

تم سمجھتی ہو، کیا اس کی تعبیر ہے ؟

بیوی:-

سامنے اب بھی بچے کی تصویر ہے

خاوند:-

ہاں، یہی صبحِ نو کی بھی تنویر ہے !
—— اک نئی سرزمیں، اک نیا آسماں
کارواں سوئے بزمِ افق ہے رواں
اس افق میں نئی زندگی ہے نہاں
تم بھی پہلے پہل بننے والی ہو "ماں" —— !
—— ہاں، ملاؤ قدم،
ہاتھ میں ہاتھ دو،
اس نئے پھول کی خوشبوؤں کی قسم،
سوئے منزل یونہی بڑھتے جائیں گے ہم —— !!!

(پرندوں کی چہچہاہٹ
اور خوش گوار ہواؤں کے ساتھ
واقعی صبح ہو جاتی ہے)

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

—— میرؔ

حمید الماس

منزل بہ منزل

زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
جرسِ کاروانِ بیداری
بلبلِ بوستانِ سرشاری
گرمیٔ بزمِ ناز و رعنائی
دامنِ ارتقاء کی پہنائی
شورشِ نغمہ ہائے صبح و شام
رقصِ موجِ شرابِ لالہ فام
نازشِ بزمِ حسنِ ماہتابی
روئے گل پر ہے تجھ سے شادابی
نورِ خلدِ زمیں ہے ذات تری
ایک افسوں ہے کائنات تری
چشمِ خوباں میں تیری مستی ہے
رازِ تخلیق تیری ہستی ہے

زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
ایک میں بھی ہوں تیرا سودائی
اے ندیمِ حریمِ تنہائی
لیکن اے شمعِ محفلِ عالم
نہ ہوئی مجھ پہ تیری چشمِ کرم
اے صدائے ربابِ احساسات
ایسے گذرے ہیں مجھ پہ کچھ لمحات
گیسوئے شب کی نرم چھاؤں میں
رسمساتی ہوئی فضاؤں میں
چاندنی کے حسیں نظاروں میں
جگمگاتے ہوئے ستاروں میں
دل میں تصویرِ غم اُتر آئی
دفعتاً میری آنکھ بھر آئی
دستِ تمکیں سے قلب چھوٹ گیا
آبگینے کی طرح ٹوٹ گیا

زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
ایسے لمحات جب کہ آتے ہیں
غم کے تاروں کو چھیڑ جاتے ہیں
چاندنی دل کو گدگداتی ہے
مجھ کو ہر بات یاد آتی ہے
عہدِ طفلی کے دل نشیں ایام
جگمگاتی سحر، سہانی شام
نت نئی جستجو کے افسانے
آرزوؤں کے دل میں میخانے
آسمانوں کی سیر کرتے تھے
چاند تاروں سے بھی گذرتے تھے

وہ انوکھی ضدیں لڑکپن کی
وہ ہوائیں سحر کے دامن کی
اب تو بھولا ہوا فسانہ ہیں
ایک موہوم سا ترانہ ہیں

زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
اُن سہانے دنوں میں بھی تو نے
نہ دیا سازِ عیش کو چھونے
وہ مری ماں وہ بھیا رکی دیوی
تجھ کو بھائی نہیں خوشی اس کی
تو ذرا انتظار کر نہ سکی
میری ماں مجھ کو پیار کر نہ سکی
اور احساس کی صداؤں میں
مشعلِ فکر کی ضیاؤں میں
نوجوانی کے لالہ زاروں میں
اوس بہتی ہوئی بہاروں میں
جستجوئے نشاط میں اکثر
دشتِ خونابِ غم کی راہوں پر
پیارے ممتا کی نرم باہوں نے
ماں کی شفقت بھری نگاہوں نے
اپنے لختِ جگر کو جی بھر کر
اپنے نورِ نظر کو جی بھر کر
مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا
گیت گاتے ہوئے نہیں دیکھا
زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
تو نے میرے جہاں کو چھین لیا
ایک بچے سے ماں کو چھین لیا

مجھ کو جب اس کی یاد آتی ہے
روح تک کانپ کانپ جاتی ہے

زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
صرف اتنا ہی کم نہ تھا یہ جور
تو نے سوچیں مگر جفائیں اور
یاد ہے وہ فساد کا ہنگام
جب کہ ہر صبح بن گئی تھی شام
ظلم و وحشت سے تو نے کام لیا
باپ کو بھی مرے شہید کیا
اب نہ پاؤں گا دہر میں زنہار
ماں کی ممتا اور باپ کا پیار
اب نہ آنسو ہیں اور نہ آہیں ہیں
خشک دریا ہیں خشک راہیں ہیں

زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
ظلم کیونکر ترے گناؤں میں
اور کیسے انہیں چھپاؤں میں
وہ مرا بھائی جو مری جاں ہے
دق کے موذی مرض میں غلطاں ہے
وہ سہانے دنوں کی تصویریں
بن گئیں آنسوؤں کی زنجیریں
روح میں ہیں غموں کے سو گرداب
زندگانی کا ڈوبتا مہتاب
ہو گئی زہر پھول کی خوشبو
زرد آنکھوں میں خون کے آنسو
شعلۂ بے کسی بھڑکتا ہے

سانس اکھڑتی ہے دل دھڑکتا ہے
روز ہی دل کی دھڑکنوں کا شمار
اڑتے لمحوں کے بے ثمر اشجار
دھیمی دھیمی سی وقت کی گروش
ہر نفس ایک موت کی لرزش
زندگی کیوں وفا نہیں کرتی
اس کو صحت عطا نہیں کرتی
تا کجا آنکھ اشکبار رہے
تا بہ کے دق کا وہ شکار رہے

زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
جس طرف دیکھتا ہوں آہیں ہیں
غم میں ڈوبی ہوئی نگاہیں ہیں
در ہی درد نوحہ ساماں ہیں
گرم آنسو پلک پہ لرزاں ہیں
شدتِ غم میں کوئی روتا ہے
کوئی اشکوں سے منہ کو دھوتا ہے
کتنی مائیں ہیں کتنی بہنیں ہیں
جن کے سینوں میں غم کی آنچیں ہیں
راز اب یہ ہوا مجھے معلوم
میں تو کیا کُل جہان ہے مغموم
ایک میں ہی نہیں رہینِ ستم
سینکڑوں ہیں قتیلِ خنجرِ غم
میرا سرمایہ صرف چند آنسو
اور ہر سمت بہہ رہا ہے لہو
کھیت میں مل میں شاہراہوں میں
آدمیت کی بارگاہوں میں
ظلم اور جور کی کہانی ہے
موت کے بس میں زندگانی ہے
لاکھ ڈھونڈو خوشی نہیں ملتی
چاند ہے چاندنی نہیں ملتی
زہرِ غم اب پیا نہیں جاتا
زندگی، اب جیا نہیں جاتا

زندگی شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
تیری نظروں میں چند گلشن ہیں
چند ایواں ہیں چند مسکن ہیں
صرف محلوں میں نور ہے تیرا
چشمِ زر میں سرور ہے تیرا
مفلسوں پر کرم نہیں تیرا
جھونپڑی میں قدم نہیں تیرا
لیکن اے شوخ و شنگ شہزادی
اے نفس کی رواں دواں وادی
آدمی ہو رہا ہے اب بیدار
اپنے یک طرفہ لطف سے ہشیار
صبحِ نو کی قریب ہے وادی
چونک اے زندگی کی شہزادی
اب اُجالے قریب آتے ہیں
زندگی کے نقیب آتے ہیں
روشنی رنگ، روپ لاتی ہے
جھونپڑوں میں پلٹ کے آتی ہے
اب میرا غم غمِ زمانہ ہے
اور ہونٹوں پہ یہ ترانہ ہے

گلشنِ دہر کی بہار ہیں ہم
زندگانی کے تاجدار ہیں ہم

قلندر

ترجمہ

رضا ہمدانی

کانٹا

(پشتو)

میں جب شام سے اندھیرے میں گاؤں پہنچا ــــ تو گاؤں کسی بیوہ کی زندگی کی طرح سونا سونا تھا ــــ لوگ باگ حجرے میں دم بخود تھے ۔ بچے بھی خلاف معمول جلدی ہی گھروں کو چلے گئے تھے ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گاؤں کی زندگی کسی نے لوٹ لی ہو، مستی چھین لی ہو اور رنگ و روپ کھرچ لیا ہو ۔

میں نے حجرے کی طرف سے گزرتے ہوئے سلام کیا

"وعلیکم" ــــ کسی نے بڑا سرد اور ادھورا سا جواب دیا ــــ میرے دل میں وسوسوں نے جنم لینا شروع کیا ۔ جی میں آئی کہ کسی سے اس افسردگی کی وجہ پوچھوں لیکن، قوت گویائی کے ہوتے ہوئے بھی ہمت نہ پڑی ۔ مجھے بھی ماحول نے متاثر کر دیا تھا ۔

میری رفتار سست پڑ گئی ۔ ایک دفعہ پھر میں نے سارے حجرے پر نگاہ دوڑائی ، لوگ سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے ۔ میں پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روانہ ہو گیا اور جب پنگھوٹ پر پہنچا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ناچنے لگا ۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید آج میں کسی دوسرے رستے پر آنکلا ہوں ۔ لیکن جوں ہی میری نظر بیر کے پرانے اور چھدرے درختوں پر پڑی تو میرا خیال بدل گیا ۔

"لیکن یہ افسردگی کیسی ہے ــــ؟" میں نے ادھر ادھر دیکھا ۔ آج تو پنگھوٹ پر کوئی پانی بھرنے والا بھی نہ تھا ــــ "بات کیا ہے؟ خدا خیر کرے" بے اختیار میرے دل سے یہ بات اچھل کر میرے منہ میں آ گئی ۔ میں نے محسوس کیا کہ سیاہی لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہی ہے ۔ خدا جانے یہ میرا وہم تھا یا سچ مچ آج کی رات معمول سے زیادہ تاریک تھی ۔ میں نے دماغ پر بہتیرا زور دیا ۔ لیکن الجھن بڑھتی ہی گئی ۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا بات ہے ۔ میرے دل کی حرکت آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی اور ساتھ ہی میری رفتار بھی ۔

اور جب میں اپنے گھر پہنچا تو گھر بھی اجڑا اجڑا محسوس ہوا ۔ کچی دیوار ... میں کھدے ہوئے طاقچے پر سرسوں کے تیل کا دیا روشن تھا ۔ مجھے اس مدھم اجالے میں بیٹھے ہوئے گھر کے لوگ قبر سے اٹھے ہوئے مردے معلوم ہو رہے تھے ۔ میرا دل دھک سے رہ گیا ۔

حلق خشک ہو گیا اور میں صحن میں حیران و پریشان کھڑا ادھر ادھر گھورنے لگا ۔ تھوڑی دیر بعد جب میں حجرے سے واپس آیا تو میرے ذہن پر چھائے ہوئے اندھیرے بکھر چکے تھے لیکن پریشانی کے نئے نئے بادلوں نے دوبارہ میرے ذہن پر قبضہ کرنا شروع کر دیا تھا اور جب غم غلط کرنے کی غرض سے میں نے چلم کا ایک لمبا کش

لیا تو حجرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی توجہ میری طرف منعطف ہو گئی۔ ایک دم تمام نگاہیں اٹھیں۔ نگاہوں میں قہر تھا یا رحم۔ یہ میں نہیں سمجھ سکا۔ ادھر حجرے میں بچھی ہوئی چارپائیوں میں لرزش پیدا ہوئی — چر — چر — چر — چر — "چلیں چل کر کچھ نا کھا لیں" حجرے کے ایک گوشے میں بچھے ہوئے کھاٹ سے ایک شخص نے اٹھتے اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "نماز کا وقت بھی ہے — اذان تو ہو گئی ہے نا —؟" ایک دوسرے نے اٹھتے ہوئے کہا اور جب اسے جواب نہ ملا تو وہ مصنوعی کھانسی کھانستے ہوئے حجرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے جتنے عرصے میں چلم پی کر ایک طرف کھڑی کی اتنی دیر میں سب جا چکے تھے۔ اب حجرے میں میرے اور خانو کی کے سوا کوئی اور نہ تھا — میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"کیا بات ہے —؟" میں نے خانو کی سے پوچھا

"کچھ نہیں خان! بس یہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ سب کا پردہ رکھے" اور خانو کی نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر خاموشی اختیار کر لی

"خیریت تو ہے نا — کچھ کہو تو سہی" میں نے چلم دوبارہ اپنی طرف کھینچتے ہوئے اس سے پوچھا

"کچھ بھی تو نہیں خان — بس یہ دعا کرو کہ خدا لالچوں کو غارت کرے"

"مگر کچھ تو کہو، واقعہ کیا ہے" میں نے اسے پھر مجبور کیا

"ہاں تو" اس نے بات شروع کی لیکن اس کی زبان جیسے تالو کے ساتھ چپک گئی لیکن اس نے جلدی ہی لعاب دہن سے زبان تر کر لی —

"ہاں ہاں کہو کہو" میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا

"وہ مکرم ہے نا، گاؤں کے اس سرے پر"

"ہاں ہاں" میں نے گھبراتے ہوئے جلدی جلدی پوچھا۔ دراصل مجھے ڈر تھا کہیں بات ادھوری ہی نہ رہ جائے

"اس کی بڑی لڑکی ہے نا، پری زاد" یہ کہہ کر وہ ذرا رک گیا

"کیا ہوا پری زاد کو؟" میں نے پھر جلدی سے پوچھا

"آج اسے پولیس لے گئی ہے" اس نے مغموم لہجہ میں کہا

"سچ —؟" میں نے اس طرح اس سے پوچھا جیسے اس بات کا مجھے علم ہی نہیں حالانکہ اتنی بات تو مجھے گھر سے بھی معلوم ہو چکی تھی

"مگر کیوں —؟" میں نے پھر خانو کی سے پوچھا

"بدنامی"

"بدنامی کس کے ساتھ —؟"

"خان خیل کے ساتھ"

"کیا کہا؟" میں نے بے اختیار کہا۔ میرے دل سے ہوک اٹھی لیکن وہ دل ہی میں گرہ بن کر رہ گئی۔ میرے ذہن پر جو سیاہ بادل چھا رہے تھے ان میں اضافہ ہو گیا۔ اور مجھے فوراً عید کا دن یاد آیا جب میں گھر میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ سرخ چادر میں لپٹی لپٹائی ایک لڑکی ہمارے گھر آئی تھی اور اس نے جب مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو اپنے آپ کو سکیڑتے ہوئے ایک طرف ہو گئی تھی اور میں نے بھی احتیاطاً اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی کون ہو سکتی ہے کہ میرے کان میں میری ماں کی آواز آئی

"بٹیا — ان سے پردہ کرتی ہے۔ یہ تو تمہارا اپنا ہے"

اگرچہ میں ان کی مزید باتیں تو سن نہ سکا تھا البتہ لڑکی نے جو جواب دیا تھا وہ اب بھی میرے ذہن میں محفوظ تھا

"میں خفا ہو رہی ہوں چاچی نہیں تو ان سے پردہ کیا"

اور پھر جب میں نے ماں سے اس کا اتا پتا پوچھا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ "پری زاد" ہے، مکرم کی لڑکی۔ عید مبارک کے لئے آئی تھی۔ بڑی نیک بخت لڑکی ہے" اور میری سوچ کے سلسلے کو خانو کی کی کھانسی نے توڑ دیا۔ اس نے اپنا حلق تازہ کرتے ہوئے کہا "خان! پری زاد بڑی حیادار

لڑکی تھی بچاری مگر ..... "

"مگر کیا" — میں نے جلدی سے پوچھا

"لوگ کہتے ہیں — "

"لوگ کیا کہتے ہیں ؟"

"لوگ یہی کہتے ہیں کہ "امیدوار" تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا دل اچھل کر میرے منہ میں آگیا ہو۔ میں یکدم چارپائی سے اٹھا۔ غم غصے اور پریشانی کے عالم میں مجھے اپنا ہوش نہ تھا — معلوم یہ حالت کب تک قائم رہتی اگر چلم میرے پاؤں سے ٹکرا کر گر نہ پڑتی۔ مجھے خیال آیا کہ خانو کیا کہیگا۔ میں نے فوراً چلم اٹھائی اور واپس چارپائی پر آ بیٹھا اور اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے خانو کی کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ پھر سے جوڑنے لگا

"مگر لوگوں کا کیا خیال ہے ؟"

"جتنے منہ اتنی باتیں خان۔ کسی کو کیا پڑی ہے جو کسی غریب کے ننگ و ناموس کا خیال رکھے۔ لوگ تو چرچے کرتے ہیں"

آخر کچھ تو کہتے ہوں گے"

"بات یہ ہے خان کہ یہ خان خیل بڑا اوباش ہے اس کی آنکھیں ہی بدمعاشوں ایسی ہیں" خانو کی نے بات کو پھر ادھورا چھوڑ دیا

"ہاں اس کا تو سارا گھرانا ہی اس قسم کا ہے مگر پری زادو ......" اور معلوم نہیں کہ بات میرے منہ ہی میں کیوں ٹوٹ گئی

"نہیں یہ بات نہیں خان" اس نے میرے خیال کی تردید کردی

"تو پھر کیا بات ہے ؟" میں نے پوچھا

"سید ہی کہتا تھا کہ نکرم کی بیوی نے کئی دفعہ خان خیل کی منت زاری کی، اس کے پاؤں پڑی اور دامن پھیلا پھیلا کر اس سے بھیک مانگی"

"کیوں — ؟ بھیک کیسی ؟" میں نے اس سے پھر پوچھا

"ننگ و ناموس — پری زادو کی ماں نے خان خیل سے کہا، تم نے ظلم و جبر تو جو کچھ کرنا تھا کرلیا اب ہم غریبوں کی لاج رکھ لو اور پری زادو سے نکاح کرلو"

"مگر ان کم بختوں نے رپورٹ کیوں نہیں کی" میں نے غصے سے کہا۔

"تم بھی کتنے بھولے ہو خان۔ نکرم خان خیل کا ہمسایہ[1] نہیں — وہ بھلا اس کے مقابلے کا ہے۔ اور پھر اس کی سنتا بھی کون۔ اگر وہ موقع پر ہوتا تو شاید کچھ کر بھی لیتا۔ لیکن جب اس بیچارے کو خبر ہوئی تو پری زادو کو پولیس لے جاچکی تھی"

"وہ کہاں تھا اس وقت — ؟"

"اسے خان خیل ہی نے منڈی بھیجا تھا"

"تو پھر رپورٹ کس نے کی — ؟"

"رپورٹ، خان خیل نے خود"

"وہ کیوں — ؟"

"بات صاف ہے۔ وہ اپنی جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے نیفے میں اڑسی ہوئی نسوار کی ڈبیہ نکالی اور میری طرف دیکھ کر پھر بات شروع کی" دراصل وہ دعویٰ کسی اور پر کرکے ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا" وہ خاموش ہوگیا اور ڈبیہ سے نسوار کی ایک موٹی سی چٹکی لیکر اپنی بائیں باچھ میں ٹھونس لی اور پھر ایک ٹھنڈی طویل آہ بھر کر خاموش ہوگیا اور جب میں حجرے سے مغموم مضمحل باہر نکلا تو ترنج بور رہا تھا میں چادر سر پر ڈال کر جلدی جلدی گھر کی طرف چل پڑا۔

دوسرے دن میں نے خانو کی کو چوپال میں بیٹھے دیکھا۔ کھانا کھا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کھانا چھوڑ کر میرے پاس آگیا۔ میں نے میرے پاؤں

[1] ہمسایہ۔ مقامی اصطلاح میں بڑے زمیندار [illegible]

تک لے دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے خانوکیہ —"

"کچھ سنا خان ؟"

"نہیں تو — کیا بات ہے — ؟" میں نے جواب دیا

"پری زادو کے متعلق 'خان ۔"

"کیوں' پھر کیا ہوا پری زادو کو" میرے ذہن پر ایکدم پھر بھیانک بادل چھانے لگے

"پھر کیا ہونا تھا بچاری کو 'سپرد کر دی گئی" اس نے اندوہگیں لہجے میں کہا ۔ خانخیل کے گھر 'معصوم بھیڑ' بھیڑیئے کے سپرد کر دی گئی" اور ایک بار میرے دماغ میں باری باری بے شمار خیالات رینگنے لگے ۔ "اب کیا ہوگا" میرا سر درد کرنے لگا ۔ خانو کی مجھے مجبور کر رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ کھانے میں شرکت کروں ۔ مگر میرا خیال کسی اور طرف ہی تھا ۔ میں نے اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کیا ۔ دراصل میرے حواس ہی بجا نہ تھے ۔ گاؤں کے لوگ باگ کھیت اور چوپال میلے میں لگے ہوئے منڈلوں کی طرح چکراتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے ۔ میں نے خانو کی سے ہاتھ ملایا اور واپس گھر چلا آیا ۔

دن یونہی گزرتے رہے ۔ دنوں کے ساتھ ساتھ یہ قصہ بھی پرانا ہوگیا اور پری زادو کے ملنے کی اہمیت گھٹتی گئی تاہم جب کبھی کسی پگڈنڈی یا رہگذر پر کوئی سرخ سیاہ دوپٹہ لئے گذر جاتی تو مجھے ایکدم پری زادو یاد آجاتی "نہیں چاچی میں شرماتی ہوں" میرے ذہن میں ایک مترنم آواز گدگدی کرنے لگتی ۔ وہ میرے ذہن کے آئینے میں تصویر کی طرح آکھڑی ہوتی اور پھر پہروں وہ تصویر ذہن کے پردوں پر مرتسم رہتی ۔ اور پھر مجھے عید کا دن یاد آتا جب وہ آئی تھی ۔ دوپٹے میں موٹی موٹی سیاہ آنکھیں اور شرم وحیا کے بارے جھکی ہوئی پلکیں لئے — اور یہ یاد پہروں میری آنکھوں میں دنیا تاریک رکھتی ۔

ایک دن ہم جوار ڈھو رہے تھے — دور سے کچھ سپاہی گاؤں کے بالائی حصے کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیئے ۔ میں نے انہیں کوئی زیادہ اہمیت نہ دی لیکن خانو کی بڑے معنی خیز اور رازدارانہ انداز میں میرے قریب آیا اور کہنے لگا

"پری زادو کے پیچھے آج پھر آئے ہیں"

اور میرے ذہن میں پولیس کے سپاہیوں کی قطار اپنی بھاری بھاری چپلوں اور قدموں کی بھدی بھدی آواز دل کے ساتھ پھڑ پھڑانے لگی ۔ "کون آئے ہیں" میں نے پوچھا

"پولیس"

"پیشی ہے کیا"

"نہیں خان"

"تو پھر —"

"کہتے ہیں اس کی لڑکی کو کسی نے مار ڈالا ہے"

"لڑکی — لیکن اس کی لڑکی کہاں سے آگئی — ؟" میرا منہ کھلا رہ گیا اور فوراً مجھے خانو کی کی بات یاد آئی "لوگ کہتے ہیں امیدوار تھی" "اس کے لڑکی ہوئی تھی نا —" خانو کی' میری بے خبری پر غصہ اور افسوس کر رہا تھا — اور میرا ذہن ایک دم مفلوج ہوگیا ۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ ظلم کیوں ہوا لیکن بات میرے منہ میں پتھر بن کر رہ گئی تھی ۔

"بہت بڑا ظلم ہوا ہے خان" خانو کی نے پھر کہنا شروع کیا "بے چاری کو مار مار کر نیلا کبود کر دیا تھا ظالموں نے ۔"

"لیکن کیوں — کس نے ایسا ظلم کیا ؟" یہ میرے زخمی دل کا استفسار تھا

"اس کے ماموں کم بخت نے یہ ظلم کیا" خانو کی نے جواب دیا

"ماموں نے کیسے گوارہ کرلیا" میں نے حیرانی سے پوچھا

"کہتے ہیں خانخیل نے ایسا کرنے پر اسے اکسایا ۔"

(باقی صفحہ ۲۲۶ پر ملاحظہ فرمایئے)

ڈاکٹر فقیر محمدؐ فقیر

ترجمہ

شفیع عقیل

رشتے جو ٹوٹ نہ سکے

(پنجابی)

عنایت علی پھولا نہیں سما رہا تھا۔ آج اسے عید کی خوشی سے بھی زیادہ خوشی تھی۔ وہ اس خوشی میں ہاتھوں سے چٹکیاں بجاتا کبھی گھر کے اندر جاتا اور کبھی باہر آتا اور آہستہ آہستہ نہ جانے کس سے باتیں کر رہا تھا

فضلاں نے کئی بار بیٹھک کے اس دروازے کے دراڑوں کے ساتھ لگ کر جو صحن کی طرف کھلتا تھا کچھ سننے کی کوشش کی مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آسکا۔ آخر تنگ آکر اس نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا اور عنایت علی سے پوچھنے لگی

"خدا خیر کرے، آج یہ اتنی خوشی کس بات کی ہے؟"

عنایت علی نے جلدی سے اپنا ہاتھ گریبان میں چھپا لیا۔ ایک نظر فضلاں کی طرف دیکھا اور پھر چارپائی سے اٹھ کر کمرے میں ناچنے لگا

"اساں یار نوں ملن لئی جاناں

چٹھی آئی سجناں دی

اساں یار نوں

اساں یار نوں"

فضلاں نے عنایت علی کو اس طرح ناچتے ہوئے دیکھا تو دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر بے اختیار ہنس پڑی اور پھر بولی۔

"آج آپ کی عقل کو کیا ہو گیا ہے؟"

عنایت علی نے اس کے جواب میں شریر نظروں سے فضلاں کی طرف دیکھا اور اسے خدا جانے کیا خیال آیا کہ وہ خاموشی سے چارپائی پر بیٹھ گیا اور ذرا منہ بنا کر کہنے لگا

"فضلاں تیرے بتانے کی بات نہیں ہے"

اتنا کہہ کر عنایت علی نے زمین پر نظریں گاڑ دیں

"فضلاں کو بتانے کی بات نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟؟ یہ آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ نے تو ساری زندگی کبھی ایسی بات نہیں کی تھی"

عنایت نے سر اوپر اٹھایا اور ایک لمبا سانس بھر کے کہنے لگا

"فضلاں! دنیا میں کبھی کبھی کوئی بات ایسی بھی کرنا پڑ جاتی ہے۔ جو پہلے کبھی نہ کی ہو۔ یگلی! یہ دنیا ہے!!"

"آج آپ یہ سر جھکا کر کیا آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں — ؟"

"آنکھ مچولی بھی تو آپس میں ہمجولی ہی کھیلا کرتے ہیں فضلاں!"

فضلاں عنایت کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی اور بڑی اداسی سے کہنے لگی

"آپ نے تو آج تک مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔ آج وہ کونسی ایسی بات ہے جو مجھ سے چھپا رہے ہیں۔ مجھے بھی تو بتائیے نا ؟"

اس کے جواب میں عنایت کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا۔

"تجھے کیا بتاؤں۔ صحیح بات تو خود مجھے بھی معلوم نہیں"

"آخر کچھ تو بات ہوگی نا"۔ فضلاں نے کہا

عنایت نے گریبان میں ہاتھ ڈال ایک لفافہ نکالا اور کہا

"جو کچھ ہے یہی ہے۔ مگر یہ معلوم نہیں کہ بھیجنے والا کون ہے ؟"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خط کے آخر میں کسی نہ کسی کا نام پتہ ضرور لکھا ہوگا ؟" فضلاں نے خط کو بغور دیکھتے ہوئے کہا

"نام پتہ تو لکھا ہے" عنایت کہنے لگا "لیکن کسی ناواقف عورت کا ہے۔ نہ میری اس سے جان نہ پہچان۔ مگر اس نے اس طرح لکھا ہے جیسے کسی گہرے دوست کو لکھا جاتا ہے"

"اور لکھا کیا ہے — ؟"

فضلاں ذرا جھک کے بولی

"میں تو خط پڑھ کے خود حیران ہوں کہ اس نے کیسے اس طرح کا خط بے دھڑک بھیج دیا ہے۔ لکھتے وقت اسے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی لکھا ہے :۔

میرے پیارے عنایت!

آج دو برس بیت گئے۔ تقدیر نے ایسی جدائی ڈال دی ہے جو اب عمر کے ساتھ ہی ختم ہو گی۔ حالانکہ محبت کے رشتے مرنے کے بعد ہی ٹوٹتے ہیں۔ ہم نے نہ جانے کونسا گناہ کیا ہے جس کی یہ سزا ملی ہے۔ لیکن اب مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو واگہ (سرحد) پر آ کر چند لمحوں کے لئے اپنا چاند سا مکھڑا دکھا جائیے' شاید اس سے اداس دل کو کچھ تسلی ہو جائے — پھر روتے آہیں بھرتے دو برس بیت جائیں گے"

خط پڑھ کر عنایت پھر کھلکھلا کر ہنسا۔ فضلاں نے جھپٹ کر عنایت کے ہاتھ سے وہ خط چھین لیا اور خط کے آخر میں لکھے ہوئے نام پر انگلی رکھ کر بولی

"یہ نام کیا لکھا ہے؟"

عنایت نے ہنستے ہنستے نیچے جھک کر نام پڑھا

"سنت کور"

فضلاں نے غصے سے خط کو ایک طرف پھینک دیا اور کہنے لگی

"یہ بھگوں سنگھ کون ہے ؟"

اس پر عنایت نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا

"کوئی بھی ہو کسی پردیسی کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے ۔ تو اٹھ کر میرے کپڑے نکال، وقت ضائع مت کر ۔ اس نے آج ہی واہگہ پہنچنے کے لئے لکھا ہے ۔ چلتے ہیں، سائیں سہاگ دے گا تجھے کا بھاگ تو نہیں لے لے گا"

فضلاں غصہ میں چمک کر بولی ۔

"خدا جانے کون چڑیل ہے ۔ گھر جاتی ۔ آپ یونہی پیسے جا رہے ہیں"

"تو کپڑے تو نکال لیگی ! یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے ۔ مجھے اٹھا کر امرت سر تو لے نہیں جائے گی، ذرا تماشہ ہی سہی"

فضلاں نے جب یہ دیکھا کہ عنایت جانے سے باز نہیں آئے گا تو اٹھتے ہوئے کہنے لگی

"اچھا چلئے، اور مجھے بھی ساتھ لے چلئے ۔ میں یہاں اکیلی کیا کروں گی"

عنایت پھر ہنسا اور بولا

"چل تو بھی چل ـــــ تجھے اعتبار نہیں مجھ پر ۔ چل جلدی سے تیار ہو جا"

فضلاں نے عنایت کے کپڑے نکالے اور خود بھی تیار ہو گئی

عنایت نہا دھو کر اور کپڑے پہن کر فضلاں سے کہنے لگا

"چلو چلیں"

دونوں آگے پیچھے چل دیئے ۔ راستہ میں عنایت نے کوئی دس روپے کی مٹھائی خریدی اور دس ہی روپے کا میوہ پھل لیا اور لاری پر بیٹھ کر واہگہ پہنچ گئے ۔

واہگہ کی سرزمین دو حصوں میں بٹی نظر آ رہی تھی ۔ سرحد کے پھاٹک پر جدائی سہنے والے کڑے کوس لئے کھڑی تھی ۔ پھاٹک کے اس طرف چاند تارے والا سبز پرچم جھول جھول کر پاکستان پر فخر کر رہا تھا اور پھاٹک کے اس طرف ترنگا جھنڈا ہندوستان کا دم بھرتا نظر آ رہا تھا ۔

عنایت کا اداس چہرہ اب اداس نہیں تھا ۔ اس کے چہرے پر سرخی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ رہی تھی ۔ وہ بڑے جوش اور شوق سے بار بار فضلاں کو جلدی چلنے کے لئے کہتا خود آگے آگے چل رہا تھا ۔ وہ اپنے ارد گرد اس طرح نظریں ڈالتا جا رہا تھا جیسے کوئی فاتح جرنیل ہے جس کی رفتار اور فاتحانہ چال میں کوئی جھجک نہیں ـــ کوئی خوف نہیں ۔

یکایک پھاٹک پر پہرہ دینے والے پاکستانی سپاہی نے رعب دار آواز میں کہا

"ہالٹ"

عنایت ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا ۔ اور پھر سپاہی کے قریب ہو کر اسے سلام کیا

سپاہی نے پوچھا ـــ تم کون ہو؟ اور کہاں جا رہے ہو؟

ادھر ہندوستانی پھاٹک کے دوسری طرف کھڑے ہوئے بلونت سنگھ نے خوشی میں سینہ پھلا کر آواز دی

"عنایت علی ! میں آ گیا ہوں!!"

عنایت علی بلونت سنگھ کی آواز سن کر بے اختیار اس کی طرف بڑھا مگر پہرہ دینے والے سپاہی نے اسے کلائی سے پکڑ کر کھڑا کر لیا اور پوچھا ـــ

تمہارا پرمٹ کہاں ہے ؟

بلونت سنگھ کی بیوی ست کور نے فضلاں کو دیکھ کر آواز دی

"بہن تم ادھر میرے پاس آجاؤ"

لیکن پہرہ دینے والے سپاہی نے اسے بھی وہیں روک لیا ـــ عنایت نے سپاہی سے کہا

"ہمیں امرتسر نہیں جانا۔ ہم تو اپنے بہن بھائیوں سے ملنے آئے ہیں اور ملاقات کر کے ابھی واپس چلے جائیں گے"

"بغیر پرمٹ کے کوئی کسی سے نہیں مل سکتا ـــ تم قانون کو کیا سمجھتے ہو؟"

بلونت سنگھ نے ہندوستانی سپاہی سے کہا

"میں اپنے بہن بھائیوں کو کوئی توپ یا مشین گن دینے نہیں آیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا ورنہ پرمٹ کا انتظام کر کے آتے"

سپاہی نے بڑے رعب سے کہا

"سردار جی بحث نہ کرو۔ کیمپ آفیسر کے پاس جاؤ"

ادھر عنایت علی پاکستانی آفیسر کے کیمپ میں کھڑا منت سماجت کر رہا تھا لیکن کیمپ آفیسر نے اس کی کوئی بات نہ سنی۔ آخر لمبی چوڑی بحث کے بعد اسے صرف اتنی اجازت ملی کہ وہ پھلوں کی ٹوکری بلونت سنگھ کو دیدے

عنایت پھل اور مٹھائی کی ٹوکری سر پر اٹھائے کیمپ سے باہر نکلا۔ سامنے گیٹ میں بلونت سنگھ بھی کھڑا تھا۔ اس کے سر پر بھی ایک چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ عنایت بلونت سنگھ کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ اسے بھی اتنی ہی اجازت ملی ہے۔ دونوں بھائی جدائی کی تھکا دینے والی آرزوئیں دل میں لئے آگے بڑھے لیکن اپنی اپنی ٹوکریاں بدلانے کی بجائے وہ دونوں آپس میں لپٹ گئے اور ایک دوسرے کے گلے میں آنسوؤں کے ہار پہنا دیئے ـــ

ـــ دونوں طرف کے سپاہیوں نے بلونت اور عنایت کو اپنی اپنی سرحد کی طرف ڈھکیل دیا ـــ

جہاں تک نظر جاتی تھی اپنی اپنی منزل کے مسافر پیچھے پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہے اور چلتے رہے!

کانٹا

(صفحہ ۲۲۲ سے آگے)

مگر خان خیل نے ایسا کیوں کیا ـــ" میں بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا

"اس کا مطلب تھا کہ یہ کلنگ کا ٹیکہ ہے جتنی جلدی دور ہو سکے بہتر ہے"

اور یہ سنکر میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بھینسے کی رسی بے اختیار چھوٹ گئی ـــ

اچانک میری نظر بالائی گاؤں کے رستے پر پڑی ـــ چند لوگوں نے ایک چارپائی اٹھائی ہوئی تھی اور ان کے گرد پولس گھیرا ڈالے آ رہی تھی۔ چارپائی زمین پر رکھ دی گئی ـــ پھولوں کی ننھی نازک ڈال کی طرح ایک بچی چارپائی کے ایک طرف پڑی تھی۔ اس کے سینے سے حلقوم پر ایک سیاہ دھبہ سا اس کی بے گناہی کا شاہد تھا ـــ اور اس کے ساتھ ہی پری زاد درحیت لیٹی پڑی تھی ـــ سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی۔ اور مجھے ایک دفعہ پھر سرخ دوپٹے کے فانوس میں کالی کالی موٹی آنکھیں یاد آگئیں ـــ میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا

"ہائے اللہ" وہ کراہنے لگی۔ جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ کالی چادر اس کے چہرے سے سرک گئی۔ میں نے نیچی نظروں سے دیکھا۔ یہ وہ چہرہ تو نہیں جو میں نے عید کے دن دیکھا تھا۔ اب میرے سامنے نیلا پیلا چہرہ، دھنسی ہوئی آنکھیں تھیں ـــ یہ پری زاد ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ لیکن مجھے خود خانو کی بات یاد آگئی بیچاری کو مار مار کر نیلا پیلا کر دیا ہے ظالموں نے"۔ اور میں یہ نظارہ برداشت نہ کر سکا۔ میں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا

دوسری رات میری پانی کی باری تھی۔ کھیتوں کو پانی دیکر تھکا ہارا واپس آ رہا تھا۔ رت جگے کی وجہ سے آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ میں حجرے کے موڑ تک پہنچا ہی تھا کہ میرے کان میں آواز آئی۔ کوئی کہہ رہا تھا "لو ایک بیلچہ اور بھی آگیا"

"بیلچہ ـــ؟ بیلچہ کس لئے ـــ؟" میں نے حجرے والوں سے پوچھا "کرم خان کی لڑکی بیچاری مرگئی ہے" کسی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

میری آنکھوں کے سامنے [illegible] گیا۔ میں بے بدھ ہو کر چارپائی پر گر بیٹھا

تصنیف و ترجمہ

محمد ادیب

چار قطرے خون

(گجراتی)

دیارام سیٹھ کے انگوٹھے میں ٹانچنی چبھ گئی۔ اور کوئی تین چار قطرے خون بہہ نکلا۔ یہ سُن کر آپ حیران رہ گئے ہوں گے۔ کیونکہ ٹانچنی کے زخم سے تین چار قطرے خون بہہ نکلنا آپ کو غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن دراصل یہ حادثہ ہی کچھ ایسی منفرد نوعیت کا ہے جس نے ایسی کئی غیر ممکن باتوں کو ممکنات کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اب اس پر یقین کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ بہرحال دیارام سیٹھ کے انگوٹھے میں ٹانچنی چبھ گئی۔ اور تین چار قطرے خون بہہ نکلا، یہ ایک حقیقت ہے۔

ہُوا یوں کہ حسبِ معمول اشنان، درشن اور پُوجا پاٹھ کے مذہبی فرائض ادا کر کے سیٹھ جی نے اپنے مکان کے اگلے حصہ میں بنے ہوئے دفتر میں قدم رکھا۔ اس وقت سامنے دیوار پر آویزاں گھڑی نو بجا رہی تھی۔ فرش پر بچھے ہوئے شُدّھ کھدّر کے گدّے پر بیٹھ کر انہوں نے گاؤ تکیے کا سہارا لیا، اور یکے بعد دیگرے دونوں ٹانگیں پھیلا دیں۔ پُوجا پاٹھ کے بعد پڑھے جانے والے اشلوکوں کا ورد ابھی جاری ہی تھا لیکن نظریں تو سامنے بیٹھ کر ڈاک پڑھتے ہوئے منشی جی پر جمی ہوئی تھیں۔ آخری اشلوک کا نسبتاً زور سے ورد کر کے وہ منشی جی سے مخاطب ہوئے۔

"کہئے منشی جی آج کی ڈاک کیا کہہ رہی ہے؟"

"لکشمی ٹریڈنگ کا پندرہ ہزار کا ڈرافٹ ہے" بڑی عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ منشی جی نے کہا۔ اور پھر قدرے توقف کے بعد ڈرافٹ سیٹھ جی کی جانب بڑھا دیا۔

سیٹھ جی نے گدّے پر لیٹے ہی لیٹے ایک بار بڑے غور سے ڈرافٹ کو پڑھا۔ پھر سامنے دیوار کے طاق میں رکھی ہوئی بھگوان کی مُورتی پر ایک عقیدت مندانہ نظر ڈالی اور کہنیاں ٹیک کر اُٹھ بیٹھے۔ اس کے بعد سامنے رکھے ہوئے بکس نما ڈیسک سے سلپ بک نکال کر ایک سلپ لکھی ڈرافٹ کو سلپ پر جما کر کچھ سوچا۔ ڈبیہ سے ایک ٹانچنی نکال کر ایک بار دانت کُریدا، اور پھر ڈرافٹ اور سلپ میں ٹانچنی چبھوتے ہوئے گویا ہوئے۔

"لیجئے منشی جی یہ ڈرافٹ ...."

لیکن بعد کے الفاظ "رام — رام — رام — اے بھگوان" کی کربناک چیخوں میں ڈھل گئے۔

منشی جی ہڑبڑا اٹھے، "ارے کیا ہوا سیٹھ جی، کیا ہو گیا آپ کو؟" پوچھتے ہوئے سیٹھ جی کی جانب لپکے۔

احساس درد سے بلبلاتے ہوئے سیٹھ جی نے کوئی جواب دینے کی بجائے آپ ہی آپ دانت بھینچے اور دوسرے ہاتھ سے انگوٹھے میں سے ٹانچی کھینچ نکالی اور بچھو کی طرح اسے دور پھینک دیا۔

اب جو دیکھا تو انگوٹھے کے گوشت اور ناخن کے درمیان خون کا ایک قطرہ ابھر آیا تھا۔ علی الصبح خون کے درشن ہوتے ہی سیٹھ جی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور منشی جی کا تو جیسے سارا خون ہی منجمد ہو گیا۔ آنکھیں جھپکاتے ہوئے انہوں نے سیٹھ جی کے انگوٹھے پر جمے ہوئے خون کے قطرے کا بغور جائزہ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھا کر انہوں نے انگلی سے خون کا قطرہ پونچھ لیا۔ اور رامو کے فرش دھونے کے بعد جو تھوڑا سا پانی وہاں پڑا رہ گیا تھا اسی میں اپنی انگلی ڈبو کر دھو ڈالی

لہو پونچھتے وقت انگوٹھے پر تھوڑا سا دباؤ پڑا۔ اور خون کا ایک اور چھوٹا سا قطرہ آہستہ آہستہ ابھرتا ہوا زخم کے دہانے پر آ کر جم گیا۔ مزید لہو کے درشن سے منشی جی کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ لیکن اس بار خود سیٹھ جی نے ہمت سے کام لیا، اور دوسرے ہاتھ سے خون پونچھ کر اسی پانی میں انگلی دھو ڈالی۔

لمحہ بھر کے بعد ہی سیٹھ جی اور منشی جی کی نگاہیں ٹکرائیں، اور پھر دونوں کی نگاہیں زخم پر مرکوز ہو گئیں۔ اچانک زخم کی تہہ سے خون کے ایک اور قطرے نے سر اٹھایا، اور بڑی سبک رفتاری کے ساتھ زخم کی تہہ سے دہانہ تک کا سفر طے کرتا ہوا نظر آیا۔ سیٹھ جی کا رواں رواں کانپ اٹھا انہیں دفعتاً خیال آیا۔ "اگر زخم سے اسی طرح ایک ایک قطرہ خون نکلتا رہا تو ......؟"

چند لمحوں کی مکمل خاموشی کے بعد سیٹھ جی نے انگوٹھا منشی جی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیجئے منشی جی اسے ایک بار زور سے دبا دیجئے"

"نا سیٹھ جی" منشی جی نے بدکتے ہوئے کہا۔

"کیوں —؟"

منشی جی گڑگڑا اٹھے "آپ کو تکلیف ہوگی"۔

"تکلیف ہوگی تو سہہ لوں گا، لیجئے ....."

"جی نہیں" منشی جی نے ندامت سے نظریں جھکاتے ہوئے کہا "مجھ سے کسی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی"۔

"اچھا تو میں خود ہی نمٹ لیتا ہوں" سیٹھ جی نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

اب سیٹھ جی کے چہرے پر کرب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ چند لمحوں تک انگوٹھے کا بغور معائنہ کیا۔ پھر منشی جی کے سراپا پر ایک المناک نگاہ ڈالی۔ انگوٹھے کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان جمایا، اور "رام" کا قدرے زور سے ورد کرتے ہوئے انگوٹھا جو بھینچا تو خود سیٹھ جی کے منہ سے ار — ر — ر — رکی دلدوز چیخ نکل پڑی۔

اسی لمحہ منہ پھیر کر کھڑے ہوئے منشی جی نے بھی "ذرا سنبھل کر سیٹھ جی" کا حوصلہ افزا نعرہ لگایا۔

اب دونوں کی نگاہیں ایک ساتھ انگوٹھے پر جا پڑیں۔ عین اس وقت خون کا ایک موٹا سا قطرہ زخم کے دہانے پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ سیٹھ جی نے جھنجھلا کر فوراً پورا انگوٹھا پانی میں ڈبو دیا، لیکن منشی جی کی تاب برداشت جواب دے چکی تھی۔ وہ چیخ اٹھے:

"رامو! اے رامو!"

"کیا ہے منشی جی۔" رانو کی بائے بھیتر سے سیٹھانی نے جواب دیا۔

"تھوڑا کپڑا رامو کے ساتھ بھجوایئے۔ سیٹھ جی کے چوٹ آئی ہے۔"

"ہیں — ہیں۔ کیا ہوا؟ چوٹ آئی ہے؟" کہتی ہوئی سیٹھانی تیز ہوا کے جھونکے کی طرح دفتر میں داخل ہوئیں، اور دیکھا تو سیٹھ جی انگوٹھا تھامے بیٹھے ہیں۔ چہرہ کرب و اضطراب میں ڈوبا ہوا ہے اور پاس ہی سُرخ رنگ کا سیّال پڑا ہوا ہے۔ سیٹھانی کسی زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑا اٹھیں۔

"ہائے رام — ہائے بھگوان۔ یہ کیا؟ یہ اتنا سارا خون کہاں سے نکلا؟" اور پھر سیٹھ جی کا ہاتھ پکڑ کر نہیں اٹھاتے ہوئے بولیں — "چلیے آپ اندر چلیے۔"

سیٹھ جی اندر جا کر جھولے پر دراز ہو گئے، اور جھولے کے پاس کھڑے ہوئے منشی جی کو کچھ ایسی خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان آنے والا ہے۔ انگوٹھے کا معائنہ کرنے کے بعد سیٹھانی چیخیں۔

"رامو۔ اے۔ رامو—"

"جی سیٹھانی جی۔" کہتا ہوا رامو آ پہونچا۔

"جلدی سے پانی گرم کر—" رامو کو حکم دے کر سیٹھانی منشی جی سے مخاطب ہوئیں —"اور منشی جی آپ ڈاکٹر کو فون کیجیے۔"

"لیکن اتنی سی بات پر ڈاکٹر کو بلانے کی کیا ضرورت ہے۔" سیٹھ جی نے آگا پیچھا سوچ کر کہا۔

"ڈاکٹر کو نہ بلاؤں تو کس کو بلاؤں؟ کیا میں اندھی ہوں؟ اتنا سارا خون جو بہہ گیا ہے؟ منشی جی آپ کھڑے منہ کیا تک رہے ہیں، جائیے جلد فون کیجیے۔"

دفتر میں قدم رکھتے ہی ڈاکٹر کی نظر سب سے پہلے فرش پر پھیلے ہوئے سُرخ سیّال پر پڑی۔ قدرے پریشان ہو کر وہ دفتر سے گذرتے ہوئے بھیتر آئے —

"آیئے ڈاکٹر صاحب۔" پیش قدمی کے لئے آگے بڑھتے ہوئے سیٹھانی نے کہا "یہ دیکھیے انہیں کیا ہو گیا ہے۔"

"لیکن یہ اتنا سارا خون کہاں سے نکلا،" جھولے کے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈاکٹر نے پوچھا۔

"یہ بڑی ٹانچنی انگوٹھے میں گھس گئی ہے۔" انگلی سے تقریباً ڈھائی اِنچ کا اندازہ دیتے ہوئے سیٹھانی بولیں۔

"ٹانچنی؟" ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں۔ اتنی بڑی۔" سیٹھانی نے ٹانچنی کی لمبائی کا پورا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سیٹھانی جی۔ تھوڑا صبر سے کام لیجیے۔ ابھی سب ٹھیک ہوا جاتا ہے۔"

ڈاکٹر کی صبر کی تلقین سن کر سیٹھ جی کے ہاتھ سے دامنِ صبر چھوٹ گیا۔

"جی نہیں۔ صبر کے ساتھ تو ان کا پرانا بیر ہے ڈاکٹر صاحب۔ ٹانچنی چبھ گئی اور ذرا سا خون نکلا، تب سے اِن پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ صبح سے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا ہے اور آپ کو بھی تکلیف دی۔"

"لیکن ٹانچنی کے زخم سے اتنا سارا خون کیسے بہہ نکلا۔ وہاں فرش پر......" ڈاکٹر نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

سیٹھ جی کے چہرے پر مسرت کے جذبات پھیل گئے۔ سرہانے رکھے ہوئے تکیہ کو بغل میں دباتے ہوئے وہ بولے "یہ ٹانچنی کی نہیں میرے خون کی تاثیر ہے ڈاکٹر صاحب۔ دراصل میرا خون ہی کافی گاڑھا اور صاف ہے۔"

"مجھے وہ ٹانچنی دکھایئے۔" کہہ کر ڈاکٹر نے اپنا بیگ کھولا، اور دوا لگانے میں مصروف ہو گئے۔

سیٹھانی کاغذ کے پرزے پر ٹانچنی رکھ کر لے آئیں۔ ڈاکٹر نے ٹانچنی کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اسے ایک ڈبیہ میں بند کر کے اپنے بیگ میں رکھ دیا۔ اور واپس جانے کی تیاری کرتے ہوئے بولے

"سیٹھانی جی۔ چنتا کا کوئی کارن نہیں ہے۔ زخم معمولی سا ہے۔ البتہ ٹانچنی کی جانچ پڑتال کرنی ہوگی، کیونکہ خون کافی بہ نکلا ہے۔ اگر درد یا جلن محسوس ہو تو گرم پانی کی سینک کیجئے اور مکمل آرام کرنے دیجئے"

"آرام؟ آرام کے نام کی تو انہوں نے قسم کھا رکھی ہے۔ ― سیٹھانی کے سینے میں بیتنی دھرم کا جو سوتا بڑی دیر سے اندر ہی اندر اُبل رہا تھا دفعتاً پھوٹ پڑا۔ ساری دنیا کے سدھار کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ آج بھی شرنارتھیوں کی سبھا کی صدارت کرنے والے ہیں۔ ایک ہزار کا چندہ دیں گے۔ اور نام روشن کریں گے۔ لیکن آج تو میں ہرگز ہرگز نہ جانے دوں گی۔ انہیں تو کوئی اور صدر بھی مل سکتا ہے۔ لیکن بھگوان نہ کرے کچھ کم زیادہ ہو گیا تو ہمارے ...."

"یہ بھی کوئی طریقہ ہے۔" سیٹھانی کے منہ سے کوئی نامناسب بات نکل جانے کے خوف سے سیٹھ جی نے مداخلت کی۔

درمیانی وقفہ میں ڈاکٹر صاحب رخصت ہو چکے تھے۔ سیٹھانی اُچک کر جھولے پر چڑھیں اور سیٹھ جی سے لگ کر بیٹھ گئیں۔ ایک بار سیٹھ جی کے انگوٹھے پر ایک اچٹی سی نظر ڈالی، پھر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے والہانہ انداز میں بولیں "اب آپ آرام کیجئے۔ میں منشی جی کو بھیج کر جلسہ والوں کو مطلع کئے دیتی ہوں۔"

"لیکن یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔ سیٹھ جی نے دکھ بھرے انداز میں کہا "صدارت قبول کرلی ہے تو حاضری دینا میرا اخلاقی فرض ہے ورنہ سوچو تو لوگ کیا کہیں گے۔"

"لوگوں کا اتنا خیال ہے آپ کو، اور ہم یہاں جان چھڑک دیں ...." سیٹھانی آگے نہ بول سکیں، اُن کا گلا رُندھ گیا۔

"تم اس طرح آہیں نہ بھرو۔ شہر کے تمام بڑے بڑے، نیتا اور افسر وہاں ہوں گے۔ اخباروں میں بھی نام شائع ہو چکا ہے اور پھر تمہارے بھائی ہیں کارپوریشن کے صدر۔ وہ میری نیند حرام کر دیں گے۔"

"یہ سب ٹھیک ہے لیکن ڈاکٹر نے مکمل آرام کرنے کی تاکید جو کی ہے۔ ایسے جلسے تو روز ہی ہوا کرتے ہیں.... بس اب آپ آرام کیجئے۔"

سیٹھ جی مزید جرح کے خواہاں تھے لیکن سیٹھانی دندناتی ہوئی دفتر میں جا چکی تھیں۔ دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ کر سیٹھ جی جھولے پر دراز ہو گئے۔ کوئی انجانا سا خیال گھڑی کے رقاص کی طرح ان کے ذہن پر ٹک ٹک ٹک ٹک کر رہا تھا۔ اور اس ٹک ٹک کے ساتھ ہی تصور کے پردے پر بہت سی پرچھائیاں اُبھرتی اور مٹتی جا رہی تھیں۔ بڑی بے چینی کے ساتھ انہوں نے کروٹ بدلی، اور پھر ذہن پر خیالات کی اَن گنت پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

"ہرے رام .... ہرے رام ...... یہ ذرا سی ذلیل سی ٹانچنی ―― تو میرا سارا کیا کرایا بگاڑ کر رکھ دے گی۔ جلسہ کی صدارت کوئی نئی بات نہیں لیکن آج کا جلسہ تو پردھان منتری کے حکم سے منعقد ہو رہا ہے۔ اس کی سیاسی و سماجی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ شرنارتھی نیتاؤں سے متعارف ہونے کا یہ سنہری موقع اگر ہاتھ سے نکل گیا تو ...... اور سیٹھانی! انہیں تو ایک ہزار ایک کا چیک کھٹک رہا ہے۔ لیکن جلسہ میں غیر حاضری پر میری عزت کا جس طرح نیلام ہوگا اُس کی انہیں ذرا بھی چنتا نہیں ―― اُف بھگوان۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔ عورت کی عقل چوٹی تک"

انگوٹھے میں ایک ٹیس سی اٹھی، اور پھر انگوٹھا دفعتاً از خود تن کر الف ہو گیا۔ کرب و اضطراب کے کئی بل سیٹھ جی کی پیشانی پر اُبھر آئے۔ ایک بار انگوٹھے کو گھورا، اور پھر اسے اپنے محور کے گرد گھمانے لگے۔ انگوٹھے کو اپنے محور کے آس پاس متحرک پا کر سیٹھ جی نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن ذہن دوبارہ خیالات کے بھنور میں جا ڈوبا۔

"اُف یہ ٹانچنی" سیٹھ جی بڑبڑائے ۔ اور ٹانچنی کا خیال آتے ہی انہیں یوں محسوس ہوا جیسے اس حادثے کی تہہ میں کوئی خوفناک سازش چھپی ہوئی ہے ۔ دفعتاً ذہن پر ڈاکٹر کی تصویر اُبھری ۔ ڈاکٹر نے بھی کمال کر دیا ۔ ذرا سی ٹانچنی لگ گئی ۔ دو تین قطرے خون بہہ نکلا ۔ اس پر تو آپ فرماتے ہیں "گرم پانی سے سینک کیجئے ۔ کاروبار بند رکھئے اور مکمل آرام کیجئے ۔ شکر ہے بھگوان کا کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے کشمیر جانے کی ہدایت نہ کی ورنہ..... ایک دل آویز مسکراہٹ سیٹھ جی کے ہونٹوں پر رقص کرنے لگی ۔ پھر خیال آیا ۔ ڈاکٹر غریب کا بھی اس میں کیا دوش ۔ فیملی ڈاکٹر ہونے کے کارن اُسے میری چنتا ہونا ہی چاہئے ۔ بڑے تجربہ کار اور ہمدرد ہیں ۔ ٹانچنی کی جانچ پڑتال کرنے کو کہہ گئے ہیں ۔ کہیں ٹانچنی میں تو کوئی ملاوٹ نہیں تھی ۔ آج کل ہر چیز میں ملاوٹ ہوتی ہے حتیٰ کہ سنتریوں میں زہر ملا کر بیچنے والوں کا قصہ تو ابھی تازہ ہی ہے ۔ ممکن ہے کوئی زہریلی دھات ٹانچنی کے اجزائے ترکیبی میں ملا دی گئی ہو ۔ ملک میں ہر طرف تخریبی تحریکیں چل رہی ہیں ۔ فرقہ پرستوں اور کمیونسٹوں کی سازشوں کے جال پھیلے ہوئے ہیں ۔ دولت مندوں کو مٹانے کی سازشیں ہو رہی ہیں ...... گھنٹہ بھر ہو گیا لیکن سوزش ہے کہ مٹنے کا نام نہیں لیتی ۔ درد بھی بڑھتا جا رہا ہے ۔ سیٹھ جی چلائے ۔

"منشی جی ؟"

"حاضر ہوا سیٹھ جی" کہتے ہوئے منشی جی بھیتر آئے ۔ "فرمایئے ؟"

"آپ اب تک یہیں دھرے ہوئے ہیں ؟" سیٹھ جی بپھرے ۔ "جلدی سے پہونچو سبھا کے منتری کے پاس ، اور اسے اطلاع دے دو کہ میں آج کے جلسے کی صدارت نہ کر سکوں گا ۔"

"جی ہاں ..... جی ہاں ـــ یہ لیجئے میں چلا ۔"

"لیکن آپ وہاں جا کر کہیں گے کیا ؟"

"کہہ دوں گا کہ سیٹھ جی کے ٹانچنی ...."

"ٹانچنی نہیں اپنا سر" کہہ کر سیٹھ جی نے آپ ہی اپنا سر پیٹ لیا ۔ انگوٹھا پیشانی سے ٹکرایا اور " ا ـ ر ـ ر ـ ر ـ ر کے شور سے کمرہ گونج اُٹھا ۔ سیٹھانی دوڑی آئیں ، اور بولیں :

" درد ہو رہا ہے نہ ؟ ہونا ہی چاہئے ۔ آرام کرنے کی بجائے بیکار کی دماغ پاشی کئے جا رہے ہیں ـــ رامو ۔ اے رامو ؟ پانی گرم ہوا یا نہیں ؟" چیختی ہوئی سیٹھانی رسوئی گھر میں داخل ہوئیں ۔

"ہو گیا سیٹھانی جی"

"تو منہ کیوں سل گیا ہے تیرا ؟ ۔ ہائے رام یہ سب لوگ مل کو مجھے پاگل بنا دیں گے ۔"

جوش کھاتے ہوئے پانی کی پتیلی رامو نے اٹھائی اور تیزی سے سیٹھ جی کے کمرے کی طرف بڑھا ۔ لیکن ابھی وہ تین چار قدم ہی آگے بڑھا ہو گا کہ اس کا پیر پھسل گیا اور پتیلی سمیت وہ دھڑام سے فرش پر آ رہا ۔

" او سیٹھ جی ...... میں مر گیا ..... میں جل گیا !" کی دلدوز چیخوں کے بعد رامو نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا ۔ سیٹھ جی دوڑے آئے ، اور منظر دیکھ کر دم بخود رہ گئے ۔ چند لمحوں کے بعد وہ چیخے ـــ " اب گدھے کی طرح بھونکتا کیوں ہے .... سالے اندھا ہے ..... آج نہ جانے کس کی منحوس شکل دیکھی ہے ۔ جو صبح سے بدشگونیوں کا تانتا بندھ گیا ہے ۔ اور ان کی چیخ پکار نے الگ ناک میں دم کر رکھا ہے ۔ اب اسے اسپتال بھجوایئے ۔"

"جی ہاں ـ اب میرا ہی دوش نظر آئے گا آپ کو" ـــ سیٹھانی نے رونی صورت بنا کر کہا ـــ " اے رامو ۔ یہیں مرے گا یا جائے گا اسپتال ۔"

رامو سسکیاں لیتا لنگڑاتا اسپتال جانے کے لئے باہر نکلا منشی جی جلسہ والوں کو اطلاع دینے کے لئے چل دیئے۔ سیٹھانی بڑبڑاتی ہوئی فرش پر پھیلا ہوا پانی صاف کرنے لگیں، اور سیٹھ جی جھولے پر بیٹھ کر صبح سے جو بدشگونیاں ہو رہی تھیں ان کے مذہبی اور اخلاقی اسباب پر غور کرنے لگے۔

رامو اسپتال پہونچا۔ ڈاکٹر نے مرہم پٹی کر دی۔ اور انجکشن کے لئے پندرہ روپے کا بندوبست کر کے دو دن بعد دوبارہ اسپتال آنے کو کہا۔ اس وقت راموں کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ انتہائی مایوسی کے عالم میں وہ اسپتال سے باہر نکلا اور اپنے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

راستہ بھر وہ یہی سوچتا رہا۔ انجکشنوں کے لئے وہ پندرہ روپے کہاں سے اور کس طرح حاصل کر سکے گا۔ وہ جانتا تھا کہ سیٹھ جی اب اُسے ایک پائی بھی دینے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ کیونکہ ابھی چند دن پیشتر اُس نے اپنی شادی کے لئے سو روپے مانگے تھے اُس وقت سیٹھ جی نے سو اسو کے کاغذ پر انگوٹھا لگوا کر اسے پچھتر روپے دیئے تھے۔ اور پھر اس کے بعد جب وہ اپنی نئی نویلی دلہن جمنی کو شہر لانے کے لئے تیار ہوا اور کرایہ کے لئے مزید دس روپے کا سیٹھ جی سے مطالبہ کیا۔ اس وقت سیٹھ جی نے جو ٹکا سا جواب دے دیا تھا، وہ اسے بھولا نہ تھا۔ لیکن جمنی کو شہر لانے کا وہ مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ چنانچہ اپنے پڑوسی ممدو اور جگن سے مشورہ کر کے اس نے جمنی کو دھرم چند سیٹھ کے ہاں ملازم رکھنے کا وعدہ کیا تھا اور اُن سے دس روپے کی رقم پیشگی لے کر وہ اپنی سسرال گیا تھا۔ اگرچہ ممدو اور جگن نے اسے اپنے ارادے سے باز رکھنے کی بہتیری کوشش کی۔ گرانی، شہر کے اخراجات وغیرہ دلائل سے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن نئی نویلی دلہن کا دیوانہ راموں ٹس سے مس نہ ہوا۔

چنانچہ جمنی آئی، اور آتے ہی دھرم چند سیٹھ کے ہاں کام ... پر لگ گئی۔ دھرم چند سیٹھ ایک اعلیٰ پیمانے کے تاجر ہونے کے علاوہ دیا دھرم کے اوتار مانے جاتے تھے۔ اعلیٰ ذات کے ہندو ہونے کے باوجود وہ گاندھی جی کی اچھوت سدھار تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ودھوا آشرموں اور میلا سنگھوں کے چندوں میں انہوں نے جی کھول کر روپیہ دیا۔ اور شرنارتھیوں سے تو انہیں اس قدر ہمدردی تھی کہ پچاس سال کی عمر میں بھی انہوں نے ایک بیس سالہ شرنارتھی دوشیزہ سے بیاہ کر لیا تھا۔ اگرچہ دھرم چند سیٹھ کے اس کرانتی کاری اقدام پر کچھ فرقہ پرستوں اور پرانے وچار کے لوگوں نے بہت چیخ پکار کی۔ احتجاجی جلسے کئے لیکن جاتی اور سماج کے ان فرسودہ بندھنوں کے سامنے انہوں نے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ طبعاً دیالو اور اصولاً سدھارک ہونے کے کارن وہ اُونچ نیچ اور ذات پات کے جھگڑوں کے سخت مخالف تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے گھر کے معمولی نوکروں سے بھی سمان برتاؤ کرنے کے عادی تھے۔

راموں کی نئی نویلی دیہاتی دلہن جمنی کو ایسی کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع ملا۔ چنانچہ انسانی فطرت کے مطابق اُس پر شہری زندگی کا رنگ چڑھنے لگا۔ ابتدا میں، تو راموں کا گھر سنسار ٹھیک ٹھیک چلتا رہا۔ لیکن دھرم چند سیٹھ کی منظورِ نظر ملازمہ کا درجہ حاصل کرتے ہی جمنی کے جیسے پر نکل آئے۔ راتوں کو دیر سے گھر لوٹنا اب اس کا معمول ہو گیا تھا۔ اب وہ حد درجے مغرور اور زبان دراز ہوتی جا رہی تھی۔ رامو اندر ہی اندر سلگتا رہا۔

اور پھر جمنی ایک دن آدھی رات گئے گھر لوٹی۔ راموں کے سینے میں دبی ہوئی چنگاری ایک دم بھڑک اٹھی۔ اُس نے لکڑی اٹھائی۔ ادھر جمنی کی زبان بھی قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ لکڑی اور زبان کے ٹکراؤ سے اٹھتا ہوا شور سن کر اس کے پڑوسی ممدو اور جگن دوڑتے ہوئے آئے اور بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کیا۔ لیکن جمنی بے غیرت نہیں تھی۔ اس کی خودداری نے اسے اپنے پتی دیو کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے پر آمادہ کیا، اور بقیہ زندگی دھرم چند سیٹھ کی سیوا میں گذارنے کا فیصلہ کر کے وہ علی الصبح ہی غائب ہو گئی۔

ایسے پیچیدہ حالات میں سیٹھ جی سے انجکشن کے لئے مزید پندرہ روپے ملنے کی اسے کوئی توقع نہیں تھی مایوس ہو کر اس نے اس ساری درگھٹنا کے لئے اپنے نصیب ہی کو دوش دیا۔

ادھر منشی جی نے تو کمال ہی کر دیا۔ وہ دفتر سے نکل کر جلسہ والوں کو اطلاع دینے کے لئے جا رہے تھے۔ جوہری بازار میں پہونچتے ہی ایک حیرت انگیز خیال دفعتاً اُن کے ذہن میں اچھل پڑا۔ انہوں نے سوچا سیٹھ جی شہر کے ممتاز ترین نیتاؤں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اُن کے شبھ نام

سے شہر کا بچہ بچہ واقف ہے اس درگھٹنا کی خبر بازار میں عام کردی جائے تو ہر طرف سنسنی پھیل جائے گی۔ شاید سیٹھ جی کے اعزاز میں آج بازار ہی بند کردیئے جائیں، اور جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ یہ شاندار کارنامہ اس خاکسار کا مرہونِ منت ہے تو انہیں اس ادنیٰ سیوک کی اہمیت کا احساس ہوگا اور پچھلے چار سال سے ملتوی رکھا ہوا تنخواہ میں اضافہ کا سوال بھی شاید آسانی سے حل ہوجائے ......

خیال حیرت انگیز ہی نہیں انتہائی مفید بھی تھا۔ منشی جی کا جھریوں پڑا چہرہ مسرت سے تمتما اٹھا۔ اور اُن کے بوڑھے پیر جوانوں کی سی تیز رفتاری کے ساتھ متحرک ہوگئے۔

ہیرالال سیٹھ کے دفتر کے قریب پہونچ کر وہ دفعتاً ٹھٹک گئے۔ ہیرالال سیٹھ نے قدرے تعجب سے پوچھا "کیا بات ہے منشی جی۔ آج اتنے سویرے کہاں چل دیئے ؟"

"جی ہاں" منشی جی نے اگل دیا، "ذرا جلدی میں ہوں"۔

"کیسی جلدی ...... کیا ہوا ہے؟"

"حادثہ ہوگیا ہے ...... سیٹھ جی زخمی ہوگئے ہیں"۔

"کیسا حادثہ ...."

آگے کے الفاظ سیٹھ جی کے گلے میں اٹکے ہوئے چھوڑ کر منشی جی یہ جا اور وہ جا۔

ہیرالال سیٹھ الجھ کر رہ گئے۔ مزید وضاحت کے لئے منشی جی کو آواز دینے کی بجائے انہوں نے ٹیلی فون اٹھایا۔ دیارام سیٹھ کے گھر سے سیٹھانی نے جواب دیا، اور ڈھائی اِنچ لمبی ٹانچنی سے لے کر چھٹانک بھر خون بہہ جانے تک کی ساری سرگذشت انتہائی المناک انداز میں بیان کی۔ ہیرالال سیٹھ کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ گھر میں سیٹھانی سے واقعہ کا ذکر کیا۔ اور سیٹھ جی کی مزاج پرسی کے لئے ان کے گھر ہو آنے کی اخلاقی ہدایت بھی کی۔ سیٹھانی نے اپنی پڑوسن کانتا بہن سے حادثہ کا ذکر کیا، اور پھر تو اس معما پارو کو جیسے پر لگ گئے۔ اور منٹوں میں یہ سنسنی خیز خبر سارے جوہری بازار میں عام ہوگئی۔ عزیزوں اور دیگر رشتہ داروں نے موٹریں اور گاڑیاں دوڑا دیں۔ تجارتی حلقوں کے احباب نے ٹیلی فون کھٹکھٹائے اور ٹانچنی لگنے سے لے کر خون نکلنے تک کی ساری واردات معلوم کر کے افسوس و ہمدردی کا اظہار کیا۔ دیارام سیٹھ کے مکان کے باہر موٹروں اور گاڑیوں کی قطاریں لگ گئیں اور گھر میں سیٹھ سیٹھانیوں کا جم غفیر اکٹھا ہوگیا۔ سیٹھانی کے مسرت و غم کی انتہا نہ رہی اور حقیر سی ٹانچنی کا یہ حادثہ سیٹھ سیٹھانی کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ثابت ہوا۔

حادثے کی خبر شام کے اخبارات میں جلی سُرخیوں میں شائع ہوئی جسے پڑھ کر سیٹھانی کے بھائی اور کارپوریشن کے صدر رشی ڈر بیابھائی تشریف لائے۔ ساری واردات انہوں نے ٹھنڈے دل سے سنی۔ پھر بھی وہ سیٹھانی کے اندازِ بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور سیٹھ جی کے چہرے پر پھیلے ہوئے درد و کرب کے جذبات دیکھ کر تو انہیں یقین سا ہوگیا کہ اس حادثے کی تہہ میں کوئی گہرا راز پوشیدہ ہے۔

بہن کے گھر سے نکل کر رشی ڈر بیابھائی ڈاکٹر سے ملے اور ان سے ٹانچنی لے کر سیدھے کلکٹر کے بنگلے پر پہونچے۔ جہاں اتفاق سے چند پولیس افسران بھی موجود تھے اور اسی حادثہ پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ دو گھنٹے کی بحث کے بعد سارے حادثے کی مکمل تحقیقات کرنے کا فیصلہ کیا گیا، اور یہ بھی طے پایا کہ شہر میں ٹانچنی کا جتنا بھی اسٹاک ہو سیل کردیا جائے۔ لیکن معلوم نہیں کن ذرائع سے یہ راز فاش ہوگیا۔ ٹانچنی کے دام میں سو گنا اضافہ ہوگیا۔ بلیک مارکیٹروں نے موقع سے فائدہ اٹھایا، اور من مانا منافع بٹورا۔ اور بقیہ مال زیرِ زمین دوز کردیا گیا۔

دوسرے دن صوبہ کے نئے ہوم منسٹر جو ضلع کے دورے پر آئے ہوئے تھے واپسی میں ایک دن کے لئے کلکٹر کے ہاں قیام پذیر ہوئے کارپوریشن کے صدر رشی ڈر بیابھائی بھی حاضرِ خدمت ہوئے۔ اور پانی، بجلی، گٹر سے لے کر ہندو مسلم فساد، فرقہ پرستوں کی سرگرمیاں اور کمیونسٹوں کی تخریبی کارروائیوں

پر روشنی ڈالی، اور اس کے بعد ٹانچی کے حادثہ کا ذکر کیا۔ حادثہ کی خبر سُن کر وزیر داخلہ بڑی گہری چنتا میں ڈوب گئے۔ پر موکھ منتری نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ اس حادثہ کی تہہ میں کوئی خوف ناک سازش کام کر رہی ہے۔ اور اپنے اس خیال کی تائید کے لئے انہوں نے ایک انتہائی حیرت انگیز لیکن شرمناک واقعہ کا ذکر کیا۔ جو اس جنگ عظیم میں ہوا تھا۔ پچھلی جنگ عظیم میں زخمیوں کے لئے بڑی تعداد میں انجیکشنوں کی سوئیوں کی ضرورت پڑی تھی اس وقت ایک مقامی کمپنی نے سی بدیسی سرکار سے لاکھوں کی سوئیوں کا آرڈر لیا تھا، اور اس کے بے ایمان مالکوں نے پارسلوں میں کپڑا سینے والی مشینوں کی سوئیاں بھر کر روانہ کر دیں تھیں اور اس طرح دیس کی عزت کا نیلام کر دیا تھا۔ اور یہ واقعہ سن کر وزیر داخلہ ہکا بکا رہ گئے۔ اور انہیں یقین کرنا ہی پڑا کہ اس حادثہ کی تہہ میں کوئی گہری سازش کارفرما ہے۔ آخر کار حادثہ کی مکمل تحقیقات کا وعدہ کر کے وہ صوبے کے صدر مقام کی جانب روانہ ہو گئے۔

وہاں پہونچتے ہی وزیر داخلہ نے صوبہ کے سر برآوردہ ڈاکٹروں اور سائنٹیفک اداروں کے نمائندوں کی ایک ... کانفرنس بلوائی۔ متواتر تین نشستوں کے بعد کانفرنس نے متعلقہ ٹانچی کا کیمیائی تجزیہ کرنے کے لئے دو ڈاکٹروں اور ایک سائنس داں پر مشتمل ایک کمیشن کے تقرر کا فیصلہ کیا اور کمیشن کو اپنی تمام کارروائی صیغۂ راز میں رکھنے کی خاص ہدایت دی۔ ملک کے مختلف کارخانوں سے ٹانچیوں کے نمونے منگوا کر تحقیقاتی کمیشن نے اپنا کام شروع کیا۔ اب کیمیائی تجزیے کے لئے ضروری آلات وادویات کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ چند چیزیں تو ملک ہی میں میسر آ گئیں۔ باقی سامان کے لئے ایک بدیسی فرم کو آرڈر دیا گیا اور شپنگ پرمٹ اور اسٹرلنگ وغیرہ مشکلات سے گذر کر یہ اسباب تقریباً تین ماہ کے بعد صدر مقام تک پہونچا، البتہ اس عرصہ میں حادثے کی تحقیقات کی بنیادی سب کمیٹی نے اپنی کارروائی مکمل کر لی تھی۔

مطلوبہ آلات وادویات کے فراہم ہوتے ہی کمیشن نے کیمیائی تجزیے کے کام کا آغاز کر دیا۔ ایک سو پانچ میٹنٹوں کی مختلف ٹانچیوں پر چار سو بیس تجربات کئے گئے۔ اور دو ماہ کی مختصر مدت میں کیمیائی تجزیہ کا کام مکمل کر کے کمیشن کے اراکین نے بیس ہزار الفاظ پر مشتمل ایک رپورٹ وزیر داخلہ کی خدمت میں پیش کی۔ اور اس بیش بہا خدمت کے صلہ میں وزیر داخلہ نے کمیشن کے اراکین کو ۲۰ ہزار روپے کا نذرانہ پیش کیا۔ اس کے بعد حادثہ کی تحقیقاتی کمیٹی نے اپنا کام شروع کیا لیکن رامو......

جی ہاں۔ رامو کو انجکشن کے لئے پندرہ روپے کی ضرورت تھی۔ اگرچہ سیٹھ جی کے متعلق اسے کوئی خوش فہمی نہیں تھی تاہم ممدو اور جگن کے مشورہ سے اس نے قسمت آزمائی کی۔ سیٹھ جی نے راموسے پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ اور پھر اس کی عدم موجودگی میں نوکر کے بغیر سیٹھانی کی مشکلات اور اپنے کاروبار کا چوپٹ ہو جانا وغیرہ مصائب کا ذکر کر کے رامو کی ہتھیلی پر دو روپے رکھ دیئے۔ اور زخم اچھے ہو جانے پر جلد ہی کہیں اور ملازم ہو جانے کا مفید مشورہ دے کر اسے بڑے پیار بھرے انداز میں رخصت کیا۔

ٹھیک اسی وقت جگن کو یاد آیا کہ وہ چند ایسی جڑی بوٹیاں جانتا ہے جن کے استعمال سے زخم دو ہی دن میں مندمل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خیراتی اسپتال کا علاج موقوف کر کے جگن کی مجوزہ جڑی بوٹیاں استعمال کی گئیں۔ لیکن زخم مندمل ہونے کی بجائے اور گہرے ہوتے گئے آخر کار سول اسپتال کا رخ کرنا پڑا جہاں رامو کی ٹانگ کاٹ ڈالی گئی۔

چند دنوں کے بعد ممدو اور جگن اسپتال جا کر رامو کو اپنے گھر لے آئے۔ جمنی کے روٹھ جانے کے بعد سے رامو تنہا رہ گیا تھا۔ تنہائی کے یہ دن اس نے سینہ پر سل رکھ کر گذار دیئے لیکن جمنا کو منا لینا اس کی خودار طبیعت نے گوارا نہ کیا۔ اب تو اسے جمنا سے سخت نفرت ہو گئی تھی ویسے جگن بھی پچھلے کئی دنوں سے بیکار تھا۔ تاہم ممدو کا گاردہ بھوچل رہا تھا۔ پیاز لہسن کے ٹھیلے سے اسے معقول آمدنی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ ایک نئے سماج وادی قسم کے اشتراکی خاندان کی بنا ڈال کر یہ تینوں کرانتی کاری مجاہد زندگی کے میدان میں نبرد آزما ہو گئے۔

اور پھر ایک دن اچانک جمنی کا نزول ہوا۔ رامو نے تو اسے دیکھتے ہی گالیاں دینے لگا۔ اس نے جمنی کو فوراً گھر سے نکل جانے کا حکم دیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اب اس کی صورت تک دیکھنا نہیں چاہتا۔ لیکن جمنی اب ایک خدمت گذار بیوی کی حیثیت میں واپس آئی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو ایسی

بس پسری کی حالت میں، چھوڑ کر کہیں اور کیسے جا سکتی تھی۔ اس نے لوگ لاج اور اپنی محبت کا واسطہ دے کر بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گی رامو۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تیری حالت اتنی خراب ہے۔ میں اس کمینے سیٹھ کی نوکری نہیں کروں گی۔ مجھے معاف کر نا ہو۔

"نہیں۔ نہیں۔ تو اپنا منہ کالا کر۔ اس گھر میں تو نہیں رہ سکتی تھ۔

"کیوں نہیں رہ سکتی" جمنی نے پتنی ادھیکار کا سہارا لے کر کہا "میرے پتی کا گھر ہے۔ میں اب یہیں رہوں گی اور تیرے چرنوں میں ہی مروں گی۔ ...... مجھے یہاں کسی کونے میں پڑی رہنے دے رامو۔ میں تم سب کی سیوا کروں گی ......"

جمنی کا گلا رُندھنے لگا۔ وہ کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھی۔ رامو کو نا موش پا کر اس نے جھاڑو اٹھائی اور گھر کی صفائی کرنے لگی۔

لیکن رات کو ممدو اور جگن کے آتے ہی جمنی پھوٹ پڑی۔ وہ اپنے بال نوچتی ہوئی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ممدو اور جگن بھونچکا رہ گئے۔ رامو پھر گالیاں دینے لگا۔ جگن جمنی کو چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا، اور ممدو کی دُور رس نگاہیں جمنی کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھیں۔

دفعتاً ممدو نے جگن کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ جگن اس کے پیچھے ہو لیا۔

ادھر ٹاہنجی کے تحقیقاتی کمیشن نے اپنی رپورٹ تیار کر لی تھی۔ جو ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل تھی۔ اور اب یہ رپورٹ صوبائی کابینہ کے خفیہ اجلاس کے زیر غور تھی۔ چھ گھنٹے کے طویل مباحثہ کے بعد بھی کابینہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکی۔ چند وزراء نے وزیر داخلہ کی اس کارروائی پر سخت اعتراضات کئے۔ ایک رکن نے تو وزیر داخلہ کے اس اقدام کی تحقیقات کے لئے ایک کمیشن مقرر کرنے کی تجویز تک پیش کر دی۔ لیکن وزیر اعلیٰ نے اسے ناجائز قرار دیا۔ اور مزید غور و خوض کی آئندہ اجلاس پر ملتوی کر دیا گیا۔

ادھر ممدو اور جگن گھر سے نکل کر سیدھے دھرم چند سیٹھ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

"کون ہو تم لوگ؟ کیا چاہتے ہو؟" سیٹھ جی نے پوچھا۔

"ارے!" ممدو بول پڑا "آپ نے ہمیں پہچانا نہیں۔ میں ہوں ممدو اور یہ ہے اپنا جگن"۔

"ممدو اور جگن؟ لیکن یہاں کیا لینے آئے ہو؟" سیٹھ جی نے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ۔ ہم پہلے بھی ایک بار آئے تھے۔ جمنی کے لئے۔ آپ کے ہاں نوکری کرتی تھی نہ ......"

"ہاں! لیکن میں نے اس پنچ کو آج ہی نکال دیا ہے۔ اور تم بھی نکل جاؤ، ورنہ ......" سیٹھ جی گرجے۔

"آپ نے اُسے نکال دیا ہے۔ اسی لئے تو ہم آئے ہیں"۔ جگن نے کہا۔

"میں اب اس کمینی کو نوکر نہیں رکھوں گا" سیٹھ جی غصہ سے بولے۔

"ہم اسے نوکر رکھوانے کے لئے نہیں آئے" ممدو نے جگن کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "بات یہ ہے سیٹھ کہ جب سے وہ گھر آئی ہے رو رہی ہے اور آپ کو اور ہم سب کو گالیاں دے رہی ہے۔ اس کا شوہر اسے تھانہ لے جا رہا تھا لیکن میں نے روک دیا"۔

یہ سن کر سیٹھ جی جھنجھلا اُٹھے اور پیشانی پر گہرے بل ڈالتے ہوئے کرخت لہجے میں بولے "میں ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ اس نے ...... اس نے ......!"

سیٹھ جی کے کرخت لہجے میں لرزش پیدا ہو گئی۔ اور بعد کے الفاظ ہونٹوں پر پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ سیٹھ جی کی ناؤ کو بھنور میں پھنستا دیکھ کر ممدو نے ایک بڑا سا پتھر لڑھکا دیا:

وہ کہتی ہے کہ کل صبح سیٹھانی سے ......

سیٹھانی کا لفظ سن کر سیٹھ جی کرسی سے اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور چیخ پڑے:

"کون سیٹھانی ۔ سیٹھانی کو اس سے کیا تعلق ؟"

ممدو نے پینترا بدلتے ہوئے کہا ۔ "وہ کہہ رہی تھی کہ آپ کی سیٹھانی جی کو ابھی اس بات کی خبر نہیں ۔"

"کس بات کی ؟ "

" یہ تو آپ جانیں اور جمنی ...... اچھا اب ہم چلتے ہیں ، ضرورت پڑنے پر یاد کریں ۔ ہم سب ساتھ ہی رہتے ہیں ۔"

ممدو اور جگن مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے ۔ اور سیٹھ جی سکتہ کے عالم میں کرسی میں دھنس گئے ۔ سیٹھانی ، جاتی ، سماج ، شہر ، بازار کے خوف نے اُن پر ہیجانی کیفیت طاری کر دی ۔

ممدو اور جگن نے دھرم چند سیٹھ کے ہاں سے لوٹ کر جمنی سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن غیرت مند جمنی کو اپنے اُبھرے ہوئے پیٹ کے سوا کچھ اور بتانا ناگوارا نہ ہوا ۔ دفعتاً باہر کسی کی موٹر کا ہارن بجا ۔ ممدو اچھل پڑا ۔ تیزی سے باہر نکل کر وہ موٹر کے قریب جا کھڑا ہوا ۔ جگن بھی آ پہونچا ۔

" کون ممدو ؟ "

" جی ہاں سیٹھ جی " کہہ کر اس نے موٹر کا دروازہ کھول دیا ۔ گلی میں اندھیرا ہونے کے سبب وہ اندر بیٹھے ہوئے سیٹھ جی کی صورت تو نہ دیکھ سکا لیکن اس نے دھرم چند سیٹھ کی آواز پہچان لی ۔

" جمنی کہاں ہے ؟ " یہ دیا رام سیٹھ کی آواز تھی ۔

" جمنی اور رامو دونوں گھر ہیں ہیں ، بُلاؤں ؟ "

" نہیں " دھرم چند سیٹھ نے کہا ، اور پھر ممدو کو اپنے قریب کھینچ کر اس سے سرگوشی میں کچھ کہا ، اور پھر دو موٹے بنڈل اس کے ہاتھ میں تھما دیئے ۔ اور " کل شام مجھ سے مل لینا " کی تاکید کرتے ہوئے موٹر اسٹارٹ کر دی ۔

ممدو نے گھر لوٹ کر دیکھا تو وہ نوٹوں کے بنڈل تھے ۔ رامو کے ہاتھ میں نوٹوں کے بنڈل تھماتے ہوئے ممدو نے کہا :

" ایسی بیٹی خدا سب کو دے ۔"

اور پھر کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھا ۔ لیکن رامو کے چہرے پہ سیاہی پھیل گئی تھی ۔ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اُس نے کروٹ بدلی ، اور بڑی موٹی سی گالی دے کر سب کو خاموش ہو جانے کو کہا ۔ ممدو نے نوٹ کے بنڈل اٹھائے اور جگن کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا ۔ باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا ۔ گلی کے موڑ کے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا کوئی فقیر مدھم سروں میں گا رہا تھا ۔

یہ دنیا ہے .... یہ دنیا ہے

ادھر صوبائی کابینہ کے دوسرے خفیہ اجلاس میں تحقیقی کمیشن کی رپورٹ دوبارہ زیر غور آئی اور تین گھنٹوں کے گرما گرم مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ " امن عامہ کو خطرہ لاحق ہونے کے امکانات موجود ہونے کے سبب رپورٹ اشاعت کے قابل نہیں ۔ لہٰذا اس سارے معاملہ کو فائل کر دیا جائے اور وزیر داخلہ کو تمام اعتراضات سے بری الذمہ قرار دیا جائے ۔"

اس طرح تحقیقی کمیشن کی کارروائی اختتام پذیر ہوئی ـــــ

دوسری طرف دھرم چند سیٹھ کی ہدایت کے مطابق جمنی کو ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں داخل کرایا گیا ۔ لیکن چند دنوں کے علاج معالجہ کے بعد شفایاب ہو کر جمنی جب گھر لوٹی ، تو رامو کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے روپوش ہو گیا تھا ۔ اور ممدو اور جگن کی کوشش کے باوجود اس کا کوئی پتہ نہ چلا ـــــ

(باقی صفحہ ۲۵۴ پر)

لوهسون

ترجمہ

تمنائی

پاگل کی ڈائری

(چینی)

بھائی جن کا نام ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے اسکول میں میرے اچھے دوست تھے۔ کئی سال کی علیحدگی کی وجہ سے ہم ایک دوسرے سے بے خبر ہو گئے۔ کچھ دن ہوئے مجھے اتفاق سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک بہت بیمار ہے اور چونکہ میں اپنے پرانے وطن کو واپس جا رہا تھا۔ راستہ میں ان سے ملنے کیلئے رک گیا۔ ان میں سے ایک سے میری ملاقات ہوئی اور اس نے مجھے بتایا کہ بیمار چھوٹا بھائی تھا۔

اس نے کہا "اتنی دور دراز سفر طے کر کے آپ جو ہم سے ملنے آئے اس سے مجھے خوشی ہوئی لیکن کچھ دن ہوئے وہ صحت یاب ہو گیا ہے اور ایک سرکاری عہدہ سنبھالنے کہیں اور چلا گیا" پھر ہنستے ہوئے اس نے اپنے بھائی کی ڈائری کی دو جلدیں نکالیں اور کہا "ان سے اسکی پچھلی بیماری کی نوعیت معلوم ہوگی، تم تو دوست ہو تمہیں دکھانے میں کوئی ہرج نہیں۔" میں نے ڈائری لے لی اور پڑھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اس وہم میں گرفتار ہو گیا تھا کہ لوگ اسے اذیت دینا چاہتے ہیں۔ تحریر بے حد الجھی ہوئی اور [illegible]تی اور اس میں بہت سی پاگل پن کی باتیں تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے تاریخیں نہیں ڈالی تھیں اس لئے صرف روشنائی کے رنگ اور لکھائی کے فرق ہی سے یہ کہا جا سکتا [illegible] ساری تحریر ایک وقت کی نہیں تھی بعض حصے قطعی غیر مربوط نہیں تھے۔ میں نے اس کے ایک حصہ کی نقل کر لی ہے تاکہ طبی تحقیق کا موضوع ہو سکے۔ میں نے ڈائری میں [illegible] لفظ بھی نہیں بدلا ہے سوائے ناموں کے اگرچہ یہ بھی گمنام لوگوں کے تھے جن سے دنیا واقف نہیں۔ عنوان صحت کے بعد اس نے خود ہی چنا تھا اور میں نے اسے نہیں بدلا۔

آج کی رات چاند بہت روشن ہے

تیس سال سے زیادہ سے میں نے اسے نہیں دیکھا ہے اس لئے جب آج دیکھا تو میری طبیعت میں غیر معمولی امنگ پیدا ہوئی۔ میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ پچھلے تیس سال سے میں اندھیرے میں رہا ہوں۔ لیکن اب مجھے محتاط ہونا چاہیئے ورنہ "چاؤ" خاندان کا وہ کتا دو بار کیوں دیکھتا۔؟
میرے خوف کی وجہ ہے۔"

"آج کی رات چاند نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ برا شگون ہے۔ آج صبح جب میں احتیاط کے ساتھ باہر نکلا تو مسٹر چاؤ کی نگاہیں عجیب سی تھیں گویا وہ مجھ سے ڈر رہی ہوں گویا وہ مجھے قتل کر دینا چاہتے ہوں۔ سات آٹھ دوسرے آدمی بھی تھے جو سر جوڑے میرے متعلق باتیں کر رہے

تھے۔ جب میں نے انھیں دیکھ لیا تو وہ ڈر گئے۔ جتنے لوگ مجھے راستے میں ملے ان کا بھی یہی حال تھا۔ ایک، جو سب سے زیادہ خطرناک معلوم ہو رہا تھا، دانت نکال کر مسکرایا۔ اس سے میرے سارے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کی تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔

لیکن میں ڈرا نہیں، چلتا گیا۔ سامنے بچوں کی ایک جماعت بھی میرے متعلق باتیں کر رہی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں مسٹر چاؤ کی نظروں جیسی بات تھی لیکن ان کے چہرے بے حد زرد تھے۔ میں حیران ہوا کہ ان بچوں سے میرا کیا جھگڑا ہو سکتا تھا۔ میں ان سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ "مجھے بتاؤ" — لیکن وہ بھاگ گئے۔

"میں سوچتا ہوں کہ مسٹر چاؤ سے، سڑک پر چلنے والوں سے، میرا کیا جھگڑا ہو سکتا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، سوائے اس کے کہ بیس سال ہوئے جب میں نے مسٹر جیو کے حساب کے کاغذات پر پاؤں رکھ دیا تھا اور مسٹر کو بہت ناخوش ہوئے تھے۔ اگرچہ مسٹر چاؤ ان کو نہیں جانتے ہیں، لیکن انھیں یہ واقعہ معلوم ہوا ہوگا اور انھوں نے اس کا بدلہ لینے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اسی لئے سڑک پر چلنے والے اور لوگوں سے مل کر میرے خلاف سازش کر رہے ہیں لیکن بچے؟ اس وقت یہ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ انھوں نے ایسی عجیب نگاہوں سے مجھے کیوں دیکھا گویا وہ مجھ سے خوفزدہ ہوں، گویا وہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہوں۔ اس سے واقعی مجھے خوف معلوم ہوتا ہے۔ یہ بڑی پریشان کن بات ہے۔
میں سمجھ گیا کہ ان کو اپنے والدین سے معلوم ہوا ہوگا۔"

"رات کو میں سو نہیں سکتا۔ ہر بات غور طلب ہے اگر آدمی اسے سمجھنا چاہے
"یہ لوگ — ان میں سے بعضوں کو مجسٹریٹوں نے سزا دی ہے۔ بعضوں کو شہر کے معزز لوگوں نے طمانچے مارے ہیں۔ بعضوں کی بیویوں کو امین قرقی نے لے لیا ہے۔ بعضوں کے والدین نے قرض خواہوں سے تنگ آ کر خودکشی کر لی تھی لیکن یہ کبھی ایسے خوف زدہ اور خطرناک نہیں دکھائی دیتے تھے جیسے کل۔

سب سے غیر معمولی بات یہ تھی کہ سڑک پر ایک عورت اپنے بچے کو مار رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ "شیطان! دانتوں سے تیری بوٹیاں کاٹ لوں تب مجھے ٹھنڈک پڑے گی —!" لیکن دیکھے مجھے جا رہی تھی۔ میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ چونک پڑا۔ تب سارے زرد چہرے اور لمبے دانتوں والے لوگ میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے ہنسنے لگے۔ بوڑھا چن جلدی سے آگے بڑھا اور مجھے گھر لے چلنے پر اصرار کرنے لگا۔

وہ مجھے گھر لے گیا۔ گھر کے سارے لوگوں نے مجھ سے عدم واقفیت کا اظہار کیا۔ ان کی نگاہیں بھی دوسروں جیسی تھیں۔ جب میں اپنے مطالعے کے کمرے میں گیا تو انھوں نے باہر سے تالا ڈال دیا۔ گویا کسی مرغی یا بطخ کو بند کر رہے ہوں۔ اس سے میں اور بھی پریشان ہو گیا۔

چند دن ہوئے ہمارا ایک آسامی فصل کے متعلق کچھ بتانے کو آیا۔ اس نے میرے بڑے بھائی سے کہا کہ اس کے گاؤں والوں نے وہاں کے ایک بدمعاش آدمی کو مل کر مار ڈالا ہے۔ پھر بعضوں نے اس کا دل نکال لیا اور اپنی ہمت بڑھانے کے لئے اسے تیل میں تل کے کھا لیا۔ جب میں نے بیچ میں کچھ بولنا چاہا تو آسامی اور میرے بھائی دونوں نے مجھے گھورنا شروع کر دیا۔ مجھے آج احساس ہوا کہ ان کی آنکھوں میں بھی وہی بات تھی جو باہر کے لوگوں کی آنکھوں میں۔

اس کا خیال کرتے ہی میرے تلوے سے بھیجے تک کپکپی طاری ہو گئی —— وہ لوگ انسان کو کھاتے ہیں! پھر مجھے کھا لینے سے انھیں کون سی چیز باز رکھ سکتی ہے —؟

میں سمجھ گیا اس عورت کا کہنا کہ "دانتوں سے تیری بوٹیاں کاٹ لوں" زرد چہرے لمبے دانتوں والے لوگوں کا قہقہہ، آسامی کا بیان کیا ہوا واقعہ یہ سب پوشیدہ اشارے ہیں۔ ان کی باتوں میں جو زہر ہے، ان کے قہقہوں میں جو چبھن ہے مجھے ان سب کا احساس ہے۔ ان کے دانت سفید اور چمکیلے ہیں، انسانوں کو کھانے کے لئے!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ میں برا آدمی نہیں ہوں لیکن جب سے میں نے مسٹر کو کے حساب کے کاغذات پر پاؤں رکھدیا مجھ پر شبہ کیا جانے لگا ہے۔ ان کے پاس بعض راز ہیں جن کا میں قیاس نہیں کر سکتا اور جب وہ ناراض ہو جائیں گے تو وہ کسی کو بھی بد معاش قرار دے سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے جب میرے بڑے بھائی مجھے لکھنا سکھا رہے تھے۔ اگر کسی اچھے آدمی کا ذکر آتا اور میں اس کے خلاف دلائل پیش کرتا تو وہ اس تحریر پر پسندیدگی کا نشان ڈالدیتے اور جب میں بدکرداروں کے متعلق باز پرس نہ کرتا تو وہ کہتے بہت خوب اس سے تمہاری ذہانت ظاہر ہوتی ہے" - میں ان کے پوشیدہ خیالات کا کس طرح اندازہ لگا سکتا ہوں، خاص کر جب وہ کھانے کے وقت سے متعلق ہوں؟ -

اگر آدمی سمجھنا چاہے تو تمام باتوں پر غور کرنا ہوگا۔ جیسا کہ مجھے خیال آتا ہے پرانے زمانے میں لوگ اکثر انسانوں کو کھاتے تھے لیکن مجھے بالکل یقین نہیں۔ میں نے تاریخ میں دیکھنا چاہا۔ لیکن میری کتاب میں تاریخ نہیں دی ہوئی ہے اور ہر صفحہ پر "نیکی اور اخلاق" لکھا ہوا ہے۔ چونکہ ویسے بھی مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں آدھی رات تک غور سے کتاب پڑھتا رہا یہاں تک کہ الفاظ گڈمڈ نظر آنے لگے اور ساری کتاب پر صرف تین لفظ ہی نظر آ رہے تھے۔ "انسانوں کو کھاؤ"

کتابوں میں لکھے ہوئے سارے الفاظ، آسامی کی کہی ہوئی ساری باتیں ایک پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ مجھے گھورتی ہیں۔

میں بھی انسان ہوں اور وہ مجھے بھی کھانا چاہتے ہیں !

صبح میں کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ بوڑھا چن میرا کھانا لایا ــــ ایک پیالے میں ترکاریاں اور ایک پیالے میں ابلی ہوئی سالم مچھلی ــ مچھلی کی آنکھیں سفید اور سرد تھیں اور اس کا منہ ان لوگوں کے منہ کی طرح کھلا ہوا تھا جو انسانوں کو کھاتے ہیں۔ چند ہی لقموں کے بعد میں یہ تمیز نہ کر سکا کہ میں مچھلی کے لقمے منہ میں رکھ رہا تھا یا انسان کے گوشت کے۔ اس لئے میں نے یہ مسئلہ چھیڑ دیا۔

"چن! بھائی سے کہو، یہاں میرا دم گھٹ رہا ہے۔ میں صحن میں چہل قدمی کرنا چاہتا ہوں"۔ بوڑھے چن نے کچھ نہیں کہا لیکن باہر چلا گیا اور فوراً واپس آ کے دروازہ کھول دیا۔

میں ہلا تک نہیں، کیوں کہ میں جانتا تھا کہ وہ مجھے باہر جانے نہیں دیں گے۔ صرف یہ دیکھتا رہا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں اور ٹھیک ہی تھا۔ میرے بڑے بھائی ایک بوڑھے کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ باہر آئے۔ ان کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک تھی اور اس ڈر سے کہ میں کہیں دیکھ نہ لوں انھوں نے اپنا سر جھکا لیا اور پھر اپنی عینک کے نیچے سے مجھے دیکھتے رہے

"آج تو تم بڑے مزے میں ہو"۔ انھوں نے مجھ سے کہا

"ہاں"

"آج میں نے مسٹر ہو کو تمہیں دکھلانے کے لئے بلایا ہے" بھائی نے کہا۔

"بہت اچھا"۔ میں نے کہہ تو دیا لیکن میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ـــــ یہ بوڑھا آدمی دراصل میرا قاتل تھا۔ محض یہ دیکھنے کیلئے کہ میں کتنا فربہ ہوں، اس نے میری نبض دیکھنے کا بہانہ بنایا کیوں کہ اسے بھی میرے گوشت میں سے حصہ ملنے والا تھا۔ پھر بھی میں خوفزدہ نہیں ہوا، اگرچہ میں انسانوں کو نہیں کھاتا، میں ان سے زیادہ دلیر ہوں۔ میں نے اپنی دونوں مٹھیاں آگے بڑھا دیں کہ دیکھوں وہ کیا کرتا ہے بوڑھا بیٹھ گیا، پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر ہاتھ ٹٹول کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ پھر آنکھیں کھولیں اور بولا "اپنا ذہن بھٹکنے مت دو۔ چند دن آرام کرو، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے"۔

ذہن بھٹکنے مت دو، چند دن آرام کرو! جب میں فربہ ہو جاؤں گا تو انھیں زیادہ گوشت کھانے کو ملیگا۔ لیکن اس سے میرا کیا فائدہ ہوگا۔ یا میں کیسے "بالکل ٹھیک" ہو جاؤں گا؟ یہ سب لوگ جو انسان کا گوشت کھانا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنا جرم بھی رکھنا چاہتے

ہیں ۔ مجھے اس حماقت پر ہنسی آتی ہے ۔ مجھے یہ ایسا مضحکہ خیز معلوم ہوا کہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ۔ میں جانتا تھا کہ میرے اس قہقہہ میں ہمت اور دیانت تھی ۔ میرا بھائی اور بڈھا میری ہمت اور دیانت سے ڈر کر زرد پڑ گئے ۔

لیکن میں چونکہ دلیر ہوں اس لئے وہ مجھے کھا جانے کے اور زیادہ خواہش مند ہیں تاکہ میری دلیری ان میں سرایت کر جائے ۔ بوڑھا دروازے سے باہر چلا گیا لیکن دور جانے سے پہلے دھیمی آواز میں میرے بھائی سے کہا ۔

"فوراً کھا لینے کے لئے" اور میرے بھائی نے سر ہلا کے کہا "اچھا" تو آپ بھی اس میں ہیں ! یہ حیرت ناک بات معلوم کر کے اگرچہ مجھے صدمہ ہوا تاہم یہ بات غیر متوقع نہیں تھی کہ مجھے کھا جانے کی سازش میں میرے بھائی بھی شریک ہیں ۔

میرے بڑے بھائی آدم خور ہیں !

میں آدم خور کا چھوٹا بھائی ہوں !!

خواہ مجھے دوسرے کھا جائیں گے پھر بھی میں آدم خور کا چھوٹا بھائی ہوں !!!

چند دنوں سے میں پچھلی باتوں پر غور کر رہا ہوں ۔ فرض کر لیجئے کہ وہ بڈھا قاتل نہیں تھا ، واقعی ڈاکٹر تھا پھر بھی وہ آدم خور ہوگا ۔ اس کے پیش رو "لی شرجن" نے جڑی بوٹیوں پر جو کتاب لکھی ہے اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ انسان کا گوشت تلا اور کھایا جا سکتا ہے کیا اس کے بعد بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ وہ آدم خور نہیں ہے ؟ ۔

جہاں تک میرے بڑے بھائی کا تعلق ہے انھیں بھی معصوم نہیں کہا جا سکتا ۔ مجھے پڑھاتے ہوئے خود انھوں نے اپنی زبان سے کہا تھا ۔ "لوگ[1] کھانے کے لئے اپنے بیٹوں کو بدل لیتے ہیں" ۔ اور ایک بار انھوں نے ایک بُرے شخص کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اسے نہ صرف مار ڈالنا چاہیئے بلکہ اس[2] کا گوشت کھا لینا چاہیئے اور اس کی کھال پر سونا چاہیئے" اس وقت میں کم سن تھا اور دیر تک میرا دل زور زور سے دھڑکتا رہا تھا اور ابھی ۔ ۔ ۔ ل ہی میں ہمارے آسامی نے ایک شخص کے دل اور جگر کھا جانے کے بارے میں جو واقعہ سنایا تھا میرے بھائی سے سنتے ہوئے سر ہلاتے ر ہے ہے ۔ یہ واقعہ انھیں عجیب نہیں معلوم ہوا ۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کا خیال بدلا نہیں ۔ جب کھانے کے لئے بیٹوں کو بدلنا ممکن ہے تو پھر کوئی بھی چیز بدلی جا سکتی ہے ۔ کسی کو بھی کھایا جا سکتا ہے ۔ پہلے میں ان کی باتیں صرف سن لیتا تھا اور کچھ کہتا نہیں تھا ۔ اب میں جانتا ہوں کہ مجھے بتاتے وقت نہ صرف ان کے ہونٹوں پر انسانی چربی ہوتی تھی بلکہ ان کا دل انسانوں کو کھانے پر لگا ہوتا تھا ۔

بالکل اندھیرا ۔ مجھے نہیں معلوم دن ہے یا رات ۔ چاؤ خاندان کا کتا پھر بھونکنے لگا ہے
شیر کی درندگی ، خرگوش کی بزدلی ۔ لومڑی کی چالاکی ....

مجھے ان کی ترکیب معلوم ہے ۔ نتائج کے ڈر سے وہ کسی کو ایک دم نہیں مار ڈالتے اس لئے ان سبھوں نے مل کر جال بچھایا ہے تاکہ میں مجبور ہو کر خودکشی کر لوں ۔ چند دن پہلے سڑک پر لوگوں کا جو انداز تھا اس کو دیکھئے اور پچھلے دنوں سے میرے بھائی کا جو رویہ ہے اس پر غور کیجئے تو سب کچھ صاف ہو جاتا ہے ۔ انھیں تو یہ پسند ہے کہ آدمی گلے میں رسّی ڈال کے پھانسی لگا لے ۔ تب ان پر قتل کا الزام نہیں لگے گا اور وہ جی بھر کے لطف اٹھا سکیں گے ۔ اس سے ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ ہوگا دوسری طرف اگر آدمی ڈر کے یا پریشان ہو کے مر جاتا ہے تو اگرچہ وہ کچھ دبلا ہو جاتا ہے پھر بھی وہ اسے کھا لیتے ہیں ۔

وہ صرف مردار کھاتے ہیں ! مجھے یاد ہے میں نے ایک مکروہ جانور کے بارے میں کہیں پڑھا تھا جس کی آنکھوں میں منحوس چمک ہوتی ہے

[1] [2] یہ اقتباسات چینی ادبِ عالیہ سے ماخوذ ہیں

وہ صرف مردار کھاتا ہے وہ بڑی بڑی ہڈیاں چبا کے نگل جاتا ہے۔ اس کا خیال بھی آدمی کو ڈرا دینے کے لئے کافی ہے۔ اس جانور کو لکڑ بھگا کہتے ہیں۔ یہ بھیڑیئے کا رشتہ دار ہوتا ہے اور بھیڑیا کتے کے خاندان سے ہے۔ پچھلے دنوں چاؤ خاندان کے کتے نے مجھے کئی مرتبہ دیکھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی اس سازش میں ان کے ساتھ شریک ہے۔ بڈھے کی نظریں جھکی ہوئی تھیں لیکن میں کب اس سے دھوکا کھا سکتا ہوں!

سب سے افسوسناک میرے بڑے بھائی کی حرکت ہے۔ وہ بھی آدمی ہیں تو وہ کیوں نہیں ڈرتے؟ وہ کیوں دوسروں کے ساتھ مل کر مجھے کھانے کی کوشش کر رہے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب اس طرح کے کافی واقعات ہو جائیں گے تو ایسا کرنا جرم نہیں ہوگا؟ یا ایسا کام کرنے کے لئے جیسے وہ غلط جانتے ہیں انھوں نے اپنا دل سخت کر لیا ہے؟

وہ پہلے آدم خور ہوں گے جنھیں میں مطعون کروں گا اور وہ پہلے شخص ہوں گے جنھیں میں راہ راست پہ لانے کی کوشش کروں گا۔

سچ تو یہ ہے کہ ایسے دلائل کو بہت پہلے قبول کر لینا چاہیئے تھا

یکایک کوئی آگیا۔ وہ صرف بیس سال کا ہوگا اور اس کے خد و خال مجھے صاف دکھائی نہیں دیئے۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی لیکن وہ صاف بناوٹی معلوم ہوتی تھی میں نے اس سے پوچھا

"انسان کو کھانا درست ہے؟"

مسکراتے ہوئے اس نے جواب دیا "جب تک قحط نہ ہو تو کوئی انسان کو کیسے کھا سکتا ہے؟"

مجھے فوراً احساس ہوگیا کہ یہ ان ہی میں سے ایک ہے۔ لیکن میں نے ہمت کر کے اپنا سوال دہرایا

"لیکن کیا یہ درست ہے؟"

"لیکن تم یہ کیوں پوچھتے ہو؟ تم ..... تمہیں مذاق پسند ہے .... آج کتنا خوشگوار دن ہے"

"ہاں - اور چاند کتنا روشن ہے۔ لیکن میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کیا یہ درست ہے"؟

وہ بوکھلا گیا اور منہ ہی منہ میں بولا "نہیں ......"

"نہیں؟ پھر بھی لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں؟"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں کیا کہہ رہا ہوں، لوگ انسانوں کو کھا رہے ہیں۔ تمام کتابوں میں لکھا ہوا نظر آرہا ہے ـــ تازہ سرخ روشنائی سے"

"اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور پیلا پڑ گیا "ہو سکتا ہے" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا" ایسا ہوتا آیا ہے ...."

"چوں کہ ایسا ہوتا آیا ہے اس لئے درست ہے؟"

"میں ان باتوں پر تم سے بحث نہیں کرنا نہیں چاہتا۔ تمہیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ غلط ہے"

میں اچھل پڑا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں لیکن وہ شخص غائب ہو گیا تھا۔ میں پسینے میں شرابور تھا۔ وہ میرے بڑے بھائی سے بہت چھوٹا تھا لیکن وہ بھی اس سازش میں شریک تھا۔ اسے اس کے والدین نے سکھایا ہوگا اور مجھے ڈر ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کو سکھلا دیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ بچے بھی مجھے اتنی خوفناک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

دوسروں کو کھانا چاہتے ہیں خود کھائے جانے سے ڈرتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں ....

اگر ان کے دماغ سے اس وہم کا تسلط اٹھ جائے تو وہ فکر سے آزاد ہو کر بڑے آرام سے کام کریں، وہ چلیں پھریں اور سوئیں۔ بس انھیں صرف ایک قدم اٹھانا ہے لیکن پھر بھی باپ بیٹے، میاں بیوی، بھائی دوست، استاد شاگرد، جانی دشمن اور اجنبی تک اس سازش

میں شریک ہیں اور ایکدوسرے کی ہمت افزائی کر رہے ہیں اور ہاتھ بٹا رہے ہیں اور وہ اپنا رویہ کسی طرح بھی نہیں بدلیں گے۔

آج صبح سویرے میں بڑے بھائی کی تلاش میں نکلا۔ وہ بڑے کمرے کے دروازے کے باہر کھڑے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کے پیچھے پہنچ کر دروازہ بند کر دیا اور غیر معمولی سکون اور نرمی سے کہا

" بھائی صاحب مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے"

"کیوں کیا بات ہے؟" انھوں نے جلدی سے میری طرف پلٹ کر پوچھا

" بات تو کچھ بھی نہیں۔ لیکن کہنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ بھائی صاحب! غالباً ابتدا میں ہر قوم میں تھوڑی بہت آدم خوری تھی۔ بعد میں نقطہ نظر بدلنے کے ساتھ بعضوں نے اسے چھوڑ دیا اور چوں کہ وہ نیکی کی طرف مائل تھے، وہ انسان بن گئے ...... سچ مچ کے انسان لیکن بعض ابھی تک آدم خور ہیں۔ ٹھیک حشرات الارض کی طرح۔ بعض تو مچھلی بن گئے بعض چڑیاں، بندر اور آخر کار انسان! لیکن بعض بہتر ہونا نہیں چاہتے تھے اور ابھی تک حشرات الارض ہی بنے ہوئے ہیں۔ آدم خور جب اپنا مقابلہ ان لوگوں سے کرتے ہوں گے جو آدم خور نہیں ہیں تو وہ کتنے شرمندہ ہوتے ہوں گے۔ غالباً اس سے زیادہ جتنا حشرات الارض اپنا مقابلہ بندروں سے کر کے۔

زمانہ قدیم میں ایک باورچی نے اپنے ظالم آقا کے لئے اپنے بیٹے کو پکا دیا تھا۔ یہ پرانا قصہ ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ ابتدائے آفرینش سے انسان ایکدوسرے کو کھاتے آئے ہیں۔ اس باورچی کے زمانے تک، انقلاب کے زمانے تک اور انقلاب کے زمانے سے ابھی حال تک جب کہ اس گاؤں کا ایک آدمی پکڑا گیا۔ پچھلے سال ایک مجرم کو شہر میں پھانسی دی گئی اور ایک دق کے مریض نے روٹی کا ٹکڑا اس کے خون میں تر کر کے چوس لیا۔

لوگ مجھے کھانا چاہتے ہیں اور بیشک آپ اکیلے اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے لیکن آپ ان کے ساتھ کیوں مل گئے؟ وہ تو آدم خور ہیں سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر وہ مجھے کھا سکتے ہیں تو آپ کو بھی کھا سکتے ہیں۔ ایک گروہ کے لوگ ایک دوسرے کو کھا سکتے ہیں —— لیکن اگر آپ فوراً اپنا رویہ بدل لیتے ہیں تو ہر شخص مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا آیا ہے آج ہم ایک دوسرے پر خاص طور سے مہربان ہو سکتے ہیں۔ بھائی! آپ کہتے ہیں یہ ناممکن ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ایسا ممکن ہے۔ پچھلے دن جب آسامی نے مال گزاری کم کرانا چاہی تو آپ نے کہا تھا یہ ناممکن ہے۔"

پہلے تو وہ حقارت سے مسکراتے رہے۔ پھر ان کی آنکھوں میں قاتلانہ چمک آئی اور جب میں نے ان کے راز کا ذکر کیا تو ان کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ دروازے کے باہر کچھ لوگ کھڑے تھے جس میں مسٹر چاؤ بھی معہ اپنے کتے کے موجود تھے۔ سب اپنی اپنی گردنیں لمبی کر کے جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے سب کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے کیونکہ وہ کپڑوں میں لپٹے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ بعض چہرے زرد دکھائی دے رہے تھے اور ہیبت ناک حد تک جامد۔ ان کے قہقہے رکے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ سب کے سب ایک ہی تھے —— آدم خور لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ سب ایک ہی طریقے سے نہیں سوچتے۔ ان میں سے بعض کا خیال تھا کہ چوں کہ ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اسلئے انسانوں کو کھانا چاہیئے۔ بعض مانتے تھے کہ انسان کو نہیں کھانا چاہیئے پھر بھی کھانا چاہتے تھے اور انھیں ڈر تھا کہ لوگوں کو کہیں ان کا راز نہ معلوم ہو جائے اس لئے جب انھوں نے میری آواز سنی تو غصہ ہوتے لیکن اپنی حقارت بھری بھینچے ہونٹوں والی مسکراہٹ باقی رکھی۔

یکایک میرے بھائی سخت برانگیختہ ہوتے اور زور سے چیخے۔ "تم سب باہر جاؤ۔ پاگل کو اس طرح دیکھنے کا کیا مطلب ہے؟"۔ تب مجھے ان کی چالاکی کا احساس ہوا۔ وہ اپنا رویہ بدلنے کو کبھی تیار نہ ہوں گے اور ان کے منصوبے سارے مکمل تھے۔ انھوں نے مجھے پاگل قرار دے دیا تھا۔ وہ جب مجھے کھا لیں گے تو نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی گڑبڑ نہیں ہوگی بلکہ غالباً لوگ شکر گزار ہوں گے۔ ہمارے آسامی نے جو واقعہ سنایا تھا کہ گاؤں والوں نے ایک بدمعاش شخص کو کھا لیا تو وہاں بھی یہی ترکیب کی ہوگی۔ یہ ان کی پرانی چال ہے۔

بوڑھا چن بھی غصے میں بھرا ہوا اندر آ گیا لیکن وہ میری زبان بند نہیں کر سکے۔ مجھے لوگوں سے کہنا تھا

"تمہیں بدلنا چاہیے۔ تہ دل سے بدلنا چاہیے" میں نے کہا "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مستقبل میں آدم خوروں کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہوگی"

"اگر تم نہیں بدلو گے تو تم خود کھا لئے جاؤ گے۔ اگرچہ انسان ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن حقیقی انسان باتیوں کو مٹا دیں گے۔ جیسے شکاری بھیڑیوں کو۔ جس طرح حشرات الارض مٹ گئے"

بوڑھے چن نے سب کو بھگا دیا، میرے بھائی غائب ہو گئے تھے بوڑھے چن نے مجھے اپنے کمرے میں چلنے کا مشورہ دیا۔ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ شہتیر اور لکڑیاں میرے سر پر ہل رہی تھیں کچھ دیر ہلنے کے بعد وہ بڑی ہو گئیں اور ایک کے اوپر ایک ڈھیر ہونے لگیں۔

بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ میں ہل نہ سکتا تھا۔ ان کا مقصد تھا کہ میں مر جاؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ وزن جھوٹا تھا اس لئے میں کوشش کر کے نکل آیا۔ پسینے سے تر تھا لیکن مجھے کہنا پڑا

"تمہیں فوراً بدل جانا چاہیے۔ دل کی گہرائیوں سے بدل جانا چاہیے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ آئندہ دنیا میں آدم خوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوگی ...."

سورج نہیں چمکتا۔ دروازہ نہیں کھلتا۔ ہر روز دو کھانے۔

میں نے کھانے کی پتیلیاں اٹھائیں اور بڑے بھائی کا خیال آیا۔ میں اب سمجھا کہ میری چھوٹی بہن کیسے مری۔ انھیں کے باعث۔ اس وقت وہ صرف پانچ سال کی تھی۔ پیاری پیاری۔ اس کی تصویر اس وقت بھی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اماں خوب روئیں لیکن وہ انھیں سمجھاتے رہے اور رونے سے منع کرتے رہے۔ غالباً اس لئے کہ انھوں نے خود اسے کھا لیا تھا اور اماں کے رونے سے انھیں شرم آ رہی تھی —— یعنی احساس شرم ان کے اندر ضرور تھا۔

میری بہن کو میرے بھائی نے کھا لیا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں کہ اماں کو اس کا احساس تھا یا نہیں۔

میرا خیال ہے اماں کو پتہ ہوگا لیکن روتے ہوئے انھوں نے صاف صاف ایسا نہیں کہا غالباً اس لئے کہ انھوں نے مناسب خیال نہیں کیا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں پانچ سال کا تھا۔ ہم بڑے کمرے کے سامنے سائے میں بیٹھے تھے۔ میرے بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کسی کے والدین بیمار ہوں تو سعادت مند بیٹے کی نشانی یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے جسم کے گوشت کا ٹکڑا کاٹ کر ان کے لئے ابال دے۔ اماں نے اس کی تردید نہیں کی تھی۔ اگر ایک ٹکڑا کھایا جا سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ پورا جسم بھی۔ اور پھر بھی اس وقت جو آہ و بکا ہوئی تھی اس کا خیال کر کے میرا دل خون ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بڑی عجیب بات ہے!

"میں اس ظلم کو برداشت نہیں کر سکتا۔

مجھے ابھی احساس ہوا ہے کہ میں اب تک ایسی جگہ رہتا رہا ہوں جہاں پر چار ہزار سال سے لوگ انسان کا گوشت کھاتے رہے ہیں۔ میرے بھائی نے گھر کا انتظام سنبھالا ہی تھا کہ ہماری بہن مری اور انھوں نے اس کا گوشت کھانے میں پکوا دیا ہوگا اور اس طرح ہمیں بھی لاعلمی میں کھلا دیا۔

یہ ممکن ہے کہ لاعلمی میں میں نے اپنی بہن کے گوشت کی کئی بوٹیاں کھالی ہوں اور اب میری باری ہے . . .

میرے جیسا آدمی، آدم خوری کی چار ہزار سالہ تاریخ کے بعد —— اگرچہ مجھے پہلے اس کا کوئی علم نہ تھا۔ کیسے یہ امید کر سکتا ہے کہ اسے سچے انسان کا سامنا ہوگا؟ —— شاید ابھی تک ایسے بچے موجود ہوں جنھوں نے انسان کا گوشت نہ کھایا ہو —— ان بچوں کو بچایا جائے ...."

(اپریل ۱۹۱۸ء)

ارک نائٹ

ترجمہ

سید رضا کاظمی

نصف بہتر

(امریکی)

"اگر میری زندگی کی کوئی خواہش باقی رہ گئی ہے تو وہ یہ ہے کہ میں تمام دنیا کے طویل سفر پر جاؤں"، نسیم اسماں کی بیوی نے آتش دان کے قریب بیٹھے ہوئے کہا۔ "تم ریٹائر ہو چکے ہو۔ ہمارے پاس دولت ہے۔ وقت ہے اور ہم بہ آسانی تمام ممالک کی سیر کو جا سکتے ہیں۔"

نسیم نے محسوس تو ضرور کیا کہ اُس کی بیوی نے اس کی جانب چارہ پھینکا ہے لیکن اُس نے اسے نگلنے سے انکار کر دیا اور اخبار سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا "اُس محنت اور مزدوری کرنے والے انگریز کا انجام کیا ہو سکتا ہے جسے دن کے اختتام پر اُس کی مرغوب شے ایل کی شراب نہ ملے؟"

انجام کیا ہو سکتا ہے؟ یہ تو دنیا کبھی نہیں جان سکتی جب تک کہ کوئی ایسا گر کے نہ دیکھے اور میں دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت تم کسی ایسے تجربہ کے موڈ میں نہیں ہو لہٰذا تم فوراً بار میں چلے جاؤ میں جانتی ہوں کہ تم مجھے کچھ چین سے بیٹھنے نہ دو گے جب تک کہ میں تمہیں بار میں جانے کی اجازت نہ دیدوں گی میری طبیعت کئی روز سے ناساز ہے لیکن تمہیں اس کی توفیق کہاں کہ ایک شام میرے ساتھ گھر میں بیٹھ کر گذارتے"، اس کی بیوی نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

نسیم کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے فیصلہ کرنا دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی بیوی کی طبیعت خراب ہے اور وہ بجد نحیف نظر آ رہی ہے اسلئے گھر بیٹھ کر اس کا جی بہلانا چاہئے لیکن اُسے اپنی شام کی شراب بھی چاہئے۔ اس کے دل میں تکلیف دہ قسم کی کشمکش شروع ہو گئی لیکن بالآخر فتح شراب کی ہوئی!

"میں جلد ہی واپس آ جاؤنگا" اُس نے بیوی کو خوش کرنے کے خیال سے کہا۔

لیکن موّلی نے زیتون کی شاخ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا

"میں خوب سمجھتی ہوں تمہارے وعدوں کو۔ وہاں پہنچ کر تم شراب پیو گے اور جوا کھیلو گے اور اس وقت باہر نکلو گے جب بار بند ہونیکا وقت آ جائیگا"،

"عورتوں کے بے بنیاد شبہات کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بار بند ہونیسے بہت پہلے ہی میں گھر واپس آ جاؤنگا"۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ نسیم اسماں کا ارادہ یہی تھا کہ جو کچھ اُس نے کہا ہے اسے پورا کر دکھائے کم از کم اس لئے کہ اس کی بیوی کے شبہات بے بنیاد اور الزامات غلط ثابت ہوں لیکن جب وہ بار میں پہنچا تو وہاں پر ایک دلچسپ بحث چھڑی ہوئی تھی اور موضوع بحث کچھ ایسا تھا جس میں حصہ لینے کے لئے

نیم ہمعال جیسے دوراندیش اور باعمل انسان کی سخت ضرورت تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ تمام بارک شائر میں صرف نسیم ہی ایک ایسا شخص ہے جو ہر بحث میں فیصلہ کن انداز میں حصہ لینے کی قابلیت کا حامل ہے۔

"بات یہ ہے نسیم" ریی نے کہا "اس اخبار میں لکھا ہے کہ ایک بڑے ڈاکٹر کی رائے ہے کہ ہٹلر درحقیقت...... میں اس لفظ کا تلفظ نہیں کر سکتا۔

نسیم نے اخبار ہاتھ میں سے لیا۔

"دراصل یہ ایک قسم کی بیماری کا طبی نام ہے جس کا مطلب ہے منقسم شخصیت یعنی کسی انسان کی شخصیت کا دو مختلف حصوں میں تقسیم ہو جانا"
نسیم نے واقفکارانہ انداز میں کہا۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" انیٖا نامی ویٹرس نے کہا "میں نے ایک فلم میں ایسے آدمی کو دیکھا ہے جس کی دو شخصیتیں تھیں۔ ان میں سے ایک....."

"بیکار کی باتیں نہ کرو" گرافر نے انیٖا کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میرا فیصلہ تو یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اپنے تئیں دو شخصیتوں میں تقسیم کر سکتا ہے تو یہ امر واقعی نہیں بلکہ گندہ پراپیگنڈہ ہوگا"

"فیصلہ کرنے میں اتنی جلدبازی سے کام نہ لو گرافر" نسیم نے کہا "سائنس کی موجودہ دریافت کی رُو سے ہر فرد چند افراد کا مجموعہ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ہم تم سائنس کو غلط نہیں ثابت کر سکتے"

"تم دیکھ لینا ایکدن یہ سائنس اپنے تئیں کسی گڑھے میں گرا لیگی اگر وہ اسی طرح اسی رفتار سے اس قسم کی دریافت کرتی رہی" ڈیمپلی نے کہا

"لیکن کیا ہم نے آج سے قبل جڑواں بچوں کے بارے میں نہیں سُنا ہے؟ ہو سکتا ہے کہ یہ بیماری بھی کچھ اسی قسم کی ہو ہاں یہ فرق ضرور رہے گا کہ بچے جڑواں پیدا ہوتے ہیں اور آدمی کی دو شخصیتیں اُس کے پیدا ہونے کے بعد ہو جاتی ہیں" ریی نے کہا

"یہ سب بکواس ہے میں تم سے عمر میں بڑا ہوں اور آج تک میں نے انسان کے دو مختلف شخصیتوں میں تقسیم ہو جانے کے بارے میں کبھی نہیں سُنا۔ ڈیمپلی نے کہا۔

"لیکن یہ تو حال کی دریافت ہے" نسیم نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کبھی بھی ہو لیکن مجھے یقین نہیں آ سکتا کہ کسی کا اپنے تئیں دو شخصیتوں میں تقسیم کر لینا ممکن ہے" گرافر چیخا "اور یہی میرا خیال ہے" ڈیمپلی چلایا۔

"ٹھہرو ٹھہرو۔ ہمیں انگریزوں کے انصاف پسندی کے جذبہ کی توہین نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم دو آدمی ایک اکیلے سے اُلجھ رہے ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ.....

اور اس طرح بحث جاری رہی۔ کبھی دھیمے لہجوں میں اور کبھی اونچی آوازمیں۔ یہاں تک کہ بار کے ایک کی کرخت آواز گونجی "حضرات بار کے بند کرنے کا وقت ہو گیا"

نسیم ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اوہ رات کے بارہ بج گئے اور میں نے مولی سے وعدہ کیا تھا کہ میں جلد ہی گھر لوٹ آؤنگا" اور تیز تیز قدموں سے وہ بار کے باہر نکل گیا۔ وہ بہت تیز چل رہا تھا جتنا تیز اس کی چھوٹی ٹانگیں اُسے لیجا سکتی ہیں۔ وہ سوچ رہا تھا اگر میں جلد گھر پہنچ گیا تو میں یہ بہانہ کر دوں گا کہ میں بار کے بند ہونے سے پہلے ہی گھر کو چلدیا تھا لیکن راستہ میں آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہوا کا لطف لیتا ہوا آیا اس لئے دیر ہو گئی۔

اس نے خود کو مجرم محسوس کیا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک غلطی کو چھپانے کے لئے دوسرا جھوٹ بولنے جا رہا تھا بلکہ اس لئے کہ اُس نے اپنی بیمار بیوی کو گھر پر تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ دفعتاً......

ایک تیز چمک اندھیرے کو چیرتی ہوئی فضا میں غائب ہو گئی۔ خاموش دھماکا ہوا اور ستارے ایک دوسرے سے ٹکرا گئے۔ افق پر زرد روشنی کی پھلجڑی چھوٹ پڑی اور نسیم نے خود کو زمین پر نیم بے ہوشی کے عالم میں پایا۔

میں یقیناً اس بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گیا ہوں" نسیم بڑبڑایا لیکن جونہی اُس کے ہوش و حواس درست ہوئے اُس نے اپنے قریب ایک آدمی کو

اپنی ہی طرح زمین پر لیٹا ہوا دیکھا

" اچھا تو تم مجھ سے ٹکرا گئے تھے ! بھلے آدمی دیکھکر کیوں نہیں چلتے"، سیم نے اس آدمی سے کہا

" بات دراصل یہ ہے کہ چھ اور نصف درجن برابر ہوتے ہیں"، اس آدمی نے جواب دیا

" مجھ سے بحث مت کرو"، سیم نے کہا " آؤ مجھے سہارا دو"،

" لیکن تم مجھے سہارا کیوں نہیں دیتے" اس آدمی نے جواب دیا۔

" تمہارے جیسے نامعقول آدمی سے میرا کبھی سابقہ نہیں پڑا لیکن میرے پاس بحث کے لئے وقت نہیں ہے۔ میری بیوی بیمار ہے اور گھر پر بالکل تنہا ہے میں نے وعدہ کیا تھا کہ جلد لوٹ آؤں گا اور اب میں آدھی رات کو یہاں اس حالت میں پڑا ہوں"،

" شرابی !"، اس آدمی نے طنز بھرے لہجہ میں کہا " جب تمہاری بیوی بیمار ہے تو تم اس کے قریب بیٹھ کر اس کا جی کیوں نہیں بہلاتے۔ میں تو ہمیشہ اپنے گھر میں ایسا ہی کرتا ہوں۔

" کہاں ہے تمہارا گھر ؟"

" وہ رہا سامنے۔ وہی جس کے پھاٹک پر بیلیں پھیلی ہوئی ہیں"،

" وہ تمہارا گھر ہے !"

" ہاں "

سیم نے محسوس کیا کہ اس آدمی کی آواز جانی پہچانی ہے۔ ایسی جیسے وہ ہر روز سنتا رہا ہے۔

" تم کون ہو" اس نے اونچی آواز میں کہا اور اس آدمی کو کالر سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا بجلی کے کھمبے کے قریب لے آیا لیکن روشنی میں پہنچ کر سیم کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ آدمی بالکل اس کا ہم شکل ہے جیسے وہ آئینہ میں خود اپنا چہرہ دیکھ رہا ہو۔

ایک سیکنڈ تک سیم بالکل خاموش کھڑا رہا لیکن فوراً ہی اس کا دماغ کام کرنے لگا۔

" تم بدمعاش ہو۔ تم نے میرا بھروپ بھرا ہے یقیناً کسی بُرے ارادہ سے۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا" سیم نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

" نہ میں بدمعاش ہوں نہ بھروپیا۔ میں سیم اسمال ہوں"،

" جھوٹا کہیں کا ! سیم اسمال تو میں ہوں"،

" مجھے جھوٹا ثابت کرنے سے پہلے میری طرف غور سے دیکھئے کیا میں سیم اسمال نہیں ہوں کیا میری شکل اس کے جیسی نہیں ہے"،

" ہاں ہے تو ضرور"، سیم نے اعتراف کیا۔ لیکن میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا آخر یہ کیا معاملہ ہے تم کیونکر ثابت کر سکتے ہو کہ تم سیم اسمال ہو ؟"،

" میری ایک بیوی ہے جس کا نام مولی ہے اور میری دس برس کی بچی ہے جس کا نام بیونی ہے"،

" او ہ تم یقیناً بہت ہوشیار ہو۔ بھیس بدلنے سے پہلے تم نے میرے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی ہیں لیکن میں تمہارا جھوٹ ابھی ثابت کر دونگا اور پھر دیکھنا کہ تمہارا کیا حشر ہوتا ہے"،

یہ کہہ کر سیم نے اپنی واسکٹ کی جیب سے سونے کی زنجیر میں بندھی ہوئی گھڑی کو باہر نکالا۔ یہ گھڑی مجھے شادی کے وقت تحفتاً دی گئی تھی اور اس کے ڈھکنے پر میرا نام کندہ کیا ہوا ہے۔ یہ دیکھو۔ پیارے سیم اسمال کے لئے۔ محبت اور خلوص کے ساتھ۔ الفرڈ"،

" لیکن تمہیں یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ میری گھڑی پر بھی یہی لکھا ہوا ہے۔ یہ دیکھو" اور اس آدمی نے اپنی واسکٹ کی جیب سے بالکل ویسی ہی گھڑی اسی قسم کی سونے کی زنجیر سمیت باہر نکالی !

" اوہ خدا"، سیم اپنے بالوں کو نوچنے لگا۔ آخر مجھ سے کونسا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔ میں کس مصیبت میں پھنس گیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ہی تم ہوں یا میں تم ہو یا یہ کہ ہم دونوں ہم ہیں"

کچھ دیر تک سیم بالکل خاموش کھڑا رہا۔ دفعتاً اس نے زور کا نعرہ بلند کیا "اب میں سمجھ گیا"

"کیا؟" اس آدمی نے پوچھا

ہم دونوں میں ہوں۔ ہاں۔ ہم دونوں۔ دراصل یہ ایک قسم کی بیاری ہے۔ ایک انسان کا دو شخصیتوں میں منقسم ہو جانا جس کے بارے میں ہم شراب خانہ میں بحث کر رہے تھے اور اب میں خود ہی دو ہو گیا ہوں،،

"ہو سکتا ہے تمہارا خیال درست ہو لیکن اب ہمیں کیا کرنا چاہئے،،

دیکھو مسٹر۔ یہ سوال بڑی سنجیدگی سے غور کرنے کا ہے۔ ایسا واقعہ ہر شخص کی زندگی میں ظہور پذیر نہیں ہوا کرتا میری رائے ہے کہ قبل اس کے کہ کوئی ہمیں دیکھ لے اور تمام مزا کرکرا ہو جائے ہم سامنے والے بڑے میدان میں جا کر اطمینان سے اس واقعہ پر غور کریں۔ ٹھیک ہے نا۔ اور ہاں۔ ہمیں ایک دوسرے کو مخاطب کرنے میں دقت نہ ہو اس لئے میں تمہیں سیمی ول کے نام سے مخاطب کروں گا اور تم مجھے میرے نام سیم سے پکارو گے۔ یعنی مطلب یہ کہ اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے ہمیں اپنی شخصیت کو جدا رکھنا پڑیگا۔

اور دونوں میدان میں پہنچ کر گھاس پر بیٹھ گئے۔ سیم نے اپنے خیال کے مطابق اس واقعہ کا جوازپیش کرنا شروع کیا۔

"اگر ہم ہوشیاری سے کام کریں تو کافی دولت کما سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر اور سائنسداں ہم سے ملاقات کرنے کے لئے سینکڑوں روپے خرچ کرنے کو تیار ہوں گے،، سیم نے کہا

"نہیں سیم ہمیں ڈاکٹروں سے کچھ سروکار نہیں رکھنا چاہئے،، سیمی ول نے کہا "وہ ہمارا آپریشن کرنا چاہیں گے،،

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ اچھا ہم ملک ملک کا سفر کریں گے۔ لوگ دور دور سے ہمیں دیکھنے آئیں گے اور ہم اُن سے ٹکٹ کی رقم وصول کرینگے،،

"میں عجیب الخلقت انسانوں کی طرح نمائش کے لئے رکھا جانا بالکل پسند نہیں کرتا" سیمی ول نے کہا

"نہیں ایمانداری سے دولت کمانے میں کوئی ہرج نہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ میں نے ذہن میں تمام پروگرام مرتب کر لیا ہے۔ پھر اس کا بھی امکان ہے کہ گورنمنٹ ہم میں دلچسپی لے۔ بھلا سوچو تو سہی۔ اگر یونہی گورنمنٹ ہر آدمی کو دو آدمیوں میں تقسیم کر سکے تو فوج کے لئے کافی آدمی دستیاب ہو سکیں گے،،

"لیکن ہم تمام شب یہاں اسی طرح بیٹھے رہیں گے اور خیالی پلاؤ پکاتے رہیں گے اور وہاں گھر پر مولی میرا انتظار کر رہی ہوگی،،

"لیکن ہم گھر نہیں جا سکتے،، سیم نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا "میرا مطلب ہے ہم دونوں گھر نہیں جا سکتے،،

وہاں ٹھیک ہے۔ لیکن ایسا تو ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے ایک یہیں بیٹھ کر تمام شب سوچتا رہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے اور دوسرا گھر جا کر مولی کا مونسِ تنہائی بن سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو سیم تم یہیں آرام کرو۔ کوئی زیادہ سردی بھی نہیں ہے میں گھر جاتا ہوں اور صبح سویرے تمہارے لئے ناشتہ لے کر یہیں آجاؤں گا،،

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم میری بیوی کے ساتھ رات کو تنہا رہو۔ جانتے ہو یہ کتنا بڑا اخلاقی جرم ہے

"لیکن تم نے ہی تو مجھے بتلایا کہ ہم تم دونوں دراصل ایک ہیں لہذا اگر میں گھر جاؤں گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم گھر گئے ہو۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو تو سیم۔ ہم میں سے ایک کو تو گھر کے باہر رہنا ہی ہوگا۔ تا آنکہ ہم کوئی مناسب انتظام کر سکیں۔ تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ چند دنوں کے لئے کہیں باہر چلے جاؤ۔ تم وہاں سوچتے رہنا میں گھر پر بیٹھ کر سوچتا رہوں گا اور ہم ضرور کوئی راستہ سوچ نکالیں گے،،

"کیا کہا میں قصبہ سے باہر چلا جاؤں! ذرا سوچو تو سہی سیمی۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں گھر بار۔ گھر کا آرام۔ سب کچھ چھوڑ کر دوسرے شہروں کی ٹھوکریں کھاتا پھروں،،

"تو پھر چارہ کار بھی کیا ہے؟"

"خیر۔ میں مولی کی خاطر یہ قربانی بھی کرنے کو تیار ہوں۔ اچھا خدا حافظ"

"لیکن تم جاؤ گے کہاں؟"

"میں پیدل برٹلی کی جانب چل پڑوں گا اور صبح وہاں پہنچکر بینک سے کچھ رقم نکال لوں گا اور......"

"لیکن دیکھو میرے بینک کے روپوں سے فضول خرچی نہ کرنا" سیمی نے ٹوک کر کہا

"تمہارے روپے نہیں سیمی۔ ہمارے۔ ہم دونوں کے! اچھا خدا حافظ"

"تم واپس کب ہوگے؟"

"جب دوبارہ تم میرا چہرہ دیکھو تو سمجھ لو میں واپس آگیا۔ لیکن میری غیر موجودگی میں سوتی کے آرام کا بہت خیال رکھنا"

"کیا آپ کو ٹکٹ چاہیئے"، بکنگ آفس کی کھڑکی کے پیچھے سے کسی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" سیم نے جواب دیا" آج تک تو سوتی میرے لئے ٹکٹ خریدا کرتی تھی اور میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بہر حال بتلاؤ کہ تمہارے پاس کس کس قسم کے ٹکٹ ہیں"

"پہلا۔ دوسرا۔ ڈیوڑھا۔ تیسرا۔ تفریحی اور آنے جانے کا ٹکٹ"

"اچھا تو مجھے آنے جانے کا ٹکٹ دیدو"

"ایک ٹکٹ۔ کہاں کے لئے؟"

"عجیب آدمی ہو ارے بھئی یہیں کے لئے میں یہیں واپس آنا چاہتا ہوں"

بکنگ کلرک نے خیال کیا کہ سیم اس سے مذاق کر رہا ہے اس لئے اسے غصہ آگیا لیکن سیم نے بھی جواباً نشہ میں سجر کو بحث شروع کردی اور یہ تبلانے سے قطعی انکار کردیا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔

"میرے خیال میں پرلے درجہ کا بیوقوف دوکاندار بھی وہ چیز فروخت کر سکتا ہے جو کوئی گاہک خود طلب کرتا ہے۔ کمال تو جب ہے کہ گاہک کے ہاتھ وہ چیز فروخت کردیجائے جو گاہک خریدنا نہ چاہتا ہو۔ سمجھے"، اُس نے بکنگ کلرک کو گھورتے ہوئے کہا۔

"لیکن حضرت آپ آخر جانا کہاں چاہتے ہیں"، بکنگ کلرک نے بیچارگی سے پوچھا۔

"بھلا میں کیونکر تبلا سکتا ہوں کہ مجھے کہاں جانا ہے جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہوجائے کہ کس جگہ جانے پر کتنا خرچ آیگا اور آیا میں وہ خرچ برداشت بھی کر سکتا ہوں یا نہیں! کوئی عقلمند آدمی اپنے جیب کی رقم سے آگے دوڑنے کی کوشش نہیں کرتا۔ لہذا تم مجھے چند شہروں کے متعلق تفصیل سے تبلاؤ"

بکنگ کلرک نے لانبا سانس کھینچا اور ایک کتاب کھول کر بولا۔

"للان ڈوڈونو۔ نہایت ہی صاف ستھرا شہر۔ آمد و رفت کا کرایہ پچیس شلنگ چھ پینس"

"نہیں۔ میں اس شہر کا تلفظ بھی ادا نہیں کر سکتا اور میں کبھی ایسے شہر میں ایک منٹ بھی قیام نہیں کر سکتا جس شہر کا تلفظ دشوار ہو۔ میں وہاں خود کو شکست خوردہ محسوس کروں گا"، سیم نے گردن کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا

"اسکیٹر برو۔ پندرہ شلنگ اور......"

"نہیں نہیں۔ اس شہر کا نام نہ لو۔ میرا ایک دوست وہاں گیا تھا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ ہوٹل کے کمرہ میں وہ پتلون پہن رہا تھا کہ اُس کو گر گیا اور ٹانگ ٹوٹ گئی"

"تو کیا ہوا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ پھر ٹھیک جا سکتی ہے۔ اب سائنس نے بڑی ترقی کرلی ہے"

"ہاں ٹھیک تو ہوگئی لیکن مصیبت یہ تھی کہ اُس کی بیوی کو اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ یہ ٹانگ دوسری کے مانند نہیں ہے لہذا اُسے دوسری ٹانگ کو توڑ کر اس کی مانند کرلینا چاہیئے۔ اس بات پر اُن دونوں کا روز جھگڑا ہوتا اور دونوں کی جان ہنچ میں آگئی تھی۔..... نہیں میں اسکیٹر برو نہیں جاؤں گا"

"ملیک پول۔ بارہ شلنگ چھ پینس۔ دس روز قیام کی اجازت"

"بلیک پول۔ دس روز قیام کی اجازت! ہاں یہ کچھ دلچسپ معلوم ہوتا ہے"
"تو پھر بلیک پول کا ٹکٹ دیدوں؟"
"ٹھہرو۔ میں جلد بازی کا عادی نہیں۔ میں ایک بار بلیک پول جا چکا ہوں اور میں نے وہاں سرکہ میں ڈوبے ہوئے گھونگے کثیر تعداد میں کھایا تھا جس کی وجہ سے واپسی میں میں ٹرین میں ہی بدہضمی کا شکار ہو گیا تھا۔ پھر بھی میرا وقت وہاں بہت اچھا گذرا تھا"
"تو پھر بلیک پول ٹھیک رہیگا"
"اچھا تو ٹکٹ دیدو"
اور سیم اسمال بلیک پول پہنچ گیا۔
تمام دن وہ شہر کے چکر لگاتا اور شام کو سمندر کے کنارے ریت پر جا بیٹھتا اور رنگ برنگے لباس میں گھومنے والی عورتوں کو گھورتا رہتا ایک دن ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے جس کے بال رنگے ہوئے تھے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا اور سیم نے دوسرے ہی دن ایک رنگین ٹائی خریدی جب دوسرے دن اس عورت نے دوبارہ اس کی جانب دیکھا تو اس نے فوراً ہی بازار جا کر ایک قیمتی ہیٹ خرید لیا۔
ایک دن جب کہ سورج کی تمازت کچھ شدید تھی اور تمام لوگ سمندر میں ڈبکیاں لگا رہے تھے سیم بھی پانی میں کود پڑا اور تمام دن پانی ہی میں پڑا رہا۔ جب تیسرے پہر بھوک ناقابل برداشت ہوئی تو وہ کھانے کی تلاش میں پانی سے باہر نکلا۔ شہر کے ہوٹل بالکل سنسان تھے اور اس نے ان میں جانا پسند نہ کیا لہٰذا وہ اپنی جائے قیام پر واپس چلا آیا اور مکان کی مالکہ کو بلا کر کہنے لگا "میرا خیال ہے کہ مجھے زکام ہو گیا ہے"
"تمام دن خالی پیٹ سمندر کے پانی میں پڑے رہو گے تو زکام نہ ہوگا تو کیا ہوگا"
"تو کوئی دوا جانتی ہو"
"میں تو اپنے شوہر کو جوشاندہ دیا کرتی تھی۔ بڑا نیک تھا میرا شوہر"
مر گیا۔ تین سال ہونے آئے
"کہاں ہے تمہارا شوہر"
"اچھا ہوا۔ کم از کم اب اُسے زکام تو نہیں ہوتا ہوگا! خیر گھر پر مجھے جب کبھی زکام ہوتا تو میری بیوی مجھے کھانے کو شکر اور پینے کو گرم برانڈی دیا کرتی تھی"
"میرے پاس برانڈی نہیں ہے۔ میں شکر لائے دیتی ہوں کھا لو اور کل برانڈی پی لینا"
"خدا کی قسم تم عورتوں سے جینا محال ہے۔ میری بیوی مولی کا بھی یہی حال ہے"
"خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس طرح وہ تم جیسے انسان کے ساتھ گذارہ کرتی ہے"
"مجھے لنکاشائر میں ہمدردی یا اخلاق کی امید ہی نہیں رکھنا چاہئے"
"لنکاشائر نہیں جناب یارک شائر"
"اب حد ہو گئی یعنی بے عزتی کی انتہا ہو گئی" سیم نے پیر پٹکتے ہوئے کہا "اب مجھے یہاں ایک منٹ کے لئے بھی ٹھہرنا گوارہ نہیں کل صبح میں گھر واپس چلا جاؤں گا"
اور دوسری صبح سیم گھر کی جانب روانہ ہو گیا
وہ بہت خوش تھا اور تیز قدموں سے اپنے مکان کی سمت بڑھ رہا تھا کہ دفعتہً اس کی مسرتوں پر اوس پڑ گئی اُسے یکایک ستی دل کا خیال آگیا۔
"اوہ۔ اگر میں اس طرح بے تحاشا گھر کے اندر چلا گیا اور ستی دل وہاں موجود ہوا تو مولی کو تمام راز معلوم ہو جائیگا اور وہ سوالات کی بوچھاڑ کر دیگی لہٰذا مناسب یہی ہے کہ میں چپ جاؤں اور پہلے گھر کے اندر کا حال معلوم کر لوں" یہ سوچ کر سیم اپنے مکان کے لان میں دبے پاؤں داخل ہوا

"اور کھڑکی کے قریب درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ مولی آتش دان کے قریب کرسی پر بیٹھی ہوئی کوئی چیز بُن رہی ہے اور سیمی دل قریب ہی بیٹھا ہوا اسے کوئی کتاب پڑھ کر سنا رہا ہے۔ نسیم نے خود کو تنہا بے بس اور بھوکا محسوس کیا اور اسے بھوک اور تھکاوٹ اور شدید معلوم ہونے لگی یہ دیکھ کر کہ دوسرا آدمی اس کے گھر میں آرام سے بیٹھا ہوا ہے اور وہ باہر ٹھنڈی ہوا میں کھڑا ٹھٹھر رہا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ اس وقت اسے گرم چائے کا ایک پیالہ مل جائے۔

وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ آیا اور دور کھڑے ہو کر کھڑکی پر چھوٹی کنکریاں پھینکنے لگا کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ روشنی کی باریک لکیر لان پر بکھر گئی ساتھ ہی اسے مولی کی آواز سنائی دی۔ "غالباً پڑوسی کے لڑکے شرارت کر رہے ہیں۔ انھیں تنبیہہ کر دو کہ اگر کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تو......"

دروازے سے سیمی دل نے سر نکال کر باغ میں جھانکا اور نسیم نے آہستہ سے کہا "سیمی میں تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں فوراً سامنے والے میدان میں پہنچ جاؤ۔ سمجھے"

"کون ہے نسیم پیارے" اندر سے مولی کی آواز آئی۔

"کوئی نہیں" سیمی دل نے جواب دیا۔ "مولی میرا خیال ہے کہ میں ذرا باہر ٹہل آؤں اس طرح میں تمہارے کمرہ کو اپنے پائپ کے دھوئیں سے نہیں بھر دوں گا اور تمہیں کوئی شکایت کی گنجائش نہ رہے گی"

"لیکن جلد واپس آ جانا نسیم" مولی کی آواز آئی اور دروازہ بند ہو گیا۔ نسیم آہستہ آہستہ لان سے باہر آیا۔ اس نے محسوس کیا اور مولی کی آواز اور اس کا لب و لہجہ بہت نرم و شیریں تھا اور پھر اس نے سیمی دل کو نسیم پیارے کہا تھا حالانکہ اس نے آج تک اسے پیارے کے لقب سے سرفراز نہیں کیا تھا۔ جب تک سیمی دل اس کے قریب پہنچے نسیم رشک حسد اور غصہ کی آگ میں تپنے لگا تھا۔

"خیر تو ہے نسیم" سیمی دل نے کہا

"خیر ہے یا نہیں یہ جان کر کیا کرو گے لیکن یہ سن لو کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب میں گھر آ کر اپنی جگہ پر اپنی بیوی کے قریب بیٹھوں گا"

"لیکن میرا خیال ہے کہ تم نے کہا تھا کہ تم مختلف ممالک کی سیر کو جانا چاہتے ہو؟"

"میں سیر کر آیا اب تمہاری باری ہے"

"نہیں نسیم انصاف کہو۔ میں یہاں بڑے آرام سے ہوں اور مولی بھی بہت خوش ہے۔ ہر شام میں اس کے قریب بیٹھ کر اسے افسانے پڑھ کر سناتا ہوں اور......"

"میں جانتا ہوں کہ وہ بہت خوش ہے اور ابھی ابھی میں نے اسے تمہیں پیارے کہتے ہوئے سنا ہے لیکن وہ میری بیوی ہے اور......"

"ہماری بیوی نسیم"

"بحث مت شروع کرو۔ تم ایک ہفتہ آرام سے رہے اور میں پردیس کی خاک پھانکتا رہا اب تمہاری باری ہے"

"لیکن نسیم تم گھر سے باہر رہنا پسند کرتے ہو اور میں گھر میں رہنا چاہتا ہوں"

"خدا کے لئے بحث مت کرو۔ میری طرف دیکھو میں بیمار ہوں۔ بھوکا ہوں۔ صبح سے میں نے ایک پیالی چائے بھی نہیں پی ہے! لہٰذا ایک شریف آدمی کی طرح اپنا راستہ لو"

"نہیں میرا راستہ گھر کو جاتا ہے اور میں وہیں جا رہا ہوں خدا حافظ"

"تو میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں"

"کیا تمہیں یہ گوارہ ہے کہ مولی کو یہ راز معلوم ہو جائے اور اس کا ذہنی سکون جاتا رہے"

"لیکن آج نہیں تو کل مولی پر یہ راز افشا ہو ہی جائے گا لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ کل کے بجائے آج ہی اسے معلوم ہو جائے تاکہ میں ایک پیالی چائے پی سکوں"

"نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے اگر ...."

لیکن سیمی دل کے جملہ ختم کرنے سے پہلے ہی سیم اپنے گھر کی جانب بھاگا۔ اُس نے سوچا کہ اگر وہ پہلے گھر میں داخل ہو جائے گا تو جواب دہی سیمی دل کے کاندھوں پر پہنچ جائے گی۔ وہ دوڑتا رہا اور اس کے پیچھے سیمی دل بھاگتا رہا۔ دونوں کی طاقت برابر کی تھی لیکن سیم آگے تھا۔ اُسے باغ کا پھاٹک کھولنے کے لئے رکنا پڑا۔ جیسے وہ رُکا سیمی دل دوڑا ہوا آیا اور اُس سے ٹکرا گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھ کر زمین پر گر گئے اور ایک دوسرے پر غالب آنے کی کوشش کرنے لگے۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور انھیں مولی کی آواز سنائی دی "آخر یہ کیا ہو رہا ہے"

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگے

کچھ دیر بعد تینوں ساتھ کھڑے ہوئے تھے!

"خدا کے لئے گھر میں چلو قبل اس کے کہ پڑوسی تمہیں اس حالت میں دیکھیں"، مولی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا

دونوں مولی کے پیچھے گھر میں داخل ہوئے اور آتشدان کے قریب پہنچ کر کھڑے ہو گئے۔ مولی نے انھیں غور سے دیکھا اور اپنے تئیں پلنگ پر گرا کر رونے لگی۔

"آخر یہ کیا مذاق ہے سیم"، مولی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "تم میں سے سیم اسمال کون ہے"

"ہم دونوں سیم ہیں"، سیمی دل نے جواب دیا۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ تم نے آج تک مجھے نہیں بتلایا تھا کہ تمہارا کوئی جڑواں بھائی بھی ہے۔ خیر یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ تم دونوں میں سے اصلی سیم کون ہے میں دوسرے کو ایسی سزا دونگی کہ وہ اپنی پیدائش پر افسوس کرے گا"

"لیکن ہم دونوں ہم ہیں مولی۔ سیم نے کہا "میرا مطلب ہے کہ دونوں میں ہوں"

"تم میں سے کون یہاں گذشتہ ہفتہ سے ہے"

"میں"، سیمی دل نے کہا "یہ تو بلیک پول کے سفر پر گیا ہوا تھا"

"ہا۔ ہا۔ اب میں جان گئی کہ تم دونوں میں سیم اسمال کون ہے۔ تم۔ تم۔۔ ایسا برتاؤ تم ہی کر سکتے ہو کہ اپنی بیوی کے پاس غیر مرد کو چھوڑ کر خود سیر و تفریح کے لئے چلے جاؤ۔ میں آج ...... وہ سیم اسمال کی جانب بڑھی لیکن سیمی دل نے درمیان میں آکر اُسے روک لیا۔

نہیں مولی غصہ نہ کرو۔ کیا اس کے چلے جانے کے بعد ہم دونوں خوش نہیں رہے ہیں۔ کیا میں ہر شام تمہارے قریب بیٹھ کر تمہیں افسانے نہیں سناتا ہوں۔ کیا میں نے تمہاری تیمار داری نہیں کی ہے"

ہاں تم نے میری اچھی دیکھ بھال کی ہے اور اس کے لئے میں تمہاری شکر گذار ہوں۔ دراصل مجھے ہر وقت شک ہوتا تھا کہ بات کیا ہے کہ سیم اب میرا اتنا خیال کرتا ہے اور ہر شام میرے قریب بیٹھا رہتا ہے مجھے اپنی خوشی کا یقین نہ آتا تھا"

مولی کرسی پر بیٹھ کر رونے لگی۔ سیم خاموش کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی بیوی کے قریب گیا۔

"کیا یہ سچ ہے مولی کہ تم میری غیر موجودگی میں بیحد خوش رہی ہو؟"

مولی بہر حال عورت تھی اور اُس نے ضروری سمجھا کہ اس سوال کے جواب میں اس درجہ طنز بھر دے کہ سیم کی طبیعت بدمزہ ہو جائے

"ہاں سیم میں اپنی زندگی میں کبھی اتنا خوش نہیں رہی جتنا گذشتہ ہفتے اور یہ سات دن میری شادی شدہ زندگی کے بہترین دن رہے ہیں"

"تو میرے خیال میں اس شخص کے لئے جو زندگی کی دوڑ میں ہار گیا ہو اور کوئی بات کہنے کی نہیں رہ جاتی اس لئے میں بھی کچھ نہیں کہوں گا میرا مطلب ہے کہ میں اپنی بیوی کی خوشی کی راہ میں حائل نہیں ہوں گا اس لئے مولی خدا حافظ۔ خدا تمہیں ہمیشہ خوش و خرم رکھے"

سیم سر جھکائے ہوئے دروازہ کی جانب بڑھا۔ مولی خاموش بیٹھی اُسے جاتا ہوا دیکھتی رہی ایسا معلوم ہوتا جیسے مولی سکتہ کے عالم میں ہے نیلیہ

"سیم کو چپنا چاہئے دیتی لیکن سیمی دل کی آواز نے اُسے چونکا دیا۔

"میں کہتا تھا سیم" سیمی دل نے فاتحانہ کہا "کہ صرف میں اس عورت کو خوش رکھ سکتا ہوں"

"خوش رکھ سکتا ہوں!" مولی نے سیمی دل کو منہ چڑھاتے ہوئے کہا۔ "بڑا آیا خوش رکھنے والا۔ ٹھہرو سیم۔ یہاں آؤ۔ میرا خیال ہے کہ اگر یہ بات سچ ہے کہ انسان کبھی کبھی دو مختلف شخصیتوں میں منقسم ہو جاتا ہے تو ہم تینوں کو بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے کہ ہمیں کیا کرنا ہے"

"لیکن ہم کافی سوچ بچار کر چکے ہیں" سیمی دل نے کہا "اور میرے خیال میں بہتر صورت تو یہی ہے کہ تینوں یہاں رہیں"

"کیا کہا" مولی چیخی "یعنی میں دو شوہروں کے ساتھ رہوں! جانتے ہو کہ یہ قانونی اور اخلاقی جرم ہے"

"لیکن میں اور سیم دونوں ایک ہی شوہر ہوئے" سیمی دل نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہو سکتا ہے کہ یہ درست ہو اور ہمیں درست اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا دل صاف ہے اور ہم آج کی ترقی یافتہ دنیا میں رہتے ہیں لیکن انگریزی قانون آج بھی قدامت پسند ہے اور وہ اسی نتیجہ پہ پہنچیگا کہ دو شوہر دو ہی ہوتے ہیں" مولی نے ترشی سے کہا

"لیکن مولی شادی تو ہماری ایک ہی ہوئی ہے" سیم نے کہا

"ہاں گرجا میں تو ایک ہی ہوئی لیکن اس کے باہر کی شادی غیر قانونی ہے" مولی نے جواب دیا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر......"

"چپ رہو سیم اور مجھے سوچنے دو" مولی نے سختی سے کہا۔

کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد مولی نے کہا

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ میری ماں کہا کرتی تھی کہ جب شک و شبہ میں پھنس جاؤ تو فوراً جا کر سو جاؤ"

"تو؟" سیم دل نے کہا

"ہاں تو پھر" سیم بولا

"تو پھر یہ کہ میں سونے جا رہی ہوں اور تم دونوں فوراً گھر کے باہر نکل جاؤ"

"لیکن مولی" سیم دل نے التجا آمیز لہجہ میں کہا "مجھے یہ گوارا نہیں کہ......"

"اور مجھے بھی گوارا نہیں ہے لیکن تم نے اپنے آپ کو بغیر میری مرضی اور ارادے کے دو شخصیتوں میں تقسیم کیا ہے لہٰذا تم دونوں ہی اس کا حل تلاش کرو" مولی نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا اور دونوں کو دھکا دیتی ہوئی دروازہ تک لے آئی "چلو باہر نکلو" جب سیم اُس کے قریب سے گذرا تو مولی نے آہستہ سے کہا "اس وقت تک گھر نہ آنا جب تک تم دونوں ایک نہ ہو جاؤ"

دھماکے کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا اور دونوں رات کی تاریکی میں ٹھنڈی ہوا کے تھپیڑے کھانے کیلئے باہر نکال دئے گئے

"مناسب یہی ہے کہ ہم ایک جگہ بیٹھ کر سوچیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ چلو بڑے میدان میں چلیں" سیم نے کہا اور دونوں بڑے میدان کی جانب روانہ ہو گئے۔ بجلی کے کھمبے کے قریب پہنچکر سیم نے کہا

"یہی وہ جگہ ہے جہاں ہم دونوں ملے تھے"

"ہاں کاش تم گھر سے باہر کو نہ گئے ہوتے" سیمی نے کہا

"چپ رہو ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گا" سیم نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔ دفعتاً اس کے کان میں مولی کے الفاظ گونجنے لگے "اس وقت تک گھر واپس نہ آنا جب تک تم دونوں ایک نہ ہو جاؤ" اور ایک عجیب خیال اس کے دماغ میں چکر لگانے لگا

"سیم سنبھال۔ تمہاری آنکھوں میں خون نظر آ رہا ہے۔ کیا تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو" سیمی دل چلایا

"ہاں۔ سیمی تیار ہو جاؤ۔ ایک سچے یارک شائیر کے باشندہ کی طرح مقابلہ کرنے کو تیار ہو جاؤ"

"لیکن میں لڑائی جھگڑا پسند نہیں کرتا" سیمی نے عاجزی سے کہا
"تو میں تمہیں اس کا وادی بنا دوں گا"، یہ کہہ کر سیم نے ایک گھونسا سیمی دل کی کنپٹی پر مارا، اور فوراً ہی دوسرا گھونسا اس کے دوسری کنپٹی پر مارا۔

"میں نے کتاب میں پڑھا ہے کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر چانٹا مارے تو تم دوسرا گال سامنے کر دو لیکن اس کتاب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ جب دوسرے گال پر بھی طمانچہ پڑے تو کیا کرنا چاہئے میرے خیال میں ایسی حالت میں آدمی کو اپنی عقل کو کام میں لانا چاہئے"، یہ کہہ کر سیمی نے ایک گھونسہ سیم کے سینہ پر مارا

"اوہ"، سیم غرایا، "اچھا میں بھی تیار ہوں"

اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کو مارتے رہے۔ غالباً یہ دنیا کی سب سے دلچسپ کشتی تھی۔ کیونکہ دونوں سیم ہمسال تھے اور دونوں کی جسمانی طاقت برابر تھی اس کے علاوہ دونوں کا دماغ بھی ایک ہی طرح کام کر رہا تھا۔ اگر سیم داہنے ہاتھ سے وار کرتا تو سیمی دل بائیں ہاتھ سے روک لیتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی آئینہ کے سامنے مکہ بازی کی مشق کر رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے پر غالب نہ آسکا اور دونوں تھک کر چور ہو گئے

معاً ایک دوسرا خیال سیم کے ذہن میں آیا "اگر اب سیمی مجھ پر وار کرے گا تو میں وار نہیں روکوں گا اور اس طرح سیمی منہ کے بل زمین پر گر جائے گا۔

لیکن بجنسہ یہی خیال سیمی کے ذہن میں بھی ابھرا
اور جب دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیا تو دونوں نے سامنے سے ہٹ جانے کی کوشش کی، انجام یہ ہوا کہ سیم سر کے بل بجلی کے کھمبے سے جا ٹکرایا اور چکرا کر زمین پر گر گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے کان میں آوازیں آئیں

"بیچارہ سیم"، غالباً شراب کے نشہ میں بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گیا"،

سیم نے انہیں بتلانے کی کوشش کی کہ وہ کشتی لڑ رہا تھا لیکن اس کے منہ سے الفاظ نہ نکل سکے۔ اس نے اٹھنا چاہا لیکن چکرا کر گر پڑا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے مکان میں ہے اور مولی اس پر جھکی ہوئی ہے۔

"سیم تم نے پھر زیادہ شراب پی لی"، مولی نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا

"نہیں مولی میں نشہ میں نہیں ہوں"

"ہاں ہاں اس وقت تم نشہ میں نہیں ہو"

"میں نے اُسے قتل کر دیا ہے"

"کسے"

"سیمی دل کو"

"سیمی دل کو ہی دل کون ہے؟"

سیم مسکرانے لگا۔ "یہ عورتیں بھی خوب ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اپنے شوہر کی زندگی کے کس واقعہ کو فوراً بھول جانا چاہئے"
اس نے سوچا۔ اس کے دل میں مولی کے لئے بے پناہ محبت امڈ آئی "کتنی اچھی مولی۔ کس محبت سے میرے سر پر ٹھنڈے پانی کی تھیلی پھیر رہی ہے"

"مولی۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کر دگی؟"

"کیوں نہیں سیم۔ میں گذشتہ بیس سال میں تمہیں اتنی دفعہ معاف کر چکی ہوں کہ اب میرے لئے اس عادت کو چھوڑ دینا دشوار ہے"

مولی۔ میں نے طے کرلیا ہے کہ اب میں تمہارے ساتھ بہترین سلوک کروں گا۔ انتہائی محبت سے پیش آؤں گا۔ میں بلیک پول جاکر بالکل خوش نہ تھا اور اب جبکہ میں نے سیمی دل کو قتل کر دیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہم دونوں ختم ہوگئے ہیں یعنی اب وہ میرے اندر ہے۔ وہ میری شخصیت کا بہترین حصہ ہے اور اب میں اس حصہ کو اپنے جسم کے سامنے کے حصے میں لے آؤں گا تاکہ میں تمہارے ساتھ محبت.....،،

"یہ کیا کہہ رہے ہو۔ ایسا کرنے سے تم عجیب الخلقت انسان ہو جاؤ گے۔ بھلا پچھلا حصہ کہیں آگے آسکتا ہے۔" "جو بھی ہو اب میں بار میں کبھی نہیں جاؤں گا۔ میں ہر شام تمہارے قریب بیٹھ کر تمہیں افسانے پڑھ کر سناؤں گا"

"نہیں نہیں ایسا نہ کرنا ورنہ میرا ذہنی سکون جاتا رہے گا۔ تم جیسے ہو ویسے ہی مجھے پسند ہو"

"نہیں مولی میں نے عہد کرلیا ہے۔ اب میں سیمی دل کی طرح رہوں گا وہ دراصل میرا نصف بہتر ہے" "بکواس بند کرو۔ تمہاری صرف ایک ہی نصف بہتر ہے اور وہ میں ہوں۔ تمہاری مولی۔ سمجھے۔ اب سو جاؤ۔"

چار قطرے خون

(صفحہ نمبر ۳۶ سے آگے)

لیکن —— ممدو سے جمنی کا رنڈاپا نہ دیکھا گیا —— اور جمنی کو بھی ایک موزوں جیون ساتھی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جگن اور جمنی ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوگئے۔

ممدو آج کل سبزی مارکیٹ میں لہسن پیاز کا تھوک بیوپاری ہے۔ اور جگن اس کی دوکان میں منیجر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ پچاس روپیہ کرائے کے ایک مکان میں یہ جدید طرز کا اشتراکی خاندان سکونت پذیر ہے۔ ہم پیشہ تاجروں میں ممدو کو حامد سیٹھ، جگن کو جگن لال اور جمنی کو جمنا بہن کے شبھ نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو مہاتما گاندھی روڈ سے گذرنے کا اتفاق ہوا ہو تو سبزی مارکیٹ کے صدر دروازے پر آویزاں کیا ہوا ذیل کا بورڈ آپ نے ضرور دیکھا ہوگا! ——

حامد سیٹھ اینڈ کمپنی

ہول سیل مرچنٹ اینڈ کمیشن ایجنٹ ——...

آزاد جمالدینی
ترجمہ
انجم قزلباش

بلوچی

روشنی کی تلاش میں

(۱) چوکنت مردو لگورءَ اے وخت آزمندگ
بگنذءِ نج نہ ورئے دوست پہ آخراءِ عمرءَ

میرے عزیز دوست!
دیکھو! زندگی کے آخری لمحوں میں کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا۔
آزمائش اور جدوجہد کے دوران جوانمرد کیونکر پیچھے ہٹ سکتے ہیں

(۲) اے دَوراَءِ دہشت ترنگ راہ۔ لواراَءِ گرم چگوات
نکنفت پیرزگ۔ لاشار ورندی دلّ اَءِ برءَ

خوف وہراس اور دہشت کا زمانہ ہے۔ راستے پیچ در پیچ اور مصائب سے بھرپور ہیں۔ جسم کو جھلسا دینے والی لو بھی چل رہی ہے۔ لیکن لاشار اور رند اور ان کی نسلیں ایک ہو کر ان مصائب اور خطرات کو خاطر میں نہ لائیں گی۔

(۳) ہزار راحت ما۔ جان و مال ءَ نذر کنن
دتی پہ مُرادءَ ماپسیر۔ پدءَ پہ ذُذاءَ سرءَ

ہم اپنی راحتوں، آسائشوں، جان و مال اور سر تک کو
اپنے مقصد اور عزت کے لئے
قربان کردیں گے!

(۴) وطن! اگوں حونءَ دتی ماترا کنن سرشان
چوگرانے اپ دتی ساہءَ۔ قسم دُرّ اَءِ سرءَ

میرے سندر دیس! ہم اپنے عزیز سر کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز جانتے ہیں، اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تیرے تحفظ، سلامتی اور خوش حالی کے لئے اپنا خون بہا دیں گے۔

(۵) چو کوہ اَءِ اپ ءَ تچانءَ پہ منزلءَ آزات
رَوَن اسپیدگ اَءِ نور تجیت وکپت نظرءَ

جس طرح پانی پہاڑوں سے بہتا ہوا اپنی منزل کی سمت رواں دواں ہے، اسی طرح ہم بھی قدم آگے بڑھاتے چلے جا رہے ہیں تاکہ ہم سرعت سے پھیلتی ہوئی روشنی کو دیکھ سکیں۔

پنجابی

منو بھائی
— ترجمہ —
منیر ابنِ عظیم

ساڈے گیت فجر دیاں بانگاں

کوئی ہڈ ورتی، کوئی جگ بیتی اساں ساریاں کھول سنایاں نے
اساں آپے کہڑیاں ہتھکڑیاں اساں آپ بنایاں پھائیاں نے
ہُن رَل مِل سجنو! دھونڈاں گے کوئی دارو رات ہنیری دا
لکھ آساں فجر سویریاں اساں نگر نگر ورتائیاں نے

اسی جھیڑیاں کولوں نہیں ڈردے، اسی طعنے سُن کے نہیں سڑدے
ایہہ جھنے ساڈیاں کھٹیاں نے، ایہہ طعنے عُمر کمایاں نے
کجھ آس اُمیداں دِتیاں نے اساں آون والیاں راہیاں نوں
کجھ نویاں راہواں دسیاں نے ساتوں جاون والیاں راہیاں نے

ساڈے ہتھ پوناں دیاں واگاں تے، ساڈے گیت فجر دیاں بانگاں نے
دل آکھے آس اڈیکاں نوں "ہُن تھوڑیاں ہور جدائیاں نے"
توں راکھا کچیاں کندھاں دا، اسی دل وگدے دریاواں دے
کئی کندھاں اساں اشارے وچ منہ بھرنے ڈیگ وکھایاں نے

توں قول نبھانے نہیں ویکھے، فرہاداں دے منصوراں دے
سر نیویں ہوندے نہیں ویکھے، اساں عشق دیاں مغروراں دے

ہمارے گیت صبح کی اذانیں

ہم نے غمِ ذات اور غمِ کائنات کی داستانیں بڑی تفصیل سے سنائی ہیں۔
ہم نے خود اپنے ہاتھوں اپنے لئے ہتھکڑیاں بنائی ہیں اور پھانسی کے پھندے تیار کئے ہیں۔
اب ہم تمام ساتھی اجتماعی کوشش سے اس سیاہ تاریک رات کا علاج ڈھونڈیں گے۔
ہم نے ہر آبادی اور ہر شہر میں نئی صبح کی بہت سی امیدیں تقسیم کی ہیں۔

ہم طعنوں سے نہیں ڈرتے، ہم طعنوں سے بھلا کیوں ڈریں جبکہ یہ طعنے
ہماری عمر بھر کی کمائی اور زندگی کا سرمایہ ہیں۔
مستقبل کے مسافروں کو ہم کچھ نئی آس امیدیں دیئے جا رہے ہیں۔
ماضی کے مسافروں نے ہمیں کچھ نئی راہیں دکھائی ہیں۔

اب صبح کی ہواؤں کی باگیں ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور ہمارے گیت صبح کی اذانیں ہیں۔
ہمارا دل کہتا ہے "اب جدائی کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں"۔
تم کچی دیواروں کے محافظ ہو اور ہم بہتے دریاؤں کے دل ہیں۔
ہم نے ایسی کئی دیواریں ایک اشارے میں منہ کے بل گرا کر دکھائی ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی منصوروں اور فرہادوں کو
وعدہ پورا کرتے نہیں دیکھا۔
اور ہم نے کبھی عشق کے مغروروں کو سرِ ندامت خم کئے
ہوئے نہیں دیکھا۔

وحید العالم
ترجمہ
احمد سعدی

بنگالی

انوکھا دیس

سچائی کی حد کو بہت دور چھوڑ کر
نہ جانے ہم لوگ آج کہاں، کس دیس میں آگئے ہیں ؟
اس دیس کی ہر چیز انوکھی ہے
یہاں نا اہل لوگوں کا اقتدار ہے اور ذہین لوگ مطعون ہیں
یہاں اصل کو نقل اور نقل کو اصل سمجھا جاتا ہے
یہاں دل کے کالے، لباس کے اُجلے لوگوں کی بڑی قدر ہے
یہاں لوگ منہ پر میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں
اور دل کے اندھیرے میں نفرت و فریب کی چھری چھپائے رکھتے ہیں
یہاں لاکھوں انسان اپنا خون پسینہ بہا کر شاہراہ بناتے ہیں
اور اسی شاہراہ پر ایک دن خون تھوک کر مر جاتے ہیں
اسی شاہراہ پر ان کی موت سے بے پروا
نئی نئی کاریں فراٹے بھرتی ہوئی گزرتی رہتی ہیں
ان کاروں کے مالکوں کی توند دیکھنے کے قابل ہوتی ہے
یہ لوگ قوم کے خادم اور بڑے نیک نام ہوتے ہیں۔
اور لوگوں کا سلام بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتے ہیں
اور قوم کا لاکھوں روپیہ اپنی توند میں ہضم کر لیتے ہیں۔
انسان آج اندھیرے میں روپوش ہیں
اور لٹیروں کی بن آئی ہے
یہاں سچ بولنے والے قابل گردن زدنی ہیں۔
اور جھوٹے کامران و فتح مند!
سچائی کی راہ پر چلنے والوں کے لئے ہزاروں مصائب ہیں
اور فریبیوں اور سیہ کاروں کو کھلی آزادی ہے۔

سندھی

شیخ ایاز
ترجمہ
آفاق صدیقی

ساوَن آیا!

ساون آیا گہری گہری سی ہریالی چھائی
ہائے کلی مُرجھائے من کی اب بھی نہ مسکائی

بھیگی ہوائیں چاندنی راتیں تیر کسے تنہائی
من کے گھاؤ ہوئے پھر گھائل یاد پیا کی آئی

کسی کسی کو مل جاتا ہے تیرے من کا موتی
ساگر سے بھی گہری تیری آنکھوں کی گہرائی

میری آنکھیں جیسے بھک منگوں کی خالی جھولی
تیری آنکھیں مے کے پیالے جب چاہی چھلکائی

جلتی جوت کہاں دیپک کی اب ہی اک چنگاری
پھر کیوں چاروں اور پتنگوں نے تم نے بھیڑ لگائی

رات ہماری روح میں کوئی راگ ازل سے آیا
تن من میں اک آگ سی بھڑکی بات تری بن آئی

پریتم رات کوہی کے جوہر دیکھ کے تم یہ کہتے
گیت کے ہر اک بول نے کیسے جگ سندرتا پائی

یاد آیا ز سجن کو کر کے ساون کے دن بیتے
مینہ بھی لیکر نیہہ نہ آیا ہو گئی پریت پرائی

ناظم حکمت
ترجمہ
ادیب سہیل

ترکی

میرے وطن

تمہاری ہستی ہے ایک مژدہ
ٹریجیڈی ہے وجود میرا
جو تم ہو شفاف ایک کاغذ
تو ایک ٹائپ مشین ہوں میں
اے میری دلدار، میرے ننھے سے نونہالوں کی ماں، مری دلنواز ساتھی،
تم ایک نغمہ ہو ایک لے ہو
میں ایک گیتار ہوں کہ تاروں میں جن کے تم ہو ازل سے رقصاں
میں ایک مرطوب، گرم طوفانی شام ہوں ـــــ تم
اک ایسی عورت جو اس کنارے پہ ہو خراماں
مگر جو اُس پار کے حقائق کی روشنی سے، کسی بھی لمحہ نہیں ہو غافل،
ہر ایک لمحہ جو کسب انوار کا ہو طالب۔
میں آب کا ایک عریض خطہ
تم ایک اُن میں سے ہو جو مدت سے تشنہ کامی میں مبتلا ہیں
تم ایک اُن میں سے ہو جو دیتی ہیں تشنہ کامی کو اس سے تسکیں
تمہارے کوچے ہیں، میں اکیلا طواف مدت سے کر رہا ہوں
تم اُن میں اک ہو جو خیر مقدم کو اپنی خلوت کے کھولتی ہیں حسیں دریچے
ہو چین اگر تم
تو ماؤزے تنگ کا ہوں میں اک جری، بہادر، دلیر لشکر
تم ایک چودہ برس کی لڑکی ہو، ایک خلیائی کلی ہو
تو میں "ہتیں یانکی" جہازی کے دست گل چیں سے چھین لینے کو بڑھ رہا ہوں۔
ہو تم اناطولیہ کی شاداب و سبز بستی، جو اک پہاڑی پہ مدتوں سے بسی ہوئی ہے
ہو تم ہمارا حسین اور پرشکوہ بلدہ
ہو تم اعانت طلب صدا بھی
ہمارا پیارا وطن بھی تم ہو
تمہاری جانب جو تیز گامی سے بڑھ رہے ہیں وہ سب ہمارے قدم، ہمارے نقوش پا ہیں

شیخ ایاز
ترجمہ
آفاق صدیقی

سندھی

ساوَن آیا!

ساون آیا گہری گہری ہریالی چھائی
ہائے کلی مُرجھائے من کی اب بھی نہ مسکائی

بھیگی ہوائیں چاندنی راتیں تیر کسے تنہائی
من کے گھاؤ ہوئے پھر گھائل یاد پیا کی آئی

کسی کسی کو مل جاتا ہے تیرے من کا موتی
ساگر سے بھی گہری تیری آنکھوں کی گہرائی

میری آنکھیں جیسے بھک منگوں کی خالی جھولی
تیری آنکھیں مے کے پیالے جب چاہی چھلکائی

جلتی جوت کہاں دیپک کی اب ہے اک چنگاری
پھر کیوں چاروں اور پتنگوں تم نے بھیر لگائی

رات ہماری روح میں کوئی راگ ازل سے آیا
تن من میں اک آگ سی بھڑکی بات تری بن آئی

پریتم رات کوی کے جوہر دیکھ کے تم یہ کہتے
گیت کے ہر اک بول نے کیسے جگ سندر یا پائی

یاد ایاز سجن کو کر کے ساون کے دن بیتے
مینہہ بھی لیکر نیہہ نہ آیا ہو گئی پریت پرائی

ترکی

ناظم حکمت
ـــ ترجمہ ـــ
ادیب سہیل

میرے وطن

تمہاری مٹی ہے ایک مژدہ
ٹہ بجیر ڈہے وجود میرا
جو تم ہو شفاف ایک کاغذ
تو ایک ٹائپ مشین ہوں میں
اے میری دلدار، میرے ننھے سے نونہالوں کی ماں، مری دلنواز ساتھی،
تم ایک نغمہ ہو ایک لے ہو
میں ایک گیتار ہوں کہ تاروں میں جن کے تم ہو ازل سے رقصاں
میں ایک مرطوب، گرم طوفانی شام ہوں ـــ تم
اک ایسی عورت جو اس کنارے پہ ہو خراماں
مگر جو اُس پار کے حقائق کی روشنی سے، کسی بھی لمحہ نہیں ہو غافل،
ہر ایک لمحہ جو کسب انوار کا ہو طالب۔
میں آب کا ایک عریض خطہ
تم ایک اُن میں سے ہو جو مدت سے تشنہ کامی میں مبتلا ہیں
تم ایک اُن میں سے ہو جو دیتی ہیں تشنہ کامی کو اس سے تسکیں
تمہارے کوچے میں، میں اکیلا طواف مدت سے کر رہا ہوں
تم اُن میں اک ہو جو خیر مقدم کو اپنی خلوت کے کھولتی ہیں حسیں دریچے
ہو چین اگر تم
تو ماؤزے تنگ کا ہوں میں اک جری، بہادر، دلیر لشکر
تم ایک چودہ برس کی لڑکی ہو، ایک غلیا ئی کلی ہو
تو میں تمہیں "یانگی" جہازی کے دست گل چیں سے چھین لینے کو بڑھ رہا ہوں۔
ہو تم اناطولیہ کی شاداب و سبز بستی، جو اک پہاڑی پہ مدتوں سے بسی ہوئی ہے
ہو تم ہمارا حسین اور پُرشکوہ بلدہ
ہو تم اعانت طلب صدا بھی
ہمارا پیارا وطن بھی تم ہو
تمہاری جانب جو تیز گامی سے بڑھ رہے ہیں وہ سب ہمارے قدم ہمارے نقوش پا ہیں

آرٹ کے دس سال

عبدالرحمن چغتائی

۱۹۱۹ء میرے آرٹ کی تاریخ کا مبارک سال ہے۔ جب میں نے آرٹ کی دنیا میں قدم رکھا۔ ان دنوں جدید ہندوستانی آرٹ کی تحریک جس نے سارے ہندوستان کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا بنگالی آرٹ کے نام سے منسوب ہونے لگی تھی۔ بنگالی ذہنیت کے مطابق اس پر جذباتی رنگ اس شدت سے چڑھ گیا تھا کہ وہ سکڑتے سکڑتے چند ٹیگوروں کا چند آرٹسٹوں کا آرٹ رہ گیا تھا۔ پھر اس پر انحطاط نے غلبہ پا لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بے توجہی کا مرکز بن گیا اور وہ بین الاقوامی شہرت جو اسے حاصل تھی یا وہ فنی انہماک اور صلاحیتیں جن سے جدید آرٹ کی تحریک ایک شاندار مستقبل کا پیچھا کر رہی تھی اپنے مرکز سے ہٹ گئی۔ وہ چنگی اور امیدیں جن کے بل پر ہم بلند بانگ نعروں سے جدید آرٹ کو اپنا آرٹ 'ہندوستانی آرٹ' اور نیشنل آرٹ اور جدید آرٹ کہہ کر پکارتے تھے آج ناممکن سا نظر آتا ہے اور ممکن نہیں کہ ہم پھر کبھی اس خلوص اور عقیدت سے وہ سماں اور وہ فضا پیدا کر سکیں۔

ان دنوں جب میرے فن کی ابتدا ہوئی جو نام میرے سامنے کسی نہ کسی رنگ میں آتے تھے وہ ہندو تھے، بنگالی تھے۔ ان کی کثرت تھی۔ ان کا پروپیگنڈا بڑے احسن طریقے پر کیا جاتا تھا۔ جدید ہندوستانی آرٹ کی تحریک کے بانی ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کو اپنے خاندانی وقار اور روایات کی بنا پر ہر ممکن سہولت حاصل تھی۔ ہندوستان بھر کے اخبارات اس تحریک کے پشت پناہ تھے یہاں تک کہ مسلمان بھی اس تحریک کا کلمہ پڑھتے تھے۔ اس تحریک میں کلکتہ۔ بمبئی۔ لکھنؤ۔ مدراس اور دہلی کے سیکڑوں ہندو آرٹسٹ جدید آرٹ کی تحریک کو کامیاب بنانے میں ہمہ تن مصروف تھے اور جب میں نے اپنے آرٹ کی ابتدا کی تو ایک ہیجان سا اٹھ کھڑا ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرا نام اس طبقہ کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا تھا اور جب میری پہلی تصویر شائع ہوئی تو مجھے آسام، بنگال، بنگلور، بمبئی اور پشاور سے حوصلہ افزا خطوط ملے تھے۔ "معارف" اعظم گڑھ میں مولوی فضل الحق نے "دیٹل آرٹ کی نمائش" کے سلسلے میں ایک مضمون لکھا تھا۔ اسی طرح کلکتہ کے مشہور اخبار "محمدی" نے میرے نام کو ایک نیک فال تصور کرتے ہوئے ایک مسلمان آرٹسٹ ہونے کی حیثیت سے مجھ سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ کی تھیں۔

دیوان غالب مرقع چغتائی کا آغاز ۱۹۲۴ء میں ہوا اور وہ ۱۹۲۸ء میں چھپ کر شائع ہو گیا تھا۔ اس کی ابتدا اور انتہا میں ڈاکٹر تاثیر اور میرے بھائی رحیم کا ہاتھ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میری تصویروں نے لاہور، شملہ، منصوری۔ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ مدراس۔ اوٹی۔ پیل بھیت۔ نینی تال۔ لکھنؤ۔

بجنور۔ مدراس اور اڈاسٹر کی نمائشوں میں نمایاں جگہ حاصل کی اور ان پر بڑے بڑے انعام حاصل ہوئے۔ نکتہ چینی کی گئی۔ تعریف کی گئی اور دیکھے لیجیے نے بھی جدید ہندوستانی آرٹ کی تحریک میں اپنا ایک مقام حاصل کر لیا۔ اس عرصہ میں اور مسلمان نام میرے سامنے آئے۔ مسٹر فیضی رحمین اور ڈاکٹر سلیم الزماں۔ مسٹر فیضی رحمین ان دونوں یورپ میں مقیم تھے اور مغربی طرز نگارش کے طریق پر کام کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد وہ پاکستان چلے آئے ہیں۔ ان کی بنائی ہوئی بہت سی تصویریں میں نے دیکھی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کی آج تک میں نے کوئی تصویر نہیں دیکھی — میری ان تھک کوششوں نے اور میری انفرادیت نے ان مسلمان آرٹسٹوں کے اندر بھی ایک لہر سی دوڑا دی تھی جو اس وقت تھیٹر کی دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔ ان سب میں جس نام کو بڑی اہمیت حاصل تھی وہ استاد حسین بخش مرحوم تھے۔ وہ آغا حشر کے ہمعصر تھے۔ ان دونوں ناموں کے ساتھ تھیٹر کی دنیا آباد تھی اور جب تک ہندوستان تھیٹر کی تاریخ زندہ ہے یہ دونوں نام زندہ رہیں گے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک ہزار روپیہ آج کے دس ہزار روپیہ کے برابر تھا اور آغا حشر اور استاد حسین بخش تین تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے اور دنیا تھی کہ ان کے کمال فن کا کلمہ پڑھتی تھی — استاد حسین بخش کے بیسیوں شاگرد تھے جو مختلف تھیٹروں میں کام کرتے تھے جنہیں سردار ٹھاکر سنگھ، حیا سنگھ، استاد ملارام جیسا ہندو استاد، محمد عالم جیسا مسلمان اور بمن جی جیسے پارسی آرٹسٹ موجود تھے۔ ان ہی دنوں میں نے استاد اللہ بخش کا نام بھی سنا تھا اور مسلمانوں میں یہی ایک واحد آرٹسٹ ہے جس نے تھیٹر کی دنیا چھوڑ کر آرٹ کی صحیح دنیا میں سانس لیا اور اپنے فن کے معیار اور اپنی انتھک کوششوں سے شہرت حاصل کی۔

بدقسمتی سے تھیٹر کی دنیا میں بجز استاد حسین بخش مرحوم ایک بھی ایسا آرٹسٹ موجود نہ تھا جس نے کسی تحریک میں حصہ لیا ہو یا اپنی تہذیب اور کلچر کے کاموں سے اپنے آپ کو وابستہ کیا ہو۔ مگر استاد صاحب کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ دنیا راتوں کو ان کے رنگوں اور کمال فن سے متاثر ہو کر دیوانی نظر آتی تھی۔ بہی والی گوہر کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ — "آغا صاحب کا لکھا ہوا ڈرامہ ہو، استاد صاحب کی سین سینری اور پردے ہوں تو میں سمجھتی ہوں گوہر گوہر ہے۔ یہ دو ہستیاں جنہوں نے مٹی کو گوہر بنا دیا ہے"

یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک مختلف تبدیلیوں سے چلتا رہا اور سوائے استاد اللہ بخش کے کوئی دوسرا مسلمان آرٹسٹ کی حیثیت سے ہندوستان بھر کی نمائشوں میں پہلی صف میں نظر نہیں آتا تھا — پاکستان کی تخلیق کے ساتھ آرٹ کی دھرتی بدل گئی اور دیکھتے دیکھتے پاکستان بھر میں آرٹسٹ بھی غزل گو شاعروں کی طرح نظر آنے لگے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ سب آرٹسٹ پاکستان کی الجھنوں میں، الجھے بیٹھے تھے۔ نئی پود میں آج بھی بہت کم آرٹسٹ ہیں جن کو میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ بعض ذہین ہیں جو اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے سر توڑ کوششوں میں لگے ہیں اور بعض نقالوں کی طرح تقلید کا دم بھرتے ہیں۔ پاکستان کی سیاست اور ساخت نے وہ رنگ و ادب اختیار نہیں کیا جو پاکستانی آرٹسٹوں نے اپنے لئے چنا ہے۔ ہمارے آرٹ کے ذوق کا انتشار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ کوئی بدذوق سے بدذوق بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ زید یا بکر باقی ہے جس نے one man show نہیں کیا۔ ہر آرٹسٹ اس بات کا دعویدار ہے کہ اس کے آرٹ پر بڑے شاندار الفاظ میں تبصرے کئے جا چکے ہیں۔ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہمارے بعض آرٹسٹ پیکاسو گروپ سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض برگ اور لیگرو کے ہمنوا ہیں۔ بعض نے اوبین بلاک سے رشتہ ناطہ جوڑ رکھا ہے۔ ہر آرٹسٹ کی انفرادیت کسی نہ کسی استاد کامل سے وابستہ ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی کا پیغمبر کہلاتا ہے۔ ہمارے آرٹسٹوں کے فنی انہماک میں ان پر پیچ راستوں کی نشوونما ضرور ہے جو دنیا کے کسی عاشق نے اس سے پہلے جنوں کیفیت اختیار نہ کئے تھے۔ ندرت کی بلندی، انفرادیت کا نعرہ، تخلیق کا فقدان ان کا پہلا قدم ہے۔ ان کے اپنے فن کی انتہا ان کے سامنے ہے اور انھوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ آخری دم تک اپنی ہٹ پر قائم رہیں گے۔ یہ اقدام اور یہ خود اعتمادی فن کار کی سلامتی کی ضامن ہے۔ میرے خیال میں یہی ایک حقیقت ہے جو ایک فن کار کو دوسروں سے بلند کرتی ہے۔ جمود اور تنزل کو روکتی ہے تاکہ کوئی تخلیق کار اپنے فرائض سے کوتاہی نہ کرے۔

ہو فن کار کا زاویۂ نگاہ اس کے خاص انداز کا نام ہے جو اسے اندرونی اور بیرونی قوتوں کے ذیر اثر بچپن سے شباب اور شباب سے پختگی تک مختلف شکلوں میں حاصل ہوتا رہتا ہے اور وہ ہی بجا سمجھتا ہے کہ اختراع اور بغاوت اس کا موروثی حق ہے جوں جوں وہ اپنے پیشے اور فرائض کو نظر انداز تر کرتا چلا جاتا ہے سمجھتا ہے کہ اتنا

کا ہر ذرہ متاع امید ہے۔ اس پر دنیا کی نگاہ ہے۔ ہر قسم کے تجریدی رجحانات اس کے خون میں موجود ہیں تمام تخلیقی قوتیں اسے ودیعت کی گئی ہیں۔ وہ پیغمبر بن کر آیا ہے۔ کوئی ذاتی کمزوری اسے خود کو سمجھنے میں مدد نہیں دیتی۔ وہ ماحول میں وہ پرورش پا رہا ہے۔ جیسا ہونا چاہیئے کیوں ہونا چاہیئے۔ وہ اپنی قوت متخیلہ سے اپنی صلاحیتوں سے بڑی بڑی ناممکن صورتوں کو اپنے سانچہ میں ڈھال سکتا ہے کہ دنیا کو اس کی غیر معمولی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہو اس کے اپنے نزار سے اس کو اپنا ماحول خود بیگانہ سا محسوس ہوتا ہے وہ اپنے ماحول کو تنگ کی نگاہوں سے دیکھتا ہے جس سے اس کی بے اطمینانی ہر منزل پر بڑھتی چلی جاتی ہے بمعہ اس کی دشوار تسخیر اور تخلیق کے ـ!

ہمارے تجریدی فنکار جن کی طویل فہرست میں ہر روز ایک نئے تخلیق کار کا ایک نئے تجریدی مبصر کا اضافہ ہوتا رہتا ہے قابل غور ہے بعض کو اپنے مطالعہ کی کمی کا احساس ہے۔ بعض اپنی روز افزوں ترقی پر نازاں ہیں۔ بعض کے نمایاں جوہر جھکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مسٹر پرویز، مسٹر طرسٹ اکر، مسٹر اجمل حسین، مسٹر عنفد، چودھری رائے، مسٹر شمزہ، مسٹر آذر زوبی باوجود اپنی اپنی تکنیک کے آزاد ہیں۔ وہ اپنے استحکام کے لئے کسی کے محتاج نہیں۔ پاکستان کی عمر سے کم عمر ہے ان کی مگر پاکستان کی عمر سے بلند ہے ان کا فن اور ان کی افتاد — مسٹر سلطان، پروفیسر عسکری، مسٹر ناگی، مسٹر انوار الحق، مسٹر قمر الحسن، مسٹر شفیق احمد، مسٹر وحید، مسٹر علی امام، مسٹر امین السلام، مسٹر مبارک حسین، مسٹر سردار محمد۔ یہ دوسرا گروپ بھی پاکستان کے مستقبل کے لئے مبارک فال ہے۔ مسٹر زین العابدین، مسٹر شفیع الحق، مسٹر　　مسٹر عبدالرزاق اور مسٹر رشید چودھری سے مشرقی پاکستان کے آرٹ کی تحریک نہ صرف زندہ ہے بلکہ ان آرٹسٹوں کی اور اس گروپ کے دوسرے آرٹسٹوں کی ممنون منت بھی ہے۔ مسٹر زین العابدین مشرقی بنگال کے لیڈر ہیں اور وہ اپنی صلاحیتوں کے باوجود نئے راستوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں آج بہت ہی قابل ستائش عورتیں بھی ہیں جن کے وجود سے پاکستان کا آرٹ اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ان میں مس آغا زبیدہ ایک خاص وصف کی مالک ہیں۔ رضیہ سراج الدین، مس رضیہ فیروز الدین، ذکیہ نیل، مس عباسی، مس قریشی، اصغری منظور، مسز صغرا ربابی، مس نسیم انور، مس طاہرہ، مسز انور افضل[1] اپنی اپنی طرز نگارش سے پاکستان کے آرٹ کی ذمہ دار ہیں اور ان کے فن کی ہمارے دلوں میں جگہ ہے

ہمارے آرٹ میں ابھی ایسا شاندار انقلاب نہیں ہوا کہ ہم اپنے آرٹ کو ان قوموں کے مقابل کھڑا کر سکیں جن کی بدایوں کی طرف ہم نے بہت توجہ دی جنہیں اپنے قدیم اور تجریدی ہونے کا دعویٰ ہے۔ آرٹ اپنے مسلک اور اپنی صلاحیتوں سے عبارت کبھی قوم کی زندگی کا جز نہیں بنا اور نہ اس نے ان قوموں کی نظروں میں وہ درجہ حاصل کیا ہے جو اپنی روایات کی ترجمان اور اپنی تہذیب سے سرشار ہیں ہوتی۔

آرٹ قوم کا ورثہ بھی ہے اور ترکہ بھی ہے

(1) مس قرۃ العین حیدر کا نام بھی اس ضمن میں قابل تذکرہ ہے۔ — ص)

کلاسیکی موسیقی میں ترمیم کی گنجائش

شاہد احمد دہلوی

جس طرح ہماری شاعری اسلوبوں کی شاعری ہے۔ کہ اس میں قصیدہ، مرثیہ، رباعی، قطعہ، غزل اور نظم شامل ہیں اسی طرح ہماری موسیقی اسلوبوں کی موسیقی ہے اور اس میں الاپ، دھرپد، ٹپہ، خیال، ٹھمری، دادرا، غزل اور گیت شامل ہیں۔ یعنی اسلوبوں میں تبدیلی اور ترقی کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔ ان میں آزادی اور آزادہ روی صرف ایک حد تک اختیار کیجا سکتی ہے۔ ان کی تو خوبی ہی یہ ہے کہ ان کے مقررہ اصولوں کی پابندی کی جائے۔ کسی فن سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ سننے اور دیکھنے والا اس فن کے اصولوں سے خود بھی واقفیت رکھتا ہو۔ ہم غزل سے اس لئے لطف اٹھاتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ غزل کا ڈھنگ کیا ہوتا ہے۔ اس کے مضامین کیسے ہوتے ہیں۔ بحر، ردیف اور قافیہ کیا ہوتا ہے۔ جب ہم یہ شعر سنتے ہیں کہ:- ؎

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا
اسے آہ دامن باد نے سر شام ہی سے بجھا دیا۔

تو بے کسی اور بے بسی، حسرت و یاس، مظلومی و محرومی کی ایک دردناک تصویر ہمارے ذہن میں ابھرتی ہے مگر جب یہی شعر کوئی فرنگی سنتا ہے تو اسے نہ صرف اس شعر میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی بلکہ وہ حیران ہو کر پوچھتا ہے کہ "مرنے کے بعد قبر میں سے مردہ کیسے بولنے لگا۔؟"۔ ہماری غزل کی روایت یہ ہے کہ مرنے کے بعد بھی نامراد عاشق شکوہ کرتا رہتا ہے اور ہمارا خالص مشرقی مزاج اس کی بعد مرگ محرومی پر اور بھی زیادہ ہمدردی پر مائل ہوتا ہے ہر چند کہ مردے کا بولنا صریحاً خلاف حقیقت ہے پھر بھی ہم اسے ایک مسلمہ صداقت سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ ہماری غزل کی یہی روایت ہے اور اسے تسلیم کرنے کی ہم نے غزل گو شاعر سے مفاہمت کر لی ہے اس لئے نہ صرف یہ مفروضہ ہمیں ناگوار نہیں گزرتا بلکہ ہمارے لطیف احساسات کو بیدار کر کے ہماری تسکین کا باعث بنتا ہے۔ یہی کیفیت ہمارے مجرد تصویر سازی کے فن کی ہے کہ جب تک آپ میں تجریدی فن کا پس منظر موجود نہ ہو آپ اس سے کما حقہ لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ جب آپ سے کہا جاتا ہے کہ اب ایک غزل سنیئے تو آپ کے ذہن میں فوراً ایک اسلوب ابھر آتا ہے اور آپ کی چند توقعات قائم ہو جاتی ہیں اور ان ہی کی تکمیل سے آپ کو حظ حاصل ہوتا ہے۔ فن کو منطقی استدلال کی کسوٹی پر نہیں کسا جاتا بلکہ فن لطیف ہوتا ہی

اسلئے ہے کہ اس میں محض جذباتی پہلو ہوتا ہے اور حقائق سے گریز ہوتی ہے۔ تجریدی مصور چند آڑے ترچھے خطوط سے جہان معنی پیدا کر دیتا ہے۔ شاعر ایک شعر سے طلسمات کے دروازے کھول دیتا ہے اور موسیقار سُروں کے مخصوص امتزاج سے جذبات کو زیر و زبر کر دیتا ہے

ہماری موسیقی اسلوبوں کی موسیقی ہے۔ جب ہم دھرپد کا نام لیتے ہیں تو عظیم تصورات ہمارے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ موسیقار سے ہم بجا توقع وابستہ کر لیتے ہیں کہ وہ جلال و جمال کی ایک پر شکوہ موسیقانہ تصویر ہمارے سامنے پیش کریگا۔ ——————— اس میں حمد، نعت، منقبت یا کسی بزرگ یا عظیم ——— انسان کا جاہ و جلال پیش کرے گا۔ اور اس انداز سے پیش کرے گا کہ اس کی سرخوشی سے ہماری روح میں اہتزاز پیدا ہو جائے گا۔ "خیال" کے لفظ کے ساتھ بھی ایسے ہی تصورات بروئے کار آتے ہیں۔ منجملہ دھرپد کی صفات کے خیال میں تانوں کا تانا بانا ایک ایسا جال بن دیتا ہے جس میں سامع کا تخیل الجھ کر انبساطی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ تانوں کی تدریجی تیزی ضبات تلب اور گردشِ خوں میں ایک لطیف تاثر پیدا کر دیتی ہے۔

اور جب ہم "ٹھمری" کا نام سنتے ہیں تو حسن بسیط ایک لطیف پیکر میں ڈھلنے لگتا ہے جسن سے بڑھکر اور کیا صداقت ہو سکتی ہے اور یہ حسن، یہ صداقت ہمارے دلوں کو موہ لیتی ہے۔ روح نکھرنے لگتی ہے اور ایک طلسماتی پیکر بہ انداز دلربائی پیش نظر ہو جاتا ہے۔

کلاسیکی فن کی عظمت کا راز یہی ہے کہ قدیم ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ نیا نظر آتا ہے۔ شکسپیر اس لئے عظیم ہے کہ اس کے ڈرامے جب بھی آپ پڑھتے ہیں آپ کو نیا لطف حاصل ہوتا ہے۔ رفائیل کے شاہکار اس لیے عظیم ہیں کہ ان کا آب و رنگ آج بھی آپ کی آنکھوں میں کھبا جاتا ہے۔ فردوسی کا ہزار سالہ شاہنامہ آج بھی ہم سے اپنی عظمت کا لوہا منوا رہا ہے۔ ماضی کے دھندلکے ہماری کلاسیکی موسیقی کی دلپذیری کو مدھم نہ کرسکے جدید موسیقی اپنی ہر دلعزیزی کے باوجود کلاسیکی موسیقی کے سر سے تاج نہ اتار سکی۔ صدیوں کی گرد اس کے رخ کا غازہ بن گئی۔

کلاسیکی فن مکمل فن ہوتا ہے اور جو چیز مکمل ہو اس کی تکمیل، ترمیم یا اس میں اضافے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ فولادی سانچے گھٹا بڑھا نہیں کرتے۔ ان میں فن ڈھلتا رہتا ہے اگر کوئی پرزہ ناقص رہ جاتا ہے تو اسے سانچے کا قصور نہیں کہہ سکتے۔ صدیوں سے دھرپد، خیال، ٹھمریاں ڈھلتی چلی آرہی ہیں۔ اگر ان میں کوئی ناقص ہے تو اسے خارج کیا جا سکتا ہے۔ حشو و زوائد سے پاک کرنا بھی حسن کو بڑھاتا ہے۔ ہماری کلاسیکی موسیقی میں بھی بعض رسمی خرابیاں آگئی ہیں۔ اگر انہیں نکال دیا جائے تو اس کا حسن نکھر جاتا ہے۔ مثلاً آج فنکاروں نے کلاسیکی موسیقی کے رس کو بہت کچھ نظر انداز کر دیا ہے اور صرف اسلوب کی پیروی اختیار کر لی ہے۔ اس لئے ہمارا فن ایک جسد بے روح بنتا جا رہا ہے۔ فنکاروں کی ضرورت سے زیادہ روایت پرستی سے بھی ہمارے کلاسیکی فن کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ جو چیز زمانے کا ساتھ نہیں دیتی وہ نامطبوع ہو جاتی ہے۔ سانچے تو بدلے ہی نہیں جا سکتے مگر ہم خام مواد کو بدل سکتے ہیں اور اسے حسب ضرورت بدل بھی دینا چاہیئے۔ مثلاً خیال کے وہ بول جواب سے دو اڑھائی سو سال پہلے گائے جاتے تھے انھیں آج بھی گلانے کے بجائے ہم آج کل کے قطعے اور رباعیاں گا سکتے ہیں۔ اُس زمانے کی باتیں اُسی زمانے میں بھلی لگتی تھیں اب وہ بے معنی ہو گئی ہیں۔ مثلاً درباری کا یہ خیال :-

مالنیا بندھنوا۔ باندھوری باندھو۔ سب مل کر مالنیا بندھنوا

سدا رنگیلے محمد شاہ گھر کا رج۔ آج — مالنیا بندھنوا۔

اس زمانے میں محمد شاہ بادشاہ دہلی کے غسل صحت کا گانا ایک عجیب مضحکہ نظر آتا ہے۔ اس کے بدلے اگر ہم علامہ اقبال کا یہ قطعہ درباری میں گائیں تو زیادہ بامعنی اور اثر انگیز ثابت ہوگا۔

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے	بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم	بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

"خیال" کی گائیکی میں صرف بولوں کی ترمیم ہو سکتی ہے اور یہ ترمیم مناسب اور بہتر ہوگی۔ باقی خیال کی گائیکی کا وہی طریقہ رہنے کا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہم اپنی کلاسیکی موسیقی کے دوسرے اسلوبوں میں بھی بولوں کی تبدیلی کر سکتے ہیں اور انھیں موجودہ زمانے کے تقاضوں سے زیادہ قریب لا سکتے ہیں۔

ڈرامہ میں مکالمہ کی اہمیت

سید بادشاہ حسین

مؤرخین اور ناقدین ادب جانتے ہیں کہ ڈراما مختلف اصناف کے ایک ایسے خوشگوار امتزاج کا نتیجہ ہے کہ جس کے اعتدال سے اس میں محاسن پیدا ہوتے ہیں اور جس کے انتشار سے اس میں معائب رونما ہوتے ہیں۔ پلاٹ۔ مکالمہ اور کردار اس کے ارکان ثلاثہ ہیں جن کی موزوں و مناسب نشو و نما کے لئے ماہرانہ چابکدستی، وسیع مشاہدہ، و عمیق تاثرات کی ضرورت ہے۔ ایک اچھے ڈرامے کی تخلیق اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ مصنف کو نہ صرف ان تینوں لوازمات پر انفرادیانہ قابو حاصل ہو بلکہ ان کے صحیح اجتماعی امتزاج کا سلیقہ بھی ہو۔ اسی وجہ سے ادبیات عالم کی تاریخ میں اچھے ڈراموں کی اتنی کثرت نہیں جتنی کہ افسانوں، ناولوں اور نظموں کی ہے۔ ڈرامانگار کی مشکلات یہیں ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ پیشکش کا ایک اور مرحلہ باقی رہتا ہے جو کہ بذاتِ خود ایک مستقل اور وسیع فن ہے۔ ڈرامہ کا صحیح لطف کتابی صورت میں نہیں بلکہ پیشکش میں مضمر ہے اس لئے ڈراما اور پیشکش کا تعلق چولی دامن کا سا ہے۔

ڈرامے کے ان تینوں ارکان اور پیشکش پر بحث کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی وسعت ضروری ہے۔ اس مضمون میں صرف ڈرامہ میں مکالمہ کی اہمیت کو واضح کرنا مقصود ہے۔ ڈرامہ کے ایک مشہور ناقد کا قول ہے کہ مکالمہ ایک ایسا طفل ہے جو کردار کے سلب اور موقع کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اس نومولود کی کامیابی اس کی تربیت۔ دیکھ بھال اور پرورش پر منحصر ہے اگر نشو و نما کے موزوں مواقع فراہم نہ کئے گئے تو یہ طفل پروان نہیں چڑھیگا اسی خوبیوں سے ڈرامے میں چار چاند لگتے ہیں اور اسی کی غلطیوں سے ڈرامے کی ناکامی قطعی ہوتی ہے اسلئے ایک حد تک یہ کہنا نامناسب ہو گا کہ ڈرامے کی کامیابی کا دار و مدار مکالمہ پر ہے۔

مصنف کی شخصیت

ڈرامہ نگار شاعر کی طرح مختلف موضوعات میں سے ایک موضوع کا انتخاب اپنے رجحان طبع کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہے اور کبھی داخلی اثرات کو اجاگر کرتا ہے جو اس کی "واردات قلب" ہوتی ہے اور کبھی خارجی تاثرات کی جھلک پیش کرتا ہے جو اس کے مشاہدات کا نچوڑ ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کی شخصیت کا شدید تصادم کردار اور موقع سے بھی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض دفعہ ڈرامانگار کردار کی زبان سے خود بولنے لگتا ہے اور بعض دفعہ کردار موقع کا لحاظ کرتے ہوئے اظہار خیال میں آزاد ہوتے ہیں۔ یہ تصادم افسانوں میں بھی اکثر نظر آتا ہے لیکن ڈرامے کی پیشکش میں یہ نسبتاً زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ برناڈ شا کے اکثر خود مصنف کی ترجمانی کرتے دکھائی دیں گے ان کا مزاج اور طنز، نکتہ چینی اور صاف گوئی شا کی ذات کی غمازی کرتی نظر آئیگی۔ بہرحال عام طور پر مصنف کا تسلط زیادہ تر مسئلہ خیز ڈراموں میں دکھائی دیگا ورنہ بالعموم ڈرامہ نگار مناسب موقع کردار

سے اظہار خیال کو ترجیح دیتا ہے۔

مکالمہ کی موزونیت

موزوں اور مناسب مکالمہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ فضا اور ماحول سے ڈرامہ نگار کا اتنا قریب ہونا ضروری ہے کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہ رہ سکے اور ذرا بھی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ رہن سہن کے طریقے بول چال کا لب ولہجہ، خاص مسائل پر رجحانات، اقتصادی پوزیشن غرض زندگی کے جملہ پہلو سے مصنف اس طرح واقف ہو کہ گویا خود بھی اسی فضا اور ماحول میں سانس لے رہا ہے برناڈشا کا دعوی تھا کہ لندن کے چالیس میل اردگرد کی سماجی اور لسانی زندگی سے وہ ایسا واقف تھا کہ محض عادات واطوار اور لب ولہجہ سے وہ بتا سکتا کہ کون کہاں کا اور کس گروہ کا ہے۔ اس قدر عبور اور آگاہی کی ضرورت اس لئے بیشتر آتی ہے مکالمہ میں کردار کی خصوصیات کو اجاگر کرنا، کردار کے لب ولہجہ کی پابندی کرنا، اختصار کا خیال رکھنا، بے ضرورت اور بے موقع مباحث نہ پیدا کرنا، صحیح روزمرہ استعمال کرنا بہت ضروری ہوتا ہے اس کے سوا ایکٹنگ کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے مثلاً ایسا مکالمہ یا مکالمہ کا ایسا انداز اختیار نہ کرنا جس سے اداکاری میں دشواری پیدا ہو کافی اہمیت رکھتا ہے

کردار کی خصوصیات

ڈراموں کی ایک قسم ایسی ہے جس کو کرداری ڈرامے کہا جا سکتا ہے میری مراد ایسے ڈراموں سے ہے جن میں مسز مالا پراپ، فال اسٹاف، ڈاکٹر اسٹاک من، ٹارٹف وغیرہ جیسے کردار پیش کئے گئے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے کردار ڈرامے میں اتنے اہم اور اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ پلاٹ اور دوسرے کردار ان کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں اور لوگوں کی توجہ ان پر ہی مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ ڈرامہ نگار کو ان کی نشو و نما میں اور ان کا مکالمہ لکھنے میں بڑی احتیاط اور مہارت دکھانی پڑتی ہے کیونکہ ان کے بارے میں ذرا سی لغزش اور غلطی لوگوں پر بہت بار گزرتی ہے۔

اس قسم کے کرداروں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ کوئی کردار المیہ ہوتا ہے کوئی طربیہ اور کوئی طنز و مزاح کا بولتا مجسمہ ہوتا ہے۔ فال اسٹاپ مسز مالا پراپ مزاحیہ کردار ہیں جو لوگوں کو ہنساتے اور خوب ہنساتے ہیں۔ لوگوں کی توقع یہ ہوتی ہے ان کا ہر جملہ ایک لطیفہ ہو اور ان کا ہر فقرہ مزاح سے بھرپور ہو۔ اس میں ذرا بھی کمی ان کو اکتا دیتی ہے۔ اسی طرح مولیر کو ٹارٹف کی نشو و نما میں بڑی احتیاط اور بڑی چابکدستی برتنی پڑی ابسن کے کردار ڈاکٹر اسٹاک من کا بھی یہی حال ہے۔ بہر طور کردار کی وضع کو نباہنا ڈرامہ نگار کا اولین فرض ہے۔

کردار کی زبان

کردار سماج کا ایک ایسا نمونہ ہوتا ہے اور وہ اپنے پیشہ، طبقہ اور مقام کی نمائندگی اور ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً دولت مندوں کا ایک طبقہ ہے اس میں بھی کچھ پشتینی رئیس ہوں گے۔ کچھ نو دولتئے، کچھ متوسط درجہ کے اور کچھ غریب امیروں کے ٹھاٹھ بھی جدا جدا ہوں گے بعض آبائی روایتوں پر کاربند ہوں گے اور بعض نئی تہذیب کے دلدادہ۔ ان میں بھی تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ الگ ہوں گے۔ بہر حال امیروں کے طبقہ میں بھی الگ الگ گروہ ہوں گے۔ ان کی ذہنیت، ان کا تمدن۔ ان کی معاشرت، بود و باش اور خیالات اور رجحانات میں فرق ہوگا اور اسی فرق کو وہ اپنے کردار اور مکالمہ میں ظاہر کریں گے۔

اس کے سوا افراد سماج پیشوں میں بھی تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ وکیل لسنتاً باتونی ہوگا اور قانون کا اطلاق زندگی کے ہر شعبہ پر کرے گا، پروفیسر اپنی علمیت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکیگا۔ تاجر اپنی کاروباری ذہنیت کو چھپا نہ سکے گا۔ مزدوروں کی بول چال ان کی اپنی خاص ہوگی۔ شاعر تخیلات کی دنیا سے علیحدہ نہ ہو سکے گا۔ لیڈروں اور صحافیوں کی ہر تان عوام پر ٹوٹے گی۔ مولوی کی نصیحت خشک ہوگی جس میں خدا کا خوف، جنت کی ترغیب اور ملا کی رہنمائی حاصل کلام ہوگی۔

مقام اور ماحول کا بھی اثر مکالمہ پر پڑتا ہے۔ لب ولہجہ اور روزمرہ ہر مقام کا الگ الگ ہوتا ہے۔ شریڈن کا ڈرامہ "دو رقیب" اس کی عمدہ مثال ہے۔ انگلستان میں اسکاٹ لینڈ ویلس، اور آئرلینڈ کے لہجوں اور روزمرہ میں نمایاں فرق ہے۔ شریڈن نے اپنے اس ڈرامے میں اسی فرق کو واضح کر کے مزاح پیدا کیا ہے۔ ہندوستان میں یہ فرق لکھنؤ، دہلی، دکن اور پنجاب کے الگ الگ لہجوں سے پیدا کیا جا سکتا ہے اور پاکستان میں سندھی، پنجابی اور یوپی، والوں کے لہجوں سے واضح ہو سکتا ہے۔ بعض دفعہ تو بول چال اور لہجوں سے کردار کے ماحول کا پتہ چلتا ہے اس لئے ڈرامہ نگار کو ان کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اردو کے قدیم ڈراموں میں جو ناٹک کمپنیوں کے لئے لکھے جاتے تھے ان باتوں کا خیال نہیں رکھا گیا اور بلا لحاظ طبقہ و پیشہ اور مقام ایک ہی قسم کی زبان مکالموں میں استعمال کی گئی جس کی وجہ سے مرزا ہادی رسوا لکھنوی کو کہنا پڑا کہ ان کی زبان "مچھلی بازار کی ہے"، دراصل ان باتوں کا لحاظ رکھنے سے ڈرامہ نگار کو کردار کی نشوونما میں بڑی مدد ملتی ہے اور ڈرامہ کا پس منظر ناظرین اور قارئین کے ذہن نشین ہوتا ہے۔

اس کے سوا مکالمہ کی زبان کرداروں کی عمر پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ نو عمر بچے کی زبان وہ نہیں ہونی چاہئے جو کہ ایک تعلیم یافتہ جوان یا پختہ کار اور عالم بوڑھے کی زبان ہو سکتی ہے اگر اس فرق کو پیش نظر نہ رکھا گیا تو مکالمہ غیر فطری اور غیر حقیقی معلوم ہوگا۔ مسائل پر اظہار خیال کے وقت بھی عمر، علم اور تجربہ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ کردار اپنی زبان کی بجائے دوسروں کی زبان سے بولے گا۔ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن پر بچوں، جاہلوں اور ناتجربہ کار عوام کا اظہار خیال نہ تو مناسب ہے اور نہ انھیں زیب دیتا ہے اس لئے ڈرامہ نگار کو اس کا علم بخوبی ہونا چاہئے کہ کونسی بات کس سے کہلوائے۔ طنز و مزاح میں تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کارخانہ دار سے طب پر اظہار خیال کروائے لیکن سنجیدہ موقع پر یہ چیز نامناسب ہوگی۔

مزاح کا ذکر آیا ہے تو اس کی دو قسمیں طنز اور تضحیک کا بھی حال سن لیجئے۔ برنارڈ شا طنز کا ماہر تھا اور اس سلسلہ میں اس کا مکالمہ تیر و نشتر کا کام کرتا تھا۔ ڈاکٹر کی الجھن میں طنز کے جو تیر اس نے برسائے ہیں ان سے انگلستان کے ڈاکٹروں نے پناہ مانگی۔ جب اس کا ڈرامہ شائع ہوا تو اس طبقہ میں ایک ہلچل مچی اور میڈیکل ایسوسی ایشن نے یہ تصفیہ کیا کہ کوئی ڈاکٹر اس کا علاج نہ کرے۔ شا کو اس کی خبر ہوئی۔ اس نے بیماری کا بہانہ کیا اور اپنے ڈاکٹر کو بلا بھیجا لیکن اس نے ایسوسی ایشن کے فیصلہ کا ذکر کرتے ہوئے معذرت چاہی۔ شا نے شاہ انگلستان کو خط لکھا کہ وہ بیمار ہے اور ڈاکٹر اس کا علاج کرنے سے انکار کرتے ہیں اگر وہ خدا نخواستہ مرگیا تو انگلستان مر جائے گا۔ جارج پنجم نے وزیر اعظم سے کہا کہ شا کے علاج کا بندوبست کر دیا جائے۔ اپنے اثرات کو استعمال کر کے وزیر اعظم نے ایسوسی ایشن کو اپنا فیصلہ واپس لینے کی ترغیب دی۔ ڈاکٹر علاج کے لئے شا کے پاس گئے۔ اس نے کئی ماہرین کو طلب کیا۔ سب کی متفقہ رائے سے نسخہ تجویز ہوا لیکن شا نے دوا پینے سے انکار کیا یہ کہہ کر کہ حقیقتاً وہ بیمار نہیں ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹروں کی تشخیص کس حد تک حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔

تضحیک کی مثال مولیئر کا ڈرامہ "نکاح بالجبر" ہے۔ تضحیک میں غلو سے کام تو لیا جاتا ہے اور واقعہ پر رنگ آمیزی کی جاتی ہے لیکن کچھ اس طرح کہ حقیقت بالکل چھپ نہ جائے طنز اور تضحیک تاثرات کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن اس کا استعمال مکالمہ میں بڑی مہارت اور چابکدستی چاہتا ہے کیونکہ مزاح اور ابتذال میں فاصلہ بہت تھوڑا سا ہے۔ ابتذال کی مثالیں ہمارے پرانے ڈراموں میں بہ کثرت ملتی ہیں جن کو اس زمانے کے ڈرامہ نگار اور پیش کنندہ عوام کا مذاق کہتے رہے ہیں۔ یہی وبا ہماری فلموں میں آج تک جاری ہے۔

مزاحیہ ڈراموں کی ایک اور قسم بھی ہے جس کو انگریزی میں "فارس" کہا جاتا ہے اس میں عام طور پر واقعات بھی مضحکہ خیز ہوتے ہیں اور پلاٹ کی بنیاد بھی ایک طرح سے "بے بنیاد" ہوتی ہے جس سے ڈرامہ ایک ہنسنے ہنسانے کی چیز ہو جاتا ہے۔ اس کا مکالمہ شوکت تھانوی کے قاضی جی قسم کے ڈراموں، امتیاز علی تاج کے چچا چھکن قسم کے افسانوں اور چراغ حسن حسرت مرحوم کے حرف و حکایت جیسے فقروں کا انداز ہوتا ہے۔

اختصار ڈرامہ کے مکالمہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مختصر ترین ہوں ایسے کہ اس سے زیادہ اختصار مطلب کو واضح کرنے کے لئے ناممکن ہو جائے جس طرح شاعری میں صنف غزل میں اختصار ضروری ہے اور شاعر کو دو مصرعوں میں اپنا پورا مطلب بیان کر دینا پڑتا ہے اسی طرح ڈرامے کے مکالمہ کے لئے اجمال و اختصار لازمی ہیں۔ کوئی جملہ بے ضرورت اور کوئی فقرہ بیکار نہ ہو۔ فن انشا میں مختصر نگاری سب سے مشکل صنعت تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے لئے ... جب تک کلام و بیان پر پوری قدرت اور الفاظ کے صحیح مفہوم و معنی سے کماحقہٗ واقفیت نہ ہو اختصار نگاری کی خوبیاں واضح نہیں ہو سکتیں۔

ڈرامہ میں اختصار نگاری کو پیش نظر رکھنے کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے اول یہ کہ ڈرامہ اسٹیج کے لئے لکھا جاتا ہے اور تماشہ کا وقت معین ہوتا ہے طول کلامی سے پیشکش کا وقت بڑھ جاتا ہے جس سے تماشائی اکتا جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ڈرامہ کی فنی خوبیاں مکالمہ کی طوالت کی وجہ سے ناس

ہوجاتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ اداکاری کی راہ میں طویل مکالمے دشواریاں پیدا کرتے ہیں کیونکہ اداکار کا کام صرف یہی نہیں ہوتا کہ مکالمہ کے الفاظ طوطے کی طرح دہرائے بلکہ الفاظ کو حرکات میں تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ طوالت کی وجہ سے فقروں اور جملوں میں چستی اور چمک باقی نہیں رہتی۔ پانچویں یہ کہ طویل مکالمے گفتگو کا انداز نہیں بلکہ تقریر کی طرز اختیار کر لیتے ہیں۔ چھٹے یہ کہ موضوع زیر بحث الجھنوں میں پڑ جاتا ہے۔

طویل مکالموں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ برنارڈ شا کے اعزاز میں انگلستان نے "مالورن فیسٹول" منائے اور اس تقریب کے موقع پر شا سے درخواست کی گئی کہ وہ ایک نیا ڈرامہ لکھے۔ اس نے "دی ایپل کارٹ" لکھا اور اس منتخب مجمع کے آگے پیش کیا جس میں دنیا بھر کے نقاد، ادیب اور مصنف موجود تھے۔ ڈرامہ شروع ہوا پہلا ایکٹ ختم ہوتے ہوتے ایک گھنٹہ اور بیس منٹ گذر گئے۔ اس ایکٹ میں ایک کردار کی ایک تقریر پندرہ منٹ کی تھی۔ جب یہ طویل ڈرامہ ختم ہوا تو شا کو ایک مختصر سی تقریر کے لئے اسٹیج پر بلوایا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے خوش ہے کہ دنیا بھر کے ناقد، ادیب اور مصنف اس مجمع میں موجود ہیں اور ان سبھوں نے اس کا ڈرامہ شروع سے آخر تک دلچسپی اور انہماک کے ساتھ دیکھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سبھوں نے اسے بہت پسند بھی کیا لیکن وہ ان سب کے سامنے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ اگر یہی ڈرامہ شیکسپیر کا ہوتا تو آدھے گھنٹہ کے اندر تھیٹر خالی ہو جاتا۔ یہ شرف صرف شا ہی کو حاصل ہے کہ اس کا بدترین ڈرامہ بھی پوری توجہ اور دلچسپی کا مرکز ہوتا ہے۔

یہاں اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ جدید طرز میں افتتاحیہ، اختتامیہ یا خود کلامی کا رواج باقی نہیں رہا۔ اس کے سوا سہیلیوں کا گانا یا نظم میں سوال و جواب بھی مذاق پارینہ ہو کر رہ گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں ظاہر ہے کہ مکالمہ کی اہمیت اور زیادہ ہو گئی ....

.... بات بات پر شعر پڑھنا اور قافیہ پیمائی سے کام لینا بھی متروک ہو گیا۔ ان سب کی جگہ چاق و چوبند روز مرہ نے لے لی۔ اس لئے اب مکالمہ نویسی جاہل منشیوں کے بس کی نہیں رہی بلکہ اہل زبان اور صاحب علم مصنف کا کمال چاہتی ہے۔

اداکار کی سہولتوں کا خیال

مکالمہ میں اداکار کی سہولتوں کا بھی خیال رکھنا ازبس ضروری ہے وہی الفاظ اور فقرے اسی طرز میں لکھے جائیں کہ جن کو اداکار فطری انداز میں بہ آسانی اور بغیر کسی تصنع کے بول سکے۔ منظوم مکالمہ اور شعر خوانی کی وجہ سے اداکاری میں جو تصنع پیدا ہوتا ہے اس کی عمدہ مثالیں قدیم اردو ڈراموں میں بکثرت ملتی ہیں۔ حقیقی زندگی میں افراد سماج گفتگو نظم میں نہیں کرتے خطابت کا انداز اختیار کرتے ہیں مقفیٰ اور مسجع مکالمے بھی اداکار کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ اس کے سوا اس طرز کے مکالموں میں حرکات و سکنات بے ربط اور بے معنی ہو جاتے ہیں۔ بہرحال تصنع کو الگ کرنے کے بعد سماج کی صحیح تصویر روز مرہ کی گفتگو ہی کے ذریعہ کھینچی جا سکتی ہے۔

اسلامی ادب

پروفیسر حنیف شوق

اسلامی ادب کے دعوے نے کچھ حلقوں کو برہم اور اکثر کو پرجوش بنا دیا ہے لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ ایک مٹتے ہوئے سماجی نظام نے مذہب کا سہارا ڈھونڈا ہی اور بسم اللہ کے گنبد میں پناہ لینے کے لئے خرقۂ سالوس اوڑھ لیا ہے لیکن یہ پناہ خواہی خارجی زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے جسے نظر انداز کر دینے کی کوشش بھی ایک غلط رجحان کی پیداوار ہے۔ ہاں اس ادبی ہیجان کا مطالعہ تاریخی شواہد اور عملی زندگی کی صورتوں کے پیش نظر کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ پھر یہ بحث اتنی آسان بھی نہیں کہ بیان فسانے کی دل آویزی یا مناظرے کی گرما گرمی کام آسکے۔ آج کے سماجی تقاضوں کے ساتھ ساتھ آرٹ مذہب کلچر اور تاریخ کی ماہیت و سرمایے پر نظر رکھے بغیر اس موضوع پر کچھ کہنا اندھیرے میں تیر چلانے سے زیادہ نہیں۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلامی ادب کا دعویٰ سماج کے کن رجحانات کی غمازی کرتا ہے؟ اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ اس دعوے سے ماحول کے مثبت عناصر کو تقویت ملتی ہے یا منفی تحریکات کو فروغ ہوتا ہے؟ انسانی افکار کا مطالعہ سماجی محرکات کی روشنی میں ہی کیا جا سکتا ہے چنانچہ ہمارے سماج میں اسلامی ادب کی اٹھتی ہوئی آواز ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ کچھ لوگوں کے لئے یہ نعرہ ایک ذہنی حقیقت بن چکا ہے جس کی تصوریت کا چراغ عصر حاضر کے ہنگاموں نے روشن کیا ہے۔ اس روشنی میں تاریخی قوتوں کی کشمکش صاف نظر آتی ہے۔ در اصل مشینوں کے عمل نے انسان کا اعمال نامہ بدل دیا۔ صنعتی انقلاب نے نہ صرف پیداوار کے نئے ذرائع قائم کئے بلکہ ان رابطوں نے تہذیب کے قصر کی نئی مینا کاری بھی کی۔ لیکن رفتہ رفتہ اقتصادی رشتوں کے ساتھ ساتھ انسانی تعلقات بھی الجھتے گئے۔ اس نظام کا تضاد نمایاں ہوتا گیا اور اس تہذیب کی چمک ماند پڑتی گئی۔ اس زوال کا اثر قصر تہذیب کے چند گوشوں کے انہدام تک محدود نہیں رہا بلکہ ہمارے افکار ذہنی تک وسیع ہو گیا۔ اس لئے کسی بحث کا آغاز کرتے ہوئے ایک عصر کے ذرائع پیداوار کا اس عہد کی تہذیبی سرگرمیوں سے جو رشتہ ہے اسے بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ نئے اقتصادی رابطوں کی تلاش میں سرگرداں انسان کو کہنہ تہذیب کے کئی عناصر سے برسر پیکار ہونا پڑا۔ ادھر خود اپنے اندرونی خلفشار کی وجہ سے پرانی تہذیب کے قلعہ میں پھوٹ پڑ گئی۔ آج دو جنگوں کے بوجھ سے خمیدہ انسانیت مستقبل کی جانب ہراساں نظروں سے دیکھ رہی ہو اور اسے بعض اوقات موہوم سہارا بھی خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ ان حالات میں نئی آوازیں ساحرانہ کشش رکھتی ہیں اور کوہ ندا کی طرح سننے والوں کو اپنی جانب کھینچ لاتی ہیں۔ لیکن ان آوازوں کی سحر کاری اور ان تصورات کی داخلی رنگینی میں واقعات اور سیاسیات کی آمیزش اور عصر حاضر کی تاریخی قوتوں کی آویزش نمایاں ہے۔ ہمارا کام اس آویزش کو سمجھنا اور اس آویزش کا جائزہ لینا ہے جس نے اسلامی ادب کے

تصور میں رنگ بھرا ہے۔ ادیب کا نظریۂ حیات اس کی پرداز فکر اور اس کا طرز بیان، زندگی کے تانے بانے سے الجھے ہوئے ہیں۔ اس پیچ سماجی محرکات کو نظر انداز کر کے ادبی تحریکوں پر عامیانہ آرائی و خیال بحثی کی اٹھان ہو تو جو حقیقت نگاری کا طریقہ کار نہیں، چنانچہ اسلامی ادب کے سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائنٹفک طریق کار سے الگ ہو کر یہ بحث چٹ پٹے جملوں کی پوٹ اور الزامی دعووں کا انبار ہو کر رہ گئی ہے جسے صحیح تحقیق سے کوئی علاقہ نہ رہا۔

انسان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہو کہ وہ ماضی کی روایات کا وارث رہا ہے۔ ارتقا کے عمل نے اسے کائنات کے سمعیوں پر محیط وعظیم تجربوں کا تسلسل بخشا ہے۔ دراصل فطرت کے حیاتیاتی سلسلے میں انسان ایک نئی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ انسان ہی تھا جس نے اوزاروں کے استعمال سے فطرت کی تسخیر کا آغاز کیا اور آخر کار تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی۔ اس میں شک نہیں کہ وحشت و بربریت کے راستوں سے تہذیب کی منزل تک پہنچا ہے۔ خوراک کی تلاش نے سے مدید پھرایا ہے لیکن انسان کی ترقی کا یہ سلسلہ آگ کی دریافت، پتھر کلمان کی ایجاد، مٹی اور لکڑی کے برتنوں کے استعمال، زرعی ذرائع پیداوار اور زبان کی باقاعدہ تدوین، پھر سب سے بڑھ کر سماجی اداروں کی تنظیم تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام عرصہ میں خواہ وہ خانہ بدوشی کا ہو یا زرعی آبادکار سماج سے اس کا رابطہ استوار رہا ہے۔ لیکن جب کبھی سماجی تنظیم کی قائم کی ہوئی صورتیں "پیر تسمہ پا" کی مانند آگے بڑھنے میں فراحم ہونے لگیں تو یا تو وہ مخصوص تہذیب مٹ گئی یا اس نے یہی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں۔ ایسی صورت میں کہ جب انسان —— یا زیادہ صحیح لفظوں میں —— انسانوں کے گروہ نے فطرت کو برابر سماجی ضروریات کے سانچے میں ڈھالا ہو فطری انسان (Naturmensch) کا تصور بعض مفکرین کی دماغی اپج سے زیادہ نہیں رہتا۔ جہاں انسان نے ماضی کے کارناموں اور تمدنی روایات کی روشنی میں حال کی تعبیر کی ہو وہاں انسانی ذہن نے خارجی حالات کے پیش نظر حیات و کائنات کی گتھی کو بارہا سلجھانے کی کوشش بھی کی ہو۔ لیکن جس طرح عالم فطرت میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اس اختلاف سے ہمیں مطالعۂ فطرت میں مدد ملتی ہو اسی طرح انسانی گروہوں کے تصورات بھی مختلف ہوتے ہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود مخصوص حالات میں جو باتیں اقدار مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں وہ یقیناً گہری معنویت کی حامل ہیں۔ ان سے یہ بات تو ظاہر ہو ہی جاتی ہو کہ تصور حیات و کائنات محض انفرادی تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ یہ بھی پھیلتے ہوئے سماج کے ارتقا کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ہو اور اس طرح یہ زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق انسانی علم سے ہم آہنگ ہے۔

یہاں ابتدائی عہد کے انسانوں کے عقاید یا توہمات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان کے دیویوں اور دیوتاؤں کے متعلق تصورات فطرت کے مختلف مظاہر کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن انھیں محض دریاؤں، پہاڑوں یا میدانوں کا عکس سمجھ لینا حقیقت کی غلط تاویل ہو۔ یہ دیوتا پیداوار کے عمل سے براہ راست تعلق رکھنے کے سبب سے سماجی زندگی کی جیتی جاگتی حقیقت بن گئے تھے۔ ہندوستان کی لہلہاتی ہوئی سرزمین نے وشنو، ادشا، پرتھوی، اگنی، وایو اور اندرا جیسے ذہنی پیکر تراشے ان پیداواری عمل سے براہ راست تعلق رکھنے والے دیوی دیوتاؤں نے آریائی تہذیب کے ایوانوں کو جگمگا دیا۔ یہ مافوق الفطرت طاقتیں ایک جانب انسانی نفس کی بے پناہ قوت کا اظہار ہیں اور دوسری جانب اس کی خواہشات کی کارفرمائیوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ برہما اور رودر تخلیق و تخریب کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں اور انسانی ذہن کی نسبتاً ترقی یافتہ شکلیں ہیں چنانچہ "رگ وید" کے آخر کے بھجنوں میں (جس کا شمار انسانی ذہن کی قدیم ترین دستاویزوں میں ہوتا ہے) حقیقت کے اس بڑھتے ہوئے شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ ذہنی تلاش تجسس اور استفہام کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک بھجن میں جسے میکس ملر (Max - Muller) نے "نامعلوم خدا سے" کا عنوان دیا ہے۔ تخلیق کا یہ گیت نئے روپ میں ظاہر ہوتا ہے

"کون سچائی کو جانتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے؟ ہم کیسے وجود میں آئے؟ یہ تخلیق کیونکر ظاہر ہوئی؟ کیا یہ دیوتا دنیا کے ساتھ پیدا ہوئے؟ کون جانتا ہے کہ پہلے پہل وجود کیسے ہوا؟"

"وہ جو تخلیق کا سرچشمہ ہو گیا اس نے ہی اسے بنایا ہے یا نہیں بنایا ہے؟ وہ جو آسمانی بلندیوں سے ہم پر نگاہ رکھتا ہے کیا اس راز کو جانتا ہے یا شاید نہیں جانتا ہے؟"

ہندوستان کی زرخیز وادیوں میں آریوں کی آمد سے پہلے ہی دراوڑی تہذیب برگ و بار لا چکی تھی جس کے گواہ ہڑپہ اور موہن جوڈارو کے آثار ہیں۔ آریوں نے ان قدیم تہذیبی روایتوں سے بہت کچھ اپنے رسوم و عقاید کی خوشہ چینی کی۔ یہ تہذیبی اختلاط رنگ لایا اور فطرت کی فیاضیوں کے درمیان انسانی ذہن طفولیت کے گہوارے میں جھولتے بھولتے آسمانوں کی خبر لانے لگا۔ لیکن اسی زمین پر بکھرے ہوئے حقیقت کے ذروں نے انسانی تخیل کو فلک پروازی کی طاقت عطا کی تھی۔ اسے

زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ہم تہذیب کے ابتدائی عہد میں بھی بھجنوں کی سماجی معنویت پر غور کر سکتے ہیں۔ یہ بھجن فصلیں بونے یا کاٹے جانے کے وقت، بارش ہونے، شکار میں کامیابی یا اچھی پیداوار کے لئے اجتماعی دعاؤں کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کے رواج یا رسوم کے تحت ادا ہو جانے پر انسانی ذہن اپنے آپ میں خارجی حالات کو بدل دینے کی قوت پاتا تھا۔ اس طرح داخلی کیفیات کے طلسم سے حقیقتاً فطرت کی تسخیر کا کام لیا جاتا تھا۔ یہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ابتدا میں مذہب کیوں نیرنگ، طلسمات، جادو اور توہمات کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے لیکن انسانی سماج تغیر پسند اور ارتقا پذیر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ زرعی زندگی کی جڑیں مستحکم ہوتی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کار یا تنظیم محنت کے لئے سماج مختلف طبقوں میں بٹ گیا۔ اب وسیع بادشاہتوں کی تشکیل بھی ہوئی اور مقدس پروہتوں کا سایہ بھی ہیئت اجتماعی پر منڈلانے لگا۔ ایک پھیلتے ہوئے سماج کی ضرورتوں کو تجارتی طور پر فراہم کرنے کے لئے ایک تیسرے طبقے کی نمود ہوئی اور دراوڑی مفتوحین کو نئے ملک میں اپنے وجود کی وجہ جواز کے لئے بہرحال ایک چوتھے پامال، مظلوم اور غلام طبقہ کی تشکیل کرنا چاہی تھی جس میں اس سماج کے مظلوم افراد برابر شریک ہوتے گئے کیونکہ ذات کھو دینے یعنی سماجی قوانین کی دانستہ یا غیر دانستہ نافرمانی کے بعد ان کے لئے کہیں جائے پناہ نہ تھی۔

پروہتوں کے طبقے نے اجتماعی محنت سے رشتہ منقطع کر کے اپنے آپ کو محض مذہبی امور کے لئے وقف کر لیا۔ لیکن ان کا مذہب بھی سماجی حقیقتوں ہی کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ اس طبقہ کی اجتماعی محنت سے دوری گیان دھیان کی شکل میں ظاہر ہوئی یہاں حقیقت یا کائنات کا شعور حقیقی عمل کے ذریعہ پیدا نہیں ہوا بلکہ فرصت کی فراوانی نے خیال کو مہمیز کیا اور وہ انجان راستوں پر چل نکلا لیکن اس پرواز کی حدیں پروہتوں کے جماعتی مفاد نے کھینچی تھیں کیونکہ انھیں اپنے قائم کردہ فکری نظام کو باقی ماندہ طبقات کے تابع رکھنے کا ذریعہ بھی بنانا تھا۔ چنانچہ ان کا نظام فکر ایک جانب سے ایسے طبقہ کا فلسفہ ہے جو غور و فکر میں زندگی بسر کر سکتا ہے اور دوسری جانب باقی ماندہ طبقات پر اس طبقہ کی بالادستی قائم کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ویدوں سے اپنشدوں تک حقیقت سے یہ دوری بڑھتی ہی گئی۔ ویدوں کو الہامی ادب کہا گیا ہے لیکن اپنشدوں میں زندگی کی روحانی غایت کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کی پرواز زیادہ نمایاں ہے۔ کرم (عمل) اور موکش (نجات) کے تصورات کو فلسفیانہ بنیاد حاصل ہو گئی ہے اور زندگی آواگون کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کائنات کے چیدہ پہلو غیر تغیر پذیر بنیادی حقائق کے مظاہر ٹھیرتے ہیں اور حقیقت کا ادراک حواس کے سو جانے اور وجدان کے جاگنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہندو سماج اور ہندو طرز فکر برابر ان معتقدات کا اسیر رہا ہے کیونکہ پروہتوں کے اقتدار نے ذاتوں کی تقسیم سے جس طرح اپنے مفاد کی حفاظت کی تھی سماجی زندگی میں اس کی بنیادیں ٹوٹنے نہیں پائیں۔ ابتدائی دور میں شاید یہ تقسیم زندگی کے ارتقا کے لئے ضروری رہی ہو لیکن رفتہ رفتہ اس کی آہنی گرفت استحصال ظلم اور جبر کا آلہ بنتی گئی۔ بدھ مت اور جین مت کی بغاوت برہمنی اقتدار کے خلاف کھلا ہوا اعلان جنگ تھی لیکن برہمنوں نے جلد ہی مفاہمت کر لی اور ان سرکش دھاروں کا رخ اس طرح موڑ دیا کہ نہ صرف ان کی اجارہ داری قائم رہی بلکہ ان دھاروں کا زور بھی رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ برہمنوں کی قائم کی ہوئی تقسیم زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ غیر ضروری ہوتی گئی اور اسی نسبت سے ان کے افکار کی حقیقت سے دوری بڑھتی گئی۔ ہندو مفکرین نے اس دنیا کو "مایا" کہا تھا لیکن پہلے پہل اس "مایا" کے پردے سے حقیقت جھانکتی تھی مگر شنکر اچاریہ تک پہنچتے پہنچتے یہ مایا بھی تخلیق کی "لیلا" یا محض کھیل بن گئی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی اصنام پرستی سے آرٹ کو بڑی تقویت ملی، وشنومت، شیومت، شکتی مت اور دوسری مذہبی یا نیم مذہبی روایات نے افکار کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنا دیا اور آرٹ کی نشوونما میں بڑا حصہ لیا لیکن سماجی بنیادوں کو بدستور رہنے دیا۔ یہاں تک کہ سرمایہ دارانہ تہذیب نے ان بنیادوں پر ضرب کاری لگائی یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ ٹیگور سرمایہ دارانہ تہذیب سے منہ موڑتے ہوئے ویدانتی فلسفہ میں روحانی تسکین ڈھونڈتے ہیں۔ ہندی تہذیب کے ان تصورات کے برعکس اسلامی ماحول کے تصورات آزادی اور مساوات پر مبنی تھے کیونکہ اسلام اپنی ابتدائی معاشرت کے اعتبار سے دوسری صداقتوں کا ترجمان تھا چنانچہ مسلمان اپنی ان روایات کو لے کر جہاں بھی گئے وہاں خیالات کے دھاروں کو ضرور متاثر کیا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے خیالات کے دھارے کچھ مختلف طور پر بہتے ہیں اور ان کا تصور کائنات مختلف ہے۔ لیکن عام طور پر ادھوری سچائیاں جھوٹ سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں خصوصیت سے جب انھیں سماج دشمنی کے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ جس طرح آریوں کی تہذیبی برتری یا مغرب کی صنعتی ترقی کی دلیل نسلی فوقیت، یا مشرق کی غلامی کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی اس طرح بعض تہذیبی اختلافات ادب اور انسانیت کے محاذ پر عام انسانوں کے پائدار اتحاد کی نفی نہیں کر سکتے۔

یہ ادھوری سچائی کئی مغالطوں پر مبنی ہے جنکا تجزیہ آسان نہیں، اسلام ہندوستان میں کئی واسطوں سے آیا۔ ابتدائی اسلام عرب کی بدوانہ زندگی کی سادگی کی جھلک پیش کرتا تھا۔ اس لئے سادگی اور آزادی کے جوہر اس میں نمایاں ہیں اس کے علاوہ سامی تہذیب کی جڑیں بھی اس سرزمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ صحرائے عرب میں قبیلوں کی جفاکشی کی زندگی نے اخوت جماعت اور وحدت کے تصورات کو تقویت بخشی اور اسلام نے ان کے بکھرے ہوئے شیرازے کو منظم کردیا۔ رفتہ رفتہ ان کی مجموعی قوت جس کی رگوں میں قبائلی شجاعت کا گرم خون دوڑتا تھا دنیا کی عظیم سلطنتوں کو پارہ پارہ کردیا ان سلطنتوں کے مسقط کئے ہوئے نظام میں امتیازات کی سخت گیری نے عوام کو پامال کر دیا تھا۔ چنانچہ اسلامی برادری کا مسلک زرعی نظام کی قیمت سے کچلے ہوئے عوام کے لئے نجات کا پیغام تھا اور انھوں نے دلی جوش سے اس کا خیر مقدم کیا لیکن مسلمانوں نے جن ملکوں کو فتح کیا تھا ان کی تہذیب زوال آمادہ ہوتے ہوئے بھی نسبتاً ترقی یافتہ تھی۔ چنانچہ ان مفتوحہ ممالک میں اسلامی افکار کو نہ صرف نئے مسائل سے شناسائی حاصل کرنا تھی بلکہ نسبتاً پیچیدہ سماج کے پیچیدہ سوالات کا جواب بھی دینا تھا۔ ان سماجی مطالبات نے اسلام کی تہذیبی میراث میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ لیکن اس وسیع میراث کے تنوع اور ہمہ گیری کے پیش نظر یہ کہنا دشوار نظر آتا ہے کہ اس کا اصل اسلام سے کتنا علاقہ ہے کیونکہ جہاں اس پر اسلامی معتقدات کی گہری چھاپ ہے وہاں دوسرے عناصر کی بھی کمی نہیں جنھیں ہم بدلتے ہوئے تصورات کے تحت غیر اسلامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسلامی افکار کی تاریخ کے ایک سرسری جائزے سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے ـــ :

اسلامی مفکرین کے پیش نظر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مذہب کے سیدھے سادے معتقدات کو علوم کی نئی دریافتوں سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ ایران و عراق کے مہذب ملکوں میں اسلام کو نظریاتی اعتبار سے زرتشتیت، مانیت، باردسانیت، مزدکیت اور عیسائیت کے رجحانات کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کا سامنا بھی کرنا تھا۔ چنانچہ اسلامی معتقدات نت نئے سانچوں میں ڈھلتے گئے اور مسلمانوں نے خاص طور پر یونانی فلسفہ اور سائنس سے بہت کچھ حاصل کیا۔

اس میں شک نہیں کہ عرب میں جب تک اسلام، ایمان و توحید، نماز، روزہ، حج اور زکواۃ کے ارکان پر عمل کرنے کا نام رہا۔ عقاید میں کوئی نزاع کی صورت پیدا نہ ہوئی لیکن جب اسلامی سلطنت کے حدود وسیع ہوگئے تو ایمان و عقاید کے سلسلے میں خدا کی صفات، قضا و قدر، جزا و سزا نزاعی مسئلے بن گئے۔ لیکن اس کی وجہ خیال کی بے راہ روی نہ تھی بلکہ حقیقتاً مسلمانوں کو ایک پیچیدہ سماج کی پیچیدہ تہذیبی زندگی سے شناسائی حاصل ہونے لگی تھی۔ مسلمانوں نے ارسطو کو معلم اول قرار دیا لیکن یہ معلم اول انھیں فکر کی ان گھاٹیوں میں لے گیا جہاں عقاید کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ اس کے باوجود اسلامی افکار کی تاریخ کو یونانی فلسفہ سے غیر متعلق کر کے دیکھنا ممکن نہیں کیونکہ یونانی فکر سے ہماری محفل کے بہت سے چراغ روشن ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ گرامر میں بھی اسم، فعل اور حرف میں کلمہ کی تقسیم جو حضرت علیؓ سے منسوب کیجاتی ہے درحقیقت ارسطو کی قائم کردہ تھی۔ اسی طرح یونانی فکر کے اثر سے مسلمانوں میں عقلیت پسندی کا رجحان آگیا۔ چنانچہ مذہبی امور میں قرآن حدیث اور اجماع کے ساتھ ساتھ قیاس یا اجتہاد کا طریق کار عقلی علوم کے نشو و نما کا پتہ دیتا ہے۔ ریاضی و طب میں بھی مسلم علماء نے اپنی تحقیق وہاں سے شروع کی جہاں یونانی حکماء نے ان کو چھوڑا تھا۔

طبیعات کے سلسلے میں ارسطو کا مادے کی ابدیت کا نظریہ اسلامی افکار کی تاریخ میں جھگڑے کی بنیاد بن گیا۔ پھر اسی نظریہ کو یزدگرد ثانی کے عہد میں رائج ثنویت یا دہریت کے فلسفہ سے تقویت مل گئی جس میں وقت کے ازلی و ابدی رشتہ کو تقدیر سے منسلک کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے فتح ایران کے بعد اس فلسفہ کو کفر و الحاد سمجھ کر مردود قرار دیا لیکن اس کے اثرات سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ خدا کے ساتھ ساتھ مادے کی ابدیت کا نظریہ اسلامی وحدانیت کی نفی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلامی نظریے کے مطابق فطرت کو تخلیق کا واضح عمل ہونا چاہیئے تھا لیکن اکثر فلسفیوں نے خدا کے تصور کو سبب اول (Prime cause) تک محدود کردیا اور کائنات کو زمان و مکان میں پیہم حادثات کا سلسلہ سمجھا۔ چنانچہ ابن سینا نے ازلی وحدت سے روح آفاقی کی تخلیق کی ہے لیکن اس روحانی تخلیق کا قائل ہونے کے باوجود فطرت ہی کو مادے کے تخلیقی امکانات کی حد مانا ہے۔ خود مولینا رومؒ کے یہاں تخلیق کے کئی مدارج کا پتہ چلتا ہے سسلی کے مفکر ایم پیڈکلس (Empadocles) کا خیال تھا کہ انسانی شکل اختیار کرنے سے پہلے وجود کو کئی نباتاتی اور حیوانی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ مولینا رومؒ بھی اپنی مثنوی میں کہتے ہیں۔

ڈرامہ میں مکالمہ کی اہمیت

سید بادشاہ حسین

مورخین اور ناقدین ادب جانتے ہیں کہ ڈراما مختلف اصناف کے ایک ایسے خوشگوار امتزاج کا نتیجہ ہے کہ جس کے اعتدال سے اس میں محاسن پیدا ہوتے ہیں اور جس کے انتشار سے اس میں معائب رونما ہوتے ہیں۔ پلاٹ۔ مکالمہ اور کردار اس کے ارکان ثلاثہ ہیں جن کی موزوں و مناسب نشو و نما کے لئے ماہرانہ چابکدستی، وسیع مشاہدہ؛ در عمیق تاثرات کی ضرورت ہے۔ ایک اچھے ڈرامے کی تخلیق اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ مصنف کو نہ صرف ان تینوں لوازمات پر انفرادیانہ قابو حاصل ہو بلکہ ان کے صحیح اجتماعی امتزاج کا سلیقہ بھی ہو۔ اسی وجہ سے ادبیات عالم کی تاریخ میں اچھے ڈراموں کی اتنی کثرت نہیں جتنی افسانوں، ناولوں اور نظموں کی ہے۔ ڈرامانگار کی مشکلات یہیں ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ پیشکش کا ایک اور مرحلہ باقی رہتا ہے جو کہ بذاتِ خود ایک مستقل و وسیع فن ہے۔ ڈرامہ کا صحیح لطف کتابی صورت میں نہیں بلکہ پیشکش میں مضمر ہے اس لئے ڈراما اور پیشکش کا تعلق چولی دامن کا سا ہے۔

ڈرامے کے ان تینوں ارکان اور پیشکش پر بحث کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب کی وسعت ضروری ہے۔ اس مضمون میں صرف ڈرامہ میں مکالمہ کی اہمیت کو واضح کرنا مقصود ہے۔ ڈرامہ کے ایک مشہور ناقد کا قول ہے کہ مکالمہ ایک ایسا طفل ہے جو کردار کے صلب اور موقع کے بطن سے پیدا ہوتا ہے اس نومولود کی کامیابی کی تربیت۔ دیکھ بھال اور پرورش پر منحصر ہے اگر نشو و نما کے موزوں مواقع فراہم نہ کئے گئے تو یہ طفل پروان نہیں چڑھیگا اسی خوبیوں سے ڈرامے میں چار چاند لگتے ہیں اور اسی کی غلطیوں سے ڈرامے کی ناکامی قطعی ہوتی ہے اسلئے ایک حد تک یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ ڈرامے کی کامیابی کا دارومدار مکالمہ پر ہے۔

مصنف کی شخصیت

ڈرامہ نگار شاعر کی طرح مختلف موضوعات میں سے ایک موضوع کا انتخاب اپنے رجحان طبع کو پیش نظر رکھ کر کرتا ہے اور کبھی داخلی اثرات کو اجاگر کرتا ہے جو اس کی "واردات قلب" ہوتی ہے اور کبھی خارجی تاثرات کی جھلک پیش کرتا ہے جو اس کے مشاہدات کا نچوڑ ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کی شخصیت کا شدید تصادم کردار اور موقع سے بھی ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بعض دفعہ ڈرامانگار کردار کی زبان سے خود بولنے لگتا ہے اور بعض دفعہ کردار موقع کا لحاظ کرتے ہوئے اظہار خیال میں آزاد ہوتے ہیں۔ یہ تصادم افسانوں میں بھی اکثر نظر آتا ہے لیکن ڈرامے کی پیشکش میں یہ نسبتاً زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے۔ برناڈ شا کے اکثر، خود مصنف کی ترجمانی کرتے دکھائی دیں گے اِن کا مزاج اور طنز، نکتہ چینی اور صاف گوئی شا کی ذات کی غمازی کرتی نظر آئیگی۔ بہرحال عام طور پر مصنف کا تسلط زیادہ تر مسئلہ خیز ڈراموں میں دکھائی دیگا ورنہ بالعموم ڈرامہ نگار مناسب موقع کردار و

سے اظہار خیال کو ترجیح دیتا ہے۔

مکالمہ کی موزونیت

موزوں، اور مناسب مکالمہ لکھنا بہت مشکل کام ہے۔ فضا اور ماحول سے ڈرامہ نگار کا اتنا قریب ہونا ضروری ہے کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہ رہ سکے اور ذرا بھی اجنبیت محسوس نہ ہو۔ رہن سہن کے طریقے بول چال کا لب ولہجہ، خاص مسائل پر رجحانات، اقتصادی پوزیشن غرض زندگی کے ہر پہلو سے مصنف اس طرح واقف ہو کہ گویا خود بھی اسی فضا اور ماحول میں سانس لے رہا ہے برنارڈ شا کا دعویٰ تھا کہ لندن کے چالیس میل اردگرد کی سماجی اور لسانی زندگی سے وہ ایسا واقف تھا کہ محض عادات واطوار اور لب ولہجہ سے وہ بتا سکتا کہ کون کہاں کا اور کس گروہ کا ہے۔ اس قدر عبور اور آگاہی کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے مکالمہ میں کردار کی خصوصیات کو اجاگر کرنا، کردار کے لب ولہجہ کی پابندی کرنا، اختصار کا خیال رکھنا، بے ضرورت اور بے موقع مباحث نہ پیدا کرنا، صحیح روزمرہ استعمال کرنا بہت ضروری ہوتا ہے اس کے سوا ٹیکنیکس کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے مثلاً ایسا مکالمہ یا مکالمہ کا ایسا انداز اختیار نہ کرنا جس سے اداکاری میں دشواری پیدا ہو کافی اہمیت رکھتا ہے

کردار کی خصوصیات

ڈراموں کی ایک قسم ایسی ہے جس کو کرداری ڈرامے کہا جا سکتا ہے میری مراد ایسے ڈراموں سے ہے جن میں مسز مالا پراپ، فال اسٹاف، ڈاکٹر اسٹاک من، ٹارٹف وغیرہ جیسے کردار پیش کئے گئے ہیں۔ یہ اور اس قسم کے کردار ڈرامے میں اتنے اہم اور اتنے نمایاں ہوتے ہیں کہ پلاٹ اور دوسرے کردار ان کے آگے ماند پڑ جاتے ہیں اور لوگوں کی توجہ ان پر ہی مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے۔ ڈرامہ نگار کو ان کی نشوونما میں اور ان کا مکالمہ لکھنے میں بڑی احتیاط اور مہارت دکھانی پڑتی ہے کیونکہ ان کے بارے میں ذرا سی لغزش اور غلطی لوگوں پر بہت بار گزرتی ہے۔

اس قسم کے کرداروں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ کوئی کردار المیہ ہوتا ہے کوئی طربیہ اور کوئی طنز و مزاح کا بولتا مجسمہ ہوتا ہے۔ فال اسٹاپ مسز مالا پراپ مزاحیہ کردار ہیں جو لوگوں کو ہنساتے اور خوب ہنساتے ہیں۔ لوگوں کی توقع یہ ہوتی ہے ان کا ہر جملہ ایک لطیفہ ہو اور ان کا ہر فقرہ مزاح سے بھرپور ہو۔ اس میں ذرا بھی کمی ان کو اکتا دیتی ہے۔ اسی طرح مولیئر کو ٹارٹف کی نشوونما میں بڑی احتیاط اور بڑی چابکدستی برتنی پڑی ابسن کے کردار ڈاکٹر اسٹاک من کا بھی یہی حال ہے۔ بہر طور کردار کی وضع کو نباہنا ڈرامہ نگار کا اولین فرض ہے۔

کردار کی زبان

کردار سماج کا ایک ایسا نمونہ ہوتا ہے اور وہ اپنے پیشہ، طبقہ اور مقام کی نمائندگی اور ترجمانی کرتا ہے۔ مثلاً دولت مندوں کا ایک طبقہ ہے اس میں بھی کچھ پشتینی رئیس ہوں گے۔ کچھ نو دولتئے، کچھ متوسط درجہ کے اور کچھ غریب امیروں کے ٹھاٹھ بھی جدا جدا ہوں گے بعض آبائی روایتوں پر کاربند ہوں گے اور بعض نئی تہذیب کے دلدادہ۔ ان میں بھی تعلیم یافتہ اور مغرب زدہ الگ ہوں گے۔ بہر حال امیروں کے طبقہ میں بھی الگ الگ گروہ ہوں گے۔ ان کی ذہنیت، ان کا تمدن، ان کی معاشرت، بود و باش اور خیالات اور رجحانات میں فرق ہوگا اور اسی فرق کو وہ اپنے کردار اور مکالمہ میں ظاہر کریں گے۔

اس کے سوا افراد سماج پیشوں میں بھی تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ وکیل لسّانا باتونی ہوگا اور قانون کا اطلاق زندگی کے ہر شعبہ پر کرے گا، پروفیسر اپنی علمیت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکیگا۔ تاجر اپنی کاروباری ذہنیت کو چھپا نہ سکے گا۔ مزدوروں کی بول چال ان کی اپنی خاص ہوگی۔ شاعر تخیلات کی دنیا سے علیحدہ نہ ہو سکے گا۔ لیڈروں اور صحافیوں کی ہر تان عوام پر ٹوٹے گی۔ مولوی کی نصیحت خشک ہوگی جس میں خدا کا خوف، جنت کی ترغیب اور ملا کی رہنمائی حاصل کلام ہوگی۔

مقام اور ماحول کا بھی اثر مکالمہ پر پڑتا ہے۔ لب ولہجہ اور روزمرہ ہر مقام کا الگ الگ ہوتا ہے۔ شریڈن کا ڈرامہ "دو رقیب" اس کی عمدہ مثال ہے۔ انگلستان میں اسکاٹ لینڈ ویلس، اور آئرلینڈ کے لہجوں اور روزمرہ میں نمایاں فرق ہے شریڈن نے اپنے اس ڈرامے میں اسی فرق کو واضح کرکے مزاح پیدا کیا ہے۔ ہندوستان میں یہ فرق لکھنؤ، دہلی، دکن اور پنجاب کے الگ الگ لہجوں سے پیدا کیا جا سکتا ہے اور پاکستان میں سندھی، پنجابی اور یوپی والوں کے لہجوں سے واضح ہو سکتا ہے۔ بعض دفعہ تو بول چال اور لہجوں سے کردار کے ماحول کا پتہ چلتا ہے اس لئے ڈرامہ نگار کو ان کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اردو کے قدیم ڈراموں میں جو ناٹک کمپنیوں کے لئے لکھے جاتے تھے ان باتوں کا خیال نہیں رکھا گیا اور بلا لحاظ طبقہ پیشہ اور مقام یکساں ہی قسم کی زبان مکالموں میں استعمال کی گئی جس کی وجہ سے مرزا ہادی رسوا لکھنوی کو کہنا پڑا کہ ان کی زبان بھی بازار کی ہے" در اصل ان باتوں کا لحاظ رکھنے سے ڈرامہ نگار کو کردار کی نشو و نما میں بڑی مدد ملتی ہے اور ڈرامہ کا پس منظر ناظرین اور قارئین کے ذہن نشین ہوتا ہے۔

اس کے سوا مکالمہ کی زبان کرداروں کی عمر پر بھی منحصر ہوتی ہے۔ نوعمر بچے کی زبان وہ نہیں ہونی چاہئے جو کہ ایک تعلیم یافتہ جوان یا پختہ کار اور عالم بوڑھے کی زبان ہو سکتی ہے اگر اس فرق کو پیش نظر نہ رکھا گیا تو مکالمہ غیر فطری اور غیر حقیقی معلوم ہوگا۔ مسائل پر اظہار خیال کے وقت بھی عمر، علم اور تجربہ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ورنہ کردار اپنی زبان کی بجائے دوسروں کی زبان سے بولنے لگا۔ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جن پر بچوں، جاہلوں اور ناتجربہ کار عوام کا اظہار خیال نہ تو مناسب ہے اور نہ انھیں زیب دیتا ہے اس لئے ڈرامہ نگار کو اس کا علم بخوبی ہونا چاہئے کہ کونسی بات کس سے کہلوائے۔ طنز و مزاح میں تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کارخانہ دار سے طب پر اظہار خیال کروائے لیکن سنجیدہ موقع پر یہ چیز نامناسب ہوگی۔

مزاح کا ذکر آیا ہے تو اس کی دو قسمیں طنز اور تضحیک کا بھی حال سن لیجئے۔ برناڈ شا طنز کا ماہر تھا اور اس سلسلہ میں اس کا مکالمہ تیر و نشتر کا کام کرتا تھا۔ ڈاکٹری انجمن میں طنز کے جو تیر اس نے برسائے تھے ان سے انگلستان کے ڈاکٹروں نے پناہ مانگی۔ جب اس کا ڈرامہ شائع ہوا تو اس طبقہ میں ایک ہلچل مچی اور میڈیکل ایسوسی ایشن نے یہ تصفیہ کیا کہ کوئی ڈاکٹر اس کا علاج نہ کرے۔ شا کو اس کی خبر ہوئی۔ اس نے بیماری کا بہانہ کیا اور اپنے ڈاکٹر کو بلا بھیجا لیکن اس نے ایسوسی ایشن کے فیصلہ کا ذکر کرتے ہوئے معذرت چاہی۔ شا نے شاہ انگلستان کو خط لکھا کہ وہ بیمار ہے اور ڈاکٹر اس کا علاج کرنے سے انکار کرتے ہیں اگر وہ خدانخواستہ مر گیا تو انگلستان مر جائے گا۔ جارج پنجم نے وزیر اعظم سے کہا کہ شا کے علاج کا بندوبست کروایا جائے۔ اپنے اثرات کو استعمال کر کے وزیر اعظم نے ایسوسی ایشن کو اپنا فیصلہ واپس لینے کی ترغیب دی۔ ڈاکٹر علاج کے لئے شا کے پاس گئے۔ اس نے کئی ماہرین کو طلب کیا۔ سب کی متفقہ رائے سے نسخہ تجویز ہوا۔ لیکن شا نے دوا پینے سے انکار کیا یہ کہہ کر کہ حقیقتاً وہ بیمار نہیں ہے اور یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹروں کی تشخیص کس حد تک حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔

تضحیک کی مثال مولیئر کا ڈرامہ "نکاح بالجبر" ہے۔ تضحیک میں غلو سے کام تو لیا جاتا ہے اور واقعہ پر رنگ آمیزی کی جاتی ہے لیکن کچھ اس طرح کہ حقیقت بالکل چھپ نہ جائے طنز اور تضحیک تاثرات کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن اس کا استعمال مکالمہ میں بڑی مہارت اور چابکدستی چاہتا ہے کیونکہ مزاح اور ابتذال میں فاصلہ بہت تھوڑا سا ہے۔ ابتذال کی مثالیں ہمارے پرانے ڈراموں میں بہ کثرت ملتی ہیں جن کو اس زمانے کے ڈرامہ نگار اور پیش کنندہ عوام کا مذاق کہتے رہے ہیں۔ یہی وبا ہماری فلموں میں آج تک جاری ہے۔

مزاحیہ ڈراموں کی ایک اور قسم بھی ہے جس کو انگریزی میں "فارس" کہا جاتا ہے اس میں عام طور پر واقعات بھی مضحکہ خیز ہوتے ہیں اور پلاٹ کی بنیاد بھی ایک طرح سے "بے بنیاد" ہوتی ہے جس سے ڈرامہ ایک ہنسنے ہنسانے کی چیز ہو جاتا ہے۔ اس کا مکالمہ شوکت تھانوی کے قاضی جی قسم کے ڈراموں، امتیاز علی تاج کے چچا چھکن قسم کے افسانوں اور چراغ حسن حسرت مرحوم کے حرف و حکایت جیسے فقروں کا انداز ہوتا ہے

اختصار

ڈرامہ کے مکالمہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ مختصر ترین ہوں ایسے کہ اس سے زیادہ اختصار مطلب کو واضح کرنے کے لئے ناممکن ہو جائے جس طرح شاعری میں صنف غزل میں اختصار ضروری ہے اور شاعر کو دو مصرعوں میں اپنا پورا مطلب بیان کر دینا پڑتا ہے اسی طرح ڈرامے کے مکالمہ کے لئے اجمال و اختصار لازمی ہیں۔ کوئی جملہ بے ضرورت اور کوئی فقرہ بیکار نہ ہو۔ فن انشا میں مختصر نگاری سب سے مشکل صنعت تسلیم کی گئی ہے۔ اس کے لئے ..... جب تک کلام و بیان پر پوری قدرت اور الفاظ کے صحیح مفہوم و معنی سے کما حقہٗ واقفیت نہ ہو اختصار نگاری کی خوبیاں واضح نہیں ہو سکتیں۔

ڈرامہ میں اختصار نگاری کو پیش نظر رکھنے کے کئی اسباب ہیں۔ سب سے اول یہ کہ ڈرامہ اسٹیج کے لئے لکھا جاتا ہے اور تماشہ کا وقت معین ہوتا ہے طول کلامی سے پیشکش کا وقت بڑھ جاتا ہے جس سے تماشائی اکتا جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ڈرامہ کی فنی خوبیاں مکالمہ کی طوالت کی وجہ سے ناس

ہوجاتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ اداکاری کی راہ میں طویل مکالمے دشواریاں پیدا کرتے ہیں کیونکہ اداکار کا کام صرف یہی نہیں ہوتا کہ مکالمہ کے الفاظ طوطے کی طرح دہرائے بلکہ الفاظ کو حرکات میں تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ طوالت کی وجہ سے فقروں اور جملوں میں چستی اور چمک باقی نہیں رہتی۔ پانچویں یہ کہ طویل مکالمے گفتگو کا انداز نہیں بلکہ تقریر کی طرز اختیار کر لیتے ہیں۔ چھٹے یہ کہ موضوع زیر بحث الجھنوں میں پڑ جاتا ہے۔

طویل مکالموں کے سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ برنارڈ شا کے اعزاز میں انگلستان نے "مالورن فیسٹول" منائے اور اس تقریب کے موقع پر شا سے درخواست کی گئی کہ وہ ایک نیا ڈرامہ لکھے۔ اس نے "دی ایپل کارٹ" لکھا اور اس منتخب مجمع کے آگے پیش کیا جس میں دنیا بھر کے نقاد، ادیب اور مصنف موجود تھے۔ ڈرامہ شروع ہوا پہلا ایکٹ ختم ہوتے ہوتے ایک گھنٹہ اور بیس منٹ گذر گئے۔ اس ایکٹ میں ایک کردار کی ایک تقریر پندرہ منٹ کی تھی۔ جب یہ طویل ڈرامہ ختم ہوا تو شا کو ایک مختصر سی تقریر کے لئے اسٹیج پر بلوایا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ اس سے خوش ہے کہ دنیا بھر کے ناقد، ادیب اور مصنف اس مجمع میں موجود ہیں اور ان سبھوں نے اس کا ڈرامہ شروع سے آخر تک دلچسپی اور انہماک کے ساتھ دیکھا اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سبھوں نے اسے بہت پسند بھی کیا لیکن وہ ان سب کے سامنے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ اگر یہی ڈرامہ شیکسپیر کا ہوتا تو آدھے گھنٹہ کے اندر تھیٹر خالی ہوجاتا۔ یہ شرف صرف شا ہی کو حاصل ہے کہ اس کا بدترین ڈرامہ بھی پوری توجہ اور دلچسپی کا مرکز ہوتا ہے۔

یہاں اس کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا کہ جدید طرز میں افتتاحیہ، اختتامیہ یا خود کلامی کا رواج باقی نہیں رہا۔ اس کے سوا سہیلیوں کا گانا یا نظم میں سوال و جواب بھی مذاق پارینہ ہو کر رہ گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں ظاہر ہے کہ مکالمہ کی اہمیت اور زیادہ ہوگئی..............

..............بات بات پر شعر پڑھنا اور قافیہ پیمائی سے کام لینا بھی متروک ہوگیا۔ ان سب کی جگہ چاق و چوبند روز مرہ نے لے لی۔ اس لئے اب مکالمہ نویسی جاہل منشیوں کے بس کی نہیں رہی بلکہ اہل زبان اور صاحب علم مصنف کا کمال چاہتی ہے۔

اداکار کی سہولتوں کا خیال

مکالمہ میں اداکار کی سہولتوں کا بھی خیال رکھنا از بس ضروری ہے وہی الفاظ اور فقرے اسی طرز میں لکھے جائیں کہ جن کو اداکار فطری انداز میں بہ آسانی اور بغیر کسی تصنع کے بول سکے۔ منظوم مکالمہ اور شعر خوانی کی وجہ سے اداکاری میں جو تصنع پیدا ہوتا ہے اس کی عمدہ مثالیں قدیم اردو ڈراموں میں بکثرت ملتی ہیں۔ حقیقی زندگی میں افراد سماج گفتگو نظم میں نہیں کرتے خطابت کا انداز اختیار کرتے ہیں مقفیٰ اور مسجع مکالمے بھی اداکار کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ اس کے سوا اس طرز کے مکالموں میں حرکات و سکنات بے ربط اور بے معنی ہوجاتے ہیں۔ بہرحال تصنع کو الگ کرنے کے بعد سماج کی صحیح تصویر، روزمرہ کی گفتگو ہی کے ذریعہ کھینچی جا سکتی ہے۔

اسلامی ادب

پروفیسر حنیف شوق

اسلامی ادب کے دعوے نے کچھ حلقوں کو برہم اور اکثر کو پرجوش بنا دیا ہے لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں - ایک مٹتے ہوئے سماجی نظام نے مذہب کا سہارا ڈھونڈا ہی اور بسم اللہ کے گنبد میں پناہ لینے کے لئے خرقۂ سالوس اوڑھ لیا ہے لیکن یہ پناہ خواہی خارجی زندگی کی ایک اہم حقیقت ہو جسے نظر انداز کر دینے کی کوشش بھی ایک غلط رجحان کی پیداوار ہے - ہاں اس ادبی ہیجان کا مطالعہ تاریخی شواہد اور عملی زندگی کی صورتوں کے پیش نظر کرنا ضروری ہو جاتا ہے - پھر یہ بحث اتنی آسان بھی نہیں کہ بیان فسانے کی دل آویزی یا مناظرے کی گرماگرمی کام آسکے - آج کے سماجی تقاضوں کے ساتھ ساتھ آرٹ مذہب کلچر اور تاریخ کی ماہیت و سرمایے پر نظر رکھے بغیر اس موضوع پر کچھ کہنا اندھیرے میں تیر چلانے سے زیادہ نہیں - بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلامی ادب کا دعویٰ سماج کے کن رجحانات کی غمازی کرتا ہے؟ اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی غور طلب ہو کہ اس دعوے سے ماحول کے مثبت عناصر کو تقویت ملتی ہو یا منفی تحریکات کو فروغ ہوتا ہے؟ انسانی افکار کا مطالعہ سماجی محرکات کی روشنی میں ہی کیا جا سکتا ہے چنانچہ ہمارے سماج میں اسلامی ادب کی اٹھتی ہوئی آواز ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ کچھ لوگوں کے لئے یہ نعرہ ایک ذہنی حقیقت بن چکا ہے جس کی تصوریت کا چراغ عصر حاضر کے ہنگاموں نے روشن کیا ہے - اس روشنی میں تاریخی قوتوں کی کشمکش صاف نظر آتی ہے - دراصل مشینوں کے عمل نے انسان کا اعمال نامہ بدل دیا - صنعتی انقلاب نے نہ صرف پیداوار کے نئے ذرائع قائم کئے بلکہ ان رابطوں نے تہذیب کے قصر کی نئی میناکاری بھی کی - لیکن رفتہ رفتہ اقتصادی رشتوں کے ساتھ ساتھ انسانی تعلقات بھی الجھتے گئے - اس نظام کا تضاد نمایاں ہوتا گیا اور اس تہذیب کی چمک ماند پڑتی گئی - اس زوال کا اثر قصر تہذیب کے چند گوشوں کے انہدام تک محدود نہیں رہا بلکہ ہمارے افکار ذہنی تک وسیع ہو گیا - اس لئے کسی بحث کا آغاز کرتے ہوئے ایک عصر کے ذرائع پیداوار کا اس عہد کی تہذیبی سرگرمیوں سے جو رشتہ ہو اسے بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا - چنانچہ نئے اقتصادی رابطوں کی تلاش میں سرگرداں انسان کو کہنہ تہذیب کے کئی عناصر سے برسرپیکار ہونا پڑا - ادھر خود اپنے اندرونی خلفشار کی وجہ سے پرانی تہذیب کے قلعہ میں پھوٹ پڑ گئی - آج دو جنگوں کے بوجھ سے خمیدہ انسانیت مستقبل کی جانب ہراساں نظروں سے دیکھ رہی ہو اور اسے بعض اوقات موہوم سہارا بھی خوش گوار معلوم ہوتا ہے - ان حالات میں نئی آوازیں ساحرانہ کشش رکھتی ہیں اور کوہ ندا کی طرح سننے والوں کو اپنی جانب کھینچ لاتی ہیں - لیکن ان آوازوں کی سحر کاری اور ان تصورات کی داخلی یگانگی میں واقعات اور سیاسیات کی آمیزش اور عصر حاضر کی تاریخی قوتوں کی آویزش نمایاں ہے - ہمارا کام اس آویزش کو سمجھنا اور اس آویزش کا جائزہ لینا ہے جس نے اسلامی ادب کے

تصور میں رنگ بھرا ہے۔ ادیب کا نظریۂ حیات اس کی پیدائش اور اس کا طرزِ بیان، زندگی کے تانے بانے سے الجھے ہوئے ہیں۔ اس ہنگامی سماجی محرکات کو نظر انداز کر کے ادبی تحریکوں پر حاشیہ آرائی، خیال پرستی کی اڑان ہو تو ہو حقیقت نگاری کا طریقہ کار نہیں۔ چنانچہ اسلامی ادب کے سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ سائنسی طریق کار سے الگ ہو کر یہ بحث چٹ پٹے جملوں کی پوٹ اور الزامی دعووں کا انبار ہو کر رہ گئی ہے جسے صحیح تحقیق سے کوئی علاقہ نہ رہا۔

انسان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ماضی کی روایات کا وارث رہا ہے۔ ارتقا کے عمل نے اسے کائنات کے صدیوں پر محیط دعظیم تجربوں کا تسلسل بخشا ہے۔ دراصل فطرت کے حیاتیاتی سلسلے میں انسان ایک نئی کڑی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ انسان ہی تھا جس نے اوزاروں کے استعمال سے فطرت کی تسخیر کا آغاز کیا اور آخر کار تہذیب و تمدن کی بنیاد ڈالی۔ اس میں شک نہیں کہ وحشت و بربریت کے راستوں سے تہذیب کی منزل تک پہنچا ہے۔ خوراک کی تلاش نے اسے در بدر پھرایا ہے لیکن انسان کی ترقی کا یہ سلسلہ آگ کی دریافت، تیر و کمان کی ایجاد، مٹی اور لکڑی کے برتنوں کے استعمال، زرعی ذرائع پیداوار اور زبان کی باقاعدہ تدوین، پھر سب سے بڑھ کر سماجی اداروں کی تنظیم تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام عرصہ میں خواہ وہ خانہ بدوش رہا ہو یا زرعی آبادکار، سماج سے اس کا رابطہ استوار رہا ہے۔ لیکن جب کبھی سماجی تنظیم کی قائم کی ہوئی صورتیں "پیر تسمہ پا" کی مانند آگے بڑھنے میں مزاحم ہونے لگیں تو یا تو وہ مخصوص تہذیب مٹ گئی یا اس نے اپنی زنجیریں توڑ ڈالی ہیں۔ ایسی صورت میں کہ جب انسان — انسانوں کے گروہ — یا زیادہ صحیح لفظوں میں — فطرت کو برابر سماجی ضروریات کے سانچے میں ڈھالا ہو، فطری انسان (Naturmensch) کا تصور بعض مفکرین کی دماغی اپج سے زیادہ نہیں رہتا۔ جہاں انسان نے ماضی کے کارناموں اور تمدنی روایات کی روشنی میں حال کی تعمیر کی ہو وہاں انسانی ذہن نے خارجی حالات کے پیش نظر حیات و کائنات کی گتھی کو بار ہا سلجھانے کی کوشش بھی کی ہو۔

لیکن جس طرح عالم فطرت میں اختلاف پایا جاتا ہے اور اس اختلاف سے ہمیں مطالعۂ فطرت میں مدد ملتی ہے اسی طرح انسانی گروہوں کے تصورات بھی مختلف ہوتے ہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود مخصوص حالات میں جو باتیں اقدار مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں وہ یقیناً گہری معنویت کی حامل ہیں۔ ان سے یہ بات تو ظاہر ہو ہی جاتی ہے کہ تصورِ حیات و کائنات محض انفرادی تخیل کی پیداوار نہیں بلکہ یہ بھی پھیلتے ہوئے سماج کے ارتقاء کے ساتھ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا ہے اور اس طرح پر زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق انسانی علم سے ہم آہنگ ہے۔

یہاں ابتدائی عہد کے انسانوں کے عقاید یا توہمات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ان کے دیویوں اور دیوتاؤں کے متعلق تصورات فطرت کے مختلف مظاہر کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن انھیں محض دریاؤں، پہاڑوں یا میدانوں کا عکس سمجھ لینا حقیقت کی غلط تاویل ہے۔ یہ دیوتا پیداوار کے عمل سے براہ راست تعلق رکھنے کے سبب سے سماجی زندگی کی جیتی جاگتی حقیقت بن گئے تھے۔ ہندوستان کی لہلہاتی ہوئی سرزمین نے وشنو اوشا، پرتھوی، اگنی، وایو اور اندرا جیسے ذہنی پیکر تراشے ان پیداواری عمل سے براہ راست تعلق رکھنے والے زرعی دیوتاؤں نے آریائی تہذیب کے ایوانوں کو جگمگا دیا۔ یہ مافوق الفطرت طاقتیں ایک جانب انسانی نفس کی بے پناہ قوت کا اظہار ہیں اور دوسری جانب اس کی خواہشات کی کارفرمائیوں کو ظاہر کرتی ہیں۔ برہما اور رودر تخلیق و تخریب کے عمل کو ظاہر کرتے ہیں اور انسانی ذہن کی نسبتاً ترقی یافتہ شکلیں ہیں چنانچہ "رگ وید" کے آخر کے بھجنوں میں (جسکا شمار انسانی ذہن کی قدیم ترین دستاویزوں میں ہوتا ہے) حقیقت کے اس بڑھتے ہوئے شعور کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ ذہنی تلاش، تجسس اور استفہام کا پتہ دیتے ہیں۔ ایک بھجن میں جسے میکس ملر (Max Muller) نے نامعلوم خدا سے" کا عنوان دیا ہے۔ تخلیق کا یہ گیت نئے روپ میں ظاہر ہوتا ہے

"کون سچائی کو جانتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے؟ ہم کیسے وجود میں آئے؟ یہ تخلیق کیونکر ظاہر ہوئی؟ کیا یہ دیوتا دہلے کے ساتھ پیدا ہوئے؟ کون جانتا ہے کہ پہلے پہل وجود کیسے ہوا؟"

"وہ جو تخلیق کا سرچشمہ ہوگیا اس نے ہی اسے بنایا ہے یا نہیں بنایا ہے؟ وہ جو آسمانی بلندیوں سے ہم پر نگاہ رکھتا ہے کیا اس راز کو جانتا ہے یا شاید نہیں جانتا ہے؟"

ہندوستان کی زرخیز وادیوں میں آریوں کی آمد سے پہلے ہی دراوڑی تہذیب برگ و بار لا چکی تھی جس کے گواہ ہڑپہ اور موہن جوڈارو کے آثار ہیں۔ آریوں نے ان قدیم تہذیبی روایتوں سے بہت کچھ اپنے رسوم و عقاید کی چمن بندی کی۔ یہ تہذیبی انسلاط رنگ لایا اور فطرت کی فیاضیوں کے درمیان انسانی ذہن طفولیت کے گہوارے میں جھولتے جھولتے آسمانوں کی خبر لانے لگا۔ لیکن اسی زمین پر بکھرے ہوئے حقیقت کے ذروں نے انسانی تخیل کو فلک پروازی کی طاقت عطا کی تھی۔ اسے

زیادہ بہتر طور پر سمجھنے کے لئے ہم تہذیب کے ابتدائی عہد میں بھی مجبوں کی سماجی معنویت پر غور کرسکتے ہیں۔ یہ مجبیں فصلیں بونے یا کاٹنے جانے کے وقت، بارش ہونے، شکار میں کامیابی یا اچھی پیداوار کے لئے اجتماعی دعاؤں کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کے رواج یا رسم کے تحت "ادا ہو جانے پر انسانی ذہن اپنے آپ میں خارجی حالات کو بدل دینے کی قوت پاتا تھا۔ اس طرح داخلی کیفیات کے طلسم سے حقیقتاً فطرت کی تسخیر کا کام لیا جاتا تھا۔ یہاں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ابتدا میں مذہب کیوں نیرنگ و طلسمات، جادو اور رقص و سماعت کے بھیس میں ظاہر ہوتا ہے لیکن انسانی سماج تغیر پسند اور ارتقا پذیر رہا ہے۔ رفتہ رفتہ زرعی زندگی کی جڑیں مستحکم ہو گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کار یا تنظیم محنت کے لئے سماج مختلف طبقوں میں بٹ گیا۔ اب وسیع بادشاہتوں کی تشکیل بھی ہوئی اور مقدس پروہتوں کا سایہ بھی ہیئت اجتماعی پر منڈلانے لگا۔ ایک پھیلتے ہوئے سماج کی ضرورتوں کو تجارتی طور پر فراہم کرنے کے لئے ایک تیسرے طبقے کی نمود ہوئی اور دراوڑی مفتوحین کو نئے حالات میں اپنے وجود کی وجہ جواز کے لئے بہرحال ایک چوتھے یا ملی مظلوم اور غلام طبقہ کی تشکیل کرنا چاہی تھی جس میں اس سماج کے مظلوم افراد برابر شریک ہوتے گئے کیونکہ ذات کھو دینے یعنی سماجی قوانین کی دانستہ یا غیر دانستہ نافرمانی کے بعد ان کے لئے کہیں جائے پناہ نہ تھی۔

پروہتوں کے طبقہ نے اجتماعی محنت سے رشتہ منقطع کر کے اپنے آپ کو محض مذہبی امور کے لئے وقف کر لیا۔ لیکن ان کا مذہب بھی سماجی حقیقتوں ہی کی بدلی ہوئی شکل تھی۔ اس طبقہ کی اجتماعی محنت سے دوری گیان دھیان کی شکل میں ظاہر ہوئی یہاں حقیقت یا کائنات کا شعور حقیقی عمل کے ذریعہ پیدا نہیں ہوا بلکہ فرصت کی فراوانی نے خیال کو مہمیز کیا اور وہ انجان راستوں پر چل نکلا لیکن اس پرواز کی حدیں پروہتوں کے جماعتی مفاد نے کھینچی تھیں کیونکہ انھیں اپنے قائم کردہ فکری نظام کو باقی ماندہ طبقات کے تابع رکھنے کا ذریعہ بھی بنانا تھا۔ چنانچہ ان کا نظام فکر ایک جانب سے ایسے طبقہ کا فلسفہ ہے جو عزو فکر میں زندگی بسر کر سکتا ہے اور دوسری جانب باقی ماندہ طبقات پر اس طبقہ کی بالادستی قائم کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ ویدوں سے اپنشدوں تک حقیقت سے یہ دوری بڑھتی ہی گئی۔ ویدوں کو الہامی ادب کہا گیا ہے لیکن اپنشدوں میں زندگی کی روحانی غایت کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کی پرواز زیادہ نمایاں ہے۔ کرم (عمل) اور موکش (نجات) کے تصورات کو فلسفیانہ بنیاد حاصل ہو گئی ہے اور زندگی آواگون کی زنجیروں میں جکڑی نظر آتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ کائنات کے جیدہ پہلو غیر تغیر پذیر بنیادی حقائق کے مظاہر ٹھہرتے ہیں اور حقیقت کا ادراک حواس کے سوچنے اور وجدان کے جاگنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہندو سماج اور ہندو طرز فکر برابر ان معتقدات کا اسیر رہا ہے کیونکہ پروہتوں کے اقتدار نے ذاتوں کی تقسیم سے جس طرح اپنے مفاد کی حفاظت کی تھی سماجی زندگی میں اس کی بنیادیں ٹوٹنے نہیں پائیں۔ ابتدائی دور میں شاید یہ تقسیم زندگی کے ارتقا کے لئے ضروری رہی ہو لیکن رفتہ رفتہ اس کی آہنی گرفت استحصال ظلم اور جبر کا آلہ بنتی گئی۔ بدھ مت اور جین مت کی بغاوت برہمنی اقتدار کے خلاف کھلا ہوا اعلان جنگ تھی لیکن برہمنوں نے جلد ہی مفاہمت کر لی اور ان سرکش دھاروں کا رخ اس طرح موڑ دیا کہ نہ صرف ان کی اجارہ داری قائم رہی بلکہ ان دھاروں کا زور بھی رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ برہمنوں کی قائم کی ہوئی یہ تقسیم زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ غیر ضروری ہوتی گئی اور اسی نسبت سے ان کے افکار کی حقیقت سے دوری بڑھتی گئی۔ ہندو مفکرین نے اس دنیا کو "مایا" کہا تھا لیکن پہلے پہل اس "مایا" کے پردے سے حقیقت جھانکتی تھی مگر شنکراچاریہ تک پہنچتے پہنچتے یہ مایا بھی تخلیق کی "لیلا" یا محض کھیل بن گئی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی اصنام پرستی سے آرٹ کو بڑی تقویت ملی، وشنومت، شیومت، شکتی مت اور دوسری مذہبی یا نیم مذہبی روایات نے افکار کو زیادہ سے زیادہ رنگین بنا دیا اور آرٹ کی نشو و نما میں بڑا حصہ لیا لیکن سماجی بنیادوں کو بدستور رہنے دیا۔ یہاں تک کہ سرمایہ دارانہ تہذیب نے ان بنیادوں پر ضرب کاری لگائی یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ ٹیگور سرمایہ دارانہ تہذیب سے منہ موڑتے ہوئے ویدانتی فلسفہ میں روحانی تسکین ڈھونڈتے ہیں۔ ہندی تہذیب کے ان تصورات کے برعکس اسلامی ماحول کے تصورات آزادی اور مساوات پر مبنی تھے کیونکہ اسلام اپنی ابتدائی معاشرت کے اعتبار سے دوسری صداقتوں کا ترجمان تھا چنانچہ مسلمان اپنی ان روایات کو لے کر جہاں بھی گئے وہاں خیالات کے دھاروں کو ضرور متاثر کیا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا ایک حد تک صحیح ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے خیالات کے دھارے کچھ مختلف طور پر بہتے ہیں اور ان کا تصور کائنات مختلف ہے۔ لیکن عام طور پر ادھوری سچائیاں جھوٹ سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتی ہیں بخصوصیت سے جب انھیں سماج دشمنی کے مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے۔ جس طرح آریوں کی تہذیبی برتری یا مغرب کی صنعتی ترقی کی دلیل نسلی فوقیت یا مشرق کی غلامی کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتی اس طرح بعض تہذیبی اختلافات ادب اور انسانیت کے محاذ پر عام انسانوں کے پائدار اتحاد کی نفی نہیں کر سکتے۔

یہ ادھوری سچائی کئی مغالطوں پر مبنی ہے جنکا تجزیہ آسان نہیں، اسلام ہندوستان میں کئی واسطوں سے آیا۔ ابتدائی اسلام عرب کی بدوانہ زندگی کی سادگی کی جھلک پیش کرتا تھا۔ اس لئے سادگی اور آزادی کے جوہر اس میں نمایاں ہیں اس کے علاوہ سامی تہذیب کی جڑیں بھی اس سرزمین میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ صحرائے عرب میں قبیلوں کی جفاکشی کی زندگی نے اخوت، شجاعت اور وحدت کے تصورات کو تقویت بخشی اور اسلام نے ان کے بکھرے ہوئے شیرازے کو منظم کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان کی مجموعی قوت جسکی رگوں میں قبائلی شجاعت کا گرم خون دوڑتا تھا دنیا کی عظیم سلطنتوں کو پارہ پارہ کر دیا ان سلطنتوں کے مستحکم کئے ہوئے نظام میں امتیازات کی سخت گیری نے عوام کو پامال کر دیا تھا۔ چنانچہ اسلامی برادری کا مسلک زرعی نظام کی قیصریت سے کچلے ہوئے عوام کے لئے نجات کا پیغام تھا اور انھوں نے دلی جوش سے اس کا خیر مقدم کیا لیکن مسلمانوں نے جن ملکوں کو فتح کیا تھا ان کی تہذیب زوال آمادہ ہوتے ہوئے بھی نسبتاً ترقی یافتہ تھی۔ چنانچہ ان مفتوحہ ممالک میں اسلامی افکار کو نہ صرف نئے مسائل سے شناسائی حاصل کرنا تھی بلکہ نسبتاً پیچیدہ سماج کے پیچیدہ سوالات کا جواب بھی دینا تھا۔ ان سماجی مطالبات نے اسلام کی تہذیبی میراث میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ لیکن اس وسیع میراث کے تنوع اور ہمہ گیری کے پیش نظر یہ کہنا دشوار نظر آتا ہے کہ اس کا اصل اسلام سے کتنا علاقہ ہے کیونکہ جہاں اس پر اسلامی معتقدات کی گہری چھاپ ہے وہاں دوسرے عناصر کی بھی کمی نہیں جنھیں ہم بدلتے ہوئے تصورات کے تحت غیر اسلامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسلامی افکار کی تاریخ کے ایک سرسری جائزے سے اس امر کا اندازہ ہو سکتا ہے —:

اسلامی مفکرین کے پیش نظر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ مذہب کے سیدھے سادے معتقدات کو علوم کی نئی دریافتوں سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ ایران و عراق کے مہذب ملکوں میں اسلام کو نظریاتی اعتبار سے زرتشتیت، مانیت، باردسانیت، مزدکیت اور عیسائیت کے رجحانات کے ساتھ ساتھ یونانی فلسفہ کے مختلف پہلوؤں کا سامنا بھی کرنا تھا۔ چنانچہ اسلامی معتقدات نت نئے سانچوں میں ڈھلتے گئے اور مسلمانوں نے خاص طور پر یونانی فلسفہ اور سائنس سے بہت کچھ حاصل کیا۔

اس میں شک نہیں کہ عرب میں جب تک اسلام، ایمان و توحید، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے ارکان پر عمل کرنے کا نام رہا۔ عقاید میں کوئی نزاع کی صورت پیدا نہ ہوئی لیکن جب اسلامی سلطنت کے حدود وسیع ہو گئے تو ایمان و عقاید کے سلسلے میں خدا کی صفات، قضا و قدر، جزا و سزا نزاعی مسئلے بن گئے۔ لیکن اس کی وجہ خیال کی بے راہ روی نہ تھی بلکہ حقیقتاً مسلمانوں کو ایک پیچیدہ سماج کی پیچیدہ تہذیبی زندگی سے شناسائی حاصل ہونے لگی تھی۔ مسلمانوں نے ارسطو کو معلم اول قرار دیا لیکن یہ معلم اول انھیں فکر کی ان گھاٹیوں میں لے گیا جہاں عقاید کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ اس کے باوجود اسلامی افکار کی تاریخ کو یونانی فلسفہ سے غیر متعلق کر کے دیکھنا ممکن نہیں کیونکہ یونانی فکر سے ہماری محفل کے بہت سے چراغ روشن ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ گرامر میں بھی اسم، فعل اور حرف میں کلمہ کی تقسیم جو حضرت علی سے منسوب کی جاتی ہے در حقیقت ارسطو کی قائم کردہ تھی۔ اسی طرح یونانی فکر کے اثر سے مسلمانوں میں عقلیت پسندی کا رجحان آگیا۔ چنانچہ مذہبی امور میں قرآن، حدیث اور اجماع کے ساتھ ساتھ قیاس یا اجتہاد کا طریق کار عقلی علوم کے نشو و نما کا پتہ دیتا ہے۔ ریاضی و طب میں بھی مسلم علماء نے اپنی تحقیق وہاں سے شروع کی جہاں یونانی حکماء نے ان کو چھوڑا تھا۔

طبیعات کے سلسلے میں ارسطو کا مادے کی ابدیت کا نظریہ اسلامی افکار کی تاریخ میں جھگڑے کی بنیاد بن گیا۔ پھر اسی نظریہ کو یزدگرد ثانی کے عہد میں رائج زروانیت یا دہریت کے فلسفے سے تقویت مل گئی جس میں وقت کے ازلی و ابدی رشتہ کو تقدیر سے منسلک کیا گیا تھا۔ مسلمانوں نے فتح ایران کے بعد اس فلسفہ کو کفر و الحاد سمجھ کر مردود قرار دیا لیکن اس کے اثرات سے اپنا دامن نہ بچا سکے۔ خدا کے ساتھ ساتھ مادے کی ابدیت کا نظریہ اسلامی وحدانیت کی نفی کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اسلامی نظریے کے مطابق فطرت کو تخلیق کا واضح عمل ہونا چاہئے تھا لیکن اکثر فلسفیوں نے خدا کے تصور کو سبب اول ([illegible]) تک محدود کر دیا اور کائنات کو زمان و مکان میں پیہم حادثات کا سلسلہ سمجھا۔ چنانچہ ابن سینا نے ازلی وحدت سے روح آفاقی کی تخلیق کی۔ ہر چند لیکن اس روحانی تخلیق کا قائل ہونے کے باوجود فطرت ہی کو مادے کے تخلیقی امکانات کی حد مانا ہے۔ خود مولینا روم کے یہاں تخلیق کے کئی مدارج کا پتہ چلتا ہے۔ سسلی کے مفکر ایم پیڈکلس (Empedocles) کا خیال تھا کہ انسانی شکل اختیار کرنے سے پہلے وجود کو کئی نباتاتی اور حیوانی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ مولینا روم بھی اپنی مثنوی میں کہتے ہیں۔

ہفتصد و ہفتاد و قالب دیدہ ام — ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

اس کے ساتھ ساتھ فلسفہ کے ذوق نے بہت سے مذہبی معتقدات کی ہیئت بدل دی اور اس ذوق کی پرورش میں معتزلہ نے نمایاں حصہ لیا۔ ان میں سے واصل بن عطا نے قرآن کریم کو رسول اللہ ﷺ کا کلام کہہ کر مسئلہ خلق قرآن کو اپنی منطقی حد تک پہنچا دیا۔ اسلامی مفکرین نے بھی خلقی طور پر مذہب کو سمجھنے کی کوشش کی لیکن محدثین نے علم کلام کو حرام قرار دیا اور متکلمین کو لائق تعزیر ٹھیرایا لیکن ان کی تیغ تکفیر کی بے نیازی سے بہت کم مسلم علماء بچ سکے یہاں تک کہ ابن سینا کی کتابیں نذر آتش کردی گئیں۔ اشعریہ نے البتہ مذہب کو قدیم بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی لیکن ابن تیمیہ، امام رازی اور امام غزالی نے فلسفہ ہی کے ہتھیاروں سے فلسفیانہ رجحانات کا مقابلہ کیا لیکن اس مقابلے میں بہت سے ایسے عناصر کو اپنے نظام فکر میں جذب کرلیا جن کا اصل اسلام میں کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کے برعکس صوفیوں نے عجم و ہند کے تہذیبی تصورات کے تحت کائنات میں عشق کا ظہور دیکھا ان کے خیال میں خدا محبت کا مظہر ٹھیرا اور اس اعتبار سے دوزخ کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی سزا اس سے منسوب کرنا اگر غلط نہیں تو محض مصلحت ایزدی قرار پایا۔ اخوان الصفا نام کے گروہ نے تو برملا کہہ دیا کہ ہمارے نبی چونکہ عرب کے جاہل بدوؤں میں مبعوث ہوئے تھے جن کے لئے روحانی احساس کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اس لئے انھیں جنت کی دلفریبیوں سے اچھے کاموں کے لئے لبھایا اور برے کاموں سے دوزخ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ اس طرح حشر و نشر بھی نزاعی مسئلے بن گئے کئی اسلامی مفکر بھی تھوڑے بہت اختلاف سے اسی نتیجہ پر پہنچے ابن سینا کے یہاں بھی حی ابن یقظان کی تمثیل ملتی ہے لیکن ابن طفیل نے اسے زیادہ بہتر طور پر پیش کیا ہے۔ اس تمثیل کے ذریعہ یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ الہام کے بغیر بھی انسان سچائی سے واقف ہو سکتا ہے اسی خیال نے اس تصور کو جنم دیا کہ قرآن کریم کے دو معنی ہیں ایک سمجھداروں کیلئے جو اس کی روح کو سمجھتے ہیں اور دوسرے ناسمجھوں کیلئے جو تمثیل کے پیرائے میں بہتر زندگی گزارنے کا اخلاق سیکھتے ہیں۔

اسلامی عقاید میں فلسفہ کے ساتھ ساتھ سیاست کی رنگ آمیزیاں بھی کچھ کم نہیں۔ اسلامی تاریخ مذہبی معتقدات کے نام پر طاقت حاصل کرنے کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ جس سماج میں مذہب کو بنیادی اہمیت حاصل ہو وہاں ہر معاشرتی، سیاسی یا اقتصادی تحریک مذہبی لبادہ اوڑھ کر سامنے آتی ہے۔ اس طور پر اسلامی تاریخ میں مختلف گروہوں کے اقتدار کی جنگ نے متعدد فرقوں کو رواج دیا جن میں سے اکثر نے اپنے علاوہ سب کو کافر قرار دے دیا۔ اس کے علاوہ خلفائے وقت نے بھی مذہب کو اپنے اقتدار کے لئے بہترین حیلہ بنایا۔ چنانچہ خلفائے بنی امیہ سے جب ان کے عہدے داروں کے مظالم کی شکایت کی جاتی تھی تو وہ خدا کی مرضی پر صابر و شاکر رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان حالات میں ایک طرف انسان کو اپنے افعال میں مختار ماننے کا نظریہ تھا جسے قدریہ کا نام دیا گیا۔ دوسری جانب اسے مجبور محض مانا گیا اور اسے جبریہ کہا گیا۔ ان دو نظریات کی آویزش باہمی اسلامی تاریخ میں بہت قدیم ہے۔ پھر سیاسی آویزش محض بعد کی نسلوں تک محدود نہ تھی بلکہ قرون اولیٰ میں مسیلمہ کذاب کی بغاوت کا ایک پہلو قریش کی برتری کے خلاف اعلان جنگ بھی تھا۔ اسی طرح خدا کی ذات یا صفات کے متعلق جو بحثیں اٹھ کھڑی ہوئیں وہ بھی سیاسی نوعیت اختیار کرگئیں۔ خدا کو عرش پر متمکن ماننے یا نہ ماننے یا کلام اللہ کو قدیم کہنے یا نہ کہنے پر بہت سے افراد کو موت کے گھاٹ اترجانا پڑا۔ اسلامی تاریخ کے سرسری مطالعہ سے بھی یہ بات روشن ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ اس میں سیاسی نوعیت کی مذہبی تحریکیں برابر اٹھتی رہی ہیں۔ یہ تحریکیں اپنے جلو میں نئے عقاید اور حیات کی نئی تعبیریں بھی لائیں۔

اسلامی عقاید کی اس وسیع میراث کے رد یا انتخاب کا معیار کیا ہو؟ یہ اہم سوال ہے جس کے جواب پر اسلامی ادب کے دعوے کی معقولیت کا انحصار ہے۔ ہمارا ادب کلچر کا جزو، اور مذہب ہماری تہذیبی میراث کا ایک حصہ ہے۔ پھر بھی یہ کل کی جگہ نہیں لے سکتا۔ تاوقتیکہ مذہب کی روح تمام تہذیبی قدروں اور ہر سماجی ادارے پر حاوی نہ ہو جائے لیکن اسلامی تاریخ کے مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تہذیب برابر اقتصادی ذرائع پیداوار، جغرافیائی حالات، ملکی رسوم و رواج اور نسلی خصوصیات سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ ان خصوصیات میں تبدیلی سے تہذیب کی تبدیلی بھی لازم آتی ہے۔ اس کے علاوہ انسان اپنے ماحول کو کوشش کے امکانی حدود میں بدلتا رہتا ہے جس کی وجہ سے تہذیبی اقدار بھی بدل جاتی ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام ہندوستان میں پہلے صوفیائے کرام کے ذریعے پھر فتوحات کے راستے سے داخل ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسلام خانقاہوں یا درباروں کا اسلام تھا جسے ہندوستان کی سرزمین نے بہت کچھ متاثر کیا تھا۔ یہی نہیں ہندوستانی علوم نے دوسرے ملکوں میں بھی مسلمانوں کے تہذیبی ارتقا میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ویدانت کی تعلیم سے مسلمان ناآشنا نہیں رہے تھے اور اس لحاظ سے ایرانی تصوف کے ڈانڈے ہندوستان میں بھگتی کی تحریک سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں نے علوم ہندسہ، ہیئت و طب میں بہت کچھ ہندوستان سے سیکھا تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے تہذیب کے ان متوازی دھاروں کو مل کر بہنے کا موقعہ ملا اور ایک ایسے کلچر کی نمود ہوئی (جس پر ہندو یا مسلم عناصر کی چھاپ ہونے کے بجائے) جس کا خمیر یہیں کی سرزمین سے گوندھا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی سادہ تہذیب وسط ایشیا میں ملوکیت کے زیر سایہ بہت کچھ برگ و بار لا چکی تھی لیکن ہندوستان کے ہرے بھرے میدانوں میں اس کی سرسبزی و شادابی سے آنکھوں میں طراوت آتی تھی جہاں مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان کی مظلوم انسانیت کو امید کا پیغام ملا۔ اور اسلام نے ذات پات کے تشدد کو کم کیا وہاں تہذیبی سرگرمیوں کے آتش کدے بھی پھر سے دہک اٹھے۔

بابر نے اپنی توزک میں ہندی تمدن کی کوتاہیوں کا ماتم اس طرح کیا ہے "اسپ خوب نے، گوشت خوب نے، انگور و خربزہ و میوہ ہائے خوب نے، یخ و آب سرد نے، حمام و مدرسہ نے، شمع و مشعل نے، شمع دان نے" —— مسلمانوں نے تہذیب و تمدن کی برکات سے ہندوستان کی سرزمین کو مالا مال کر دیا۔ ان کی آمد سے محفل میں شمع کا نور آ گیا اور پروانوں کا رقص گرمیِ محفل کا سبب بن گیا لیکن ہندی تہذیب کے دیئے کی مدھم روشنی بھی اپنا رنگ جمائے بغیر نہ رہی۔ رفتہ رفتہ شاعری، موسیقی، مصوری، خطاطی، فن تعمیر، سنگ تراشی، پارچہ بافی اور قالین سازی کی صنعتیں اس تہذیبی اختلاط سے متاثر ہوئیں اور زندگی کے تقریباً تمام شعبے میل ملاپ کے نور سے جگمگا اٹھے۔ اسلامی عقاید کے سلسلے میں جہاں مسلمان صوفیوں نے تمام مذہبوں کو ایک ہی حقیقت تک پہنچنے کے مختلف راستوں سے تعبیر کیا (دارا شکوہ نے اپنشدوں کا سرالاسرار کے نام سے ترجمہ کیا اور اس کو اصل قرآن کہا) وہاں سینکڑوں برس کے میل ملاپ نے مزاج و آہنگ، زبان و بیان، معاشرتی ہیئت و اسلوب، نشست و برخاست، شادی و غمی، رسوم و رواج میں بہت کچھ تبدیلیاں کیں اور اس اختلاط نے تہذیب و تمدن کے شجر کو اپنے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا۔ اسلامی ادب کی علاحدگی کے دعوے دار تاریخ کے پہیئے کو الٹا چکر دینے کے ساتھ ساتھ کیا اسلام کی انسان دوستی کی ان روایات کو بھی مٹا دینے کے درپے ہیں جن کے مٹ جانے سے ہندوستان میں اسلامی تہذیب کے جلال و جمال، عظمت و شکوہ اور وسعت و ہمہ گیری کی عالی شان عمارت منہدم ہو جاتی ہے؟

ہمیں اصطلاحی طور پر اسلامی ادب کے امکان سے انکار نہیں اور نہ اس اصطلاح میں بذات خود کوئی قباحت نظر آتی ہے لیکن اس امکان کو جس طور پر پیش کیا گیا ہے اس سے نہ صرف یہ کہ سماج کے رجعتی میلانات کو تقویت ملتی ہے بلکہ خود یہ تحریک بھی اوپری طبقہ کا مفاد قائم رکھنے کا ذریعہ بن جاتی ہے جس طرح برہمنوں نے مذہب کو اپنے اقتدار کے لیئے وسیلہ بنا یا تھا اسی طرح کعبہ کے برہمن بھی مذہب کو اپنی اغراض کے لیئے استعمال کر رہے ہیں اس لیئے وہ اسلام کا نام لے کر جذبات سے اپیل کرنا جانتے ہیں۔ لیکن خود اپنے دعووں کی تشریح یا تجزیہ سے گریز کرتے ہیں کیونکہ اس طرح پانی کی سطح پر پھوٹتے ہوئے بلبلوں کی مانند ان کی ادعائیت کا طلسم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔

اسلامی ادب کے دعویداروں کے لیئے پہلی ضروری بات یہ تھی کہ اس کا مفہوم متعین کرتے۔ پھر اس چیستاں کے حل کر لینے کے بعد بھی یہ لازم آتا تھا کہ اسلامی ادب کی جو صورتیں ہو سکتی ہیں انھیں بھی پیش کیا جائے۔ ادب کے جس حصہ کو ہم بحث کی خاطر اسلامی ادب مان لیتے ہیں اس کی تقسیم اپنے مواد کے اعتبار سے کیجا سکتی ہے۔ وہ ادب جو مذہب اسلام کی افہام و تفہیم سے تعلق رکھتا ہے اسے ہم اسلامی ادب کہہ سکتے ہیں لیکن ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ (جس کے مضمون "مذہب اور ادب" پر اسلامی ادب کے کئی علمبرداروں نے اپنے دعووں کی بنیاد رکھی ہے) انجیل کے انگریزی ترجمہ کے متعلق کہتا ہے کہ جو لوگ اسے انگریزی نثر کی ثقہ ترین دستاویز سمجھتے ہیں۔ دراصل عیسائیت کی قبر پر ایک یادگار کی تعریف کرتے ہیں۔ دراصل ایلیٹ کی یہ مذہبی شدت پسندی اس کے کیتھولک جوش کی پیداوار ہے جس کے تحت وہ ساری دنیا کو اسی رنگ میں رنگ لینے کا خواب دیکھتا ہے۔ ورنہ مذہب سے متعلق ادبی یا انسانی خوبیاں رکھنے والی تخلیقات کو ہمیں ادب ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ خصوصیت سے اردو اور فارسی ادب نے تو اس کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولینا روم سے لے کر مولینا آزاد تک قرآن کریم کی تفسیریں متنوع اور مخصوص رجحانات کی پابند رہی ہیں اور ان میں بعض اوقات اتنا ہی اختلاف پایا جاتا ہے جتنا مثال کے طور پر قرآن اور انجیل میں۔ پھر مذہب کی یہ تفسیرات بدلتے ہوئے عصری رجحانات کی غمازی بھی کرتی ہیں مثلاً غیر ملکی سامراج اور ملکی زمینداری کے خلاف تحریک وہابیت کے مذہبی روپ میں نمایاں ہوئی لیکن یہی مذہبیت سرسید کے یہاں مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی زبان بن کر انگریزی سامراج سے مفاہمت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے اور مغربی عقلیت کے پیش نظر مذہب کو فطرت کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے خلاف فطرت معجزوں اور مافوق الفطرت طاقتوں سے انکار کا سبب بن جاتی ہے۔ اسی انکار کی رو میں جبریل و فرشتہ وغیرہ سب ہوا ہو جاتے ہیں۔ سرسید کا ایک ہی شعر

نہ جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم !

ہمہ گفتار معشوق است قرآنے کہ من دارم !!

———— یہ مذہب کا بدلتا ہوا تصور ہی تو ہے جس کے ہاتھوں کبھی شاہ ولی اللہ کو ایک مسلم حکومت کے استبداد کا نشانہ بن کر سقراط کی طرح زہر کا شکار ہونا پڑتا ہے اور کبھی یہی تصور سر سید کو کسی غیر مسلم حکومت کی نوازش خطاب اور سرپرستی سے سرفراز کرتا ہے۔ پھر قرآن کریم کے علاوہ حدیث و فقہ کو لیجئے تو اختلاف کا میدان اور وسیع ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں اقبال کا یہ خدشہ کہ مفسرین قرآن کو پاژند بنا سکتے ہیں حرف بحرف صحیح ثابت ہوتا ہے۔ جب صورت حال یہ ہو تو ہم کسے اسلامی کہیں گے اور کسے غیر اسلامی؟ بالفرض آپ نے امتیاز کے لئے کوئی توجیہہ گھڑ بھی لی تو ہزاروں توجیہات میں ایک اور سہی۔

"شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا"

وہ ادب بھی جو براہ راست مذہب سے تعلق نہیں رکھتا لیکن کسی ادبی واسطہ سے اسلامی معتقدات کی بنیادیں جذباتی طور پر استوار کرتا ہے۔ اسلامی ادب کے زمرے میں شمار ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم حمد، نعت، یا منقبت وغیرہ کو پیش کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے ادب کا دائرہ بہت محدود ہے اس میں زندگی کی وسعتوں یا زنگارنگیوں کی جھلک نہیں ملتی اور ایسے ادب کو ہم صحیح معنوں میں زندگی کا ترجمان نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے ہم ادب کے لفظ کو جس مفہوم میں استعمال کرتے ہیں، اس کی زنگارنگ جلوہ آرائیوں سے اسے سروکار نہیں پھر یہاں بھی وہی دقت پیش آتی ہے، یعنی بہت سے عقیدے دوسروں کے جذباتی معتقدات سے میل نہ کھانے کے باعث ان کے نقطۂ نظر سے اسلامی نہیں رہتے۔ اس کے علاوہ اگر یہ ادب مرثیہ کی مانند کسی ایک فرقے کے مذہبی جذبات کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرے فرقوں کے لوگ اس کی ادبی یا شاعرانہ خوبیوں کی بنا پر تو متاثر ہو سکتے ہیں لیکن مذہبی اپیل کی بنیاد پر نہیں۔ پھر اسلامی ادب کی اس جذباتی تقسیم میں اگر ہم متصوفانہ شاعری کو بھی شامل کر لیں تو الجھن اور بڑھ جاتی ہے کیونکہ بعض اسلامی مفکرین نے سرے سے ان رجحانات ہی کو الحاد و زندقہ سے تعبیر کیا ہے۔ یہی نہیں تاریک کمرے میں کالی بلی کی تلاش کرنے والے بعض اوقات ایسی ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اسلامی ادب کے ایک نئے دعوے دار (جو خون لگا کر شہیدوں میں شامل ہو گئے ہیں) ملک محمد جائسی کو پکا مسلمان صوفی مانتے ہوئے بھی اس کی تصنیف پدماوت کو اس لئے سولہ آنے اسلامی شاعری نہیں مانتے کہ اس کے یہاں ہندو دیو مالا اور اس کے تصورات کو کچھ اس پیچ سے پیش کیا گیا ہے کہ ایک عام قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا چنانچہ اس دلیل کے مطابق محسن کاکوروی کی نعت کے یہ اشعار غیر اسلامی ہی کہے جائیں گے۔

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل !

جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طول عمل

خبر اڑتی ہوئی آتی ہے مہابن سے ابھی،

کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل

راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں،

تار بارش کا جو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل

کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی،

ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل

شاہد فکر ہے گھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ

چشم کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل

ابھی پتہ نہیں کہ فکری تضاد کو منطق کے فریب سے چھپانے کی یہ کوشش کیا کیا مضحک صورتیں اختیار کرے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی ادب کا لفظ

مناظرانہ کٹ حجتی اور ملّائیانہ تنگ نظری کا شکار ہے۔ لیکن وسیع النظری کا مشرب رکھنے والوں کے دعوے بھی کچھ قابل قبول نہیں، وہ تمام اردو ادب کو اسلامی ادب قرار دیتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں کسی نہ کسی طرح اسلامیت کا پہلو پیدا کرتا ہے (اس سے قطع نظر کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں) یہاں تک کہ بادشاہوں کی مدح میں "قصائد" بادشاہوں کو اعلیٰ اسلامی اخلاق پر پورا اترتے ہوئے پیش کر دینا کافی ہو۔ جولاکھ تاویلوں کے باوجود اکثر مسلمانوں کے گلے سے نیچے نہیں اتر سکتا۔

دیکھ ہاتھی پہ تجھ کو بولی خلق　　　ہے تجلّیِ حق بہ کوہ طور!

——— دراصل اردو ادب میں جہاں جہاں شعائرِ اسلامی کی تضحیک کی گئی ہو یا کفر کو اسلام سے بلند تر درجہ دیا گیا ہے وہاں ہم سے پہلے ہی تصوف کی اصطلاح کہہ دیں لیکن ان روایات و مصطلحات کو اسلامی ثابت کرنے کے لیے ہفتخواں طے کرنا پڑیگا۔

مذہبیت کے گہرے پائیدار شعور سے قطع نظر اس ادب کو بھی اسلامی ادب کہا جا سکتا ہے جس میں مسلمانوں کی سماجی یا سیاسی زندگی کے تقاضوں کو پیش کیا جائے۔ حالیؔ، شبلیؔ اور اکبرؔ کی شاعرانہ روایات ان ہی سماجی تقاضوں کی بنیاد پر استوار ہوئی ہیں۔ حالیؔ مسلمانوں کو شاندار ماضی کی یاد دلا کر ان کے ذہنی اور قومی زوال کا مرثیہ پڑھتے ہیں۔ شبلیؔ مسلمانوں کے مسائل کو ہندوستان کے مجموعی مسائل سے الگ نہیں سمجھتے اور انھیں صرف اسلام کی جمہوری روایات اپیل کرتی ہیں۔ اکبرؔ عقلی علوم اور مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے خوف زدہ ہیں کہ کہیں سنگِ تہذیب پرانے عقاید کے شیشہ کو پاش پاش نہ کر دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان رجحانات کو مذہبی تصورات یا مابعد الطبیعات سے زیادہ مادی ضروریات کا پرتو سمجھنا چاہیئے۔ سرسیدؔ کی تحریک نے مسلمانوں میں جس نئے تعلیم یافتہ طبقہ کی نمو چاہی تھی حالیؔ کی شاعری اس کے لئے مناسب ذہنی فضا تعمیر کرتی ہے لیکن اس طبقہ کا ——— جس کی سرپرستی انگریزی سامراج نے کی تھی ——— جلد ہی وسائل کی کمی کی وجہ سے برطانوی مفاد سے تصادم ہو جاتا ہے۔ اس تصادم میں اسے ہندوستان کی جمہوری تحریکوں سے سہارا ملتا ہے۔ چنانچہ شبلیؔ کی شاعری مسلمانوں کے الگ تھلگ رہنے کی پالیسی کو مذموم قرار دیتی ہے اور انھیں ترقی پسند قوتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے دیکھنا چاہتی ہے۔ اب تک اسلام کے قدیم دعویدار (یعنی علماء) کا طبقہ انگریزی سیاست کا حریف رہا تھا کیونکہ جدید تہذیب کے ترقی پذیر عناصر میں انھیں اپنے وجود کے لئے خطرہ کی گھنٹی سنائی دے رہی تھی لیکن حالات کے بدلتے ہی برطانوی پالیسی بھی بدل گئی اور کل کے حریف آج کے حلیف بن گئے ایک طرف برطانوی سیاست کو ذہنی بیداری سے خطرہ پیدا ہو چکا تھا اور دوسری جانب رجعت پسند مسلمان برطانوی استبداد کو قبول کر سکتا تھا لیکن جدید تہذیب کو نہیں۔ چنانچہ اکبرؔ کی شاعری میں ہمیں اسی مفاہمت کی جھلک ملتی ہے۔ جہاں وہ سرسیدؔ، گاندھی، کانگریس اور جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی شرکت کی مخالفت کرتے ہیں وہاں ریل، انجن، "تار برقی" اور ٹائپ بھی ان کے طنز کے بے پناہ نشتروں کی زد میں ہیں۔ یہ بدلتے ہوئے رجحانات ایک مخصوص گروہ کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کے ترجمان ہیں۔ انھیں محض اسلامی قرار دینا تاریخ، سیاسیات و عمرانیات سے ناواقفیت کا ثبوت فراہم کرنا ہے۔ پھر یہ ادب اگر اسلام کے بنیادی عقاید کا ترجمان ہے تو اس اختلاف کے کیا اسباب ہیں؟ اس سوال کا جواب منطقی پینتروں سے دینا بھی آسان نہیں اور جہاں مابعد الطبیعات کے مسائل کو چھیڑا ہی نہ گیا ہو وہاں ان کی بنیاد پر کسی فرضی وحدت کی تعمیر ذہنی انتشار کا بیّن ثبوت ہے۔

اسلامی ادب کی اس تقسیم میں سب سے اہم وہ شاخ ہے جس میں مذہب سے گہرے طور پر متاثر ہو کر اس کی روحانی اقدار کا پرچار کیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے اقبالؔ کی شاعری اسلامی ادب کے دعویداروں کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اقبال کی صورت میں انھیں ایک بڑا ذہنی انہماک مل جاتا ہے۔ دراصل موجودہ نسل نے اسلام کو سمجھا ہی اقبال کی تعلیمات کے ذریعہ ہے اس لئے اسے ان کے افکار اور اسلام کے ابتدائی اصولوں میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اقبال نے اسلام سے گہرے طور پر متاثر ہو کر اپنی شاعری کے ذریعہ اس تاثر کا اعلیٰ درجہ فنکارانہ اظہار کیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر روحانی ہونے کے ساتھ ساتھ آفاقی بھی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعرانہ اثر پذیری و اثر آفرینی کے عمل میں مذہبی عقیدت کے دوش بدوش سماجی احساس کی کار فرمائی بھی ملتی ہے۔ اسی خلّاقانہ امتزاج میں ان کی شاعری کی عظمت کا راز پنہاں ہے۔ لیکن اقبال نے مذہبی تجربہ کو اس کے رسمی مفہوم میں استعمال نہیں کیا۔ مذہب کی صورت کا احساس بھی انھیں اس لئے ہوا کہ سرمایہ دارانہ استحصال نے انسانی اقدار کو پامال کر کے سماج میں لین دین کا جو رشتہ قائم کیا ہے وہ انسانی عظمت کے منافی ہے۔ اقبال انسانی عظمت کے علم بردار ہیں اس لئے وہ سرمایہ دارانہ نظام پر کاری ضرب لگاتے ہیں اور یہاں وہ ان تمام ترقی پسند قوتوں کے ہم نوا

ہیں جو اس ناجائز استحصال کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اگرچہ اقبال بھی افلاطون کی طرح کائنات کو بنیادی طور پر تصورات سے مرکب مانتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی دنیا میں بھی خیالات کی بادشاہی نظر آتی ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اقبال گہری نظر رکھتے ہیں اور عصر رواں کے فلسفیانہ رجحانات سے بخوبی آشنا ہیں جس کا اثر ہے ان کا فلسفہ خیال کی برتری تسلیم کر لینے کے باوجود جدید عصر کے عمل کے تقاضوں سے خالی نہیں۔ اقبال عمل کی غایت متعین کرنے میں ضرور خیال پرستی سے کام لیتے ہیں لیکن ان کے یہاں بھی ماحول اور فطرت کی تسخیر ہی عمل کے کارگر ہونے کی پہچان ہے وہ انسان کو ہنگامۂ موجود میں حصہ لیتے دیکھنا چاہتے ہیں اور اسے وارفتہ و معدوم رکھنا پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے اقبال نے افلاطونی اعیان نامشہود کو مردود قرار دیا اور یونانی فکر کے اثر سے مسلمانوں میں جو مسلک گوسفندی آ گیا تھا اس کے خلاف آواز اٹھائی اس کے علاوہ اقبال نے ہر لحظہ بدلتی ہوئی متحرک کائنات کا جو تصور پیش کیا وہ قدیم ٹھیری ہوئی کائنات کے تصور سے جس کی تخلیق مکمل ہو چکی ہے اور جس میں مطلق العنان خدا کی حکمرانی ہے' بہت کچھ مختلف ہے' ان کے یہاں انسان تخلیق کے عمل میں خدا کا شریک کار ہے اور خود خدا انسان کے ذریعہ ہی اپنی مشیت کی تکمیل کرتا ہے۔ تقدیر کا وہ پرانا تصور کہ "بے رضائے تو یکے برگ نہ جنبد ز درخت" انسان کے تخلیقی عمل سے بدل جاتا ہے۔ اگرچہ اقبال نے زمانہ کی کلیت سے اس کی فلسفیانہ توجیہ کی صورت نکالی ہے لیکن ہمارے لئے تقدیر کا یہ انقلابی تصور بھی کم نہیں کہ اس پھیلی ہوئی کائنات میں خارج سے عاید کئے ہوئے جبر کے بدلے وہ انسان کے لئے

"عزم او خلاق تقدیر حق است"

کی تفسیر بن جاتی ہے۔ اقبال کے نقطۂ نظر سے دگرگوں ہوتی ہوئی کائنات میں خدا کی مرضی پر راضی رہنا مستحسن نہیں ٹھیرتا بلکہ اپنی مرضی کے مطابق جد و جہد کرنا ہی برتر مذہبی قدر قرار پاتی ہے۔ اسی طرح ان کے یہاں اوامر و نواہی کا پابند خیر و شر کا وہ پرانا شرعی مفہوم باقی نہیں رہتا بلکہ ہر وہ چیز خیر ٹھیرتی ہے جو خودی کے استحکام میں مدد دے اور ہر وہ چیز شر بن جاتی ہے جو اسے ضعیف کرے۔ قدیم اسلام میں خدا سے انکار ناقابل معافی جرم تھا لیکن اقبال کے پیش کردہ اسلام میں خودی سے انکار ناقابل معافی گناہ ہے۔ وہ کہتے ہیں

"منکر او اگر شدی منکر خویشتن مشو"

ان تصورات کے پیش نظر اقبال کے یہاں اسلام کا رسمی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اور وجدان کے رچاؤ سے انسان کا عمل ہی کفر و اسلام میں امتیازی خطوط کھینچتا ہے چنانچہ مرد مسلمان بھی کافر و زندیق ہو سکتا ہے اور کافر کے لئے مسلمان ہونا بھی کوئی حیرت انگیز امر نہیں۔ اسی طرح اقبال کے یہاں ایرانی "زروانیت" کی جھلک جاوید نامہ میں ملتی ہے جہاں زمان و مکاں کی روح "زرواں" شاعر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے

من حیاتم من مماتم من نشور
من حساب و دوزخ و فردوس و حور

اقبال کی شاعری میں حیات بعد الموت کا معرکۃ الآرا مسئلہ بھی کہیں کہیں یقین کی سرحد چھوڑ کر امکانی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ عام مذہبی تصور کے بالکل برعکس ——— جس کے مطابق اس دنیا کے سارے اعمال کی غایت اس دنیا کی دوامی زندگی میں سزا یا جزا کا حصول ہے ——— اقبال دوسری زندگی کو مشروط قرار دیتے ہیں یعنی ہم اسے پا سکتے ہیں اگر حاصل کرنے کی تگ و دو کریں۔ گویا اب تک یہ دنیا مجاز تھی اور وہ دنیا حقیقت لیکن اقبال اس زندگی کو مشروط اور اس زندگی کو حقیقی قرار دیتے ہیں

دراصل اقبال کا خدا کا تصور بھی ان کے دائرۂ فکر کا اسیر ہے جس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں

تراشیدم صنم بر صورت خویش
بہ شکل خود خدا را نقش بستم'
مرا از خود برون رفتن محال است
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم!

اس طرح ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مذہب سے حاصل کردہ روحانی تاثر بھی ——— جو ادیب کی فکر و نظر کے حدود متعین کرتا ہے ——— دراصل

اپنے ماحول کے اثرات کے تابع ہے اور خارجی بنیادوں سے الگ ہو کر اس کا تجزیہ ہم محض مذہبی معتقدات کی روشنی میں نہیں کر سکتے۔

ہم جانتے ہیں کہ ماضی کے تہذیبی رجحانات کی چھاؤں حال کے حریری پردوں سے اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے اور آرٹ کے متنوع پیرایوں میں جانے یا ان جانے طور پر رنگ کے تاربنتی رہتی ہے۔ انسانوں کی کوئی معاشرت ماضی کے عظیم تہذیبی ورثہ سے اپنا تعلق منقطع نہیں کر سکتی۔ انسان پیدائش سے لے کر موت تک رسم و رواج کے پھیلے ہوئے سلسلوں میں گھرا رہتا ہے۔ کچھ چیزوں سے وہ بغاوت کر سکتا ہے لیکن اپنے ماحول کے تمام اثرات کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں۔ اگرچہ زندگی کی تغیر پذیر صلاحیتیں ان رسم و رواج کے سانچوں کو بھی نئی نئی صورتوں میں ڈھالتی رہتی ہیں چنانچہ اسلام نے بھی عرب سے لے کر ہندوستان تک ایک طویل تہذیبی مسافت طے کی ہے۔ یہ تہذیب بار بار دم لینے کے لئے راستے میں ٹھہری، اکثر مقامات کی رنگینیوں میں کھو گئی اور منزل پر پہنچ کر یہاں کی رنگ رلیوں میں شریک ہو گئی ہے۔ اپنی موجودہ صورت میں ہم اسے اسلامی کی بجائے ہند اسلامی تہذیب کہہ سکتے ہیں۔ اس تہذیب کے اثرات اپنے ماحول کے سماجی تقاضوں سے مل جل کر ادیبوں کی ذہنی تخلیقات میں بار بار دو رنگ بنتے ہیں۔ اردو ادب میں بھی ہمیں اس تہذیب کی چھاؤں مل سکتی ہے۔ لیکن ادیبوں کی ذہنی تخلیقات میں ان مؤثرات کو مذہبی یا مابعد الطبیعاتی عقائد کی جگہ اس مخصوص تہذیب کی پیداوار کہنا صحیح ہوگا۔

پاکستان کی تشکیل کے ساتھ البتہ حالات نے نئی کروٹ لی ہے اور اگر اس تاریخی حقیقت کی جھلک ہمارے ادب یا ہماری شاعری میں ملتی ہے تو یہ حقیقت نگاری کے خلاف نہیں۔ یہاں کے سماجی یا تہذیبی مسائل دوسرے ملکوں سے مختلف ہو سکتے ہیں اور ان ہی کی بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر عمل میں آئے گی لیکن محض اس بنیاد پر ادب میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے کا کوئی جواز پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس اختلاف کا تعلق مذہبی عقاید سے زیادہ اس سرزمین کے مخصوص مسائل اور یہاں کے تہذیبی تصورات سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے یہاں کا ادب مقامی رنگ کی تمام خصوصیات اپنے اندر جذب کر لینے کے باوجود عالمگیر انسانیت کی تہذیبی میراث ہوگا۔

آج اگر کسی گوشہ سے اسلامی ادب کی آواز اٹھتی ہے تو ہمیں یہ ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ اس کی تہہ میں اسلامی ہمدردی سے زیادہ اپنی اغراض کا تحفظ تو نہیں؟ مذہب کے نام پر یہاں کے سیدھے سادے عوام کو ان کی جائز جدوجہد کی راہ سے الگ ہٹانے کا کام عرصے سے جاری ہے اسی کے ساتھ ساتھ خود طاقت حاصل کرنے کے لئے بھی اسے بہترین وسیلہ بنا لیا گیا ہے۔ اس لئے آج اگر کوئی جماعت اسلامی ادب کی آواز بلند کرتی ہے تو ہمیں اس نعرہ سے قطع نظر یہ پرکھنا ہوگا کہ اس کے پیش کردہ افکار کس حد تک انسانیت، سماجی بہبودی اور جمہوریت کے معیار پر پورے اترتے ہیں؟ ان میں کہاں تک ہماری معاشرت کی صلاح و فلاح مد نظر رکھی گئی ہے؟ وہ استحصال کے خلاف جدوجہد میں کہاں تک محنت کش عوام کا ساتھ دیتے ہیں، یا اس سیل رواں کے راستے میں بند باندھنے کی کوشش کا نام ہیں؟

اردو ادب

(دس سالہ سرسری جائزہ)

سید ابو الخیر کشفی

میرا موضوع ہے اردو ادب کے دس سال ـــــ سنہ ۱۹۴۵ء سے سنہ ۱۹۵۵ء تک ـــــ کہنے کو یوں محض دس سال لیکن کتنے تیز رفتار اور اسی مدت کے بارے میں فراق نے کہا ہے ؎

ستاروں میں کب پہلے یہ گردش و تابش تھی
ہیں موڑ پہ صدیوں کے ، دن ایک مہینے کے

اردو ادیب نے زمانہ کی برق رفتاری کا ساتھ دیا ـــــ ہر عالمی تحریک سے ہمارا ادب اس دس سال کے عرصہ میں متاثر ہوا۔ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے انسان دوستی کو اپنا مطمحِ نظر بنایا، اور دنیا کے جس گوشے میں بھی ظلم و جبر ہوا۔ اردو کے فن کاروں نے اس کے خلاف احتجاج کیا ـــــ اِن عام تحریکات سے قطعِ نظر دو واقعات کا زیادہ اثر پڑا ـــــ دوسری جنگِ عظیم اور تقسیمِ ہند ـــــ دوسری جنگ عظیم نے شاعروں کو معاشی اور سیاسی شعور عطا کیا، اور تقسیمِ ہند تو ادیبوں کے ذہنی اور فکری توازن کا سب سے بڑا امتحان تھا ـــــ ان کے ذہن کے سامنے کتنے ہی سوال تھے ـــــ وحشت اور بربریت کا عریاں رقص، بازیافتہ اور اغوا شدہ خواتین، تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی تباہی و بربادی، اور سب سے بڑا سوال یہ کہ "کیا ہم دونوں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئے؟ ـــــ کیا ہمارے درمیان اب کوئی مشترک قدر نہیں؟" ـــــ مشترک قدروں کا سوال اردو والوں کے لئے بہت اہم تھا کیوں کہ وہ تو اردو زبان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ میراث سمجھتے آئے تھے ـــــ ان مسائل نے ادیبوں اور فن کاروں کے ذہن کو اس طرح گھیر لیا کہ حیرت اور کشمکش کے عناصر نے اُن کی تخلیقی قوت اُن سے چھین لی ـــــ جو ادیب اِن عناصر پر غالب آئے ان کے یہاں توازن نہ تھا اور فن کی جگہ جذباتی اُبال نے لے لی ـــــ اس کے لئے انہیں قصوروار ٹھیرانا مجھے ہمیشہ عجیب سا لگتا ہے۔ یہ تو نفسیاتی حقیقت تھی ـــــ ممتاز شیریں یہی دیکھتی رہیں کہ کرشن چندر ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی کوشش کے سوا اور کچھ نہیں کرتے ـــــ میں صرف یہ سوچتا ہوں کہ کرشن چندر لکھتا تو رہا اور مستقبل یہ نہیں کہہ سکے گا کہ وحشیوں کے ہجوم

میں کوئی بھی انسان نہ تھا ـــــ آہستہ آہستہ توازن، اعتدلال اور فنی ضبط و نظم ہمارے ادب میں پھر سے اپنی جگہ بنا تا رہا اور اس دس سال کے ادبی سرمایہ اور تخلیقات سے میں بڑی حد تک مطمئن ہوں ـــــ عسکری صاحب کہتے ہیں کہ اردو ادب مرگیا ـ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ جس دور میں خود عسکری صاحب نے اتنی اچھی تنقیدیں لکھی ہوں، وہ دور اردو ادب کی نئی زندگی کا دور ہے، موت کا نہیں ـــــ اس مختصر تمہید کے بعد دس سال کے اردو ادب کا ایک سرسری جائزہ پیش کرتا ہوں ـــــ اس جائزہ کو آپ مختصر نوٹ کہیں تو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔

اُردو تنقید

اُردو تنقید نے گزشتہ دس سال میں نئی وسعتیں حاصل کیں۔ نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ ہمارے نقادوں نے مختلف نظریوں کو اپنایا اور انہیں اپنی عملی تنقید میں ڈھالا۔ ادب اور دوسرے عمرانی مضامین کے رشتہ پر زور دیا گیا۔ نفسیاتی تنقید کی طرف توجہ کی گئی اور اس میں نئی گہرائی پیدا ہوئی۔ خالص ادبی اقدار کا پرچار بعض نقادوں نے اس انوکھے انداز سے کیا کہ زندگی بھی فن کا ایک پہلو بن گئی۔ نئی ادبی تحقیقات کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور پرانے ادب کا جدید انداز سے جائزہ لیا گیا۔

اردو تنقید کی اس گہرائی اور گیرائی میں پُرانوں کا بھی حصہ ہے اور نئے نقادوں کا بھی ـــــ مولوی عبدالحق، اثر لکھنوی، حامد حسن قادری، قاضی احمد میاں اختر، ڈاکٹر عندلیب شادانی، نیاز فتح پوری، ڈاکٹر اعجاز حسین اور ڈاکٹر سید عبداللہ...... یہ بزرگ تحقیق و تنقید کے امتزاج کے قائل ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب کی تحقیقات اور نگارشات نے اردو زبان کی تاریخ میں کئی سو سال کا اضافہ کر دیا۔ اثر لکھنوی فنی محاسن، زبان کی صحت کے ساتھ ساتھ موضوع اور طریقۂ اظہار پر بھی نظر رکھتے ہیں ـــــ اُن کے یہاں تلخ نوائی ضرور آجاتی ہے مگر انصاف کا دامن وہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ـــــ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے کلیم الدین احمد کی طرح پُرانے بُت توڑے۔ اُن کے فیصلوں سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور ہیں بھی اختلافات ہے۔ لیکن جدید تنقید کی تاریخ میں وہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے یہاں تحقیق اور تنقید کا جو توازن ہے وہ شاید کہیں اور نہ ملے ـــــ ڈاکٹر عبداللہ اسی وقت لکھتے ہیں جب انہیں کوئی نئی بات کہنی ہو ـــــ میر کے مزاج اور شاعری کا انہوں نے بڑا تفصیلی مطالعہ کیا ہے ـــــ تحقیق کے میدان میں ڈاکٹر گیان چند کا نام اس لئے اور زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ وہ انہیں دس سال کی "دریافت" ہیں ـــــ اردو کی داستانوں پر انہوں نے جس طرح دادِ تحقیق دی ہے۔ اس میں اُن کا کوئی ہم سر یا حریف نہیں۔

رشید احمد صدیقی، فراق گورکھپوری، کلیم الدین احمد، اور مجنوں گورکھپوری نے اس مدت میں کچھ ایسا زیادہ نہیں لکھا لیکن ان کی جو تنقیدیں ہمارے سامنے آئیں اُن میں تخلیق کی شان ہے ـــــ اِن چاروں کی تحریروں نے ہمارے ادیبوں کے تفکر پر گہرا اثر ڈالا ہے ـــــ رشید صاحب نے اکبر الہ آبادی اور اردو غزل پر مفصل مضمون لکھے ـــــ آج ہمارے ادب میں تین نقاد ایسے ہیں جن کی تخلیقی قوت اُن کی تنقید میں جگہ جگہ جھلک اٹھتی ہے اور وہ نقاد ہیں رشید احمد صدیقی، فراق اور حسن عسکری۔

ترقی پسند تنقید میں اس عرصہ میں پہلے سے کہیں گہرائی پیدا ہوئی۔ حالانکہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور احمد علی کی طویل تنقیدی خاموشی اب بھی محسوس ہوتی ہے۔ عالمی ادب پر ان کی گہری نگاہ سے اردو تنقید آج بھی بہت کچھ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ سید احتشام حسین نے ترقی پسند نقطۂ نظر کو اور زیادہ استحکام عطا کیا، انہوں نے نظریاتی مباحث پر بھی قلم اٹھایا اور نئے پرانے ادب کو بھی پرکھا۔ لیکن ان کے واضح نقطۂ نظر کے باوجود اُن کے یہاں ایک وسیع تنقیدی ہمدردی بھی ہے۔ اور پرانے ادب پر وہ جب بھی قلم اٹھاتے ہیں اسی ہمدردی کے ساتھ۔ ممتاز حسین نے ترقی پسند تنقید کو اور آگے بڑھایا احتشام کے بعد وہ اس دبستانِ تنقید کے سب سے ممتاز نقاد ہیں۔ لیکن ان کے نظریات اور اُن

کی عملی تنقید میں اب تک خوشگوار مفاہمت پیدا نہ ہوسکی۔ اس کا ایک سبب اُن کا قدرے الجھا ہوا اندازِ تحریر بھی ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن اس دبستانِ فکر کے نئے نقادوں میں بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ان کے خیالات میں بھی وضاحت ہے، اور اسلوبِ نگارش بھی بہت رواں ہے۔

آلِ احمد سرور انسی، توازن اور حد سے بڑھی ہوئی احتیاط کے ساتھ تنقیدیں لکھتے رہے ہیں جو ان کے مزاج کا ایک حصہ ہوگئی ہے۔ سرور صاحب ادیبوں اور شاعروں کے ذہن میں سفر کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہوجاتے ہیں۔ لیکن اکثر پڑھنے والے کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھنے کی کوشش میں اور خوبیوں کو قربان کر دیتے ہیں — سرور صاحب کو بات کہنے کا جو سلیقہ ہے وہ بہت کم نقادوں کو نصیب ہوا ہے۔ مگر یہ سلیقہ اکثر گہرائی پر اثر انداز ہوتا ہے — وہ تو بعض شاعروں کی طرح رعنائی پر خیال کو قربان کر دیتے ہیں۔

محمد حسن عسکری کی تنقید نے جھکیوں کی تنگنائے سے گذر کر نئی وسعتیں حاصل کر لی ہیں — اس دوران میں انہوں نے ایک بہت وقیع سلسلۂ مضامین لکھا۔ اس سے پہلے ادب پر نظریاتی بحثیں تو بہت ہوئیں لیکن عسکری نے ہمارے لئے اردو ادب کے نئے مسائل دریافت کئے، ادراک پر خیال افروز مضامین لکھے۔ ترجمہ کا مسئلہ، محاورہ۔ اور اردو نثر کے متعلق ان کے مضامین اردو تنقید میں ایک نئے دور کا آغاز کرتے ہیں — ادبی معیار کے Re valuation کی ایک انتہائی کامیاب کوشش ان کا مضمون "فن برائے فن" ہے — اس میں تو زندگی فن کی خالق بھی ہے اور فن کا ایک گوشہ بھی — اگر عسکری صاحب کے یہاں "دہشت پسندی" کچھ کم ہوجائے اور وہ "اردو ادب کی موت" کے قسم کے ہنگامہ خیز انکشافات نہ کیا کریں تو وہ بہت "پیارے" نقاد ہوجائیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سید وقار عظیم نے اردو تنقید میں نئے رجحانات کی ترویج کی ہے — عبادت بریلوی ادب اور زندگی کے رشتے پر اتنا زور دیتے ہیں کہ اب ان کی تنقیدی دنیا میں خیالات کے ساتھ ساتھ الفاظ کی بے مزا تکرار ملتی ہے لیکن ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اردو تنقید میں وضاحت پیدا کی۔ سیاسی حالات اور اجتماعی ماحول کے ساتھ فن کار کی شخصیت بھی نظر میں رکھتے ہیں۔ ان میں کام کرنے کا جو حوصلہ ہے وہ نئی پود میں مشکل سے کہیں ملے گا۔ اردو غزل اور اردو تنقید پر انہوں نے بہت لکھا ہے — ابواللیث صدیقی تنقید اور تحقیق کی ہم آہنگی کو ہمیشہ سامنے رکھتے ہیں۔ ترتیب کی اہمیت سے وہ اچھی طرح واقف ہیں — ان کے بیان کام کی زبان میں کام کی باتیں ملتی ہیں۔ لیکن یہ زبان بے رنگ نہیں بلکہ اس میں مناسب ادبی آہنگ ہے اور تنقید کے لئے یہی انداز مناسب ہے۔ سید وقار عظیم نے تو ویسے تمام ادبی موضوعات پر لکھا ہے لیکن افسانہ ان کا خاص موضوع ہے۔ اردو افسانہ پر ان کی نظر وسیع ہے۔ تمام نئی تحریکات، تجربے اور ٹکنیک کے تغیرات کا جائزہ ان کی تنقیدوں میں ملتا ہے۔ لیکن اب وقار صاحب داستانوں اور ڈراموں کی طرف متوجہ ہوئے ہیں — ان دونوں اصناف سے متعلق ان کی تنقیدات میں نہ تو گہرائی ہے اور نہ کوئی نیا اندازِ نظر۔

اس دس سال کی اردو تنقید کے سلسلہ میں ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے اپنے لئے موضوعات کا انتخاب کرلیا ہے، اس سے فائدہ یہ ہوا کہ مختلف موضوعات پر اب مستقل کتابوں کی کمی نہیں — ڈاکٹر یوسف حسین کی "اردو غزل" میں ہماری شاعری کی شہزادی شہرزاد کا ہر نقش اُبھر آیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث کے مطالعے بھی "غزل اور متغزلین" کے نام سے شائع ہوگئے ہیں — ڈاکٹر عبادت کی کتاب بھی زیرِ طبع ہے — ترقی پسند ادب پر علی سردار جعفری کی کتاب ترقی پسندوں کے نقطۂ نظر کا بہت اچھا اظہار ہے — مختلف موضوعات پر کئی اور اہم کتابیں اس عرصہ میں لکھی گئیں۔ مثلاً ڈاکٹر اعجاز حسین کی کتاب "مذہب و شاعری"، علی عباس حسینی کی "اردو ناول کی تاریخ اور تنقید"، ڈاکٹر احسن فاروقی کا تنقیدی جائزہ "اردو میں تنقید"، میر کی زندگی اور شاعری سے متعلق خواجہ احمد فاروقی کی کتاب

ڈاکٹر عبداللہ کا کتابچہ اردو تذکروں کے متعلق ـــــ وغیرہ وغیرہ۔

اور آخر میں مجھے خورشید الاسلام اور مجتبیٰ حسین کا ذکر کرنا ہے۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں Paradox سے کافی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ خورشید الاسلام نے تنقیدوں میں بھی یہی گر آزمایا ہے۔ اُن کا اندازِ تحریر ہمارے تمام نقادوں سے علیحدہ ہے، اور حسن عسکری کے اسلوب کی طرح اس میں بھی بلا کی انفرادیت ہے ـــــ خورشید الاسلام نے گنتی کے چند مضمون لکھے لیکن یہی چند مضامین انہیں اہم نقادوں کی صف میں جگہ دیتے ہیں ـــــ خورشید الاسلام کی تنقید کو مروجہ مفہوم اور اصلاح میں تاثراتی کہہ کر ٹال دینا بددیانتی سے کم نہیں ـــــ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے خوب صورت اسلوب میں اُلجھ کر سرسری پڑھنے والے اور ہمارے بیشتر نقاد معنویت پر غور نہیں کرتے بشلاً اُن کا یہ فقرہ کہ "شبلی پہلے یونانی ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہوئے" ـــــ یا غالب کی شاعری کے بارے میں ان کا یہ جملہ کہ "غالب کے آتے ہی اردو شاعری کفِ دست پر اپنی ٹھوڑی رکھ کر غرقِ حیرت ہوگئی" ـــــ "امراؤ جان ادا" پر خورشید الاسلام کی تنقید اب تک توحرفِ آخر ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بھی خورشید الاسلام کی طرح زیادہ نہیں لکھا۔ وہ لکھتے لکھتے طویل وقفوں کے لئے ادب سے روٹھ جاتے ہیں۔ فانی کے بارے میں اُن کا مضمون ہمیں اردو کے اس عظیم غزل گو کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے کی دعوت دیتا ہے ـــــ اُن کا ایک مضمون "چند ذوق نغمہ کمیابی" عرصہ تک ادبی نزاع کا سبب بنا رہا۔ اور یہی کیا کم ہے کہ ذہنی ٹھہراؤ کے اس دور میں لوگ چونکے تو ـــــ پھر مجتبیٰ حسین نے چونکانے کی خاطر وہ مضمون نہیں لکھا تھا بلکہ اپنے خیالات کا جرأت سے اظہار کیا تھا ـــــ اُن کی بعض رائیں یقیناً ناقابلِ قبول تھیں۔ لیکن یہی بات ہم دوسرے نقادوں کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس دس سال کے عرصہ میں ہمیں کئی اور اچھے، متوازن اور سنجیدہ نقاد نظر آتے ہیں ـــــ خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر عبدالشکور، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ظ۔ انصاری، اویس احمد ادیب، ڈاکٹر شوکت سبزواری، پروفیسر حنیف فوق، اور سلیم احمد کے نام مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

اُردو شاعری

اردو شاعری میں تغیر و تبدل اور تجربات کا سلسلہ تو سنہ ۱۹۳۶ء سے شروع ہوگیا تھا ـــــ ایک طرف کچھ شاعر نئے موضوعات اپنا رہے تھے اور دوسری طرف کچھ شاعر ہئیت کے سلسلہ میں نئے تجربے کر رہے تھے۔ ان شاعروں میں باہمی فرق کتنا ہی ہو مگر یہ سب اردو شاعری کے نئے امکانات کی سراغ رسی کر رہے تھے ـــــ ان شاعروں میں جو کس بل تھا اس کا اندازہ یوں کیجئے کہ سنہ ۱۹۴۵ء تک انہی کی آوازیں ہماری شاعری کے افق پر چھائی ہوئی تھیں۔ اور یہ شاعر تھے جوش۔ حفیظ۔ احسان دانش۔ ساغر نظامی۔ مجاز۔ جذبی۔ جاں نثار اختر۔ اور مخدوم وغیرہ ـــــ (آج حفیظ، احسان دانش اور ساغر نظامی کا تذکرہ ماضی کی بات معلوم ہونے لگا ہے) ـــــ یہ شاعر ہماری شاعری کے ایک نئے دور کے نقیب تھے۔ مگر فیض، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ساحر لدھیانوی، مختار صدیقی، قیوم نظر، سلام مچھلی شہری، یوسف ظفر، اختر الایمان، ابن انشا، ضیا جالندھری، ساحر لدھیانوی، تیغ الہ بادی (حال مصطفیٰ زیدی)، جعفر طاہر، عزیز حامد مدنی، کیفی اعظمی، ادا جعفری اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ، ان شاعروں کی صف میں شامل ہوئے اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سنہ ۴۵ء اور سنہ ۴۷ء سے اب تک انہیں کا دور ہے۔ اور اردو کی دس سالہ شاعری میں ان کا حصہ اپنے پیش روؤں سے زیادہ ہے۔ حالانکہ مجاز، جذبی، اور جاں نثار اختر اب بھی ہمیں مایوس نہیں کرتے اور کبھی کبھی کوئی ایسی چیز ہمارے شعر و ادب کو عطا کرتے ہیں جو ہمیں ان کی زندگی کا ازسرِ نو

احساس دلاتی ہے۔

کچھ دنوں پہلے جوش صاحب "قبلۂ رندانِ ادب" تھے۔ اور علی سردار جعفری نے اپنے ہم مشرب شاعروں کی امامت جوش صاحب کو عطا کی تھی — جو اپنے گھن گرج، خلوص اور بے پناہ قوت نظم کی بنا پر اردو ادب کی تاریخ میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں — اُن کی زندگی ہی میں یہ فیصلہ یقین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن آج کی اردو شاعری کا قبلہ فیض کی ذات ہے۔ ویسے تو ہماری جدید شاعری میں انقلاب کا صحیح تصور سب سے پہلے مخدوم نے پیش کیا ع گزر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے — جوش نے تو انقلابی نعروں کو ہمارے اعصاب پر سوار کر دیا تھا، مگر اردو کی انقلابی شاعری کی تکمیل فیض نے کر دی — اُن کے یہاں جس قدر فنی نظم و ضبط ہے اُس کی کوئی دوسری مثال ہمیں جدید ادب میں نہیں ملے گی — فیض کی انقلابی شاعری میں بھی "دستِ صبا" کی نرمی ہے۔ اِسی لئے اُن کی آواز ہمیں صرف آمادۂ پیکار ہی نہیں کرتی بلکہ ہمارے دلوں کو ڈھارس بھی بندھاتی ہے، اور ہمارے دل کے زخموں پر مرہم بھی رکھتی ہے — فیض کی آواز کبھی جذبات کی شدت سے بے سُری نہیں ہوتی — وہ تو ایک ظالم حکومت کے ظلم کو بھی جفائے محبوب کے روپ میں دیکھتا ہے۔ شاعرانہ تجربے کی عظمت کی بنیاد ایسی ہی نظر اور ایسا ہی مزاج ہو سکتا ہے — اُس کے یہاں ذاتی عشق اور وطن سے عشق میں کوئی تضاد نہیں، اور یہی دونوں عشق اُس کا سرمایۂ حیات ہیں —

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دُشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اِس دل پہ بجز داغِ ندامت

احمد ندیم قاسمی نے اپنی شخصیت کا اظہار ہر صنفِ ادب میں کیا ہے، اور اُن کے خلوص نے ہر جگہ ان کا ساتھ دیا — اُن کا فن صہبا کو آبگینے میں ڈھالنا نہیں، بلکہ اُن کی صہبا میں وہ تندی ہے کہ آبگینہ خود پگھل جاتا ہے — جنگِ عظیم کے ردِّ عمل نے ان سے "ہیروشیما اور ہیروشیما کے بعد" لکھایا اور تقسیم کے بعد زندگی کی عبرت سامانی۔ اُن کے یہاں افسانے کے قالب میں کم اور شاعری کے پیمانے میں زیادہ نظر آتی ہے —

علی سردار جعفری نے "نئی دنیا کو سلام" لکھ کر اپنے کتنے ہی رفیقوں کو گردِ سفر کی طرح پیچھے چھوڑ دیا — "نئی دنیا کو سلام" عہدِ حاضر کی سب سے بہتر تمثیلی نظم ہے، کسی دوسرے شاعر نے اتنے بڑے پیمانے پر اِدھر کافی عرصہ سے کوئی ایسی چیز نہیں لکھی — اس نظم کے مختلف حصوں میں مختلف بحروں کا انتخاب بہت ہی کامیاب ہے — کہیں درانتی کی کاٹ ہے اور کہیں بچے کے ہونٹوں کا تبسم — مختار صدیقی نے بھی دوسروں سے ہٹ کر اپنے لئے راہ چنی — موسیقی اور شاعری کا تعلق تو ظاہر ہے لیکن مختار صدیقی نے موسیقی کو سازوں کی دنیا سے اغوا کر کے الفاظ میں ڈھال دیا — فیض کے بعد اختر الایمان میرے نزدیک اس عہد کے سب سے اچھے شاعر ہیں۔ (یہ میری ذاتی رائے ہے) — اختر الایمان جیسا تفکر تو کسی کے یہاں نہیں — پھر اختر الایمان کی شاعرانہ لغت (Diction) دوسروں سے مختلف ہے — زندگی کے ساتھ ساتھ حُسن سے جو وابستگی اختر الایمان کو ہے اور انسانی عظمت و بے بسی کا بیک وقت جو گہرا احساس اسے ہے شاید ہی کسی اور کو ہو — اس کی ایک مختصر نظم "سرِ راہے" میں زندگی، حسن اور آج کے شاعر کے باہمی تعلقات کچھ اس انداز سے پیش کئے گئے ہیں کہ ہم اسے اردو کے نئے شاعروں کا منشور کہہ سکتے ہیں — مثالوں سے میں قصداً گریز کر رہا ہوں لیکن یہ نظم — شاید مجھے آگے نہ بڑھنے دے۔

"شبِ ماہ بھی تو سحر بھی تو
کہ فغاں بھی تو ہے اثر بھی تو

یہ تری بہار کے دن سہی
یہ ترے نکھار کے دن سہی
سرِ راہ یوں نہ بہک کے چل
نہ مٹا کسی کو سنبھل سنبھل
کہ زمیں پہ رہتے ہیں اور بھی
جنہیں حسن سے بھی لگاؤ ہے
جنہیں زندگی بھی عزیز ہے

ساحر لدھیانوی کو جدید تر شعراء میں شاید سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ مقبولیت انہیں اپنی رومانی نظموں اور تاج محل کی وجہ سے نصیب ہوئی۔ کیوں کہ ان نظموں میں عنفوانِ شباب کے کچے، خام کار مگر بے حد گرم و شدید عشق کا اظہار ہے ـــــ ساحر نے اس عہدِ شباب کی شاعری سے گزر کر زندگی کی آگے بڑھتی ہوئی طاقتوں سے اپنا ناتہ جوڑ لیا، اور ان کی انقلابی شاعری کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ابن انشا ان سب کی نسبت نیا ہے۔ لیکن اس نے اردو میں طویل نظم کی روایت کو بہت آگے بڑھا دیا۔ وہ شاعری میں اپنا ایک مزاج رکھتا ہے، اور وہ ہے "الف لیلائی مزاج" لیکن وہ "بزم ہارون" میں بھی سوتا نہیں بلکہ اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہے اور انسانی دکھ درد کا احساس یہاں بھی اس کے نغموں کا پیچھا نہیں چھوڑتا ـــــ ابن انشا کی عشقیہ نظموں میں "چاند" ایک کردار کی حیثیت رکھتا ہے، جو بھیس بدل بدل کر بار بار نظر آتا ہے ـــــ ابنِ انشا اس دنیا کا نہیں بلکہ چاند نگر کا باسی ہے۔

ضیا جالندھری، عزیز حامد مدنی، تیغ الہ آبادی اور جعفر طاہر اس دس سالہ شاعری کی تاریخ میں کتنے ہی شاعروں کے ہجوم میں دوسروں سے بہت الگ اور بلند قد نظر آتے ہیں ـــــ ان سب کے یہاں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے حیات و کائنات کی وسعتوں کا احساس ـــــ عزیز حامد مدنی اور تیغ الہ بادی نے اپنی طویل نظموں میں تو انسان کی ذہنی اور فکری زندگی کے کتنے ہی ابواب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ جعفر طاہر نے بھی طویل نظم کو اپنایا ہے اور جہاں تک الفاظ کے انتخاب کا تعلق ہے وہ اپنے تمام ہم عصروں سے علیحدہ ایک رنگ رکھتے ہیں ـــــ Diction میں انہوں نے کئی تجربے کئے لیکن یہ تجربے صرف تجربے ہی نہیں بلکہ بڑی شاعری بھی ہیں ـــــ ہمارے شاعر جو الفاظ استعمال کر رہے تھے ان کا Range بہت محدود تھا۔ جعفر طاہر فارسی اور ہندی کے نئے الفاظ سے ہماری شاعرانہ لغت کو مالا مال کر رہے ہیں، اور ان الفاظ کے استعمال کا سلیقہ بھی انہیں حاصل ہے ـــــ پھر یہ الفاظ ان کے موضوعات کے عین مطابق ہوتے ہیں ـــــ

جن شعراء کے نام میں پہلے پیش کر چکا ہوں، ان کے علاوہ کئی اور ذہین شاعر اپنے افکار اور فن سے نئی اردو شاعری میں اچھے اضافے کر رہے ہیں، لیکن ابھی ان کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا ـــــ ان کو ابھی عظمت اور بلندی سے ہم کنار ہونے کے لئے کتنے ہی مرحلوں سے گزرنا ہے۔ قتیل شفائی، ظہور نظر، احمد راہی، عارف عبدالمتین، حمایت علی شاعر، ترپش کمار شاد اور احمد فراز وغیرہ ایسے ہی شعراء میں سے چند ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہماری نظم نگاری میں بعض عناصر کا احیاء ہوا، اور بعض نئے عناصر پیدا ہوئے ـــــ اقبال کے بعد قومی و ملی شاعری اثر صہبائی، امینِ حزیں اور اسد ملتانی وغیرہ کے دم قدم سے بالکل رسمی سی چیز ہو کر رہ گئی تھی ـــــ قیامِ پاکستان نے ہمارے شاعروں کو بے حد متاثر کیا، اور قومی شاعری میں نئی راہیں پیدا ہوئیں۔ اور نئے انداز کی نظمیں کہی جانے لگیں ـــــ ان نظموں میں جو تہذیبی شعور

ہے اس سے پہلے اقبال کے سوا اور کہیں نہ تھا ــــ حمید نسیم نے پہلا قومی غنائیہ ــــ "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" لکھا ــــ اس میں نظم معرّیٰ اور نظم پابند کا امتزاج بہت خوب صورت ہے، اور حمید نسیم نے ملتِ اسلامیۂ برصغیر کی جدّوجہد آزادی کو خوب صورت شاعرانہ اشاروں میں مقید کردیا ــــ شان الحق حقی نے اس سے زیادہ وسعت کے ساتھ ایک غنائیہ لکھا "کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد" ــــ اس غنائیہ میں شعر و موسیقی کا بہت ہی رچا ہوا آہنگ موجود ہے، اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بہتر قومی غنائیہ اب تک نہیں لکھا گیا ــــ حقی نے اجتماعی جذبات کو تغزل عطا کیا ہے۔ اسی لئے اس غنائیہ میں رپورٹنگ نہیں بلکہ جذبہ ہے ــــ ش صحٰی نے بھی اچھی قومی نظمیں لکھی ہیں، خاص طور پر ان کا "ساقی نامہ"

اردو نظم کے سلسلہ میں سیّد محمد جعفری کا تذکرہ میں نے دانستہ نہیں کیا ہے کیونکہ ادب طنز و مزاح پر لکھتے ہوئے میں نے نثر و نظم کی تخصیص نہیں کی۔

ان نوجوان شاعروں کے علاوہ مانے ہوئے نظم گو شعرا بھی دس سال کے اس عرصہ میں اپنے افکار پیش کرتے رہے ہیں مثلاً جوش ملیح آبادی، علی اختر حیدرآبادی، روش صدیقی، اور پروفیسر شور وغیرہ ــــ شاد عارفی نہ جانے اب غزل کی طرف کیوں ملتفت ہوگئے ہیں۔ ورنہ ان کے طرز کی نظمیں اس دور میں اور کس نے لکھی ہیں؟ ــــ ویسے تو ان کی غزل میں بھی نظمیت اور ان کا مخصوص طنزیہ انداز موجود ہے۔ غزل گو شعرا میں سے فراق گورکھپوری اور اثر لکھنوی نے بہت سی اچھی نظمیں لکھیں۔ خاص طور پر فراق کی نظم "آدھی رات" اور اثر کا ترجمہ ــــ دانتے کا جہنم، تاثیر مرحوم کی نظم "یدِ بیضا" فن کی بلندیوں اور فن کار کے تخیلات کی آئینہ دار ہے۔ اس موضوع پر پچھلے دس سال میں اور کوئی ایسی اچھی نظم نہیں کہی گئی۔

سنہ ۴۵ء اور سنہ ۴۶ء تک تو نظم کا دور رہا۔ لیکن سنہ ۴۷ء سے غزل کی تجدید اور احیا ہوا ــــ غزل نے ہمیشہ سماجی اور خارجی محرکات سے اپنے کو ہم آہنگ کرکے ہر ادبی بحران پر قابو پالیا، اور اس کا سبب غزل کی بہت ہی معنوی اشاریت ہے ــــ سنہ ۴۷ء سے لے کر اب تک غزل نظم پر حاوی رہی ہے اور غزل کو وسیلۂ اظہار بناکر ہمارے شاعروں نے اسے نئے تقاضوں کا متحمل بنایا ــــ غزل کی اس مقبولیت کا سبب موجودہ حالات میں تلاش کیا جاسکتا ہے ــــ سنہ ۴۷ء کے فسادات، انسان کی انسان دشمنی، دونوں حکومتوں کے غیر جمہوری رجحانات اور زبان و قلم پر پابندی ــــ ان حالات میں تفصیل سے کام نہیں لیا جاسکتا بلکہ بات اشاروں ہی میں کہی جاسکتی ہے اور غزل تو انسانی روح کا اشارہ اور سرگوشی ہے۔

استادوں اور پرانے غزل گو شاعروں نے بھی نئے حالات کو سمجھا اور غزل کے نئے رجحانات کی تخلیق میں وہی پیش رو رہے ــــ خاص طور پر فراق گورکھپوری، اثر لکھنوی اور جگر مرادآبادی، ــــ جگر کا تو اندازِ سخن ہی بدل گیا ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزلخواں ہے آج کل

اور غمِ دوراں یوں کبھی غزل کے آئینہ میں نہ جھلکا تھا ؎

حوادثِ غمِ دوراں نے پھر کہا "تسلیم"
لطافتِ غمِ جاناں کا ذکر آیا تھا

ــــ ثاقب کانپوری

آج کی اردو غزل میں چھالوں کی سی کیفیت ہے ــــ چھالے جو دکھتے ہیں مگر پھوٹ بہنے کے قائل نہیں ــــ فسادات کا اثر مشرقی اور

مغربی پنجاب کے اردو شاعروں کے یہاں زیادہ نمایاں ہے۔ خاص طور پر احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی اور جگن ناتھ آزاد کے یہاں
—— لیکن غزل کا موضوع آج صرف یہ نہیں غزل نے کتنے ہی موضوعات تسخیر کرکے اپنی مملکت میں شامل کرلئے ہیں —— فیض آج کے
غزل گو شعرا کے کارواں میں بھی اپنے ہم سفروں سے بہت آگے ہیں۔ فیض اور حفیظ ہوشیارپوری کی غزلوں کو آج کی اردو غزل کا بہترین ترجمان کہا
جا سکتا ہے —— فیض نے غزل کی روایت میں قابلِ قدر اضافے کئے ہیں۔ ہماری شاعری میں عشق و بغاوت کی معراج اب تک دار و رسن تھی
لیکن فیض نے اس روایت کو بدل دیا —— کیوں کہ رسن و دار سے آج کا عاشق بلند تر ہے ؎

گلوئے عشق کو دار و رسن پہونچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

فیض کے اشعار آج ہر ذہن میں گونج رہے ہیں اسی لئے زیادہ مثالوں کی ضرورت نہیں —— حفیظ کی غزلوں میں ہماری بہترین عشقیہ
اور تمدنی روایات بھی ہیں اور وسیع انسان دوستی بھی —— انسان دوستی کا ایسا اظہار غزل کی حدود میں اور کسی جدید غزل گو سے نہ ہوسکا ؎

تعبیر کیا تو نے اِسے عشق سے ورنہ
کس کے لئے اے دوست پریشاں ہوئے ہم
محدود ہے غم ایک نہ اک آفتِ جاں تک
افسوس حریفِ غمِ انساں، نہ ہوئے ہم!

دس سال کی اس مدت میں غزل کے سلسلہ میں متذکرۂ بالا شاعروں کے علاوہ سیف، ندیم، احمد ندیم قاسمی، ابنِ انشا، شان الحق
حقی، ناصر کاظمی، باقی صدیقی اور سلیم احمد کے نام زیادہ نمایاں اور ممتاز ہیں —— اردو غزل اس باب میں خوش قسمت ہے کہ ان شعراء
کے علاوہ اور بہت سے نوجوان آرائشِ خمِ گیسوئے غزل میں مصروف ہیں —— اِن تمام شعرا کے فن کا جائزہ اس مختصر تبصرہ میں ممکن
نہیں —— آخر میں نئے شاعروں کے دو شعر پیش کرتا ہوں (اور ستم یہ کہ ان شاعروں کے نام بھی مجھے معلوم نہیں) —— ان اشعار
سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو غزل ستارہ شکنی اور آفتاب سازی میں مصروف ہے اور اس کی کامیابی یقینی ہے —— پہلا شعر تو اردو اور
فارسی کے "زندانی ادب" میں یقیناً ایک اضافہ ہے —— اور میں بغیر کسی جھجک کے کہتا ہوں کہ زنداں کے بارے میں ایسا شعر تو فیض کے
"دستِ صبا" میں بھی نہیں —— اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فیض جیل میں آرام سے رہے ہوں اور تنہا کوٹھری کی تنہائیوں کے تجربہ سے
نہ گزرے ہوں —— کتنے عظیم تجربہ کا اظہار ہے یہ شعر ؎

کچھ عجب بوئے نفس آتی ہے دیواروں سے
ہائے زنداں میں بھی کیا لوگ تھے ہم سے پہلے

دوسرا شعر یہ ہے ؎

ہوس کو ملتا ہے ہر شب ہی یاسمن سا بدن
نصیبِ عشق وہی یادِ بوئے پیراہن

اردو افسانہ

سنہ ۴۵ء میں جو ہمارے اس مطالعہ کا نقطۂ آغاز ہے، اردو افسانہ اپنی انتہائی بلندیوں پر ملتا ہے —— ایک طرف تو پریم چند

اسکول کے مقلد علی عباس حسینی، ڈاکٹر اعظم کریوی اور سدرشن ہماری عوامی اور دیہاتی زندگی کو پیش کر رہے تھے ــــ اور دوسری طرف حیات اللہ انصاری، احمد علی، فیاض محمود، پروفیسر اختر انصاری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر رشید جہاں نے نئی روایات قایم کیں ــــ سنہ ۱۹۳۹ء سے ہمارے افسانے کو جس نئے گروہ سے سابقہ پڑا، اس نے زندگی کے ہر پہلو کو افسانوں کے ذریعہ پیش کیا ــــ اس گروہ کے راہبر اور نقیب کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو ہیں، اور یہ چاروں میرے نزدیک اردو افسانے کے بہترین ترجمان ہیں ــــ ان کے ساتھ ساتھ اس دور میں صف اول کے کئی اور افسانہ نگار ملتے ہیں۔ ان سب کے فن میں ایک انفرادیت ہے، یہ سب نئے موضوعات اور نئے تجربات اپنے دامن میں لے کر آئے ــ اوپندر ناتھ اشک، غلام عباس، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، ابراہیم جلیس، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، ہاجرہ مسرور، ان کی بہن خدیجہ مستور اور شفیق الرحمن ــــ زیادہ ممتاز حیثیت رکھتے ہیں ــــ اس دور میں موضوعات کی وسعت کے ساتھ ساتھ تکنیک کے نت نئے تجربے ملتے ہیں۔ ہمارے اس دور کے افسانوں میں آفاقی محبت بھی ہے اور جنسی رومان بھی۔ سیاسی شعور بھی اور نہاں خانۂ دل کے تجزیئے بھی۔

کرشن چندر کی افسانہ نگاری میں جو تنوع ہے، انہوں نے جو تجربات کئے، ان کا فن جن ارتقائی منزلوں سے گزرا، اس سلسلہ میں ان کا کوئی حریف اور مقابل نہیں ــــ کرشن چندر نے کشمیر کی خالص رومانی کہانیاں لکھیں، پھر ان کہانیوں میں تلخیاں بھی ابھر آئیں۔ فسادات پر ان کا افسانوی احتجاج تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ قحط بنگال کو انہوں نے اَن داتا لکھ کر ہمیشہ کے لئے ادبی تاریخ کا حصہ بنا دیا۔ اردو میں بغیر پلاٹ کی کہانی لکھی، پہلا رپورتاژ لکھا۔

عصمت چغتائی کرشن چندر سے زیادہ چابکدست فن کار ہیں۔ مسلمانوں کے متوسط طبقہ کی ذہنی اور گھریلو زندگی کی عکاسی ان سے بہتر کسی نے نہیں کی۔ ناگفتنی باتوں کے کہنے کا جو سلیقہ انہیں ہے وہ منٹو کے یہاں بھی نہیں ملتا ــــ اردو کے افسانہ نگاروں میں زبان پر جیسی قدرت عصمت کو ہے کسی اور کو نہیں۔

راجندر سنگھ بیدی فنی حیثیت سے اردو کے سب سے اچھے افسانہ نگار ہیں ــــ رومانیت اور سنگین حقیقت نگاری کو انہوں نے نئے انداز سے افسانہ میں یک جا کر دیا ــــ ان کی حقیقت نگاری بڑی بے رحم ہے۔

سعادت حسن منٹو اردو کا سب سے بدنام افسانہ نگار رہا ہے ــــ ہمارے دوسرے افسانہ نگار اپنی مجموعی کاوش کی بنا پر زندہ رہیں گے لیکن منٹو نے جتنے غیر فانی افسانے لکھے شاید کسی نے نہیں لکھے ــــ "نیا قانون"، "ہتک" اور "بابو گوپی ناتھ" اردو کے افسانوی ادب کا نقطۂ عروج ہیں۔

دوسروں نے جماعت کا حق ادا کیا اور ممتاز مفتی اور محمد حسن عسکری نے "فرد" کو اہمیت دی ــــ آخر فرد بھی تو ایک جماعت اور تمدن کا حصہ ہوتا ہے ــــ ممتاز مفتی نے انسان کے شعور اور لاشعور کی گرہیں کھولیں۔ کہیں کہیں وہ خود بھی اُلجھ گئے ــــ حسن عسکری کے بارے میں اختصار کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر کرشن چندر جدید ہے تو عسکری جدید تر ــــ عسکری کے افسانے اس کے تمدنی مشاہدہ اور مشرق و مغرب کے بہترین ادب کے مطالعہ کا امتزاج پیش کرتے ہیں ــــ "ذکر انور" اور "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" جیسے افسانوں کا خالق ہمیشگی کی زندگی حاصل چکا ہے ہمارے ادب میں۔

تقسیم ہند کے بعد ہمارا افسانہ رو بہ انحطاط نظر آتا ہے ــــ اس انقلاب نے ہمارے افسانوی ادب سے گہرائی اور توازن چھین لیا ــــ کتنے ہی افسانہ نگار اپنی تخلیقی قوت کھو بیٹھے، اور ان میں عسکری، فیاض محمود، اختر حسین رائے پوری اور احمد علی جیسے

لکھنے والے بھی موجود ہیں۔ کرشن چندر نے جو کچھ فسادات کے موضوع پر لکھا اس میں فن کم ۔ اور جذبات زیادہ ـــ لیکن اس دور میں کرشن چندر کے یہاں انسانی محبت، بچوں کی معصومیت اور سیاسی شعور ابھر آیا ہے ۔

تقسیم کے بعد پرانے افسانہ نگاروں میں سے اگر کسی نے نئی بلندیاں حاصل کیں، تو وہ سعادت حسن منٹو ہے ۔ سنہ ۴۷ء کے بعد اس کے افسانوں میں "جنس" مقصد نہیں بلکہ اس نے جنسی مسائل کو زندگی اور حیات و کائنات کے پس منظر میں دیکھنا شروع کیا ۔

منٹو کے علاوہ غلام عباس، احمد ندیم قاسمی اور ممتاز مفتی نے بھی نہ صرف اپنے معیار کو باقی رکھا بلکہ بہت اچھی اور مکمل کہانیاں لکھیں ـــ غلام عباس کا "اوورکوٹ" اور قاسمی کا "رئیس خانہ" اور "نمونہ" اس کی اچھی مثالیں ہیں ۔

تقسیم کے بعد انحطاط نظر آتا ہے لیکن جمود نہیں ـــ پرانے افسانہ نگار حالات سے مطابقت پیدا نہ کرسکے لیکن ان کی جگہ نئے لکھنے والوں نے لے لی ـــ ان لکھنے والوں نے اس مختصر عرصہ میں اپنی فنی انفرادیت کو اجاگر کیا ۔ طریقۂ اظہار کے نئے تجربے کئے ـــ اور ابھی ان میں سے کئی تھکے نہیں بلکہ آگے بڑھ رہے ہیں ـــ ان افسانہ نگاروں میں قدرت اللہ شہاب، انور، اشفاق احمد، اے ۔ حمید، شوکت صدیقی، آغا بابر، جاوید جعفری، تسنیم سلیم چھتاری اور انتظار حسین[1] ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا مطالعہ اردو افسانے کے ہر طالب علم کے لئے لازمی ہے ۔

قدرت اللہ شہاب نے کئی اچھے افسانے لکھے، اور ان کا طویل افسانہ "یا خدا" فسادات پر بہت اچھے افسانوں میں سے ایک ہے ـــ انور کا طنز زندگی کے عرفان سے پیدا ہوا ہے ـــ اشفاق احمد نئے افسانہ نگاروں میں تو مجھے سب سے بلند قد نظر آتے ہیں، "شب خون"، "امی" اور "بابا لوگ" یہ افسانے نہیں بلکہ نئے عناصر ہیں ـــ "گڈریا" میں جو فنی نظم و ضبط اور تمدنی پس منظر ہے وہ اتنی تفصیل کے ساتھ فسادات کے موضوع پر کسی اور افسانے میں نظر نہیں آتا ـــ اے ۔ حمید اردو افسانہ میں نئی رومانیت لے کر آیا ـــ اس کے یہاں حجاب امتیاز علی کی سی تکرار نہیں ـــ اس کے رومان میں دوسری جنگ عظیم کی تلخیاں بھی نظر آتی ہیں اور اس جیسی خوب صورت شاعرانہ نثر کرشن چندر کو چھوڑ کر مشکل سے کہیں نظر آئے گی ۔

اس مضمون کے مختصر حدود میں کئی اہم افسانہ نگاروں مثلاً شوکت صدیقی، انور عظیم، آغا بابر، اور انتظار حسین کے بارے میں لکھنے کی گنجائش میں نہ نکال سکا ۔ لیکن یہ سب آج کے اردو افسانہ کے بہترین فن کار ہیں ۔ شوکت مخصوص ماحول اور کرداروں کی تخلیق بڑی محنت سے کرتے ہیں ۔ انتظار حسین کی افسانہ نگاری کا محور ان گلی کوچوں کی یاد ہے جو سرحد کے اس پار رہ گئی ـــ یہ تہذیبی اور تمدنی شعور حسن عسکری کے بعد ہمیں انتظار حسین ہی کے یہاں ملتا ہے ۔

آج کا اردو افسانہ نگار زندگی کے نئے سفر کا راہرو ہے ـــ دیکھئے کہ وہ اس قافلۂ حیات کا راہبر کب بن سکے گا ؟

"رپورتاژ" اور "شخصی خاکوں" کے بارے میں مجبوری کے احساس کے ساتھ ان کا ذکر نہیں کرتا ہوں ۔ کرشن چندر کے "پودے" کو اردو کا پہلا رپورتاژ قرار دیا جاسکتا ہے ۔ لیکن اس میں وہ حقیقت نگاری نہیں جو رپورتاژ کا خاصہ ہوتی ہے اس میں افسانوی رنگ ابھر آیا ہے ۔ شاہد احمد دہلوی کا رپورتاژ ادبی حقیقت نگاری کے معیار پر پورا اترتا ہے ـــ "دلی کی بپتا" کا سا تاثر بہت کم نئی تحریروں میں نظر آئے گا ۔ یہاں فن کار نے ذاتی تجربات کو ادبی آنچ سے آفاقی بنا دیا ہے ۔ محمود ہاشمی کے رپورتاژ "کشمیر اداس ہے" میں ہر نقش واضح ہے، موضوع کے ساتھ انہوں نے خلوص برتا ہے لیکن افسانوی لہر یہاں بھی ہے ـــ اردو رپورتاژوں کے سلسلہ میں انتظار حسین کے "سانجھ بھئی چہو دیس" کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ـــ

[1] ان کے علاوہ رضیہ سجاد ظہیر، عزیز اثری، دیویندر اسر اور جیلانی بانو بھی قابل ذکر ہیں (ک)

شخصی خاکوں کو دس سال کے اس عرصے میں کافی فروغ حاصل ہوا ـــ مشہور ادیبوں نے اپنے ہم عصروں کے خاکے لکھے۔ کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے کتابچے اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں ـــ منٹو نے تو شخصی خاکوں کا مجموعہ پیش کیا ـــ "گنجے فرشتے" ـــ اس بزم میں جتنے بھی فرشتے شریک ہوئے ہیں، ان سب کا مونڈن منٹو نے بڑے سلیقے سے کیا ہے۔ لیکن ان خاکوں میں ہمیں عصمت کے "دوزخی" کے معیار کا کوئی خاکہ نہیں ملتا ـــ احمد بشیر اور نصر اللہ خاں نے بھی کئی اچھے خاکے لکھے، اور خاص طور پر نصر اللہ خاں نے شاہد احمد دہلوی کی جو تصویر پیش کی ہے وہ نوک پلک سے پوری طرح درست ہے ـــ محمد حسن عسکری نے ہم عصر ادیبوں کے بارے میں جو مضامین لکھے ہیں ان میں خاکوں کی جھلک تو ہے لیکن وہ مکمل خاکے نہیں ہیں، انہیں ادبی و شخصی تاثرات کہنا بہتر ہوگا۔[1]

ناول

ناول اور ڈرامہ، یہ دونوں اصناف میرے نزدیک اردو ادب کے ویران گوشے ہیں ـــ نذیر احمد، سرشار اور ہادی رسوا نے جس روایت کو ہمارے ادب میں قائم کیا وہ زیادہ مستحکم نہ ہو سکی، اور نہ اُس کی جڑیں ہمارے ادبی مزاج میں پیوست ہو سکیں ـــ پریم چند نے یقیناً زندگی کے کئی پہلوؤں سے ہماری ناول کو آشنا کیا اور پھر اُن کے بعد محفل پر سناٹا تھا۔

گزشتہ دس سال کے ناولوں پر نظر ڈالتے ہوئے مجموعی طور پر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے فن کاروں نے اردو ادب کی اس کم مائگی کا احساس کیا، اور وہ ناول نگاری کی طرف متوجہ ہوئے ـــ سجاد ظہیر کا ناولٹ "لندن کی ایک رات" اس سلسلہ کی پہلی کرن کی حیثیت رکھتا ہے ـــ اس کے بعد کرشن چندر، عزیز احمد اور عصمت چغتائی نے اردو ناول کے ارتقا میں حصہ لیا ـــ کرشن، عزیز احمد اور عصمت کے فن کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اس ضمن میں مجھے کوئی نیا فیصلہ نہیں دینا ہے اور نہ تفصیلی تنقید کرنی ہے۔ کرشن چندر کی "شکست" کشمیر کا پہلا دستاویزی اور مفصل مطالعہ ہے۔ ویسے تو کشمیر کرشن چندر کے افکار کی سرزمین ہے اور وہ بہت سے افسانے کشمیر کے متعلق لکھ چکے تھے لیکن شکست میں کرشن چندر نے اپنے مطالعہ میں تفصیلات کی مدد سے مینا کاری کرنی چاہی ہے۔ کرشن کے فن میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر اُن کی جذباتیت اُن کے یہاں بیدی کا سا نظم وضبط پیدا نہیں ہونے دیتی۔ اسی لئے شکست میں ایک بہت اچھے ناول کی تنظیم نہیں ـــ ہاں اس کے بعض ٹکڑے اور مناظر اردو نثر میں بڑی اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ "جب کھیت جاگے" میرے نزدیک نہ تو ناول ہے اور نہ ناولٹ ـــ اب کرشن چندر نے حوصلے کے ساتھ ناول کی طرف متوجہ ہوئے ہیں ـــ "طوفان کی کلیاں" پانچ ناولوں کے سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ اس ناول میں کرشن چندر کشمیر کی روح سے اور زیادہ قریب آ گئے ہیں، اور یہ ادب کی وہ منزل ہے جہاں ناول کی تکنیک، شاعرانہ نثر، انسان دوستی اور سیاسی شعور ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔

عصمت چغتائی کے ناولٹ "ضدی" کو ترکی زبان کی کہانی "ہاجرہ" کا ترجمہ کہا گیا ہے لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، یہاں اہمیت پلاٹ کی نہیں بلکہ انداز بیان کی ہے ـــ سماجی اونچ نیچ اور تفاوت کے پرانے موضوع کو عصمت نے بڑے جاندار کردار عطا کئے ہیں ـــ چھوٹے ٹھاکر اور آشا دونوں آنے والی دنیا کے پیغمبر ہیں ـــ ضدی مختصر کینوس کی ایک تصویر ہے لیکن عصمت نے ٹیڑھی لکیر بڑے پیمانے پر لکھی ہے۔ عصمت بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں کیونکہ اپنے موضوعات کی نزاکت کے پیش نظر وہ اشاروں سے کام لینے کی عادی ہو چکی ہیں۔ اسی لئے اس سہ منزلہ عمارت کی تخلیق میں ان کی سانس پھول گئی ـــ ٹیڑھی لکیر کی دو منزلیں جہاں فنی تکمیل کا بہترین نمونہ ہیں وہاں تیسری منزل میں انتشار ہی انتشار ہے۔ لیکن "ٹیڑھی لکیر" کی شمن کو ہم اردو کے غیر فانی کرداروں میں جگہ دینے پر مجبور ہیں۔ وہ ابن الوقت، ظاہر دار بیگ، آزاد، خوجی اور امراؤ جان ادا کی برادری کی ایک رکن ہے۔

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین کی تصنیف "ملک ادب کے شہزادے" بھی خاکوں کے سلسلہ میں نظر انداز نہیں کی جا سکتی ـــ (ص)

عزیز احمد کی ہمارے ادب میں کئی حیثیتیں ہیں — نقاد۔ افسانہ نگار اور ناول نگار — لیکن انہوں نے اردو ناول کی خدمت اپنے دوسرے ہم عصروں کی نسبت زیادہ دل جمعی اور یک جہتی کے ساتھ کی ہے — اردو ناول میں انہوں نے ہیئت سے تجربے کئے، اور موضوعات کی نئی دنیائیں تلاش کیں — "گریز"، "لندن کی ایک رات" سے یقیناً متأثر ہو کر لکھی گئی ہے لیکن کہیں زیادہ وسیع پیمانہ پر۔ اس ناول کو ہمارے کئی نقادوں نے "تقسیم کا جنسی رزمیہ" کہا ہے — مجھے اس سے انکار نہیں کہ جنسی پہلو اس میں غیر مناسب انداز میں ابھر آیا ہے لیکن عزیز احمد نے مغرب کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا، اور اس ناول کا اختتامیہ تو ہمارے ذہن میں مغربی معاشرت کے خلاف شدید ردعمل پیدا کر دیتا ہے — عزیز احمد کی ناولیں پڑھتے ہوئے نہ جانے مجھے ہمیشہ یہ کیوں محسوس ہوا کہ وہ اپنی ڈائریوں اور روزنامچوں کو ناول کا روپ دے دیتے ہیں — اس سے ایک فنی نقصان یہ ہوتا ہے کہ بعض شخصی تجربے فنی تجربوں میں نہیں ڈھل پاتے اور اُن کے ذاتی عنصر میں پڑھنے والوں کے لئے ادبی دلچسپی پیدا نہیں ہو پاتی — "آگ" اور "ایسی بلندی ایسی پستی" میرے نزدیک صرف عزیز احمد ہی کے بہترین ناول نہیں بلکہ اردو کے افسانوی ادب کا بہت قیمتی حصہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر اپنے دامن میں نئے تجربے اور نئے اسالیب لے کر اردو ناول کے ایوانوں میں آئیں اور ان کے آتے ہی نئی شمعیں جل اٹھیں — "میرے بھی صنم خانے" ایک نئے انداز میں لکھا گیا — ویسے تو یہ امراؤ جان ادا کی طرح تہذیبی ناول ہے لیکن قرۃ العین اور مرزا ہادی کے تصورِ فن میں دو دنیاؤں کا فاصلہ حائل ہے — اس ناول کی سست رفتاری شعوری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور یہ سست رفتاری ایک کھوکھلے نظام کی عکاسی کے لئے بے حد ضروری تھی — "سفینۂ غم دل" ہمارے ادب میں اپنے طرز کا واحد ناول ہے۔ اور شاید مقبول (Popular) ناولوں کے اس دور میں اس کی صحیح قدر و قیمت متعین نہ کی جا سکے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی اور اے۔ حمید کے نام پچھلے دس سال کی ناول نگاری کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں — ڈاکٹر فاروقی کے ناول "شام اودھ" کو فنی طور پر اردو کا سب سے اچھا ناول کہا گیا ہے۔ میں بھی دوسرے نقادوں کے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیتا اگر اس ناول کا اختتام مختلف ہوتا — "رہ و رسم آشنائی" کی تکنیک اردو کے عام ناولوں سے مختلف ہے — "پری" کے اشارہ کے گرد ہیروئن کا کردار آگے بڑھتا ہے۔

اے۔ حمید نے تقسیم کے بعد لکھنا شروع کیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے قابلِ رشک مقبولیت حاصل کر لی — ان کی مقبولیت نوجوانوں کے طبقہ میں زیادہ ہے اور اسی بات سے اُن کی خوبیوں اور کمزوریوں کا اندازہ ہو سکتا ہے — اے۔ حمید کو جناب امتیاز علی تاج کا جدید اڈیشن کہنا تنقیدی بد دیانتی ہے — اے۔ حمید یقیناً رومانی افتادِ طبع رکھتا ہے لیکن یہ افتادِ طبع جدید ہے — ایک ایسے نوجوان کی افتادِ طبع جس کے رومانی خوابوں پر بھی دوسری جنگِ عظیم کے سائے چھائے ہوئے ہیں — "ڈربے" اے۔ حمید کا پہلا ناول ہے۔ تقسیم کے بعد نئے وطن میں مہاجرین کی زندگی کا ہر نقش اس ناول میں بڑی صداقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور رومانی اے۔ حمید اس ناول میں تلخ حقیقت نگار نظر آتا ہے — اُس کی ناولٹ "جہاں برف گرتی ہے" اپنے اندازِ بیان کی بناء پر جدید ترنسل کے لکھنے والوں کی تمام تحریروں میں بہت اونچا درجہ رکھتی ہے — "جنگل روتے ہیں" اے۔ حمید کی ایک اور اچھی ناول ہے۔ لیکن اپنے دوسرے ناولوں میں وہ سہل پسندی کا شکار ہو گیا ہے ان ناولوں کی کہانیاں بنیادی طور پر مختصر ہیں اور انہیں اس طرح بڑھا کر اور کھینچ کر لکھا گیا کہ ان کا تاثر زائل ہو گیا اور کرداروں کا ارتقا تو ملتا ہی نہیں۔

اشفاق احمد کی ناولٹ "مہمانِ بہار" ایک بڑی گرم اور جارحانہ محبت کی کہانی ہے — اس کی ہیروئن ہمارے افسانوی ادب کی سہمی اور جھجکی ہوئی خواتین سے بالکل مختلف ہے۔ اسی طرح غلام عباس کا ناول "گوندنی والا تکیہ" قابلِ ذکر ہے۔ اس میں پنجاب کے

نقصاباتی تمدن کی جو تصویریں ملتی ہیں وہ اس سے پہلے پنجاب کے کسی فن کار نے پیش نہیں کی تھیں ــــ غلام عباس نے اردو ادب کے حضور ایک نیا پنجاب پیش کیا ہے اور غالباً پنجاب کی روح یہی ہے۔

ابو سعید قریشی اور صلاح الدین اکبر کے نام بھی اس دور کے ناول نگاروں میں نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔ فسادات اور تعلیم کے موضوع پر دو قابلِ توجہ ناول لکھے ــــ انتظار حسین کا "چاند گرہن" اور رامانند ساگر کا "اور انسان مر گیا" ــــ انتظار حسین نے مسائل کو گہری نظر سے ضرور دیکھا لیکن ناول کے فنی پہلو پر زیادہ توجہ نہ دی۔ نثار عزیز صاحبہ نے "نگری نگری پھرا مسافر" لکھ کر اچھے ناولوں کی تعداد میں ایک ناول کا اور اضافہ کیا ہے ــــ ابھی ان کے ادبی سفر کی ابتدا ہے اور ان سے توقعات وابستہ کرنے میں کوئی ایسا ہرج نہیں۔

مقبول (Popular) ناول کثرت سے لکھے جا رہے ہیں اور خوب بکتے ہیں ــــ جاسوسی ناولوں کو بے حد فروغ حاصل ہوا ہے۔ کئی ماہنامے ہر ماہ مکمل جاسوسی ناول شائع کرتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان سے جاسوسی دنیا، جاسوسی کارنامے اور پاکستان سے سلطان اور آتش ــــ ایم اسلم، رئیس احمد جعفری، قیسی رام پوری، رشید اختر ندوی، عادل رشید اور نسیم حجازی کی بہت سی ناولیں اس عرصہ میں شائع ہوئیں۔ طبع زاد جاسوسی ناول نگاروں میں ابن صفی سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔

جاسوسی اور سستے ناولوں کے اس فروغ کی وجہ لوگوں کا ذہنی فرار ہے۔ جو سنسنی خیز حالات میں گم ہو کر اپنے ماحول سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور یہ افیون ناول کے سوا اور کہاں ملے گی؟ ــــ ناول کی مقبولیت سے افسانوں کی مقبولیت بہت متاثر ہوئی ہے، اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔

ڈرامہ

اردو ناول کا نقاد جدید اردو ناول کے سلسلہ میں چند کارناموں پر تو فخر کرسکتا ہے لیکن اردو ڈرامے کی دنیا میں "انار کلی" کے بعد سناٹا ہے ــــ یہاں میری مراد اردو ڈرامہ سے "طویل ڈرامہ" ــ ہے ــــ امتیاز علی تاج کی انار کلی جدید اردو ڈرامہ کی سب سے بڑی فتح ہے ــــ اس کے بعد پروفیسر مجیب اور اشتیاق حسین قریشی وغیرہ نے کالج کے طلبا کے لئے ڈرامے لکھے اور فن سے زیادہ افادیت پر زور دیا گیا۔

پچھلے دس سال کے اردو ڈرامہ کا مطالعہ "یک بابی" تمثیلوں اور ریڈیائی ڈراموں کا مطالعہ ہے ــــ ریڈیو کے ساتھ یک بابی ڈرامے مقبول ہوئے اور یوں سماعت تمام حواسِ خمسہ کا بدل بن گئی اسی لئے جب ایسے ڈرامے اسٹیج پر پیش کئے جاتے ہیں تو ان میں عمل اور حرکت کی کمی بے طرح محسوس ہوتی ہے ــــ بہر حال اس سے انکار ممکن نہیں کہ ریڈیو کی وجہ سے ہمارے بہترین فن کار ڈرامے کی طرف متوجہ ہوئے ــــ کرشن چندر اور منٹو تو ریڈیو سے متعلق ہی تھے، اور اسی لئے ان دونوں نے کئی بہت اہم ڈرامے لکھے ــــ بڑی بات یہ کہ دونوں کے ڈراموں میں ان کے افسانوں کی خوبیاں موجود ہیں اور ان کے مزاج کی ترجمانی ان تمثیلوں میں بھی کامیابی کے ساتھ ہوئی ہے ــــ کرشن کے ڈراموں میں چاندنی جیسی اجلی نثر، وسعت اور انسان دوستی ہے۔ منٹو کے یہاں Sus-pense۔ اور زندگی کا شعور ہے ــــ عصمت نے گنتی کے چند ڈرامے لکھے لیکن ان کے مکالموں میں جو چٹیلا پن اور تلوار کی سی کاٹ ہے وہ کہیں اور نہیں ــــ یہ مکالمے ناگن کی لہکتی ہوئی زبان کے ساتھ ساتھ برنارڈ شا کی تقلید اور کہیں کہیں نقالی کا احساس دلاتے ہیں ــــ راجندر سنگھ بیدی نے سات کھیل لکھے اور یہ ساتوں ڈرامے ان کی بے پناہ مضبوط اور انفرادی شخصیت کا احساس دلاتے ہیں۔ "رخشندہ" اور "نقل مکانی" میں ڈرامائی عمل اور حرکت کے ساتھ ساتھ داخلی کشمکش بھی بڑے سلیقہ سے سمو دی گئی ہے

بیدی کے مکالمے حد درجہ فطری گفتگو کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے کردار اگر اسٹیج پر آکر بولنے لگیں تو یہی محسوس ہوگا جیسے یہ مکالمے کبھی کاغذ پر نہیں لکھے گئے تھے ــــ ان فن کاروں کے علاوہ سید امتیاز علی تاج، انصار ناصری، شاہد احمد دہلوی، انتصار حسین، رفیع پیرزادہ، عشرت رحمانی، عابد علی عابد اور اصغر بٹ وغیرہ نے اچھے ریڈیائی ڈرامے لکھے ــ عصمت، کرشن، بیدی، منٹو، خواجہ احمد عباس کمال امروہوی اور راماننـد ساگر وغیرہ نے اچھے فلمی ڈرامے لکھے۔

اوپندر ناتھ اشک، میرزا ادیب، ناصر شمسی اور جاوید اقبال کا ذکر میں علیحدہ کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ ان لوگوں نے ڈرامہ کی طرف خاص توجہ کی، اور اسے اپنے مشغلوں میں سے محض ایک مشغلہ نہ سمجھا ــــ اوپندر ناتھ اشک ریڈیو کے ساتھ ساتھ اسٹیج کی تکنک سے بھی گہری آگاہی رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے ڈرامے ادبی اور فنی دونوں معیاروں پر پورے اترتے ہیں۔ "قید حیات" اردو کے بہت اچھے ڈراموں میں سے ہے ــــ جاوید اقبال اردو ڈرامہ کی دنیا میں ایک ننھے سے پیغمبر کی طرح ایک نئی شریعت لے کر آیا تھا لیکن نہ جانے یہ ستارہ کہاں ڈوب گیا، اور وہ شریعت سرگوشی بن کر فضا میں کھوگئی ــــ ناصر شمسی کی تمثیلوں کا مجموعہ "سحر ہونے تک" اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کا بہت اچھا اظہار ہے۔ لیکن وہ بھی معاش اور پیٹ کی وادیوں میں کھو گئے ــ "تیرے کوچہ سے ہم نکلے" اردو کا سب سے اچھا تہذیبی ڈرامہ ہے اور اس کا پس منظر سنہ ۱۹۴۷ء کا فسادِ دہلی ہے ــــ فسادات کے موضوع پر افسانے تو بہت لکھے گئے، ناول بھی تحریر ہوئے لیکن ڈرامہ کو اظہار کا وسیلہ اتنے سلیقہ سے صرف ناصر شمسی نے بنایا ــــ لیکن یہ سب کل کی باتیں ہیں۔ آج یک بابی ڈرامہ کے سلسلہ میں سب سے قابل احترام نام میرزا ادیب کا ہے ــــ تقسیم کے بعد صرف میرزا ادیب نے پابندی سے ڈرامے لکھے ہیں اور ان کے ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ــــ میرزا ادیب کے کچھ ڈرامے داخلی جذبات کی بنیاد پر لکھے گئے ہیں جن کی فضا میں میٹھے میٹھے خوابوں کی کیفیت ہے ــ ایسے خواب جو ایک شیریں درد سے معمور ہوں۔ لیکن ان کے زیادہ تر ڈرامے ہمارے بعض اہم سماجی مسائل سے متعلق ہیں۔ مثال کے طور پر بازیافتہ خواتین کا مسئلہ، مہاجرین کا مسئلہ ــــ

ریڈیائی ڈراموں نے اس دور میں کافی فروغ پایا لیکن طویل ڈرامے اس لئے نہیں لکھے گئے کہ ہمارے یہاں ترقی یافتہ اسٹیج نہیں (بلکہ اسٹیج ہی نہیں)، "انڈین پیپلز تھیٹر" اور "پرتھوی تھیٹر" نے ضرور ڈرامے کی نئی زندگی کے لئے سازگار فضا اور ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی ــــ ان کے ڈراموں میں "غدار"، "دیوار"، "پٹھان"، "یہ کس کا خون ہے؟" (سردار جعفری) اور "بیمار" (سجاد ظہیر) کافی اہم اور مشہور ہیں ــــ کراچی میں شوقیہ کام کرنے والوں نے بھی اسٹیج کے احیا کے لئے جدوجہد کی۔ اور یہ کوششیں بڑی حد تک معیاری ثابت ہوئیں۔ "زوالِ حیدرآباد"، "نیا نشان"، "لال قلعہ سے لالوکھیت" اور "سنہ ۵۷ء" اچھے ڈرامے تھے اور ان کی پیش کش بھی نئے اسالیب فن کا سراغ لگانے میں مدد دیتی ہے ــــ خواجہ معین الدین کے تینوں ڈراموں کو عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اگر خواجہ صاحب "وحدتِ عناصر" پر زیادہ زور دیتے تو فنی اور ادبی طور پر ان کی تمثیلیں اور زیادہ بلند ہو جاتیں۔

طنز و مزاح

"طنز و مزاح" اردو ادب میں جنس نایاب ہو چلا ہے ــــ جہاں کبھی فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس، اور عظیم بیگ چغتائی کے مشاہدے، مسکراہٹیں اور قہقہے تھے وہاں اب خاموشی ہے ــــ بڑے، تلخ اور غیر متوازن حالات اگر سوئفٹ جیسے فن کاروں کے یہاں طنز کی روح بیدار کر دیتے ہیں تو یہی حالات اوسط درجے کے لکھنے والوں سے توازن اور نظم و ضبط چھین لیتے ہیں ــــ آج ہمارے ادب کی بھی یہی کیفیت ہے ــــ طنز و مزاح کے پل صراط سے صحیح سلامت گزر جانے والے

خال خال ہیں۔

گزشتہ دس سال کے طنزیہ ادب میں سب سے وقیع نام کنہیا لال کپور کا ہے۔ کپور اس دور کے واحد طنز نگار ہیں۔ ویسے تو مزاحیہ عنصر کی جھلک اچھے طنز نگاروں میں ہوتی ہی ہے ــــ کپور اس زندگی کے تضاد اور اس کی بوقلمونی پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی علمیت ان کے وار کی شدت بڑھا دیتی ہے ــــ اور ان کا طنز تیر نیم کش کی طرح دل میں پیوست رہتا ہے ــــ تقسیم کے بعد کپور نے جو کچھ لکھا ہے اس میں "سنگ و خشت" اور "شیشہ و تیشہ" والی بات نہیں ــــ ان کے یہاں ملکی حالات کے پیشِ نظر جو جذباتی ابال پیدا ہوگیا ہے وہ کوئی اچھی یا صحت مند چیز نہیں ــــ "گبار کاتار" اور "برج بانو" ــــ ان کے یہ دو مضامین ان کے اس دور کی تحریروں میں ادبی معیار پر پورے اُترتے ہیں۔

شوکت تھانوی کے مزاح میں تقسیم کے بعد وسعت اور گہرائی پیدا ہوئی، سماجی مطالعہ نے ان کے مزاح میں طنز کا پہلو پیدا کر دیا لیکن شوکت بھی کچھ عرصہ کے بعد "قاضی جی" کی بھینٹ چڑھ گئے۔

ابراہیم جلیس کی افسانہ نگاری جہاں تقسیم کے بعد تقریباً ختم سی ہوگئی وہاں وہ ہمیں ایک طنز نگار کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس کی طنزیہ تحریریں اخباروں کے لئے تھیں لیکن پھر بھی ان میں اچھے ادبی عنصر کی کمی نہ تھی۔ جلیس نئی بات پیدا کرنا جانتا ہے پھر اس کے قلم میں تلوار کی سی بُرّش بھی ہے ــــ یہ دونوں عناصر اس کی طنزیہ تحریروں کو بے مزا نہیں ہونے دیتے۔

رومانی شاعر "ابن انشا" نے بھی اس میدان میں اچھی نگارشات پیش کیں ــــ "معاہدۂ چانگا مانگا" کو تو اردو طنز و مزاح کے ہر اچھے انتخاب میں جگہ دینی ہوگی۔ انشا نے اسٹفن لیکاک سے متاثر ہو کر اس کے تتبع میں کافی لکھا ــــ قومی زبان میں "میر جملہ" کے قلمی نام سے انہوں نے ایک سلسلہ شروع کیا ہے "مولوی صاحب کی ڈاک" ــــ ادبی اور علمی مسائل میں طنز کی چاشنی اس سلسلہ میں بڑے سلیقہ سے ملتی ہے۔

شفیق الرحمن اب بھی کبھی کبھی اپنی شگفتہ تحریروں کے ذریعے اپنی ذہانت کا اظہار کرتے رہتے ہیں ــــ نئے طنز نگاروں میں محمد خالد اختر میں کافی صلاحیت ہے۔

روزناموں میں طنز و مزاح کا کالم مستقل حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ چراغ حسن حسرت مرحوم کا نام اس سلسلہ میں سب سے زیادہ امتیاز رکھتا ہے۔ سندباد جہازی نے اپنے آخری سفر پر جانے سے پہلے بہت کچھ لکھا۔ انہیں زبان پر جو قدرت تھی اس کی وجہ سے ان کے مزاحیہ کالموں میں دلچسپی اور ادبیت کا عنصر بہت زیادہ ملتا ہے ــــ عبدالمجید سالک کے "افکار و حوادث" بھی قابلِ ذکر ہیں۔ سالک صاحب کے یہاں مزاح سے زیادہ طنز ہے ــــ طفیل احمد جمالی تو اردو صحافت کے بُت شکن ہیں ــــ ان کی تحریروں میں ادبی چاشنی بھی ہے اور سیاسی شعور بھی ــــ مجید لاہوری اور رئیس امروہوی کی مزاحیہ نظم و نثر کا "جنگ" کی مقبولیت میں بڑا حصہ ہے۔

اردو نظم میں طنز کا رنگ، تو بدلتے ہوئے سیاسی حالات نے کافی شوخ کر دیا۔ اس طنز کے حدود کافی وسیع ہیں ــــ سرمایہ دار سے لے کر خالقِ کائنات تک، لیکن ہمارے نئے شاعر کبھی کبھی اپنے غم و غصہ کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا طنز اپنی قوت کھو بیٹھتا ہے ــــ وہ تمام شعراء جن کے یہاں طنز کے عناصر موجود ہیں ان کا ذکر یہاں ممکن نہیں ــــ شاد عارفی اور علی منظور حیدرآبادی اس میدان میں مخصوص طرز ادا اور اندازِ فکر کے مالک ہیں ــــ شاد نے ہمارے معاشرے، رسوم، تقریبات اور خود فریبیوں پر بہت اچھی نظمیں لکھی ہیں ــــ عہدِ حاضر کے مزاح گو شاعروں کے سرگروہ سید محمد جعفری ہیں[1]۔ جعفری کی شاعری میں کتنے ہی نئے عناصر ہیں ــــ اقبال کی شاعری

[1] ظریف جبل پوری اور پروفیسر عظیم عباسی بھی اس سلسلہ میں قابلِ ذکر ہیں۔ (ص)

سے انہوں نے شعوری طور پر فائدہ اٹھایا، اور اس سے ایک اہم تضاد سامنے آجاتا ہے ؎

الاٹ منٹ ہیں یاروں کی آستینوں میں
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ!

جعفری کے یہاں شعر کے بہت سے محاسن ہیں، اور مزاح میں تغزل کی شان پیدا کرنا تو انہیں کا حصہ ہے۔ مثلاً نمائش کا یہ شعر ؎

مائیکروفون سے آتے ہیں زلیخا کے پیام
اے مرے یوسفِ گم گشتہ تجھے میرا سلام

ادبی رسائل واخبارات

ادبی صحافت نے گزشتہ دس سال میں بہت زیادہ ترقی حاصل کی —— اس دور میں ہمیں جتنے اچھے رسالے نظر آتے ہیں اس کی مثال کسی پہلے دور میں مشکل سے ملے گی —— تمام ادبی تحریکات کو انہیں رسالوں نے آگے بڑھایا —— کچھ دنوں تک ترقی پسند تحریک سے وابستہ رسالوں نے "ادبی احتساب" کی بنا پر تنگ نظری کا ثبوت دیا لیکن جلد ہی وہ راہِ اعتدال پر آگئے —— عام ادبی انحطاط کے باوجود ان رسالوں نے اچھا ادبی معیار برقرار رکھنے کی جدوجہد کی، اور اس کے لئے یہ قابلِ تبریک ہیں —— رسالوں کے خاص نمبروں میں جو جدّت اور تنوع نظر آتا ہے وہ بھی مطالعہ کا ایک موضوع ہے۔

پرانے رسالوں میں "اردو"، "عالمگیر"، "نیرنگِ خیال"، "ادبی دنیا"، "معارف"، "ساقی" اور "زمانہ" قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن عالمگیر اور نیرنگِ خیال کا ادبی معیار پست تر ہوتا چلا گیا —— "زمانہ" سنہ ۱۹۴۷ء میں بند ہو گیا —— ساقی نے تمام مشکلات پر فتح پائی، اور شاہد صاحب نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا —— ساقی کا جوبلی نمبر اس کے عظیم ماضی کی طرف بہت ہی حوصلہ افزا مراجعت ہے —— "مخزن" کا از سرِ نو اجرا ہوا لیکن جلد ہی مخزن پھر بند ہو گیا —— حامد علی خاں نے مخزن کے بعد الحمرا نکالا، اور یہ رسالہ ایک مخصوص علمی روایت کو آگے بڑھا رہا ہے —— معارف شبلی و سلیمان اور ندوۃ العلما کی علمی و ادبی روایات کا باوقار ترجمان ہے —— "العلم" کراچی کے دامن میں تعلیم و ادب دونوں ہیں —— بمبئی کا "نوائے ادب" اپنی انفرادیت رکھتا ہے۔ اس سہ ماہی رسالہ میں اردو رسائل کے مضامین کی جو فہرست اور خلاصہ شائع ہوتا ہے وہ تحقیقی ذوق رکھنے والوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے —— رسالۂ اردو ادبی تحقیق و تنقید کے لئے مخصوص ہے اور مولوی عبدالحق کی ادارت میں اس نے اپنے معیار کو باقی رکھا ہے —— "نگار" آج بھی نیاز فتحپوری کی شوخیٔ تحریر اور مخصوص انداز کی بنا پر اپنے حلقہ میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ ادبی دنیا کو مولانا صلاح الدین نے ایک وقفۂ تعطل کے بعد اکیڈمی پنجاب کے زیرِ اہتمام پھر شائع کرنا شروع کیا ہے —— ادبی دنیا آج بھی اپنی روشِ خاص پر گامزن ہے۔

ان پرانے رسالوں کے علاوہ اردو کے کئی بہت اچھے رسالے انہیں دس سالوں کی پیداوار ہیں۔ ان رسالوں میں "افکار" کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ کیونکہ سنہ ۱۹۴۵ء میں "افکار" بھوپال سے جاری ہوا۔ اس پرچہ نے وسطی ہند میں اردو کے جدید ادب کا مذاق پیدا کیا اور ترقی پسند تحریک کو نئی تاب و توانائی دی —— افکار نے مضامینِ نثر و نظم کی ایک نئی باقاعدہ ترتیب کا آغاز کیا —— تقسیم کے بعد افکار کراچی سے نکالا گیا، اور اس نے پاکستان کے علاقائی ادب کو خاص اہمیت دی۔ افکار کا "منٹو نمبر" اردو ادب کا ایک مثالی نمبر کہا جا سکتا ہے۔

"نقوش" اور "سویرا" کو ہم جدید ادبی صحافت کا افتخار کہہ سکتے ہیں۔ نقوش نے نئی طرحیں ڈالیں —— اس کا "غزل نمبر" اور "شخصیات نمبر" —— یہ دونوں اپنی کمزوریوں کے باوجود ہمارے ادب میں یادگار رہیں گے —— بمبئی سے ترقی پسند تحریک کے سرکاری ترجمان کی حیثیت

سے "نیا ادب" دو ایک سال جاری رہ کر بند ہو گیا ــــ "نیا دور" نے ممتاز شیریں اور صمد شاہین کی ادارت میں جدید ادب میں اہم اضافے کئے ــــ نیا دور کے دو نمبر "بنگالی ادب نمبر" اور "فسادات نمبر" عرصہ تک یاد کئے جائیں گے۔ لیکن یہ رسالہ بھی حالات کا مقابلہ نہ کر سکا۔

تقسیم سے پہلے ہندوستان سے کئی قابلِ ذکر رسالے نکلے اور بند ہو گئے۔ ان میں خیال بمبئی (میراجی اور اختر الایمان)، اضطراب لکھنؤ (نسیم سندیلوی)، مضراب کانپور اور مندر لکھنؤ (شوکت صدیقی) قابلِ ذکر ہیں ــــ مضراب نے ادب و فلم کا جو سنجیدہ امتزاج پیش کیا، وہ اس کے بعد کسی رسالے میں نہیں ملتا ــــ دورانِ جنگ میں حکومتِ ہند نے اپنے پروپیگنڈے کے لئے "آج کل" نکالا۔ لیکن آج کل ایک اچھے ادبی معیار کا رسالہ تھا۔ اس رسالہ میں ہمارے ادیبوں نے دلچسپی لی، کیونکہ یہ معقول معاوضہ دیتا تھا ــــ تقسیم کے بعد حکومت پاکستان نے ماہ نو جاری کیا ــــ ماہِ نو میں براہِ راست پروپیگنڈا نہیں کیا گیا بلکہ پاکستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ اچھا ادب بھی پیش کیا گیا ــــ وقار عظیم، حسن عسکری، فضل حق قریشی اور رفیق خاور نے ماہِ نو کو ایک معیاری رسالہ بنا دیا۔

تقسیم کے بعد پاکستان کے تقریباً تمام صوبوں سے اچھے ادبی رسائل جاری ہوئے ــــ سرحد سے "سنگِ میل" اور "زندگی" ــــ مشرقی پاکستان سے ڈاکٹر عندلیب شادانی نے "خاور" جاری کیا۔ خاور کے ذریعہ بنگالی کے موجودہ ادیبوں کے افکار اردو والوں تک پہونچے۔ اسی لئے خاور کا بند ہو جانا ایک ادبی نقصان ہے ــــ لاہور سے اوراقِ نو، ماحول، جاوید وغیرہ رسالے شائع ہوئے مگر ان کو چند روزہ زندگی ملی "اردو ادب" اور "خیال" کے چند ہی شمارے شائع ہوئے لیکن ان کا کیف آج بھی باقی ہے ــــ یہ دونوں رسالے اُن چند ادبی پرچوں میں سے تھے جو اپنے مرتب کرنے والوں کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ــــ محمد حسن عسکری اور منٹو اردو ادب کے مُدیر تھے ــــ "خیال" کو میراجی کی روایات کی بقا کے لئے انتظار حسین اور ناصر کاظمی نے نکالا ــــ "دستور" بھی لاہور کا قابلِ ذکر پرچہ ہے ــــ حلقۂ اربابِ ذوق نے "نئی تحریریں" کا سلسلہ شروع کیا ہے، اور اب تک اس کے دو شمارے شائع ہو چکے ہیں ــــ فیض احمد فیض کا "سحر" صرف دو شمارے پیش کر سکا۔

کراچی سے ساقی، افکار، اور ماہ نو کے علاوہ "ادب" اور "مشرب" جاری کئے گئے۔ ادب تو اب کبھی کبھار شائع ہوتا ہے لیکن مشرب پابندی سے شائع ہوتا ہے، اور اس کا ادبی معیار بھی غنیمت ہے ــــ "سیارہ" نے اردو رسالوں کی صف میں اپنی خوب صورتی اور گٹ اپ کی بنا پر امتیاز حاصل کر لیا۔ "فانوس" بھی اسی حسن و خوبی کو پیشِ نظر رکھ کر جاری کیا گیا ہے۔

تقسیم کے بعد ہندوستان سے "شاہراہ"، "تہذیب" اور "فن کار" جیسے اچھے پرچے شائع ہوئے ــــ "شاہراہ" کے ابتدائی شماروں اور فن کار کے دو شماروں کا معیار ہر لحاظ سے بلند پایہ تھا ــــ علی گڑھ سے ایک بہت اچھا نیا رسالہ "فکر و نظر" شروع ہوا ہے ــــ "تحریک"، "صبا" اور "کردار" بھی ہندوستان کے نئے رسالوں میں قابلِ ذکر ہیں ــــ انجمن ترقی اردو (ہند) نے "اردو ادب" نکالا۔

ویسے تو اردو صحافت کی دنیا میں بہت سے اچھے ہفت نامے نظر آتے ہیں لیکن ان ہفت روزہ اخبارات میں، نظام، بمبئی اور شاہد، بمبئی زیادہ ادبی تھے ــــ ادارۂ شمع نے ایک نیا ہفت روزہ "آئینہ" جاری کیا ہے ــــ اس سے خوب صورت ہفت روزہ اردو میں اس سے پہلے شائع نہیں ہوا ــــ آئینہ کے دامن میں بڑا تنوع ہے اور اس کا ہر شمارہ ترقی کی طرف ایک قدم!!

سندھی ادب

ف ۔ ا ۔ ع

سماج و معاشرے سے الگ کر کے کبھی بھی ادب کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہر ملک و ہر قوم کا ادب اپنے سماج و معاشرے کے زیر اثر ترقی کرتا اور پروان چڑھتا ہے لہٰذا اسے صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس ملک کی تاریخ اور سماج کے بدلتے ہوئے معاشی و سیاسی رجحانات سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لی جائے۔

صوبہ سندھ کو انگریزوں نے انتظامی اعتبار سے صوبہ بمبئی کے تابع کر دیا تھا اور اس طرح اس کی آزاد وحدت ختم ہو گئی تھی لیکن جوں جوں ہندوستان میں سیاسی تحریکیں تیز ہوتی گئیں سندھ میں بھی قومیت کا تصور زور پکڑتا گیا اور نتیجۃً سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کا مطالبہ تیز تر ہوتا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں مجبوراً انگریزوں کو سندھ کے عوام کا یہ مطالبہ ماننا ہی پڑا۔ اس طرح سندھ ایک بار پھر آزاد وحدت و خود مختار صوبہ بن گیا۔ ۱۹۴۰ء کا سال ہندوستان کی تاریخ میں ایک بڑا ہنگامہ خیز سال رہا ہے اسی سال لاہور میں مسلم لیگ نے ہندوستان کی تقسیم کی قرارداد منظور کی۔ سندھ مسلم اکثریت کا صوبہ تھا لیکن اس کے باوجود یہاں کی تجارت، یہاں کی صنعت یہاں کی سیاست و معاشیات غرض زندگی کے ہر شعبے پر ہندوؤں کا تسلط تھا۔ مسلمان اپنی اکثریت کے باوجود غربت و مفلسی کی زندگی بسر کر رہے تھے (سوائے میروں اور پیروں کے چند خاندانوں کے) اسی چیز نے یہاں کے مسلمانوں کو پاکستان کی حمایت پر اکسایا اور سب سے پہلے سندھ اسمبلی نے اس کی حمایت میں قرارداد منظور کی۔ پاکستان بن گیا۔ ہندو تسلط ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود سندھ کے عوام کے افلاس میں کوئی فرق نہ آیا۔ زندگی کی قدروں میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ ہندوؤں کے اس خلا کو یا تو یہاں کے چند سربرآوردہ خاندانوں نے بھر دیا یا ان کے حواریوں موالیوں نے نتیجتاً عوام میں ان کے خلاف ایک نیا جذبہ پیدا ہونے لگا، قومیت کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ زمینداری کے خلاف جذبات شدید سے شدید تر ہونے لگے اور عوام میں ان سربرآوردہ خاندانوں کے خلاف بددلی و نفرت پیدا ہونے لگی۔

یہ وہ حالات ہیں جن میں سندھ کا دس سالہ ادب جنم لیتا اور ترقی پاتا ہے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ تقسیم سے قبل تک سندھ کی زندگی کے ہر شعبہ پر ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ادب و فنون لطیفہ میں بھی ان ہی کا عمل دخل تھا چنانچہ ۱۹۴۷ء تک سندھ کی جتنی بھی ادبی تحریکیں چلی ہیں۔ ان میں ہندو ادیبوں کا کافی ہاتھ رہا ہے۔ مسلمان ادیب نظر ضرور آتے

ہیں مگر بہت کم۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری طرف مسلمانوں کی طرف سے مذہبی لٹریچر سندھی زبان میں بڑی تیزی سے منتقل ہوتا ہے۔ مذہبی کتابوں کے ترجمے کئے جاتے ہیں۔ نئی کتابیں لکھی جاتی ہیں اور اس طرح اسلامی قدروں کی اشاعت کا کام تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۵ء سے تقسیم ہند تک کے ادبی دور کے ادیبوں کو ہم آسانی کی خاطر دو جماعتوں میں بانٹ دیتے ہیں

۱۔ جمعیۃ الشعرائے سندھ کے ادیب

۲۔ سندھ ادبی سنگت کے قلم کار

سندھی سدھار سوسائٹی کے نام سے ایک ادبی تحریک صوبہ سندھ میں بہت پہلے سے چلی آرہی تھی۔ جسکی طرف سے عموماً مشاعروں کا انتظام کرایا جاتا تھا۔ سنہ ۱۹۲۱ء سے اس تحریک کی طرف سے "ادیب سندھ" کے نام سے ایک رسالہ بھی نکل رہا تھا جس میں مشاعرے کی کارروائی اور ہلکے پھلکے مضامین چھپا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۶ء میں لاڑکانہ میں اس سوسائٹی کی طرف سے ایک سندھی ادبی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت شمس العلماء داؤد پوتہ نے کی۔ اس میں یہ طے پایا کہ آئندہ سے اس تحریک کا نام بدل کر جمعیۃ الشعرائے سندھ کر دیا جائے۔ اس طرح وہ انجمن جنم لیتی ہے جو آج تک اسی نام سے کام کر رہی ہے اور جس میں سندھ کے قدیم اسکول خیال کے تقریباً تمام ہی ادیب جمع ہو چکے ہیں "ادیب سندھ" اس انجمن کی طرف سے سنہ ۱۹۵۵ء تک برابر نکلتا رہا۔ اس رسالے نے سندھی غزل کے فروغ میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ جمعیۃ کی طرف سے اس کے پہلے صدر ڈاکٹر شیخ ابراہیم خلیل کی دو کتابیں "رہنمائے شاعری" اور "تنقید ادب" بھی شائع کی گئیں۔ رہنمائے شاعری کے تین حصے ہیں۔ پہلے میں صنف شاعری سے بحث کی گئی ہے دوسرے حصہ میں بحروں اور وزنوں کا بیان ہے اور تیسرے میں شاعری کے مختلف اقسام بتلائے گئے ہیں۔ نیز دیوان علی محمد قادری و ریاض نظامی بھی جمعیۃ کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ نظامی کے دیوان کا بڑا حصہ سیاسی نظموں پر مشتمل ہے (نظامی نے نظموں کے علاوہ مسدس حالی کا سندھی میں ترجمہ کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے)

سندھی ادبی سنگت کا قیام آئینی طور پر تو ۳ اگست سنہ ۱۹۴۶ء کو عمل میں آیا لیکن دراصل عملی طور پر اس کی داغ بیل سنہ ۱۹۴۵ء سے پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ سنہ ۱۹۴۳ء کا "سندھی سرکل" جو پروفیسر رام پنجوانی کی صدارت اور عبدالرزاق راز کی سکریٹری شپ میں کام کر رہا تھا دراصل سندھ ادبی سنگت ہی کا پیش خیمہ تھا اور سنہ ۱۹۴۵ء تک یہ سنگت ذہنی طور پر کافی مضبوط ہو چکا تھا۔ شیخ ایاز، گوبند مالی، کیرت بابانی، رام پنجوانی، احسان بدوی، عبدالرزاق راز، موہن پنجابی اور دوسرے جواں سال ادیب ادب و زندگی کے رشتوں کو سمجھتے ہوئے ادب میں عوام اور عوامی زندگی کو داخل کرتے جا رہے تھے۔

اس زمانے میں جس رسالے نے سب سے زیادہ اہم خدمت انجام دی اور قدیم و جدید ادیبوں کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی وہ سندھو ہے۔ سندھو ابتداً شکارپور سے جاری ہوا تھا۔ بول چند راجپال اس کے ایڈیٹر تھے۔ مسٹر لطف اللہ بدوی، داؤد پوتہ، لال چند، شیوا رام لالہ، خان بہادر محمد صدیق میمن۔ بھیرو مل و دیگر کہنہ مشق ادیب اس کے قلمی معاونین میں شامل تھے لیکن جنوری سنہ ۱۹۴۱ء سے یہ پرچہ کراچی سے جاری ہوا اور مسٹر مادھو داس شیوا لومل اس کے ایڈیٹر منتخب ہوئے۔ چونکہ اس دور میں سندھی ادب میں ترقی پسند رجحانات بھی داخل ہو چکے تھے لہذا سندھو نے بھی اپنی ادبی پالیسی تبدیل کر لی اور ادب میں حقیقت پسندی کے نظریات کو بھی قبول کرنے لگا۔ چنانچہ سندھ کے نوجوان لکھنے والے شیخ ایاز، احسان بدوی وغیرہ بھی اس کے معاونین کی صف میں شامل ہو گئے اور اس طرح یہ رسالہ ایک ہی وقت میں سندھ کے تمام ادیبوں کو لیکر آگے بڑھنے لگا۔ لیکن بدقسمتی سے اس بار یہ زیادہ دنوں چل نہ سکا اور قیام پاکستان کے ساتھ ہی بند ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد ہندو ادیب ہندوستان چلے گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ علمی ذخائر بھی منتقل ہو گئے۔ پبلیکیشنز بند ہو گئے اور یہاں کے بسے بسے ادیبوں پر وقتی طور پر ایک جمود کا سا عالم طاری ہو گیا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے۔ ایک طرف ہندو ادیبوں کے چلے جانے کی وجہ سے ایک عظیم خلا تھا بے سروسامانی تھی، دوسری طرف اردو کی (وقتی طور پر ہی سہی) غلط برتری کا تصور۔ کچھ عرصہ اس پس و پیش میں گزر گیا لیکن آخر کار انھوں نے اپنا راستہ متعین کر ہی لیا۔ مضامین و تراجم کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پرانے ادیب پھر سامنے آئے نئے لکھنے والے

پیدا ہوئے اور اس طرح سندھی ادب کی ترقی کی مشترکہ کوششوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

سندھی ادب کے دس سالہ دور میں ہم ہر جگہ دیکھیں گے کہ جہاں ایک طرف ترقی پسند ادیبوں کو طبقاتی شعور کا احساس ہو رہا ہے اور ادب میں زندگی کی قدریں براہ راست جگہ پا رہی ہیں وہاں رجعت پسند ادیبوں میں بھی قوم و قومیت کا تصور پیدا ہوتا جاتا ہے۔ تقسیم سے قبل تک یہ چیز ہمیں صرف ہندو ادیبوں کے یہاں ہی زیادہ نظر آتی ہے لیکن تقسیم کے بعد کے ادب میں مسلمان ادیبوں میں بھی یہی تصور تیزی سے پیدا ہونے لگا اور خصوصاً پچھلے دو تین سال کے ادب میں یہ قومیت پرستی و وطن دوستی کا احساس ہر ہر قدم پر ہونے لگا ہے۔

سندھی شاعری کا نیا موڑ کشن چند بیوس سے شروع ہوتا ہے۔ اسے عموماً مہاکوی کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے پہلی بار بیٹائی، سچل، سامی وبیکس کے رنگوں کو چھوڑتے ہوئے ایک نیا رنگ اختیار کیا اور سندھی شاعری کو قومیت و فطرت نگاری کے الفاظ سے روشناس کرایا۔ بیکس پر تحریک خلافت نیز اس کے بعد کی سیاسی تحریکوں کا خاص اثر پڑا تھا۔ ساتھ ہی وہ اقبال کی شاعری سے بھی بہت متاثر تھا۔ اسی اثر کے ماتحت اس نے سندھی شاعری کی پرانی روش کو چھوڑتے ہوئے اپنے لئے ایک نیا راستہ تراشا۔ اور اسی پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی۔

لیکھراج عزیز بھی اس دور کا دوسرا مشہور شاعر ہے۔ عزیز کے ہاں سوز و گداز بہت ہے۔ مرحوم عبداللہ تسبتل عزیز کے دیوان کی تمہید میں اس کے کلام پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں "شعر کے خاص اوصاف جیسے نازک خیالی اور معنی آفرینی کہتے ہیں اس شاعر کا خاص حصہ ہیں۔ فصاحت و بلاغت و تشبیہہ و استعارہ مشرقی شاعری کے چہرے کے لئے ہمیشہ زیب و زینت کا بہترین ذریعہ رہے ہیں اور یہ چیزیں ان کی شاعری میں بوجہ اتم اور بڑی خوبصورتی کے ساتھ موجود ہیں۔"

قدیم شاعروں میں لطف اللہ بدوی کا بھی ایک خاص مقام ہے۔ ان کی شاعری زیادہ تر رومانی ہوتی ہے۔ اقبال کا اثر ان کے یہاں بھی کافی موجود ہے۔ چنانچہ انھوں نے اقبال کی اکثر نظموں کے ترجمے بھی سندھی زبان میں کئے ہیں۔ آپ ایک شاعر کے ساتھ ساتھ ایک اچھے افسانہ نگار اور ناقد بھی ہیں۔ سندھی ادب میں افسانہ نگاری کی ابتدا کرنے والے بزرگوں میں آپ کا نام بھی شامل ہے لیکن سندھی ادب میں ان کا سب سے بڑا Contribution "تذکرہ لطفی" ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد تو ۱۹۴۳ء ہی میں شائع ہو چکی تھی جس میں سندھی شاعری کے ابتدائی دور سے کلہوڑوں کے دور تک بحث کی گئی ہے۔ دوسری جلد ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی جس میں تالپور دور کے شعراء کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس کی تیسری جلد ۱۹۵۳ء میں شائع ہوئی۔ یہ حصہ انگریزوں کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتا ہے نیز اس میں سندھ کے فارسی شعراء کا بھی تذکرہ ہے۔ سندھ کے شعری ادب پر اس سے زیادہ تفصیلی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔

اس کے علاوہ سندھ کے شعراء میں محمد بخش واصف (مرحوم) محمد ابراہیم خلیل۔ اللہ بخش سرشار عقیلی۔ طالب المولیٰ۔ شیخ عبداللہ۔ عبدالحلیم جوش۔ مراد علی کاظم۔ حاجی محمود خادم۔ حافظ محمد احسن بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ چوں کہ سندھی میں غزل اردو فارسی ہی سے آئی ہے۔ لہٰذا اپنے خیالات، پیرایۂ بیان وغیرہ میں بھی اس کا طریقہ بالکل وہی رہا ہے جو قدیم اردو و فارسی غزل کا تھا یا ہے یعنی عشق و عاشقی کی داستانیں، صوفیانہ مسائل، اخلاقی درس وغیرہ لیکن نئی غزلوں میں اس کے ساتھ ساتھ قومیت کی ہلکی ہلکی سی چاشنی بھی ملنے لگی ہے۔ بحیثیت مجموعی آج سندھ کے قدیم شعراء کا رنگ کچھ اس قسم کا ہے

طالب المولیٰ

اے سنگدل تو نے مجھے درد دیا جس کے لئے تیرا شکریہ!

اے دلدار تو نے مجھ پر احسان کیا جس کے لئے تیرا شکریہ

اے تصور جب بھی میں مغموم ہوا تو نے میرا ساتھ دیا!

تو نے میرا شبستان آباد کیا جس کیلئے ترا شکریہ!!

شیخ عبداللہ عبدؔ

"داستان فراق عجیب تلخ و تیز ہے۔ اگر میں اس کا ذکر کروں تو زبان پر چھالے پڑ جائیں گے ——!"

"فراقِ یار، فراقِ وطن، جدائی یار ـــــ میں اپنے سینے میں ایک جہان فراق آباد رکھتا ہوں۔"

عبدالحلیم جوش

نفس کو شعلہ کروں آہ کو شرار کروں! غمِ فراق میں گر چشم اشکبار کروں
غمِ حیات زمانے پہ آشکار کروں متاعِ درد یہ جو سب کو رازدار کروں

سندھی غزل میں قومیت کا تصوّر تیزی سے جڑ پکڑتا جا رہا ہے۔ مثال کے لئے غلام رسول گو یانگ ناز کے چند اشعار پیش کرتا ہوں

نگاہ تیز ہو اور دل میں اضطراب ہو
میرے خیال میں تصویر انقلاب ہو
ہمارے دشنہ و خنجر کی آرزو کی قسم!
نہ چنگ چاہیئے ہمیں نہ ہمارے لئے رباب ہو
وطن پرست وہی ہے کہ جس کی فطرت میں
وطن کی اپنے محبت کا شوق بیحساب ہو

سندھ کا قدیم ترین و کہنہ مشق شاعر عبدالکریم گدائی بھی آج اپنی نظموں میں "وطن بیت المصنم آ هی وطن بیت الحرم پنهنجو" کے ترانے الاپتا نظر آتا ہے۔ سندھی ادب میں "کافی" کو شروع سے ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ فقیر غلام علی مسرور نئی سندھ کا بہترین کافی گو شاعر ہوا ہے جس کا ڈیڑھ دو سال قبل ہی انتقال ہو گیا۔

سندھی ادب کی ترقی پسند تحریک میں جو ادیب پیش پیش رہے ہیں ان میں شیخ مبارک ایاز کا ایک خاص مقام رہا ہے۔ آپ نے نہ صرف سندھی زبان کے قدیم ادب کا بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ دنیا کے دوسری زبانوں کے ادب پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ آپ فلسفہ و تاریخ کے بھی طالب علم رہ چکے ہیں اور طبقات و طبقاتی کشمکش کو بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں ۱۹۴۳ء میں جب شیخ راز کراچی میں سندھی سرکل چلا رہے تھے تو آپ ہی اس کے روحِ رواں تھے "لہروں" کے لکھنے والوں میں آپ کا ایک خاص مقام تھا۔ سندھی ادب میں بغاوت و انقلاب کا تصوّر سب سے پہلے آپ ہی نے دیا "انقلاب انقلاب گیاء انقلاب گیاء"۔ وطن پرستی کے گیت بھی آپ ہی نے گائے

"اے شرابی وطن پرستی کا جام نوش کر۔ تیری یہ بے خیالی و نیم خوابی کس لئے، تیری یہ بے زبانی
اور لاجوابی کس لئے۔ تو بھی انقلابی بن۔ میں بھی انقلابی بنوں۔ ہمارا وطن کتنا پیارا ہے"

اپنی رومانی شاعری اور فلسفیانہ و عاشقانہ غزلوں میں بھی آپ نے اپنی نازک خیالیوں، الفاظ کی بندش اور طرز بیان کی وجہ سے ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھی کلچر کی حقیقی روح ایاز کے دل و دماغ میں اس طرح رچ بس گئی ہے کہ جب وہ اس کا اظہار کرتا ہے تو اتنا ڈوب کر کرتا ہے کہ اس کے الفاظ و سندھ کی روح میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ یہ چیز اس کے گیتوں اور ابیات میں خاص طور پر واضح نظر آتی ہے۔ بیت کے بارے میں خود شیخ کا خیال ہے کہ "بیت سندھی شاعری کی روح ہے۔ ہماری ذات کی یگانگت ان میں ظاہر ہوتی ہے ان میں وہ تخلیق انفرادیت ہے کہ جو نہ گیت میں ہے نہ غزل و نظم میں۔ گیت ہندی ادب کا ورثہ ہے، غزل فارسی و اردو کا، نظم یورپی ادب کا ـــــ بیت اپنے خاص و مختلف نمونے میں نہ صرف سندھی شاعری کے جذبات، خیالات و احساسات کا بہترین آئینہ دار ہے، بلکہ اس کی موجودہ شکل سرزمین سندھ ہی کی تخلیق بھی ہے" اور حقیقت یہ ہے کہ ایاز کی شاعری میں سندھی شاعری کے یہ جذبات، خیالات اور احساسات پوری طرح موجود ملتے ہیں۔ شروع سے ہی ایاز پر لوئی آراگاں اور فیض کا بڑا اثر رہا ہے اور اس کی باغیانہ فطرت تے جس کے لئے پروفیسر ملکانی نے "باغی شاعر" کا خطاب دیا تھا شروع ہی سے اپنے لئے نئی نئی وسعتوں کی تلاش شروع کر دی تھی۔ وہ اپنے گیتوں اور ابیات میں سندھ کی روح کو پیش کرتا، نظموں میں انقلاب و بغاوت کے ترانے الاپتا [illegible] نے افسانہ نگاری کی طرف

بھی توجہ دی - گوبند مالی، موہن پنجابی، رام پنجوانی اور عبدالرزاق راز کے ساتھ ساتھ ایاز نے سندھی ادب کو سب سے پہلے نوراں، شرابی، انیظراں، سفید وحشی، مسافر مکرانی اور بھی شاعر کے نئے عنوانات سے روشناس کرایا - نئی دنیا کے لکھنے والوں میں شیخ ایاز کا ایک خاص مقام تھا (اس پرچے کو گوبند مالی نے ۱۹۴۶ء میں شروع کیا تھا لیکن گوبند کے ساتھ ساتھ یہ پرچہ بھی کراچی سے منتقل ہوگیا اور آج وہاں سے سندھی ادب کی ترقی پسند تحریک کے آرگن کی حیثیت سے نکل رہا ہے) ان ترقی پسند ادیبوں میں جنہوں نے سندھ کے آخری دور میں اس سے تعاون کیا شیخ ایاز بھی شامل ہیں - پاکستان کے ہندو ادیبوں کے چلے جانے کے بعد ایک خلاء پیدا ہوگیا تو سب سے پہلے جناح کورٹ میں جلسہ بلاکر اس خلا کو پر کرنے اور ترقی پسند بنیادوں پر ادب تخلیق کرنے کی سب سے پہلی کوشش شیخ ایاز ہی نے کی لیکن اس کے بعد ہی شیخ کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آگیا - وہ فیض سے زیادہ میراجی کے معتقد ہوگئے - لوئی آراگان و پیلو نرودا سے زیادہ سارترے اور ایلیٹ کا اثر قبول کرنے لگے - بغاوت کی شمعیں روشن کرنے والا ادیب "شمعیں بجھانے" کی باتیں کرنے لگا کیوں کہ اسے "نیند آنے لگی ہے" وہ سیماب صفت شاعر، حیات انسانی کو ایک دھوکہ سمجھنے لگا - اور اس سے فرار ڈھونڈنے لگا - آج وہ خود اپنے بارے میں یوں کہتا ہے کہ" میرا خمیر نغمہ و محبت سے ہوا ہے، تخیل پرستی میری زندگی ہے، کنول سے بھبورے کی محبت ازلی ہے" اور آج اس کی شاعری اسی نغمہ و محبت کی ہوکر رہی جارہی ہے - زندگی میں محبت و نغمہ کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا لیکن ہم ایاز جیسے ادیب کو مجروح کی اس کسوٹی پر پرکھنا چاہتے تھے

جنونِ دل نہ بس اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے

تو دگیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

ایاز کے ساتھ ساتھ ایک اور نام جو آتا ہے وہ شیخ عبدالرزاق راز کا ہے - سندھ کے ترقی پسند ادیبوں میں راز کا بھی ایک خاص مقام رہا ہے آپ نے سب سے پہلے سندھ میں آزاد نظمیں لکھنے کی کوشش کی اور مواد و ہیئت کے نئے نئے تجربے کئے - ان کی اکثر نظمیں سندھ کے عوام کی زندگی سے متعلق ہیں - راز نے بھی نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ بعض بڑے اچھے طنزیہ مضامین و افسانے لکھے ہیں جو مواد و ہیئت ہر دو اعتبار سے کافی ترقی پسند ہیں - اس دور کے ترقی پسند شاعروں میں کھیئڈ اس خانی بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - لیکن تقسیم کے کچھ دنوں بعد یہ بھی بھارت چلے گئے - ان کے بعد جو شاعر ترقی پسند بنیادوں پر سامنے آئے ان میں رسول بلیچ، ناز ہمایونی، تاج صحرائی و بشیر موریانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں - بشیر موریانی نے فیض سے بڑا اثر قبول کیا ہے بلکہ بعض جگہ تو وہ صرف فیض کا سندھی ایڈیشن بن کر رہ گئے ہیں - زبان میں سندھیت بہت کم ہے اردو فارسی کا اثر بہت گہرا لہٰذا بشیر ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی اپنی شاعری میں سندھی عوام سے بہت تیزی سے کٹتے جارہے ہیں - تاج بہت کم لکھتے ہیں - مزاج میں جذباتیت زیادہ ہے - ناز ہمایوں کا ارتقاء البتہ بڑا تدریجی اور حوصلہ افزا ہے -

سندھ کی شاعری پر بحث ختم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ایک ایسے شاعر کا ذکر کر دیا جائے جو سندھی ادب میں بڑا بیش قیمت اضافہ کر رہا ہے اور وہ ہے ہری دلگیر - ہری کشن چندر بوس سے بہت زیادہ متاثر ہے - اس کے ہاں سندھی قومیت کا بڑا گہرا اثر ہے - موجودہ حالات نے ہری کی شاعری پر بڑا اثر کیا ہے اور اب وہ اکثر اپنی غزلوں اور نظموں میں قوم کے گیت گایا کرتا اور اپنی موجودہ حالت پر رو دیا کرتا ہے -

" قید میں قرار کہاں

جس کے نام پر قتل و غارت کا بازار گرم ہو

ایسے بھگوان سے ہمیں کیا غرض "

" میں اپنے ریگستانوں کو فردوس بنا دوں گا

کسی اور کے بستان سے مجھے کیا غرض "

" اے ساتھی! مجھے خبر دے، میرے وطن والوں کا کیا حال ہے - سندھ کے ایک ایک آدمی کو میرا سلام دے "

آزاد شاعری کا رواج سندھ میں ابھی زیادہ نہیں ہوا ہے لیکن بعض شاعر اسے اپنانے کی کامیاب کوشش کر رہے ہیں مثلاً

ابراہیم جویو کی ایک نظم " او سندھ" کا ایک ٹکڑا ہے

" او سندھ!
میرے اپنے سندھ
آج میں تجھ سے پوچھتا ہوں
بتا
تو مجھ سے کیا چاہتا ہے
تو مجھ سے کیا طلب کرتا ہے
تو مجھ سے پوچھ رہا ہے
کہ میں کون ہوں ؟
ماں ۔ ۔ !
میں تیری اولاد ہوں
تیری ممتا کا متلاشی
تیری شادابی و سرسبزی
تیری مٹی، تیرا پانی و تیری ہوا
اور تیری وسعتوں میں پلنے والا ایک بچہ
تیری اولاد ۔ ! "

سندھ میں افسانہ نگاری کو ابتداءً رواج دینے والے لطف اللہ بدوی، مسٹر عثمان انصاری اور غلام حیدر بلوچ ہیں۔ سندھی زبان میں سب سے پہلے بدوی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ " دستہ گل" شائع ہوا۔ انصاری صاحب نے "گمراہ دوست" اور "جزا و سزا" کے نام سے نہ صرف " منٹلیمن آف ورونا اور سیلین کے ترجمے کئے بلکہ پانچ رومانی افسانے بڑی سادہ و سلیس زبان میں Original بھی لکھے۔ ان کے ترجموں کی زبان کافی دقیق ہے اور اس پر فارسی کا زیادہ اثر ہے لیکن طبع زاد افسانوں میں یہ خامی نہیں ہے۔ انصاری صاحب پریم چند سے زیادہ متاثر ہیں۔ ان افسانوں کے علاوہ آپ نے خلیل جبران و واشنگٹن ارون وغیرہ کے تراجم سے بھی سندھی ادب کو مالامال کیا نیز Story of Philosophy کے ابتدائی تین ابواب کا ترجمہ (جو یونانی فلسفہ سے متعلق ہیں) سندھی زبان میں کیا۔ یہ ترجمہ بھی اپنی جاذبیت و رنگینی بیان کی وجہ سے بڑا مقبول ہوا۔ غلام حیدر بلوچ کے افسانے زیادہ تر عشقیہ ہوتے ہیں " شادی" "وطن جی شام" وغیرہ آپ کے مشہور افسانے ہیں جو کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ راز بلترائی کے افسانے " بک ۶ بیکاری" " شرابی" " گلبدن" بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام افسانے بھی عشقیہ ہیں۔ اس کے علاوہ پیر بخش قریشی کی " فرض ادا"۔ حسینی محمد حافظ کی " تباہی" فیض محمد فیض کے " ادھ چنگاروں" اور " فریاد عورت" اور ایم ایم پاکستانی کے " ولایتی جو " بھی عاشقانہ افسانوں میں اچھے افسانے سمجھے جاتے ہیں۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں میں " ایاز " " کیرتھ بابانی" " رام پنجوانی" " گوبند مالی" " احسان بدوی " جمال الدین ابرو" ایاز قادری" نور الدین سرکی" اور نئے نئے ابھرتے ہوئے افسانہ نگاروں میں " رشید" " شیخ حفیظ" ربانی " " مقبول" وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

جس دور میں ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا دور دورہ تھا تو ان ہی ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے " اسان جی سندھ" کی اشاعت عمل میں آئی جس میں کیرتھ بابانی، موہن پنجابی، رام پنجوانی اور ایاز کی کہانیاں شامل ہیں۔ ان کہانیوں میں سندھ کو صوفیوں اور ولیوں کا ملک ظاہر کرتے

ہوتے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا گیا تھا۔ راج گوپال آچاری کے افسانوں کا ترجمہ "کوری" اور ایاز کا افسانہ "سفید وحشی" بھی اسی دور کی یادگار ہیں
تقسیم کے بعد جو افسانوں کے مجموعے ترقی پسند رجحانوں کے ساتھ سامنے آئے۔ ان میں "ریگستانی پھول" (مرتبہ گوبند مالی) "زندگی جی راہ تی" (البشیر موریانی کا طویل مختصر افسانہ) لذت گناہ (آغا شاہین کا مختصر افسانہ) "ڈاک بنگلو" (عبدالرزاق راز کے افسانوں کا مجموعہ) "گل عہ کھٹریوں" (سندھ کے ترقی پسند افسانہ نگاروں کا مجموعہ مرتبہ مقبول صدیقی) "پھل کان پوء" (شیخ ایاز کے افسانوں کا مجموعہ) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ آج سندھ کے ترقی پسند ادیب اپنے افسانوں کے لئے عنوانات اپنے ہی ماحول سے ڈھونڈنے لگے ہیں اور یہ سندھی ادب کے لئے فال نیک ہے۔ اس کے علاوہ حیدر بخش جتوئی نے "وڈیري جي ٻيٽي" زمیندار شاہی "هاري ڪهاڻيون" هاري انقلاب" اور کئی اس قسم کی تخلیقات عوام کے سامنے پیش کیں جن میں ہاریوں پر وڈیروں کے ظلم و ستم دکھاتے ہوئے ان کی غربت و افلاس کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔

سندھی ناولوں پر بنگالی و ہندی ناولوں کا بڑا گہرا اثر پڑا ہے چنانچہ مسٹر بنکم چندر چٹرجی، ٹیگور و پریم چند سے سندھ کے ادیب بہت متاثر ہیں نیز چیٹرجی و ٹیگور کے اکثر ناولوں کے ترجمے بھی سندھی میں ہو چکے ہیں۔ چنانچہ "کھاٹی" اور "رتن" پبلی کیشن صرف ہندی و بنگالی کے افسانوں اور ناولوں کے ترجمے ہی شائع کیا کرتے تھے۔ "صرف زندگی" اور "باغی" ایسے پبلی کیشنز تھے جو سندھی کے طبع زاد افسانے و ناول بھی شائع کیا کرتے تھے۔ بعض مسلمان ادیبوں پر راشد الخیری و عبدالحلیم شرر کا بھی کافی اثر پڑا تھا چنانچہ مسٹر لطف اللہ بدوی نے راشد الخیری کی ایک ناول کا ترجمہ "عروس عجم" کے نام سے شائع کیا ہے اور فتح محمد ہالائی نے انھیں کی ایک دوسری ناول کا ترجمہ "عروس کربلا" کے نام سے کیا۔ حاجی محمود خادم نے شرر کے ایک ناول کا ترجمہ "صلیب و ہلال" کے نام سے کیا۔ بعد ازاں محمد عثمان ڈیپلائی نے ان کی مشہور ناول "فردوس بریں" کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ ۱۹۴۵ء میں اسانند کا ناول "شاعر" شائع ہوا اور عوام میں کافی پسند کیا گیا۔ پروفیسر نارائن داس بھمبھانی نے Thomas Hardy کے ناولوں کے "مالصت" "پاپ و پاکیزگی" "ودہوا" وغیرہ کے نام سے ترجمے کئے لیکن یہ ترجمے Philosophical زیادہ ہیں اور ان میں روانی اور عام پسندی بہت کم ہے۔

پروفیسر رام پنجوانی کا ناول "حلیمہ" بھی اسی زمانے میں شائع ہوا۔ ہندو مسلم اتحاد پر ایک بڑا اچھا ناول "اتحاد" گلی رسول رنگانی نے لکھا اور ایک ایسے دور میں اسے شائع کیا جب ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی وجہ سے اس قسم کے ناولوں کی بڑی شدت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ رام پنجوانی نے اپنے "چاندی جو چکو" میں بھی وقت کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گو کہ وہ اس میں زیادہ کامیاب نہ رہ سکے۔ اس کے علاوہ اسی دوران میں کئی اور ادیب سامنے آئے اور متعدد ناول لکھے گئے۔ انجم ہالائی کا عشقیہ ناول "کاروان زندگی" محمد حسن ساز کا "شکستہ ساز" خلیق مورانی کا "فاتح سندھ"۔ مسافر ہالائی کا "کاروان" محمد عیسیٰ نظامانی کا "شہید وفا" وغیرہ عوام کے سامنے آئے اور اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود سندھی ادب میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور کرتے رہے ہیں۔

تقسیم کے بعد سے اور خصوصاً ہندوؤں کے پاکستان سے چلے جانے کے بعد سے ترقی پسند بنیادوں پر کوئی اچھا ناول تخلیق نہیں کیا گیا۔ حال ہی میں عبدالرزاق کا ناول "فاتح سندھ" سامنے آیا لیکن بڑے افسوس کے ساتھ یہ ماننا پڑیگا کہ اس ناول میں راز وہ راز نہیں ہیں جو اپنے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔

یہاں میں ایک شخص کا ذکر بطور خاص کروں گا اور وہ ہیں محمد عثمان ڈیپلائی کا۔ نہ صرف ڈیپلائی پبلیکیشنز نے سندھی ادب کے فروغ میں کوشش کی ہے بلکہ خود عثمان ڈیپلائی نے اپنے ترجموں و تصانیف کے ذریعہ سندھی ادب میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ ڈیپلائی کی تصانیف و ترجموں میں افسانے بھی ہیں اور ناول بھی، سنجیدہ مضامین بھی ہیں اور بعض مذہبی رسالے بھی۔ ان کی تصانیف کی تعداد (بشمول تراجم) پچاس کے لگ بھگ پہنچ چکی ہے۔ اس میں "درد دل" (ریاض رونی کے افسانہ کا ترجمہ) "شرک نور" (مرشد کی بدمعاشیوں کے بارے میں عبرتناک افسانہ) "خاکما نور دزو" "مرشد جی واھ" "وطن فروش" "چوڏھين صدي جا چار درويش" جیسے سوشل افسانے بھی ہیں اور مجاهد کشمیر، هندوستان جي سچي تاريخ (جلد اول) احمد شاه ابدالي، مينا بازار، غازي اورنگ زيب، غازي محمد غوري

مجاھد مصر - شیر ایران - سمر قند جو صوف' ریف جو مجاھد' وھابین جو بابو جیسے تاریخی ناول بھی نیز اسلام جي مقدمو' مسلمان عورت - ھندوستان کاں پاکستان' شاہ جو رسالو' رسالو جو ھیر (رسالہ پر تنقیدی بحث)' نئون جیئن' اور جوڑی جیسے اصلاحی سماجی مضامین بھی - یہ حقیقت ہے کہ ڈیپلائی صاحب نے اپنی پبلیکیشنز اپنی ذاتی کوششوں سے سندھی ادب کی جو خدمت انجام دی ہے سندھ کا تعلیم یافتہ طبقہ اسے کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتا -

تنقید کے میدان میں ڈاکٹر داؤد پوتہ کو سندھی ادب میں خاص امتیازی حیثیت حاصل ہے - اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر موصوف نے سندھی ادب میں اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین سے بڑے بیش بہا اضافے کئے - دیوان شاہ کریم بلڑی والا (مرتبہ ۱۹۳۷ء) اور ابیات سندھی (مرتبہ ۱۹۳۹ء) کی ترتیب میں ہی آپ نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کا بڑا اچھا مظاہرہ کیا تھا - ابیات سندھ میں مخدوم محمد زماں کے کلام کے اجتماع کے ساتھ ساتھ آپ نے ابن خلدون کے مضمون "اسلامی تصوف" کا بھی سندھی میں ترجمہ کیا - اس کے علاوہ آپ کے اکثر مضامین سندھو اور مھران (پرانا دور) میں شائع ہوئے اور آج نئین زندگی و مھران (نیا دور) میں شائع ہو رہے ہیں - محمد عثمان انصاری کا ادبی انتخاب بھی تنقیدی اعتبار سے ایک بہت اچھا اضافہ تھا - اس سلسلے میں غلام محمد شہوانی (مرحوم) کا نام بھی بطور خاص قابل ذکر ہے - آپ نے "ادبی خزانو" "علمی خزانو" "ادبی اصول" کے ذریعہ سندھی زبان کو بڑا مواد دیا - ادبی اصول میں ادب کے مختلف شعبوں سے بحث کی گئی ہے علمی خزانو مولانا رومی کے دو دفتروں کا ترجمہ ہے - ادبی خزانو گلستان سعدی کا سندھی ترجمہ ہے - اس کے علاوہ آپ نے "شاہ جو رسالو" کے نام سے شاہ کے کلام کو پھر سے جمع کیا - "سندھ جی ادبی تاریخ" مصنفہ محمد صدیق میمن (دو حصے) میں سندھ کے تمام ادب (بشمول نثر و نظم) کا ایک جائزہ لیا گیا ہے - پہلے حصہ میں سندھی ادب کے شروع سے تالپور دور تک بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں انگریزوں کے ابتدائی دور سے بحث شروع ہوتی ہے - تذکرہ لطفی' سندھی کے شعری ادب پر ایک جامع کتاب ہے - اس کے علاوہ، ہنجائے شاعری (شیخ ابراہیم خلیل) مجموعۂ ادب (غلام حیدر بلوچ)، ادب سندھ (غلام حیدر گبول) - ہدایت الانشاء (ہدایت اللہ مشتاق) وغیرہ بھی اس سلسلے میں بطور خاص قابل ذکر ہیں - ع - ق - شیخ نے کھھ کھوری (راضی فقیر کا کلام) کے تعارف میں شاعری سے بحث کرتے ہوئے شاعری و زندگی کے تعلق کو سمجھانے کی جو کوشش ہے وہ تنقیدی اعتبار سے کافی اہم ہے -

ترقی پسند ادب کا ذکر کرتے ہوئے بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سندھ نے آج تک کوئی اچھا نقاد پیدا نہیں کیا - احسان بدوی نے بعض تنقیدی و تحقیقی مضمون ضرور لکھے ہیں مثلاً "سندھی مرثیو" - "سندھی غزل جو شروعات" وغیرہ لیکن یہ کوشش بھی اس سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکی - ابتداءً گوبند مالی نے "نئی دنیا" کے ذریعہ تنقیدی مباحث کا سلسلہ شروع کیا تھا - لیکن ہندو ادیبوں کے چلے جانے کے بعد ہمارے نوخیز ادیبوں کا رجحان زیادہ تر افسانوں یا شاعری کی طرف ہی رہا - وہ پختہ کار لوگ جن کی علمیت و ادبیت انھیں اچھا نقاد بنا سکتی تھی جیسے شیخ ایاز سوبھو گیان چندانی وغیرہ اس میدان میں نہیں آئے - نئے ادیب ذہنی طور پر اس قدر پختہ کار نہ تھے کہ وہ اس اہم ذمہ داری کو سنبھال سکیں نیز ملکی حالات اور اس کے تحت دماغی خلجان نے بھی اس طرف توجہ کرنے کی اجازت نہ دی نتیجتاً آج ترقی پسند ادب میں سوائے احسان بدوی کے چند مضامین کے اور کچھ پیش نہیں کیا جا سکتا -

ڈراموں کے سلسلے میں سب سے پہلا نام جو دماغ میں آتا ہے وہ پروفیسر لو - اے - ملکانی کا ہے جو one Act Play میں اپنا جواب نہیں رکھتے - اس کے بعد جس نے اس سلسلے میں سب سے زیادہ contribute کیا ہے' وہ مرسانی محمد اسمعیل ہیں جنھوں نے "نقش عمل" - "بدنصیب تری" "خیال خاطر" "سندی سبا جھڑا" "درن دایا لاگ" وغیرہ جیسے کتنے ہی ڈرامے لکھے - ان کا سفرنامہ "سیر ریگستان" بھی کافی مشہور ہے مرسانی کے علاوہ کوئی دوسرا ادیب ڈرامہ نگاری کے میدان میں اب تک سامنے نہیں آیا -

مولائی شیدائی' دین محمد وفائی' بنی بخش بلوچ اور حسام الدین راشدی سندھ کے اچھے مورخ سمجھے جاتے ہیں - مولائی شیدائی

میں تحقیقات کا مادہ بہت ہے۔ ابتداً وہ اپنے مضامین کو صرف تحقیقاتی نتائج کے ساتھ پیش کر دیتے تھے لیکن اب انہوں نے اس پر بحث و تنقید بھی شروع کر دی ہے اور ایک مؤرخ کے لئے یہ بڑا اچھا قدم ہے۔ آپ کی ایک کتاب "بلوچستان کی تاریخ" شائع بھی ہو چکی ہے۔

پیر حسام الدین راشدی کی ابتدائی زندگی افسانہ نگاری سے شروع ہوئی جب کہ وہ "فواد راشدی" کے نام سے لکھا کرتے تھے یا پھر "ستارۂ سندھ" (سکھر) کی ادارت کرتے۔ قیام پاکستان کے بعد سے آپ نے تاریخ کو اپنا لیا اور صرف تاریخی مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ آپ کے مضامین بڑی محنت اور جاں فشانی کے ساتھ لکھے جاتے ہیں اور قدیم عربی و فارسی کتب سے ان کی اسناد پیش کی جاتی ہیں کلیات "حمل" نبی بخش بلوچ نے بڑی محنت و کاوش کے بعد مدوّن کی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی و سچل سرمست وغیرہ پر بھی سندھی ادیبوں نے کافی کام کیا ہے۔ خصوصاً شاہ پر پچھلے چند سالوں میں بڑے اچھے مضامین لکھے گئے ہیں اور جن میں انکی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جی ایم سید کی کتاب "پیغام لطیف" اور سندھ انفارمیشن ڈپارٹمنٹ کا شائع کردہ "نذر لطیف" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

زندگی کے دوسرے شعبوں مثلاً اقتصادیات، سیاسیات و اخلاقیات وغیرہ پر بھی کچھ نہ کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ محمد حسین سلیمان کی "اقتصادیات جا ابتدائی اصول" اور "پاکستان جا اقتصادی مسئلا" معاشیات پر ہلکی پھلکی لیکن اچھی کتابیں ہیں۔ نذیر حسین حیدری کی "جمہوریت یا تماشو" ایک اچھی کوشش ہے۔ غلام محمد شہوانی کا "گلدستۂ اخلاق" اور محمد صالح مخدوم کا "اخلاقی جوھر" اخلاقیات پر ادب میں اچھا اضافہ کہی جا سکتی ہیں۔ جی۔ ایم سید کی "نئیں سندھ لا جدوجہد" سے سندھ کی سیاست پر روشنی پڑتی ہے

جیسے جیسے سندھی عوام میں آگے بڑھنے کا حوصلہ بڑھتا گیا اپنی زبان و ادب کی ترقی کا خیال بھی زور پکڑتا گیا۔ کسی زبان کا ادب بھی بغیر دوسری زبان کے جواہر پاروں کو اپنائے ہوئے پوری طرح ترقی نہیں کر سکتا۔ ایک شمع سے دوسری شمع کا جلنا۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ ایک ملک کا ادب دوسرے ملکوں کے لئے شمع ہدایت بنتا ہی رہا ہے۔ سندھ کے ادیبوں کو بھی اس اہمیت کا احساس تھا چنانچہ انہوں نے بھی اس اہم کام سے غفلت نہیں برتی اور دوسری زبان کے ادب پاروں کو تیزی سے سندھی میں اپنانا شروع کر دیا۔ محمد بخش واصف نے اقبال کی اسرار خودی و رموز بے خودی کے سندھی میں ترجمے کئے۔ نیز "انوار سہیلی" کا ترجمہ "گلزار چیلی" کے نام سے بھی کیا۔ فیلسوف کے نام سے اللہ بخش تالپور نے خلیل جبران کا ترجمہ کیا۔ غلام محمد شہوانی نے "HOW TO WIN FRIENDS" کا "راز رھزدن" کے نام سے ترجمہ کیا نیز آپ نے مولانا روم کی مثنوی کا چار جلدوں میں ترجمہ کر کے سندھی ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ احسان بدوی نے امریکہ کے شاعر والٹ وٹمن اور ترکی کے شاعر ناظم حکمت کے ترجموں کے ذریعے سندھی عوام کو دنیا کے دو بڑے فن کاروں سے واقف کرایا۔ "چار دانے" خواجہ احمد عباس کے افسانے کا اچھا ترجمہ ہے۔ عبدالغفور نے "جب کھیت جاگے" کا ترجمہ "هاري ۽ جي سجاڳي" اور "جنگل سے صبح ہوتی ہے" کا ترجمہ "ڏکڻ مان ٿو صبح اڀري" کر کے سندھی عوام کو اردو کی دو اچھی کتابوں سے روشناس کرایا ابراہیم جویو نے روسو کی "ایمیل" کا ترجمہ بڑی صاف و شستہ زبان میں کیا اور تعارف میں تعلیمی و ادبی نظریات سے بحث کرتے ہوئے اپنے تعلیمی نظریات کی وضاحت بھی کی۔ ادارہ انسانیت نے "گناہ و سائنس" اور "زمین اور آدمی" کے سندھی ترجمے کئے۔ عثمان انصاری نے HISTORY OF PHILOSOPHY کے پہلے تین ابواب کو سندھی میں اپنایا (جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے) اس کے علاوہ اور بھی کئی کتابوں کے ترجمے ہوئے جن میں سے بعض کا ذکر پچھلے صفحات پر بھی کیا جا چکا ہے۔

مضمون کو ختم کرنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ تین چیزوں پر اور روشنی ڈال دی جائے۔ یعنی

۱۔ وہ ادبی تحریکیں جو اس دوران میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔

۲۔ وہ پبلی کیشنز جنہوں نے سندھی ادب کو پھیلانے میں خاص حصہ لیا۔

۳ - وہ رسائل جنہوں نے سندھ کے ادب سے عوام کو روشناس کرایا۔

سندھ کی سب سے قدیم ادبی تحریک سندھی سدھار سوسائٹی ہے جس نے ۱۹۲۶ء سے جمعیۃ الشعرائے سندھ کے نام سے کام شروع کیا اور آج تک اسی نام سے کام کر رہی ہے۔ یہ جماعت اپنے سالانہ عظیم الشان اجتماعات کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ نیز اسے سندھی غزلوں کو عام کرنے میں بھی بڑا کام کیا۔ اس کی طرف سے "ادیب سندھ" نام ایک ماہانہ پرچہ بھی جاری ہوا تھا۔ جو ۱۹۳۲ء سے ۱۹۵۴ء تک جاری رہا اور ماہانہ مشاعروں کی خبروں کے ساتھ ہی ساتھ ہلکے پھلکے مضامین بھی شائع کرتا رہا

دوسری بڑی ادبی تنظیم "سندھ ادبی سنگت" ہے جو دراصل سندھ میں ترقی پسند ادیبوں کی جماعت رہی ہے، یہ جماعت ۳ اگست ۱۹۴۷ء کو باقاعدہ طور پر قائم ہوئی جس کے پریزیڈنٹ ماسٹر اسانند مامتورا، وائس پریزیڈنٹ شیخ ایاز اور سکرٹری گوبند مالی منتخب ہوئے لیکن قیام پاکستان کے بعد جب اکثر ہندو ادیب جیسے بھاری چاپڑیا، اسیر کلیانی، موہن پنجابی، دیو سیال، ایم یو ملکانی، جوتڑمل، ہندو جا کیرت بابانی وغیرہ ہندوستان چلے گئے تو یہ جماعت ختم ہوگئی۔ ۱۹۴۸ء میں شیخ ایاز نے اسے زندہ کرنے کی پھر کوشش کی اور "جناح کورٹ" میں ایک جلسہ بھی طلب کیا (جس میں کیرت بابانی بھی موجود تھے) لیکن کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں احسان بدوی، نورالدین سرکی و عبدالغفور وغیرہ نے مل کر ترقی پسند مصنفین کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کرلی جس کے سکرٹری احسان بدوی مقرر ہوئے لیکن جلد ہی یہ جماعت بھی ختم ہوگئی اور ۱۹۵۲ء میں پھر ایک بار سندھ کے تمام ترقی پسند ادیبوں نے سندھ ادبی سنگت میں داخل ہو کر کام کرنا شروع کر دیا۔ ایاز قادری اس نئی دور کی سنگت کے سکرٹری مقرر ہوئے

۱۹۵۰ء میں سکھر میں سندھ ادبی سرکل کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر شیخ ایاز منتخب ہوئے۔ اس سرکل کے تحت سکھر کا مشہور و یادگار ادبی اجتماع منعقد ہوا لیکن بعض مجبوریوں کے تحت ۱۹۵۱ء میں یہ سرکل بھی ختم ہوگیا۔

قیام پاکستان کے بعد سندھی ادبی بورڈ گورنمنٹ آف سندھ کی طرف سے قائم ہوا۔ اس نے سندھی ادب و زبان کے سلسلے میں بڑی بیش قیمت خدمات انجام دیں۔ اس بورڈ کے تحت شاہ لطیف، سچل سرمست اور سامی کی برسیاں منائی گئیں۔ شاہ کی یادگار میں "شاہ جی ودنخ" ایک مجموعہ اسی بورڈ کی طرف سے شائع ہوا جس میں شاہ کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ تنقیدی اعتبار سے یہ مجموعہ سندھی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

اللہ بچایو سموں کی کتاب سیر کوہستان جو کوہستان کے باشندوں کے رہن سہن اور انکی ادبی و سماجی زندگی کے بارے میں ایک اچھی اور مکمل دستاویز ہے۔ نیز مولا بخش بھٹو مسکین کی ابیات مسکین بھی اسی بورڈ کی طرف سے شائع ہوئیں۔ سر والٹر اسکاٹ کے TALISMAN کے قدیم ترجمے طلسم کے نام سے اسی بورڈ نے [illegible] کرائے اور اب سندھ کی قدیم کہانیاں جیسے چہار درویش، الف لیلیٰ، حاتم طائی وغیرہ کو بھی اسی کی طرف سے [illegible] کرنے کا پروگرام ہے۔ نیز سندھی لغت کی تدوین بھی اسی بورڈ کا معرکۃ الآرا کارنامہ ہے

اشاعت گھروں میں "کھانی" "رتن" "زندگی" اور باغی کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ یہ سب ادارے ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ختم ہوگئے۔ موجودہ اشاعت گھروں میں سب سے اہم پاکستان پبلیکیشن ہے جو حکومت کی طرف سے چلایا جا رہا ہے۔ سندھی کا سب سے مشہور ماہوار رسالہ نئین زندگی اسی پبلیکیشن کی طرف سے نکلتا ہے۔ گو کہ کہنے کو یہ سرکاری رسالہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عبدالواحد سندھی نے اپنے خلوص، اپنی محنت اور جانفشانی سے سندھ کے ادبی حلقوں میں اسے جتنا پسندیدہ بنا دیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے آج سندھ کے تمام لکھنے والے، بلا کسی نظریاتی امتیاز کے اس رسالے کے صفحات پر نظر آتے ہیں۔ اس کے زیادہ تر مضامین تاریخی تنقیدی اور تحقیقی ہوتے ہیں۔ یہ رسالہ سال میں دو نمبر بھی نکالتا ہے ایک آزادی نمبر، دوسرا شاہ لطیف نمبر۔

ٹیپانی پبلیکیشن کا تذکرہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ ہاری پبلیکیشن ہفتہ وار "ہاری حقدار" کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً مختلف کتابیں بھی شائع کرتا رہتا ہے۔ جیسے قربان علی نقشبندی کی "ہاری"۔ مسعود اختلافی رپورٹ کا سندھی ترجمہ "ہاری حقدار" کے نام سے یا حیدر بخش

جوتی کی ہماری چھائیوں" "ہماری انقلاب" وغیرہ۔

طالب المولیٰ کے پبلی کیشن کی طرف سے ان کا رسالہ فردوس نکلتا ہے۔ یہ رسالہ بھی اپنی قدامت پسندانہ روش کے باوجود سندھی ادب کی کچھ نہ کچھ خدمت کرتا ہی رہتا ہے۔

مہران پبلی کیشن کی طرف سے "مہران" دوماہی نکلتا ہے۔ یہ پرچہ سندھی ادب میں ایک امتیازی مقام کا حامل ہے ابتداءً یہ مارچ ۱۹۴۶ء میں جاری ہوا تھا اور جون ۱۹۴۸ء تک برابر نکلتا رہا لیکن اس کے بعد یہ بند ہوگیا۔ اب پھر سندھ ادبی بورڈ نے اسے زندہ کیا ہے اور اس کے دو شمارے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں نئین زندگی کی طرح آج کے تمام لکھنے والے قلمی معاونت کر رہے ہیں۔ اس رسالے کے مضامین بھی تنقیدی و تحقیقی ہوتے ہیں۔ نیز ساتھ ہی ساتھ غزلیات، نظموں و افسانوں کا انتخاب بھی بڑا ستھرا ہوتا ہے۔ ادارہ قلیچ بیگ کی طرف سے مرزا قلیچ بیگ مرحوم کی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ سکھر میں حبیب پبلی کیشنز ہر ماہ ایک کتاب شائع کر رہا ہے۔ اب تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں شیخ راز کی غزلوں و نظموں کا مجموعہ "ساہ نئے" بشیر موریانی کا مجموعہ "افسانہ خیالی" احسان بدوی کی "ناظم حکمت" شیخ ایاز کے افسانوں کا مجموعہ "جینجل کان پوءِ" راز کا ناول "فاتح سندھ" نیز اس کے افسانوں کا مجموعہ "ڈاک بنگو" مختلف سندھی افسانہ نگاروں کا مجموعہ "گل ء معکھڑ یون" اور سندھی صحافت وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں

اب رہ گئے سندھی رسالے۔ اکثر رسالوں کا ذکر اوپر آ ہی چکا ہے۔ ان کے علاوہ جو رسالے جاری ہوئے اور جنہوں نے سندھی ادب کو آگے بڑھانے میں مدد دی ان میں شیخ ایاز کا رسالہ "اگتے قدم" بطور خاص قابل ذکر ہے جو ترقی پسند وچاروں کے ساتھ جاری کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے یہ تین شماروں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ حیدرآباد سے "پرہ قولی" اور سکھر سے "محفل" بھی ترقی پسند ادب کی حمایت میں جاری ہوئے لیکن انھیں بھی جلد ہی بند ہو جانا پڑا۔ سکھر کے ترجمان ہفت روزہ نے بھی اپنے سندھی سیکشن کے ذریعے سندھی ادب کے فروغ کے لئے کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا لیکن بدقسمتی سے یہ پرچہ بھی زیادہ دن چل نہ سکا۔ اور مجبوراً اسے بھی بند ہونا پڑا۔ آج سندھ میں "مہران" "نئین زندگی" کے علاوہ لے دے کے صرف "فردوس" باقی رہ جاتا ہے۔ حال ہی میں کراچی سے "شاگرد" نام کا ایک رسالہ بھی جاری ہوا ہے لیکن موجودہ حالات میں اس کا مستقبل کیا ہوگا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ یوں تو سندھ سے ہفتہ وار سندھی رسالے بہت سے نکلتے ہیں لیکن ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کا نام سندھی ادب کی خدمات کے سلسلے میں پیش کیا جاسکے۔

یہ ہیں سندھی ادب کے دس سال پاکستان میں۔ اس میں شک نہیں کہ قیام پاکستان کے عین بعد ہندو ادیبوں کے ترک وطن کر جانے اور ایک خاص جماعت کی طرف سے اردو ادب و زبان کی برتری کے غلط نعروں کے سبب سندھی ادب پر جو جمود سا آگیا تھا وہ آج ٹوٹ چکا ہے۔ جوں جوں جذباتیت ختم ہوتی جا رہی ہے غلط نعروں کا بھرم کھلتا جا رہا ہے اور عوام کو اپنی مفلسی، غربت و ناداری کا احساس ہوتا جا رہا ہے سندھی کلچر و تمدن کے بقا کا خیال بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے۔ سندھی قومیت ابھر رہی ہے اور زبان و ادب کو باقی رکھنے کا عزم اور مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پچھلے تین سالوں میں سندھی ادب نے جس تیزی سے ترقی کی ہے وہ لائق تحسین ہے۔ چونکہ سندھ کے نوخیز و جواں سال ادیب عموماً درمیانی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا وہ عوام اور ان کے مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں اور یہی مسائل ان کی تخلیقات کیلئے بہترین عنوان بن سکتے ہیں۔ میں صرف ان سے یہ کہوں گا کہ وہ عوام کے مسائل کو اپناتے ہوئے سندھ کی حقیقی روح کو بھی اپنے اندر جذب کریں۔ دوسری زبانوں کے اثر سے یہ غلط تاثر پذیری چھوڑ دیں۔ جہاں تک دوسری زبانوں سے کچھ سیکھنے کا تعلق ہے یقیناً سیکھا جائے لیکن اس تمام مواد کو سندھ کے کلچر و سندھ کی روح میں جذب کر کے عوام کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ اسے آسانی سے قبول کر سکیں۔ نیز ترقی پسند بنیادوں پر تنقید کو رواج دینے کی بھی بڑی شدید ضرورت ہے۔ تنقید ادب کا صرف ایک حصہ ہی نہیں بلکہ وہ پوری [illegible] ہے۔ [illegible] تنقیدی جائزوں کے کوئی ادب کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا

(باقی صفحہ نمبر ۳۲۰ پر ملاحظہ فرمائیں)

فارغ بخاری

پشتو ادب کی تاریخ میں پچھلے دس سال کا عرصہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس مختصر عرصہ میں اس نے نہایت تیز رفتاری سے ترقی کے منازل طے کئے ہیں میں اگر یہ کہوں کہ گزشتہ دس برس میں پشتو ادب نے پوری ایک صدی کی مسافت طے کی ہے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔

پشتو شاعری میں اوائل ہی سے حریت پرستانہ خیالات اور انقلابی خد و خال ملتے ہیں۔ یہ چیز شروع ہی سے پختون قوم کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس قوم کی پوری تاریخ جنگ آزادی کے نقش و نگار سے آراستہ و پیراستہ نظر آتی ہے۔ پٹھانوں نے اپنی آزادی کی راہ میں کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ تہذیب و تمدن کی دولت کو ٹھکرا کر اجڈ اور غیر مہذب رہنا گوارا کیا۔ وہ جبل کے بھیانک غاروں میں زندگی گزارتے رہے لیکن کسی کی اطاعت کا الزام نہ لیا۔ انھوں نے عسرت و نکبت کی فضاؤں میں رہنا پسند کیا لیکن کسی کے سامنے سر نہ جھکایا۔

یہی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کی تقریباً تمام زبانوں کی شاعری کی ابتدا رومانی قسم کی بزمیہ نظموں سے ہوئی وہاں صرف پشتو زبان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آج سے ساڑھے بارہ سو برس قبل سب سے پہلے پشتو شاعر امیر کروڑ کی نظم نہ صرف رزمیہ مزاج کی حامل ہے بلکہ یہ ایک ایسی پر جوش اور ولولہ انگیز نظم ہے جسے پڑھ کر آج بھی پختون قوم کے ہر فرد کا دل قومیت کے جذبات اور حریت کے احساسات سے سرشار ہو کر رقص کرنے لگتا ہے۔

میں شیر ہوں
روئے زمین پر مجھ جیسا پہلوان نہیں
ہند و سندھ و تخار و کابل اور زابل میں بھی نہیں
مجھ سے بڑا پہلوان کہیں بھی نہیں
میرے عزم و ہمت کے تیر دشمنوں پر بجلی کی طرح برستے ہیں
میں میدان جنگ میں جاتا ہوں
بھاگنے والوں اور شکست خوردوں پر ترک و تاز کرتا ہوں

مجھ جیسا پہلوان روئے زمین پر نہیں
آسمان میری فتوحات پر فخر سے جھومتا ہے
میرے گھوڑوں کے سموں سے زمین لرزتی ہے
میں پہاڑ دل کو زیر و زبر کرتا ہوں
مجھ جیسا پہلوان کہیں نہیں
میرا حکم اونچے اونچے پہاڑوں پر جاری ہے
میرے مداح دن رات منبروں پر میری تعریف کرتے ہیں
مجھ جیسا پہلوان کہیں نہیں

پشتو ادب نے بے شمار قومی شاعر پیدا کئے۔ گیارھویں صدی ہجری کے اوائل میں رحمان بابا اور خوشحال خاں خٹک نے پشتو شاعری میں انقلاب انگیز اضافے کئے۔ رحمان بابا کو تو ہم پشتو کا سعدی کہہ سکتے ہیں لیکن خوشحال خاں کی شخصیت کچھ ایسی جامع و مانع شخصیت ہے کہ اردو ادب میں کوئی ایسا ادیب نظر نہیں آتا جسے اس کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے، وہ ایک طرف بیک وقت شاعری میں پشتو کے غالب۔ حالی اقبال اور جوش ہیں تو دوسری طرف نثر میں آزاد اور شبلی — اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ خوشحال خاں سے بڑا قومی شاعر کوئی قوم آج تک پیدا نہیں کر سکی — وہ بہت بڑا ادیب ہی نہیں قابل ترین جرنیل بھی تھا۔ عظیم مفکر بھی تھا۔ تلوار کا دھنی بھی تھا۔ وہ ایک درد دل رکھنے والا مخلص رہنما بھی تھا۔ اس کی تمام عمر میدان کارزار میں کٹی۔ غیر ملکی اقتدار سے گلو خلاصی کے لیے آخر وقت تک تلوار سنبھالے رکھی۔ اس کے ساتھ ہی پشتو ادب کو بھی اپنے گرانمایہ خیالات سے مالا مال کر دیا۔ نظم و نثر میں ایسی بے پایاں تخلیقات کیں کہ اگر وہ حوادث زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ جاتیں تو آج پشتو ادب کو کم مائیگی کا طعنہ دینے کی جرات کوئی نہ کر سکتا۔

مدعا یہ کہ اردو ادب میں فکری انقلاب کی جو تحریک آج سے نصف صدی ادھر شروع ہوئی پشتو ادب میں اس کا وجود ابتدا ہی سے موجود تھا اور تین سو برس پہلے تو وہاں یہ تحریک انتہائی عروج پا چکی تھی۔ اس کا باعث نہ صرف دو قوموں کے مزاج کا فرق ہے بلکہ حالات و کوائف اور بعض جغرافیائی اثرات کو بھی اس میں عمل دخل رہا ہے جس کی تفصیل کا یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں غیر ملکی حکمرانوں نے ہندوستان کے عوام کو اس سختی سے دبا دیا کہ ایک طویل عرصے تک انہیں سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں انقلابی تحریکوں نے زور پکڑا تو شعر و ادب بھی ان کے اثرات مرتب ہونے لگے۔ صوبہ سرحد ان تحریکوں کا بڑا مرکز تھا۔ پختون قوم ملک کی جنگ آزادی میں پیش پیش تھی اور ۱۹۳۰ء میں تو گویا اس برعظیم کی تمام سیاسی جدوجہد سمٹ کر اس خطے میں آگئی۔

سرخ کردو، سرخ کردو
نوجوانو، وطن کی سرزمین کو اپنے خون سے سرخ کردو
تم بہادروں کی اولاد ہو
تم شیر دلوں کے بچے ہو
تم غیرت کے پتلے ہو
غلامی کی زندگی موت سے بدتر ہے
اس داغ کو اپنے خون سے دھو ڈالو
سرخ کردو۔ سرخ کردو
نوجوانو وطن کی سرزمین کو اپنے خون سے سرخ کردو

آزادی کی دلہن
اپنا بوسہ اسے دے گی
جو اس کی راہ میں کام آئے گا
اسے نامردوں سے نفرت ہے
وہ اس سے پیار کرتی ہے
جو اس پہ جان نثار کرے

~~~~~~~~

یہ ہمارا ملک ہے
یہاں ہمارا ہی راج ہے
فرنگی کا کوئی حق نہیں
کہ وہ ہم پر حکومت کرے

~~~~~~~~

فرنگی ہمیں جیل سے اور پھانسی سے ڈراتا ہے
وہ ہمیں گولیوں اور سنگینوں سے ڈراتا ہے
ہم کسی چیز سے نہیں ڈرتے
یہ سینہ چھلنی ہو جائے
یہ جسم زخموں سے چور ہو جائے
ہمیں اسکی پرواہ نہیں
ہم انگریزوں کو اپنے ملک سے نکال کر ہی دم لیں گے

~~~~~~~~

پٹھانوں ـــ اے غیرت مند پٹھانوں
آج تمہارے بھائی کال کوٹھری میں پڑے ہیں
تمہارے بچے گولیاں کھا رہے ہیں
تمہاری ماؤں بہنوں کی عصمت خطرے میں ہے
اٹھو ـــ اٹھو
کب اٹھو گے
کب تمہاری غیرت میں ابال آئے گا

~~~~~~~~

انگریز کو اپنی طاقت پر ناز ہے
ہمارے ہی بھائی اس کے ہاتھ مضبوط نہ کریں
تو اس کی طاقت کچھ بھی نہیں

اس دور کو پشتو ادب کی انقلابی قدروں کے احیا کا دور کہنا چاہیئے۔ وہ گھن گرج جو اردو فارسی کے اثر سے پچھلے ادوار میں دب چکی تھی پھر عود کر آئی لیکن یہ جذباتی دور تھا اسلئے ادب و شعر کو بھاری بھاری نعروں کے سوا کچھ نہ مل سکا۔ اس دور میں سب کے سب ادیب اور شاعر جذبات کے تند و تیز دھارے میں بہہ گئے۔

پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو لوگ اتنے سہم گئے کہ پورے پانچ برس تک ادب پر ایک اٹوٹ جمود طاری رہا۔ جنگ کے اختتام پر اس کا ردعمل بیکاری، بیماری، قحط اور بھوک کی وبائیں لے کر نازل ہوا۔ اتنی بڑی حقیقت سے بھلا ادیبوں کا حساس طبقہ کیونکر بیگانہ رہ سکتا تھا۔ وہ ان حقائق کو اپنے فن کا موضوع بنانے پر مجبور تھے۔

یہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔ یہیں سے ان دس برسوں کا آغاز ہوتا ہے جن کا اس صحبت میں مجھے جائزہ لینا ہے۔ ابھی جنگ کی خوفناک تباہی و بربادی کا ازالہ نہ ہو پایا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے ساتھ ہی سارے ملک میں فرقہ وارانہ فساد کا لاوا پھوٹ پڑا اور دونوں طرف کشت و خون کا وہ بازار گرم ہوا جس کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملتی ہو۔ ادھر قیام پاکستان کے بعد جب عوام کے وہ سنہرے روپہلے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے تو قوم میں ایک عام بے دلی اور مایوسی کی فضا پیدا ہو گئی۔ حالات بد سے بدتر ہو گئے۔ مایوسی اور بے دلی روز بروز بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۵۵ء میں ڈرامہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔

مندرجہ بالا واقعات کے پیش نظر گزشتہ دس برس کا عرصہ نہ صرف ہمارے ادب کی تاریخ میں بلکہ سیاسی و معاشی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے خصوصاً صوبہ سرحد کے لوگ تو فطری طور پر ملک کی اس ابتری سے زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ قیام پاکستان کے لئے انھوں نے سب سے زیادہ قربانی دی تھی اور انتھک جدوجہد کی تھی۔ آزادی کے متعلق ان کا تصور بڑا روشن اور خوش گوار تھا لیکن حصول آزادی کے بعد جب پورے آٹھ برس تک انھیں اس خوشگوار تصور کی ہلکی سی جھلک بھی کہیں نظر نہیں آئی تو ان کے دل ٹوٹ گئے ——

کیا یہی آزادی کی دلہن ہے
جس کے لئے ہم کوہ بے ستون کاٹ کر جوئے شیر لائے تھے
نہیں نہیں
یہ تو وہی پیشہ ور عورت ہے
جو کل تک عصمت فروشی کی دوکان کھولے بیٹھی تھی

میں کہہ آیا ہوں کہ یہ دس برس پشتو ادب کی تاریخ میں نہایت اہم ہیں کیونکہ اس مختصر عرصے میں اس نے پوری ایک صدی کی مسافت طے کی ہے۔ یہ بات میں نے یوں ہی نہیں کہی بلکہ اس کے لئے میرے پاس کافی وجوہ موجود ہیں۔

پشتو ادب اپنی قدامت کے باوصف ناموافق حالات اور نامساعد واقعات کی وجہ سے خاطر خواہ ترقی نہ کر سکا اب تک اس کا تمام تر سرمایہ شعری ادب تک محدود تھا۔ اس میں بھی جدید اصناف سخن کی کمی بری طرح کھٹکتی تھی اور نثر میں تو اس کا تخلیقی سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

نثر کی ابتدا کا سہرا مرزا خان انصاری کے سر ہے۔ یہ کام ۹۶۰ھ میں یعنی نظم سے پوری آٹھ صدیاں بعد ہوا۔ اس کے بعد بھی نثر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ خوشحال خان خٹک پہلا شخص ہے جس نے نثر کی طرف پوری توجہ مبذول کی۔ اس نے نہ صرف پشتو نثر کو رواج دیا بلکہ قدیم اسلوب تحریر میں بھی نمایاں تبدیلیاں کیں۔ اس نے نثر کو صاف، سلیس، عام فہم اور بے تکلف بنا کر پیش کیا تاکہ عوام میں مقبول ہو لیکن خوشحال خان خٹک کی اس عرق ریزی اور مخلصانہ کوشش کے بعد بھی پشتو نثر کوئی خاص ترقی حاصل نہ کر سکی۔ اگرچہ اب پشتو نثر کی بے مائیگی کا وہ پہلا سا عالم نہ رہا تھا لیکن اب نظم کے ساتھ ساتھ نثر بھی رواج پا رہی تھی لیکن تراجم یا مذہبی کتب تک ہی یہ سلسلہ محدود تھا۔ ۱۹۳۰ء میں سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کچھ جدید نثر نگار بھی سامنے آئے اور پھر ۱۹۴۶ء میں نئے لکھنے والوں کی جو کھیپ پیدا ہوئی وہ اردو ادب اور انگریزی ادب دونوں سے متاثر تھی انھوں نے نثر کی کمی کو محسوس کیا اور نہایت قلیل عرصے میں افسانہ، ڈراما، ناول، تنقید غرض تمام اصناف سخن میں گراں قدر سرمایہ فراہم کر دیا۔ پشتو نظم اور غزل بھی انہی دنوں نئے موڑ سے آشنا ہوئی۔ نئے ادیبوں کو منظر عام پر لانے کا سہرا اولسی ادبی جرگہ (عوامی ادبی جماعت) کے سر ہے۔ اس کی داغ بیل قیام پاکستان کے بعد ڈالی گئی۔ اس

ادارے نے عالم وجود میں آتے ہی پشتون ادیبوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ ادارے نے باقاعدہ ہفتہ وار جلسوں سے ادبی دنیا میں حرکت و عمل کی ایسی جوت جگائی جو آج تک بجھ نہ سکی۔ یہ اسی ادارے کے جوش عمل کا نتیجہ تھا کہ پچھلے دنوں ایک عرصہ تک جہاں اردو ادب پر بے پناہ جمود طاری رہا وہاں پشتو ادب کو ایک لمحہ کے لئے بھی اس حادثہ سے دوچار نہ ہونا پڑا۔

درحقیقت پشتو ادب کا نیا دور ۱۹۴۵ء ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں پشتو ادب نے نہ صرف نمایاں ترقی کی بلکہ سالہا سال کی پسماندگی کا بہت حد تک ازالہ کر دیا۔

پشتو نظم کی ابتداء بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن اس نے نیا موڑ نئے دور ہی میں اختیار کیا۔ پھر نظم میں مغربی اصناف سخن، بلینک ورس، سانیٹ وغیرہ کی طرف بھی اسی دور میں توجہ دی گئی اور بعض نوجوان شعراء نے نہایت کامیاب نمونے پیش کئے۔

پشتو نظم کو جدید رجحانات سے متعارف کرانے میں اولسی ادبی جرگہ کے جواں سال شعراء کا غالب حصہ ہے۔ جن میں سے اجمل خٹک، مفتون، صاحبزادہ حبیب الرحمن قلندر، ولی محمد طوفان، سیف الرحمن سلیم، قمر الزماں راہی، مہدی شاہ، دوست محمد کامل، عبد اللطیف وہبی، ہمیش، رضا مہمندی، فدا، یونس خلیل ایاز، سیلانی، جگر، ناظر، منور، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یوں تو فلسفی، سید رسول رسا اور فضل حق شیدا پشتو نظم کے پیش رو ہیں، انھوں نے یہاں جدید نظم کی داغ بیل ڈالی۔ حمزہ خاں، سمندر خاں، خلیق، عبد الکریم مظلوم خاں نے بہت پہلے بیشمار نظمیں کہی ہیں لیکن ان کا انداز قدیم ہے اور انھیں جدید نظم گو شعراء کی صف میں نہیں لایا جا سکتا۔

صاحبزادہ محمد ادریس کو جدید نظم گو شعراء میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کا ذکر میں اس لئے سب سے الگ کر رہا ہوں کہ ان کا کلام سب سے جدا اور منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی کتاب "گلے وسوسے" حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ایک مثنوی قسم کی طویل نظم پر مشتمل ہے۔ جو فلسفیانہ اور دقیق مسائل سے معمور ہے۔ کتاب کے آخر میں پشتو لوک گیتوں کی ہیئتیں یا افتادہ اصناف میں آپ نے نہایت شگفتہ چیزیں پیش کی ہیں۔ ان تجربات میں بھی وہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔

یہاں جدید پشتو نظم کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

صاحبزادہ حبیب الرحمن قلندر ؎

ہم آگے بڑھ رہے ہیں
سرمایہ دار دل کے کوچ کا وقت ہے
دہقان کو مژدہ ہو ان کی عید آنے والی ہے

سیف الرحمن سلیم ؎

یہ صراحی ہٹا، جام پھینک دے
مجھ سے ننگے عوام لباس مانگتے ہیں
گرے ہوئے لوگ امداد چاہتے ہیں
میرے ارد گرد یتیم رو رہے ہیں
بھوکے اور قحط زدہ بچے بلک رہے ہیں

مہدی شاہ ؎

مسکراتے ہوئے چاند نے کہا
اے انسان مجھے حیرت سے نہ دیکھ
خود کو پہچاننے کی کوشش کر۔

اس دور کو پشتو ادب کی انقلابی قدروں کے احیا کا دور کہنا چاہئے۔ وہ گھن گرج جو اردو فارسی کے اثر سے پچھلے ادوار میں دب چکی تھی پھر عود کر آئی لیکن یہ جذباتی دور تھا اسلئے ادب و شعر کو دھاری دھاری نعروں کے سوا کچھ نہ مل سکا۔ اس دور میں سب کے سب ادیب اور شاعر جذبات کے تند و تیز دھارے میں بہہ گئے۔

پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو لوگ اتنے سہم گئے کہ پورے پانچ برس تک ادب پر ایک ٹوٹ جمود طاری رہا۔ جنگ کے اختتام پر اس کا ردعمل بیکاری، بیماری، قحط اور بھوک کی وبائیں بن کر نازل ہوا۔ اتنی بڑی حقیقت سے بھلا ادیبوں کا حساس طبقہ کیونکر بیگانہ رہ سکتا تھا۔ وہ ان حقائق کو اپنے فن کا موضوع بنانے پر مجبور تھے۔

یہ ۱۹۴۶ء کا زمانہ تھا۔ یہیں سے ان دس برسوں کا آغاز ہوتا ہے جن کا اس صحبت میں مجھے جائزہ لینا ہے۔ ابھی جنگ کی خوفناک تباہی و بربادی کا ازالہ نہ ہو پایا تھا کہ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے ساتھ ہی سارے ملک میں فرقہ وارانہ فساد کا لاوا پھوٹ پڑا اور دونوں طرف کشت و خون کا وہ بازار گرم ہوا جس کی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ادھر قیام پاکستان کے بعد جب عوام کے وہ سنہرے روپہلے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے تو قوم میں ایک عام بے دلی اور مایوسی کی فضا پیدا ہو گئی۔ حالات بد سے بدتر ہو گئے مایوسی اور بے دلی روز بروز بڑھتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۵۵ء میں ڈرامہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔

مندرجہ بالا واقعات کے پیش نظر گزشتہ دس برس کا عرصہ نہ صرف ہمارے ادب کی تاریخ میں بلکہ سیاسی و معاشی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے خصوصاً صوبہ سرحد کے لوگ تو فطری طور پر ملک کی اس ابتری سے زیادہ متاثر ہوئے کیونکہ قیام پاکستان کے لئے انھوں نے سب سے زیادہ قربانی دی تھی انتھک جدوجہد کی تھی۔ آزادی کے متعلق ان کا تصور بڑا روشن اور خوش گوار تھا لیکن حصول آزادی کے بعد جب پورے آٹھ برس تک انہیں اس خوشگوار تصور کی ہلکی سی جھلک بھی کہیں نظر نہیں آئی تو ان کے دل ٹوٹ گئے ——

کیا یہی آزادی کی دلہن ہے
جس کے لئے ہم کوہ بے ستون کاٹ کر جوئے شیر لائے تھے
نہیں نہیں
یہ تو وہی پیشہ ور عورت ہے
جو کل تک عصمت فروشی کی دکان کھولے بیٹھی تھی

میں کہہ آیا ہوں کہ یہ دس برس پشتو ادب کی تاریخ میں نہایت اہم ہیں کیونکہ اس مختصر عرصے میں اس نے پوری ایک صدی کی مسافت طے کی ہے۔ یہ بات میں نے یوں ہی نہیں کہی بلکہ اس کے لئے میرے پاس کافی وجوہ موجود ہیں۔

پشتو ادب اپنی قدامت کے باوصف ناموافق حالات اور نامساعد واقعات کی وجہ سے خاطر خواہ ترقی نہ کر سکا اب تک اس کا تمام تر سرمایہ شعری ادب تک محدود تھا۔ اس میں بھی جدید اصناف سخن کی کمی بری طرح کھٹکتی تھی اور نثر میں تو اس کا تخلیقی سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

نثر کی ابتدا کا سہرا مرزا خان انصاری کے سر ہے۔ یہ کام ۹۶۰ھ میں یعنی نظم سے پوری آٹھ صدیاں بعد ہوا۔ اس کے بعد بھی نثر کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ خوشحال خان خٹک پہلا شخص ہے جس نے نثر کی طرف پوری توجہ مبذول کی۔ اس نے نہ صرف پشتو نثر کو رواج دیا بلکہ قدیم اسلوب تحریر میں بھی نمایاں تبدیلیاں کیں۔ اس نے نثر کو صاف، سلیس، عام فہم اور بے تکلف بنا کر پیش کیا تاکہ عوام میں مقبول ہو لیکن خوشحال خان خٹک کی اس عرق ریزی اور مخلصانہ کوشش کے بعد بھی پشتو نثر کوئی خاص ترقی حاصل نہ کر سکی۔ اگرچہ اب پشتو نثر کی بے مائیگی کا وہ پہلا سا عالم نہ رہا تھا لیکن اب نظم کے ساتھ ساتھ نثر بھی رواج پا رہی تھی لیکن تراجم یا مذہبی کتب تک ہی یہ سلسلہ محدود تھا۔ ۱۹۳۰ء میں سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ کچھ جدید نثر نگار بھی سامنے آئے اور پھر ۱۹۴۶ء میں نئے لکھنے والوں کی جو کھیپ پیدا ہوئی وہ اردو ادب اور انگریزی ادب دونوں سے متاثر تھی انھوں نے نثر کی کمی کو محسوس کیا اور نہایت قلیل عرصہ میں افسانہ، ڈراما، ناول، تنقید غرض تمام اصناف سخن میں گراں قدر سرمایہ فراہم کر دیا۔ پشتو نظم اور غزل بھی انہی دنوں نئے موڑ سے آشنا ہوئی۔ نئے ادیبوں کو منظر عام پر لانے کا سہرا اولسی ادبی جرگہ (عوامی ادبی جماعت) کے سر ہے۔ اس کی داغ بیل قیام پاکستان کے بعد ڈالی گئی۔ اس

ادارے سے عالم وجود میں آتے ہی پشتون ادیبوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ ادارے نے باقاعدہ ہفتہ وار جلسوں سے ادبی دنیا میں حرکت و عمل کی ایسی جوت جگائی جو آج تک بجھ نہ سکی۔ یہ اسی ادارے کے جوشِ عمل کا نتیجہ تھا کہ پچھلے دنوں ایک عرصہ تک جہاں اردو ادب پر بے پناہ جمود طاری رہا وہاں پشتو ادب کو ایک لمحہ کے لئے بھی اس حادثہ سے دوچار نہ ہونا پڑا۔

درحقیقت پشتو ادب کا نیا دور ۱۹۴۵ء ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں پشتو ادب نے نہ صرف نمایاں ترقی کی بلکہ سالہا سال کی پسماندگی کا بہت حد تک ازالہ کر دیا۔

پشتو نظم کی ابتدا بہت پہلے ہو چکی تھی لیکن اس نے نیا موڑ نئے دور ہی میں اختیار کیا۔ پھر نظم میں مغربی اصناف سخن' بلینک ورس' سانیٹ وغیرہ کی طرف بھی اسی دور میں توجہ دی گئی اور بعض نوجوان شعرا نے نہایت کامیاب نمونے پیش کئے۔

پشتو نظم کو جدید رجحانات سے متعارف کرانے میں اولسی ادبی جرگہ کے جواں سال شعرا کا غالب حصہ ہے۔ جن میں سے اجمل خٹک' مفتون' صاحبزادہ حبیب الرحمن قلندر' ولی محمد طوفان' سیف الرحمن سلیم' قمر الزماں راہی' مہدی شاہ' دوست محمد کامل' عبداللطیف وہبی' ہمیش' رضا مہمندی' فدا' یونس خلیل ایاز' ہیلی' جگر' ناظر' ماز' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

یوں تو فاسق' سید رسول رسا اور فضل حق شیدا پشتو نظم کے پیش رو ہیں' انھوں نے یہاں جدید نظم کی داغ بیل ڈالی' حمزہ خان' سمندر خان' خلیق' عبدالکریم خاں نے بہت پہلے بیشمار نظمیں کہی ہیں لیکن ان کا انداز قدیم ہے اور انھیں جدید نظم گو شعرا کی صف میں نہیں لایا جا سکتا۔

صاحبزادہ محمد ادریس کو جدید نظم گو شعرا میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کا ذکر میں اس لئے سب سے الگ کر رہا ہوں کہ ان کا کلام سب سے جدا اور منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ ان کی کتاب "گلے وسوسے" حال ہی میں طبع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ایک مثنوی قسم کی طویل نظم پر مشتمل ہے۔ جو فلسفیانہ اور دقیق مسائل سے معمور ہے۔ کتاب کے آخر میں پشتو لوک گیتوں کی ہیئت یا افتادہ اصناف میں آپ نے نہایت شگفتہ چیزیں پیش کی ہیں۔ ان تجربات میں بھی وہ خاصے کامیاب رہے ہیں۔

یہاں جدید پشتو نظم کے چند نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

صاحبزادہ حبیب الرحمن قلندر ؔ ؎

ہم آگے بڑھ رہے ہیں
سرمایہ دار دل کے کوچ کا وقت ہے
دہقان کو مژدہ ہو ان کی عید آنے والی ہے

سیف الرحمن سلیم ؔ ؎

یہ صراحی ہٹا' جام پھینک دے
مجھ سے ننگے عوام لباس مانگتے ہیں
گرے ہوئے لوگ امداد چاہتے ہیں
میرے اردگرد یتیم رو رہے ہیں
بھوکے اور قحط زدہ بچے بلک رہے ہیں

مہدی شاہ ؎

مسکراتے ہوئے چاند نے کہا
اے انسان مجھے حیرت سے نہ دیکھ
خود کو پہچاننے کی کوشش کر۔

یہ آسمان زمین تارے
سب تیری خدمت کے لئے ہیں

عبداللطیف وحی ؎

اسی صبح کے لئے تم اتنا زور لگاتے تھے
اسی صبح کے لئے تم اتنا شور مچاتے تھے
وہ افق بھی ہوگا لیکن سورج یہ نہیں ہے
ابھی منزل بہت دور ہے
ابھی مت رکو ابھی مت رکو

اجمل خٹک جدید نظم گو شعرا میں سب سے زیادہ قدآور، ذہین اور باشعور شاعر ہے۔ وہ بابائے پشتو خوش حال خاں خٹک کے مشہور شاعر خیز خاندان کا آخری چراغ ہے اور اسی کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے۔ پشتو شاعری میں گزشتہ تین سو برس سے جتنے شعرا بھی گزرے ہیں وہ خوش حال خاں خٹک یا رحمان بابا کے اسکولوں میں سے کسی ایک کے ساتھ ضرور وابستہ نظر آتے ہیں

رحمان بابا صوفی منش شاعر تھے۔ وہ عجمی شاعری سے متاثر تھے۔ انھوں نے صرف غزل کو اپنایا۔ انھوں نے غزل میں ایسے نفسیاتی جذبات سمو کر پیش کئے اور ایسا سادہ و بے تکلف اسلوب اختیار کیا کہ ہر دلعزیزی اور قبولیت میں کوئی دوسرا شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا

خوش حال خاں خٹک کی شاعری میں طنطنہ اور دبدبہ ہے۔ گھن گرج ہے، جوش اور ولولہ ہے، قومی مزاج ہے۔ عام طور پر پشتو نظم میں خوش حال خاں اور غزل میں رحمان بابا کا تتبع کیا جاتا ہے۔ خوش حال خاں کی غزل بھی کچھ کم مقبول نہیں۔ لیکن غزل میں ان کے اسلوب کا اتباع ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اجمل خٹک نظم و غزل دونوں میں خوشحال اسکول کا پیرو ہے۔ اس کی ادبی شخصیت ہمہ گیر ہے۔ نظم و نثر کے ہر شعبے میں وہ نہایت کامیاب نظر آتا ہے لیکن بنیادی طور پر وہ نظم گو شاعر ہے۔ وہ پُرگو بھی ہے، زود گو بھی اور خوب گو بھی —— اس کی ہر نظم ایک معرکے کی نظم ہوتی ہے۔ وہ ڈوب کر لکھتا ہے اور موضوع کا حق ادا کرتا ہے۔ خیالات بلند، تشبیہات انوکھی، بندش چست اور انداز نکھرا ہوا ہوتا ہے۔

طوفان جذباتی شاعر ہے۔ اس کی نظموں میں بلا کی روانی اور جوش ہوتا ہے۔ وہ پرانا سیاسی کارکن ہے وہ انقلابی ذہن لے کر پیدا ہوا اور اس کی نظمیں بھی انقلابی رجحانات کی آئینہ دار ہیں۔ راہی، ہمیش اور مراد کی نظموں میں طبقاتی شعور رچا بسا نظر آتا ہے۔

کامل صاحب کی نظمیں ٹھوس سنجیدہ اور بلند پایہ ہوتی ہیں

یہ عجیب بات ہے کہ پشتو کے نوجوان شعرا جہاں نظم میں آتش و خون سے کھیلتے نظر آتے ہیں وہاں غزل میں ان کا لہجہ نہایت نرم و نازک اور تغزل میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حمزہ خاں شنواری ؎

تیرے خم کاکل کی قسم
میں تیرا حلقہ بگوش ہو چکا ہوں
یہ جو ہر چہرہ مجھے آشنا نظر آتا ہے
اس کی علامت ہے کہ میں تجھ سے آشنا ہو چکا ہوں۔

سمندر خاں ؎

تیری آمد آمد کا شہرہ سن کر

پھول ہنس ہنس کر سرخ ہو گئے ہیں
اور چمن ہنسی کے مارے سبز پڑ گیا ہے
درد و غم کے جنازے دفن ہو گئے ہیں

مفتون :-

یار کے غم رباب کے نغموں سے بہل نہیں سکتے
میں نے سوچا قرار شراب میں ہے
لیکن اس نے تو غم اور سوا کر دیئے

حبیب الرحمان قلندر :-

اندھیروں کا زور کم ہونے لگا
میرے دل کے داغ چمکنے لگے ہیں
جب چہچہانے کا موسم آیا
تو بلبل کی زبان میں کانٹا چبھ گیا

مھدی شاہ :-

جب وہ دریچے سے نمودار ہوئی تو اس قدر حیران تھی
کہ میں سمجھا آئینہ میں اپنا عکس دیکھ رہا ہوں

یوسف اورکزئی :-

تو اپنی آنکھوں سے مشورہ کر لے
میں اپنے دل سے مشورہ کرتا ہوں
چاہتا ہوں تیری زلفوں میں چھپ کر
ہونٹوں سے کوئی چیز چرا لوں

ولی محمد طوفان :-

میں تیری عبادت کرتا ہوں
مگر جنت کے لئے نہیں
تیری بندگی پر خوش ہوں
مگر اجرت کے لئے نہیں
میں اپنی خودی کو کسی قیمت پر بھی نہیں بیچنا چاہتا
میرا کاروبار عشق ہے مگر تجارت کے لئے نہیں

سیف الرحمان سلیم :-

اس نے مجھے زلفوں کے جال میں جکڑ رکھا ہے
اور وعدوں کے زنجیروں سے باندھ رہی ہے
تیز اور تند باتیں نہ کر

تیرے نازک ہونٹ زخمی ہوجائیں گے

نثر میں افسانہ پہلے سے موجود تھا لیکن اسے نئے رنگ میں پیش کرنے میں اجمل خٹک، طوفان، مراد، قلندر، دہمی، مفلس، راہی، مہدی شاہ، یوسف، رضا ہمدانی اور طالب کی خدمات قابل ذکر ہیں۔

ناول میں صاحبزادہ محمد ادریس تنہا شخص ہیں جنہوں نے اس صنف کی طرف توجہ دی اور ایک ضخیم ناول "دوشیزہ" لکھ کر اس کمی کا ازالہ کیا۔ اگرچہ راحت زاخیلی کا "بہت" پہلے ایک ناول مارکیٹ میں آچکا تھا لیکن اسے جدید ناول نہیں کہا جاسکتا۔

ڈرامہ کے خالق یہاں راحت، اسلم خٹک اور عبداللہ جان اسیر ہیں لیکن یہ ڈرامے قدیم طرز کے ہیں۔ دور جدید میں ریڈیو ڈرامہ نے کافی ترقی کی حمزہ خاں شنواری، اجمل خٹک، سمندر خاں اور رضا ہمدانی کے بعض ڈرامے پشتو ادب کا غیر فانی سرمایہ ہیں۔

پشتو ادب کا تنقیدی سرمایہ اب تک نہ ہونے کے برابر تھا۔ سب سے پہلے اولسی ادبی جرگہ اور ادبی ٹولے کی تنقیدی مجلسوں نے تنقید کو رواج دیا۔ صنوبر حسین، اجمل خٹک، دوست محمد کامل، حسین بخش کوثر، قلندر، دہمی، مہدی شاہ، راہی اور ہمیش نے سائنٹفک تنقید سے یہاں کے ادبی حلقوں کو متعارف کرایا۔ پشتو کے ادبی ماہناموں "اسلم"، "الفلاح" (پشتو ایڈیشن) ترجمان افغان (پشتو ایڈیشن) میں بڑے معرکے کی تنقیدی بحثیں چلتی رہیں۔ اس چیز نے پشتو ادب اور ادیبوں کو بہت فائدہ پہنچایا۔ جدید مسائل کو سمجھنے اور نئے تقاضوں کو اپنانے کا شعور پیدا ہوا اور ادب نے زندگی سے رشتہ جوڑنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس سلسلے میں سرحد کے مشہور ترقی پسند ماہنامے "سنگ میل" کی خدمات کسی طرح فراموش نہیں کی جاسکتیں جس نے پہلے پہل پشتو کے قدیم و جدید ادیبوں پر بے باک تنقیدیں کیں۔ رضا ہمدانی نے اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں پشتو ادیبوں کو اردو ادب کی موجودہ رفتار اور معیار سے روشناس کرایا۔ جدید پشتو ادب کا جدید اردو ادب سے موازنہ کر کے پشتو ادیبوں کو نئی راہیں سجھائیں۔

نصراللہ خاں نصر پشتو ادبی ٹولے کے جنرل سکرٹری ہیں۔ یہ جماعت ایک عرصے سے نہایت خاموش خدمت میں منہمک ہے۔ انھوں نے بیشمار چھوٹے چھوٹے پمفلٹ لکھ کر اس ادارے کی طرف سے شائع کئے۔ ان پمفلٹوں کی کوئی ادبی حیثیت ہو یا نہ ہو پشتو زبان و ادب کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

طنز و مزاح میں کامل صاحب، حمزہ خاں، سمندر خاں، اجمل خٹک، خلیق صاحب، قاضی عبدالحلیم اثر، مہدی شاہ، طوفان۔ رضا ہمدانی، غنی، قلندر، دہمی کے نام قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ اسے جمع کیا جائے تو اردو ادب اس میدان میں شاید ہی پشتو کا مقابلہ کرسکے۔ پٹھانوں کے مزاج کو طنز و مزاح سے خاص مناسبت ہے۔ پشتو کے ہر ادیب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اسے نہایت خوبی سے نبھایا ہے۔

پشتو ناول، افسانہ، ڈراما، تنقید نے ہر چند نہایت تیز گامی سے ترقی کی ہے اس کے باوجود وہ ابھی تک دنیا کی دوسری زندہ زبانوں کے ساتھ شانہ ملاکر چلنے کے قابل نہیں۔ اور تو اور اگر صرف اردو ادب سے بھی اس کا مقابلہ کیا جائے تو ہم اسے پوری ایک صدی پیچھے پاتے ہیں۔ البتہ پشتو نظم کے متعلق پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا اردو سے ہم دوش ہونے کا دعویٰ کوئی مبالغہ آمیز نہیں۔

پچھلے دس برس میں پشتو ادب کی ترقی کی رفتار بے حد حوصلہ افزا رہی ہے۔ اس نے تمام اصناف میں خاطر خواہ ترقی کی۔ ادب کے ہر شعبے میں نئے نئے لکھنے والے پیدا کئے۔ اس نئی پود میں اچھے لکھے پڑھے نوجوان ملتے ہیں جو اپنی زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے ادب سے بھی واقفیت رکھتے ہیں ادب کے جدید تقاضوں سے غافل نہیں۔ نئے ادب کی رفتار سے بے خبر نہیں۔ اپنی کمزوریوں، کمیوں اور خوبیوں کا انھیں پورا پورا احساس ہے۔ ان نوجوان ادیبوں کے حوصلے بلند، عزائم خارا شگاف اور قلم بے باک ہیں۔ یہ محنتی، مخلص اور فن و مقصد دونوں کے دلدادہ ہیں۔

جس رفتار سے پشتو ادب کے جدید کارواں کے قدم اٹھ رہے ہیں اسکے پیش نظر توقع کی جاسکتی ہے کہ بہت کم عرصے میں یہ بہت آگے نکل جائے تو کچھ بعید نہ ہوگا — نشر و اشاعت کی مشکلات نے پشتو ادب کی ترقی کی راہ میں جو پہاڑ کھڑے کئے ہیں وہ نہ ہوتے تو نجانے آج یہ کس مقام پر ہوتا۔ اسکے علاوہ موجودہ دور میں کچھ سیاسی حالات نے بھی ایسی خطرناک صورت پیدا کردی ہے کہ ہر خالص ادبی کوشش کو بھی مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا ہے حالانکہ پاکستان کے دیگر صوبوں میں صوبائی زبان و ادب کی ترویج کیلئے کوئی روک نہیں لیکن بدقسمتی سے اس صوبہ کے لوگ ایسا نہیں کرسکتے اور جو اس خدمت کی جرأت کرتے ہیں انھیں یہ سودا بہت مہنگا پڑتا ہے۔

شریف کنجاہی

"زبانِ انسانی سماج کا وہ آلہ ہے جس نے روزِ ازل سے کشمکشِ حیات و رجحانات کی آئینہ داری کی ہے" اس لئے کسی زبان کے ادب کا جائزہ بھی زبان کے بولنے والوں کی "کشمکشِ حیات و رجحانات" کے جائزے ہی سے عبارت ہے اور دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ۱۹۴۵ء کا سال پنجاب ہی نہیں سارے ملک کے لئے بڑا اہم سال تھا۔ اسی سال جنگ کی آگ سرد ہونے لگی تھی اور مطالبات کے شعلے بلند ہونے لگے تھے ——— مطالبات جو ان وعدوں کا لازمی نتیجہ تھے جو غیر ملکی آقا پہلی بڑی جنگ سے لے کر آج تک کرتے چلے آئے تھے لیکن ان مطالبات میں ہم آہنگی نہیں تھی کیونکہ ملک کی دو بڑی جماعتیں ہم آہنگ نہیں تھیں۔ مسلم لیگ اب پاکستان سے کم کسی چیز پر رضامند ہونے کو تیار نہیں تھی اور کانگریس "اکھنڈ ہندوستان" کا راج چاہتی تھی۔ پنجاب میں اُن دنوں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی بستے تھے اور وہ دونوں ہی مطالبہ پاکستان کے خلاف تھے اور اس طرح بالواسطہ کانگریس کے حامی۔ مسلمانوں کی بعض سیاسی جماعتیں بھی لیگ کے اس مطالبے کے خلاف تھیں اگرچہ وہ ساری کی ساری کانگریس کی حامی نہیں تھیں اور خود ان کے حامیوں کی تعداد بھی ایسی زیادہ نہیں تھی۔

ظاہر ہے کہ اہلِ پنجاب کے سامنے ان دنوں دو ہی بڑے مطالبے تھے ——— پاکستان اور اکھنڈ ہندوستان۔ اور بجا طور پر ہم ان دونوں تقاضوں کا عکس ملکی ادب میں دیکھنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ پاکستان کا مطالبہ ایک ایسے وقت میں جاندار تحریک بنا جب ملک جنگ کی آگ میں جھلس رہا تھا اس لئے اس مطالبے سے متعلق ہمیں اردو ادب میں بھی ایسی کوئی جاندار تخلیق نہیں ملتی، چہ جائیکہ ہم پنجابی میں اس کی تلاش کریں جس میں ان دنوں لکھنے والے زیادہ تر سکھ تھے جو اس مطالبے کے خلاف تھے۔ ہاں آزادی اور استخلاصِ وطن کے بارے میں پنجابی میں بہت کچھ لکھا گیا اور خوب لکھا گیا۔ آزادیٔ وطن کے ان گیت گانے والوں کی تعداد تو کافی زیادہ ہے لیکن میں صرف دو کے ذکر پر اکتفا کروں گا ——— دھنی رام چاترک اور درشن سنگھ آوارہ۔ آوارہ پریت لڑی کے بانی لکھنے والوں میں سے ہیں اور اسی لئے ان کے خیالات اور تصورات کے بارے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ ان کی پنجابی نظموں کے مجموعے "بغاوت" "انقلاب دی راہ" "ادر" میں باغی ہاں" خود پکارتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور کیا کہتے ہیں۔ چاترک آوارہ سے زیادہ عمر رسیدہ اور کہنہ مشق ہیں۔ جنگ سے پہلے ان کی نظموں کا مجموعہ "کیسر کیاری" کافی مقبولیت حاصل کر چکا تھا۔ جنگ کے بعد اور تقسیم سے پہلے ۱۹۴۶ء میں انھوں نے اپنا ایک اور مجموعہ شائع

کیا اور اس کا نام نواں جہان "(جہان نو) رکھا۔ یہ نام غمازی کرتا ہے کہ جا ترک بکیسر کیا ہی والے جا ترک نہیں ہے اور ان کی نظمیں اب زعفرانی رنگ کی جگہ "عنابی" رنگ اختیار کر رہی ہیں۔

تحریک آزادی کے پر زور مطالبے کے علاوہ جنگ کے خاتمے نے کچھ اور موضوع بھی دے دیئے تھے کیونکہ جنگ ہمیشہ شوہروں، بیٹوں اور بھائیوں کی بیویوں۔ ماؤں اور بہنوں سے عارضی یا مستقل جدائی کا پہلو لئے ہوتی ہے۔ چنانچہ جہاں ہم پنجابی شاعری کی زبان سے آزاد ہند فوج کے جلے کے دلوں اس قسم کے اشعار سنتے تھے

اوہ بجلی پئی لشکاں مارے　　ڈگن لزں پئی لے الارے

اجڑیا باغ جے ٹر گیاتاں کی　　توں دی نہ رہنا اس جھکارے

دکھ وکھ توں دی نہ ہار پردے

گلچینا چھڈ دے پھل کھوہنے

ایہہ باگاں وچ لگدے سوہنے

وہاں اب اس قسم کے بولوں سے واسطہ پڑتا ہے

سنیا مک پئے ہن پینڈے سنیا　ٹٹ گئیاں ہن لاماں

آماہی جھب آ میں سنیاں ہویاں کئیں سلا ماں

نین بکلانے تیرا راہ تک تک کے اساں نلا ماں

آ ہن یو ہر گمردں میں آگئے نکی ہبت لچاری

آماہی ہن بھاری لگدی اوہ بروہ دی کھاری

جیہڑی رکھ گیا سیئیں میرے سرتے جاندی واری

لیکن ان باتوں کے علاوہ ان دنوں عوام ضروریات زندگی کی کمیابی سے بھی دوچار تھے۔ راشن بندی اس سے پہلے ہندوستانیوں کے لئے اجنبی چیز تھی لیکن اب سول سپلائیز کا محکمہ کھڑا ہو گیا اور ہر چیز پر کنٹرول ہے!

اس کیفیت کو کنجاہ کے ایک شاعر خوشتر صاحب کی زبانی سنیئے۔

نور دین نے کہیا امام دینا ہن توں سمجھ ہو گئے بھیڑے حال ساڈے

کال ٹٹ کے پے گیا جگ اتے کی کرن گے اتھرے بال ساڈے

ابے فصل وچہ کنک ہے ڈیڈھ تو یا دے سرے تے پیا سکا ساڈے

کرج ڈنگ پٹان دی ہے ادکھاکویں لنگھنے ماہ تے سال ساڈے

اک کرن ولا چوداں کھان والے　پکی توں تے نظر نہ آئے روٹی!

ووڈے ترسدے تے نکے بلکدے　نے ہائے ہائے روٹی ہائے ہائے روٹی

یہ نظم دیہاتیوں کے درمیان گفتگو کے انداز میں لکھی ہوئی ہے چنانچہ آگے چل کر نور دین کنٹرول کے محکمے والوں پر برستے ہوئے کہتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے

جنگی فتح حکومت نے پالئی اے سودے ابے نہیں وچہ بازار کھلدے

جیڈی گل ہیندی انہاں ہٹیاں تے ایڈا نہیں تھلنے تھانیدار کھلدے

رلا رام تے روشن ہیراز ہوری نیرنال محبت پیار　کھلدے

لین دین کھلا اٹھر دی غرض ساڈی کھاتے بندے نال اوہ ٹھگے
قسمت نال جے پہنچے وچہ ہٹی اگوں سرچ دہار پے جائیدا اے
گھروں لین ٹریئے کر کے رج دیتر کہہ کے شکر گو تیری لے جائیدا اے

۱۹۴۵ء کے بعد ۱۹۴۶ء آیا اور یہاں کے بسنے والوں کے لئے اضطراب لے کر آیا۔ ملک میں فرقہ وارانہ فساد کا آغاز ہو گیا اور پنجاب اس آگ کا بری طرح شکار ہوا۔ مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگے لیکن اس فضا میں وہ لوگ بھی تھے جو مل کر رہنے کے حامی تھے اور اپنی تحریروں کے ذریعے اسی کا درس دیتے تھے۔ نثر میں سردار گوربخش سنگھ ایڈیٹر پریت لڑی نے ان ایام میں بہت کچھ کہا۔ اس رسالے میں شائع ہونے والی نظموں کا اب ولہجہ بھی مصالحانہ تھا۔ انھی دنوں چاترک صاحب نے "ایکا" کے عنوان سے ایک نظم لکھی تھی جو پنجابی ساہتیہ کے سالنامے میں چھپی۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:-

آ دیر نا۔ آ بیلیا۔
آ سوچئے بہہ کے ذرا
اک وقت سی دو نویں اسی
رچ مچ دے انسان ساں
اک خون سی اک جان ساں
نہ ویر سی نہ جھیڑ سی
نہ پھوٹ سی نہ تریڑ سی
سینے فرشتے وانگ سن
دھیاں تے بھیناں سانجھیاں
ہمسائے ماپیو جائے ساں
کھاندے کماندے آئے ساں
ہن تے حالت ہو رہے
ڈھڈاں وچ وڑ گیا چور ہے
دکھری جنی کوئی وا دگی
تینوں تے مینوں آ لگی!!

پنجاب میں ان دنوں فسادات کی روک تھام کے لئے امن کمیٹیاں جگہ جگہ قائم کی گئیں اور لوگوں کو پرامن رہنے کی تلقین کی گئی لیکن لوگ اب پرامن نہیں رہ سکتے تھے۔ پانی اب سر سے گزر چکا تھا۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان خلیج گہری ہوتی جا رہی تھیں اور مسلمان امن کمیٹی کو فساد کمیٹی سمجھنے لگے تھے کیوں کہ اس کی سرپرستی ہر جگہ خضر حکومت کرتی تھی جس سے مسلمان بدگمان تھے۔ چنانچہ انہی دنوں کنجاہ میں امن کمیٹی کا ایک جلسہ ہوا جس میں خوشتر صاحب نے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ایک نظم پڑھی جو سرکاری جذبات و رجحانات کے تو خلاف تھی لیکن مسلمانوں کے جذبات کی پوری پوری عکاسی کرتی تھی۔ امن کی کوششوں کے خلاف بھی نہیں جاتی تھی۔ وہ نظم یہ ہے ؎

چھویاں گنڈاسے لبھ رکھیاں کٹاراں دی　　نیزے سان بھالے سان نالے تلواراں دی
تیر تے کمان چھرے تیز ہویاں دھاراں دی　　ساڈے کول سان ہتھیار ہزاراں دی
چلے نہ چلائے اساں کدے دی جہاں وچہ

جویں اج تُساں پئے چلائے ہندوستان وچہ

ڈھنگ تے طریقہ اسی لڑن والے جاندے		سینے ہوئے تساں ساڈے معرکے جہان دے
ہمتاں دلیریاں رتے زور مسلمان دے		لڑان لگے قدم پچھاں رکھنا نہ جان دے

لڑن دے ساں دھنی ایسے مار دا انکار نہ
بھلے بھلے دشمناں دی بھلی ساڈی وار نہ

اسی طرح مسلمانوں کی جوانمردی اور بہادری کا ذکر کرنے کے بعد اپنے معرکوں کا ذکر کرتے ہیں ۔

اساں جنگ کیتے نال رجھیاں ایرنیاں		ذجیرڈ دیاں سان اونہدل چڑھیاں جوانیاں
کیہڑی تھاں نوں ساڈے منھے لگیاں غنیماں		بچیاں نوں مار کے دڑیاں زنانیاں

تساں دانگ بچیاں نوں نیزے تے نہ ٹنگیا
ظالماں توں ایڈا ظلم کردیاں نہ سنگیا!

اس کے بعد خوشتر صاحب بڑی اچھی طرح جنگ کے اسلامی طریقوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

ہر جنگ وچہ ساڈے نبی دا فرمان نال!		بچیاں تے بڈھیاں تے ہتھ نہیں اٹھاؤندا
تُساں نہیں زنانیاں نوں چھیڑناں ہلاؤناں		منگے جیہڑا امن اوہنوں جنگ توں بچاؤناں

تساں پہلوں چھیڑ نہیں چھیڑنی لڑائی دی!
صلح ہر دے جنگی ڈھونڈ ڈھونڈنی بھلائی دی

اسی مسلمان جنے ہندو سے کہ باہر دے!		سارے پیر دکار اس عرب دے سردار دے
اسی بدھے ہوئے اوہدے قول اتے قرار دے		امن دے تلاشی ڈھنگ امن دے گزار دے

تہاں دیکھ لے کے گنڈا سے پھر ٹھیک نہیں!
نسی ساڈے خون دے پیاسے پھر ٹھیک نہیں

اور یہ سب باتیں کہنے کے بعد غیر مسلموں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ۔

ہن کہیاں امن کیٹیاں بناندے او		ساہنوں کاہنوں نال پئے اپنے رلاندے او
کوئی دا لانا بے کہ اج گھبراندے او		مار کے چپیڑ سانوں چپ پئے کراندے او

ساڈے کولوں ڈر دے نہ اسی کوئی ہوے نہیں
ہسے دے سنگ اسی کدے رل ٹرے نہیں

آخر میں ان سب فسادات کی ذمہ داری خوشتر صاحب غیر ملکی آقاؤں پر ڈالتے ہوئے بات کو یوں ختم کرتے ہیں ۔

بکرے نوں ابجے تورڑی سمجھ نہ آئی اے
سنیے کنڈ ہتھ جیہڑا پھیردے قصائی اے

جو کے ایام تقسیم ملک تک جس طرح گزرے عیاں ہیں اور ان دنوں پنجاب پر کیا کچھ گزری محتاج بیاں نہیں۔ اس شب گزیدہ سحر اور داغ داغ اجالے نے اردو کی طرح پنجابی میں لکھنے والوں کو بھی متاثر کیا اور زود پشیمانی کی جو کیفیت پنجاب کے بسنے والوں پر طاری ہوئی اس کا سب سے زیادہ دردناک اظہار امرت پریتم نے اپنی اس مشہور نظم میں کیا جو اس بول سے شروع ہوتی ہے۔ "اج آکھاں وارث شاہ نوں کدروں قبراں وچوں بول"۔ یہ خلوص و جذبات سے لبریز نظم "سویرا" کے علاوہ اور بھی کئی رسالوں کی زینت بنی اور یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اگرچہ یہ نظم ایک سکھ عورت کی تخلیق ہے لیکن واہگہ کے اس طرف بسنے

والوں کے جذبات بھی یہی ہیں۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک کا سارا دور افراتفری اور خلفشار کا دور تھا اور "یاراں فراموش کردند عشق" والی کیفیت کا حامل۔ اس کے باوجود پنجابی ادب میں ان دنوں مختلف موضوعوں پر بعض ایسی کتابیں شائع ہوئیں جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ نانک سنگھ جی نے "Love Marriage" اور "دو کنارے" دو بہت اچھے ناول پیش کئے۔ سرجیت سنگھ نے "تبتا جاگی" لکھ کر ناولوں کے موضوع کی باگ ایک خاص طرف موڑنی چاہی۔ مسافر جی نے "دکھی دنیا" کے نام سے اپنی کہانیوں کا مجموعہ شائع کیا۔ انگریزی زبان کے بعض ناولوں کے ترجمے بھی ہوئے ہیں جن میں Hunch Back of Notre Dame کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ فسادات سے متعلق کرتار سنگھ جی دُگل نے "آگ کھان والے" کے نام سے کہانیوں کو چھپوایا۔ نوتیج جی نے پریت لڑی میں بعض کہانیاں لکھیں جو اتنی پسند کی گئیں کہ ان کا کئی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ امرتا پریتم نے "تیجے شری" ایک چھوٹا سا ناول لکھا جس میں بور ژوا زندگی کو پیش کیا۔ بلونت گارگی نے ایک ایکٹ کے ڈرامے لکھے جن میں سے مجھے دو کے نام یاد ہیں — "لین دین" اور "مہمان"۔ نظموں کا بھی یہی حال ہے۔ راجہ رام ساقی کا مجموعہ "چند کنارے" اس کے پہلے مجموعۂ کلام "ہنیریاں اجالے" کے بعد دوسری کامیاب کوشش ہے۔ اسی طرح کچی جی کے گول گیت "اور چاتر کے" "نواں جہاں" کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس میں ایک بات ضرور کھٹکتی ہے اور وہ پنجابی میں مسلمان لکھنے والوں کا فقدان ہے اور اس کا سب سے بڑا سبب پنجابی کا رسم الخط ہے۔ تقسیم سے پہلے پنجابی کے جتنے پرچے تھے وہ سب کے سب گورمکھی رسم الخط میں چھپتے تھے اور مسلمانوں میں سے بہت کم اس سے آشنا تھے۔ پھر ہم اس غلط فہمی کا بھی شکار تھے کہ پنجابی سکھوں کی زبان ہے۔ اس لئے شعر و شاعری کے سلسلے میں تو شرف صاحب مرحوم، مولا بخش کشتہ صاحب اور چند ایک اور نام کبھی نہ کبھی دیکھنے میں آ ہی جاتے ہیں لیکن پنجابی کہانیاں اور ڈرامے لکھنے والوں میں صرف سجاد حیدر ام۔ اے کے سوا اور کوئی نام نظر نہیں آتا۔ حالانکہ پنجابی رسالوں کی کمی نہ تھی اور ان میں پریت لڑی، پنجابی ساہتیہ اور پنج دریا تو خاصے مقبول تھے۔ پنج دریا کے ایڈیٹر موہن سنگھ ماہر پنجابی کے چوٹی کے شاعر ہیں۔ ان کی نظم "اسی دا بوٹا" ایک ایسی چیز ہے جس کا جواب کسی اور زبان میں نہیں مل سکتا۔ ان کا موضوع کبھی سیاسات نہیں تھا لیکن اس تقسیم کے بعد میں نے دیکھا ہے کہ وہ بھی پہلو بدل چکے ہیں۔

تقسیم ملک اور سکھوں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد پنجاب کے رہنے والوں کو محسوس ہوا کہ پنجابی تو ان کی اپنی زبان ہے چنانچہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی لاہور والی کانفرنس میں اس کی حمایت میں لب کشائی ہوئی۔ پنجابی نظمیں پڑھی گئیں اور پسند کی گئیں۔ اردو رسالوں نے انھیں شائع کیا بلکہ بعد میں تو سویرا اور ادب لطیف میں تو پنجابی نظموں کو مستقل جگہ مل گئی اور ہفت روزہ احساس میں ایک آدھ مضمون پنجابی زبان ہی میں مستقل طور پر چھپنے لگا۔ اسی طرح ہفت روزہ اقدام میں منظور انور قریشی صاحب نے پنجابی کے لکھنے والوں کے بارے میں تنقیدی مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔

انھیں ایام میں ڈاکٹر فقیر صاحب نے سالک صاحب کے مشورے سے "پنجابی" ماہنامے کا آغاز کر دیا جس نے ملک کے پڑھے لکھے طبقے کو اپنی طرف مائل کر لیا۔ چنانچہ پنجابی کے پرچوں میں ... جناب حمید نظامی۔ مولانا اختر علی آمر۔ جناب شورش کاشمیری سے لے کر ڈاکٹر باقر، سید عابد علی عابد اور صوفی تبسم صاحب تک سب نے ہی — کچھ نہ کچھ لکھا اور صوفی صاحب نے تو اس دور میں بعض ایسی غزلوں کا پنجابی ادب میں اضافہ کیا جن کو پڑھ کر بے اختیار منہ سے نکلتا ہے کہ — بیا در یدکہ ایں جا بو سخندانے ...... مثال کے طور پر ان کی یہ غزل پڑھئے —

ساڈے عشق دے چمکدے لیکھاں تے ڈاہڈے غم دیاں سیاہیاں ڈھل گئیاں
جیہڑیاں حسن تیرے چمکائیاں ساہن اوہ چاننیاں راتاں رُل گئیاں
ایس عشق زمانے دے دھاگے دیاں کجھ ایڈیاں لیاں گنجلاں ساہن
کجھ کھلدیاں کھلدیاں ہور پیاں کجھ پیندیاں پیندیاں کھل گئیاں!
گلاں مٹھیاں مٹھیاں پیار دیاں جیہڑیاں دواں نے بیٹھ کے کیتیاں سن!
جیہڑیاں نال اساڈڑے بیتیاں سن سانوں یاد رہیاں تینوں بھل گئیاں!

ساتھوں تیری محبت دیاں یاداں نواں ایس جگ دیاں دکھڑیاں کھوہ لیتا!
یاداں تیریاں کیڈیاں نعمتاں سن کیہڑے مُل آئیاں کیہڑے مُل گئیاں!
بیٹھے ہوئے ساں ایکے مدتاں توں دل دچ کئی آزادیشاں تاں دے
اِکو مہر دی یار نے نظر کیتی سبھے میل کدورتاں ڈھل گئیاں ——!!

چوتھے شعر کا مضمون وہی ہے جسے فیض نے یوں ادا کیا ہے ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا!
کس درجہ دلفریب ہیں غم روزگار کے

لیکن صوفی صاحب نے اس خیال کو جس بلندی پر پہنچایا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے اور "یاداں تیریاں نعمتاں سن کیہڑے مل آئیاں کیہڑے مل گئیاں" کا جواب نہیں مل سکتا۔

صوفی صاحب نے پنجابی شاعری میں نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ انھوں نے مستزادیں لکھیں اور اس طرح پنجابی شاعری کی تنگ دامانی کو رفع کیا۔ اس سے پہلے پنجابی شاعری میں آزاد نظم کا رواج ہو چکا تھا لیکن جہاں تک میری معلومات ہیں مستزاد کسی نے نہیں لکھی تھی اور اس کا سہرا صوفی صاحب ہی کے سر ہے۔
پنجابی رسالے نے نظموں کے علاوہ نثر میں لکھنے والوں کیلئے بھی میدان پیدا کر دیا اور اس کی قلیل مدت حیات میں قدیم شاعروں پر متعدد مضامین لکھے گئے۔ مرزا مقبول بدخشانی صاحب نے ہاشم پر لکھا۔ راقم الحروف نے میاں محمد کی شاعری پر اظہار خیال کیا اور کشتہ صاحب نے ہیر وارث شاہ میں "دخیل" اشعار کے بارے میں واقفیت بہم پہنچائی اسی طرح بھٹی صاحب نے نہ صرف اپنی پنجابی نظموں اور گیتوں کے ذریعہ پنجابی کی خدمت کی بلکہ تنقیدی مضامین سے بھی اس کو گل بداماں کیا اور کہانیاں بھی لکھیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور نے بھی پنجابی زبان کی خدمت میں کافی حصہ لیا اور اس کے پروگراموں میں بار ہا تنقیدی مقالے آئے۔ کہانیاں نشر ہوئیں اور مشاعرے ہوئے بلکہ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے لیکن ریڈیو پاکستان چونکہ ایک سرکاری ادارہ ہے اس لئے وہاں بعض ایسے شاعروں کے لئے گنجائش نہیں ہوتی جن کے تصورات وخیالات حکومت وقت کے تصورات سے آنکھ چراتے ہوں اسی لئے ریڈیو سننے والے راہی کی نظموں سے مستفید نہیں ہو سکتے جو اس وقت پنجابی کے چوٹی کے لکھنے والوں سے ہے اور اس کی کتاب "ترنجن" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے کس طرح پنجابی ادب کی روح کو اپنے آپ میں سمو لیا ہے۔ یہی حال استاد دامن کا ہے جس کی باغیانہ نظمیں نذر الاسلام کی یاد تازہ کر دیتی ہیں لیکن وہ "بدست صبا" ہم تک پہنچ سکتی ہیں نہ کسی رسالے کی زینت بن سکتی ہیں۔ کچھ مہینوں سے امروز کے صفحات میں ہر ہفتہ قاسمی صاحب کی توجہ سے "گل بات" کا مستقل عنوان قائم کر دیا گیا ہے جس سے پنجابی ادب سے لگاؤ رکھنے والوں کی کچھ نہ کچھ پیاس بجھ جاتی ہے لیکن پھر بھی ہفتہ کے بعد کسی اخبار کا ایک آدھ صفحہ زبان اور ادب کو زندگی بخشنے کیلئے ناکافی ہوتا ہے اور یہی وجہ ہو کہ ہمیں پنجابی کے اچھے اچھے شاعر تو ہر جگہ مل جاتے ہیں لیکن اچھے اچھے افسانہ نگاروں اور نقادوں کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ اور یہ دس سال تو جیسے گزرے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اگر پنجابیوں کی بے توجہی کا یہی عالم رہا تو آئندہ دس سال میں اس زبان کا کیا حشر ہو۔

سندھی ادب

(صفحہ ۳۰۶ سے آگے)

تقسیم کے بعد سے ہندوستان میں بھی بہت بڑے پیمانے پر سندھی ادب کی تخلیق شروع ہوئی۔ وہاں سے بھی کئی پرچے نکلے سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں، کتنے ہی تنقیدی مباحث چھڑے اور سندھی ادب زندگی کی کتنی ہی نئی راہوں سے ہمکنار ہوا۔ ہندوستان کا یہ سندھی ادب بھی دراصل اسی دس سالہ سندھی ادب کا ایک حصہ ہے۔ ملک تقسیم ہو سکتا ہے، عوام ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتے ہیں لیکن ادب ناقابل تقسیم ہے لہذا یہاں ہند و پاک کی بحث ہی بیکار ہے لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان کا یہ ادب اپنی جگہ خود ایک مستقل موضوع بحث ہے اسی طوالت کے لحاظ سے میں نے اس کا ذکر یہاں کرنا مناسب نہ سمجھا۔

انشاءاللہ، ہندوستان میں سندھی ادب کے بارے میں پھر کسی وقت کچھ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

بلوچی ادب

رزم آراء

پس منظر بلوچی زبان بولنے والی قوم کس خطہ میں آباد تھی ؟ اس کے متعلق ابھی تک کوئی صحیح رائے قائم نہیں ہوئی ہے اور نہ بلوچی زبان کا کوئی قدیم ادب موجود ہے جس سے کوئی اندازہ لگایا جا سکے۔ عام طور پر بلوچوں کا خیال ہے کہ حلب ان کی جنم بھومی ہے اور شجرۂ نسب امیر حمزہ سے ملتا ہے اس کی وجہ ڈومبکی قبیلہ کا وہ دفتر شعر ہے جس کا پہلا بیت ہے ؎

ما مریدوں یا علی اے دیں دا ایماں شبتن
حمزہ اولاد بلوچی صوب درگاہ گزیں!

لیکن بلوچوں کے اس خیال کی تائید تاریخ سے نہیں ہوتی۔ بعض تاریخی حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ بلوچوں نے خلیج فارس کے شمال میں اہواز کے مقام پر اسلامی فوجوں سے مقابلہ کیا تھا اور یہیں مشرف بہ سلام ہوئے۔ چوتھی صدی ہجری میں عرب سیاحوں کے سفرناموں میں بھی بلوچ قوم کا سرسری تذکرہ ملتا ہے۔ وہ بلوچ کو بلوص لکھا کرتے تھے۔ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں بلوچوں کی ایران کے مغربی خطے میں آبادی کا بھی پتہ چلتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ حلب کے بلوچوں کا ایک طائفہ کرمان کے پہاڑی علاقوں میں آکر آباد ہوا۔ کرمان میں کیچ نامی قوم ان سے پہلے آباد تھی جسے عرب سیاحوں نے "قفص" لکھا ہے اور بتایا ہے کہ قزاقی اور رہزنی ان کا پیشہ تھا۔ یہ قوم بلوچوں سے بہت خائف رہا کرتی تھی کیونکہ بلوچوں نے امیر فنا خسرو "ابوالشجاع" کی بویہ فوج کی مدد سے کیچ کی حشر انگیزیوں کا سد باب کیا تھا۔ یہ باضابطہ طور پر بویہ فوج میں بھرتی بھی ہو گئے تھے۔ اس کے بعد جب بویہ حکومت کے خلاف سلطان محمود نے محاذ قائم کیا تو اس نے ایک دستہ بلوچوں کے خلاف بھی بھیجا تھا۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود غالب آیا اور بلوچوں نے اس کی فوج میں شرکت کر لی۔ یہ چوتھی ہجری کے اواخر اور پانچویں صدی ہجری کے اوائل کا زمانہ تھا۔ چھٹی صدی ہجری میں عربی مؤرخ یاقوت نے کرمان کی بلوچ بستیوں کا ذکر کیا ہے اور بلوچوں کی معاشرتی زندگی کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس وقت بلوچ سات قبائل میں منقسم تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ بلوچوں نے افغانستان اور بلوچستان کی طرف رخ کیا اور ایک طائفہ نے ہرات میں آباد ہو کر وہاں کی سیاست اور کاروبار مملکت میں عمل دخل حاصل کر لیا۔ امیر تیمور فاتح کی فوج میں

؎ شائع کردہ جنرل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال

بھی بلوچ شامل تھے۔ اس کے بعد پندرھویں اور سولھویں صدی تک بلوچ وادی سندھ میں پہنچ گئے

بلوچ قوم کے اس تاریخی پس منظر کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے زاد بوم کے متعلق کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ قوم ایران کے پہاڑی علاقوں میں آباد تھی اور وہیں سے اس کے مختلف طائفے عرب، افغانستان، بلوچستان اور دیگر علاقوں میں ہجرت کرتے رہے چوں کہ یہ قوم جنگجو اور فنون حرب میں ماہر تھی اس لئے وہ مختلف بادشاہوں کی فوج میں شامل ہو جایا کرتی تھی۔ اس طرح وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ان کی وفاداری ایک بادشاہ سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی رہی — اور یہ بات اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ ان کا اپنا کوئی مستقل وطن نہ تھا۔

قدیم ادبی سرمایہ

بلوچ قوم کا تذکرہ دوسری صدی ہجری سے باضابطہ ملتا ہے لیکن ان کے زبان و ادب پر کوئی روشنی نہیں پڑتی اور کوئی بھی ایسی دستاویز اب تک نہیں ملی ہو جس سے دوسری صدی ہجری اور اس سے پہلے کے بلوچی ادب اور شاعری کے متعلق کوئی معلومات حاصل ہو سکے۔ انگریز مستشرقین نے بلوچی زبان و ادب پر تحقیق کرتے ہوئے ان کے ادبی ورثہ کے متعلق کسی رائے کا اظہار نہیں کیا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ بلوچ کا کونسا طائفہ سب سے پہلے بلوچستان آیا؟ زبان و ادب کا کیا ذخیرہ تھا؟ اور بعد میں کیا کیا اضافہ ہوا؟ اور امتداد زمانہ نے ان بنیادی سوالوں پر پردہ ڈال رکھا ہے لہذا بلوچی زبان و ادب کی نشو و نما اور ترقی پر جامع تنقید بغیر علمی پیمانے کی تحقیقات کے ناممکن ہے کیونکہ بلوچ قوم کے قدیم ادب پاروں اور لوک کہانیوں اور لیکو[1] کو اکٹھا کرنے کے لئے کرمان کی پہاڑیوں، سیستان کے صحراؤں اور عرب کے نخلستانوں کو کھنگالنا ضروری ہے لہذا بلوچی ادب کے موجودہ جائزے کا آغاز میر چاکر خاں رند کی بلوچستان میں آمد اور حکومت کی تشکیل کے زمانے سے کرنے کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

میر چاکر رند

میر چاکر رند پندرھویں صدی کے اواخر میں سیستان[1] اور مکران سے گزرتا ہوا سنی اور شوران پہنچا اور بالآخر سیبی اور ڈھاڈر کے علاقے کو فتح کر کے بلوچ حکومت کی بنا ڈالی۔ یہ زمانہ بہادری اور سپہ سالاری کے جوہر کی نمائش کا تھا اور قوت کا مظاہرہ ہی سب سے بڑی صفت تھی۔ بلوچ قوم کے اس عہد کو زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ اسی دور میں بادیہ نشین نہ صرف ایک مستحکم حکومت کی سرداری کرتے ہیں بلکہ بلوچی ادب کی ترویج و ترقی کا سامان بھی مہیا ہوتا ہے۔ اس دور میں بلوچی ادب شباب پر پہنچ جاتا ہے۔ میر چاکر رند، مست توکلی، بی برگ رند، ریحان، شہ مرید، میر شہک کے علاوہ لاتعداد رزم و بزم کے شعرا اسی زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے بلوچی ادب کا ماخذ نہیں ملتا۔ ممکن ہے لوگ گیت یا زہیرک[2] یا سوت[3] یا لیکو[4] دوسری صدی عیسوی سے لے کر میر چاکر رند سے بھی پہلے کہی گئی ہوں اور امتداد زمانہ کی نذر ہو گئی ہوں۔ گمان غالب ہے کہ میر چاکر رند سے پہلے بلوچی ادب کا کافی سرمایہ ہوگا شے مرید، بی برگ، میر شہک، جام ڈرک اور ریحان کی شاعری اس خیال کو مزید تقویت پہنچاتی ہے۔ نیز یہ کیونکر ممکن ہے کہ بلوچ قوم موجود ہو اور ادب و شعر سے بے نیاز ہو جب کہ ادب و شعر ان کے تمدن کی شرط اول بھی ہو لہذا یہ رائے یقیناً درست ہو کہ میر چاکر کے بلوچستان میں حکومت قائم کرنے سے پہلے بلوچی شاعری اور ادب کا گراں ذخیرہ تھا جو امتداد زمانہ کی نذر ہو گیا۔

بلوچی ادب کے تین ادوار

اس مختصر سے تعارف کے بعد بلوچی ادب کو مندرجہ ذیل تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یہ تقسیم بلوچی شاعری کے مختلف رجحانات کے پیش نظر کی گئی ہے ویسے زبان و بیان اور لب و لہجہ کے لحاظ سے بلوچی ادب کی مزید کئی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور زیادہ موزوں قبائلی اعتبار سے تقسیم ہو گی لیکن اجمالی تعارف کے لئے بلوچی ادب کے تین ہی دور پیش کئے جاتے ہیں

الف:- پہلا دور میر چاکر رند کے قیام حکومت سے شروع ہو کر انگریزوں کی آمد تک پھیلا ہوا ہے جو کہ اواخر پندرھویں صدی سے

---

[1] موجودہ دیول

[2] ...[4] ورثہ وغیرہ سنف سخن

مخروج ہو کر اٹھارویں صدی کے آخر میں ختم ہوتا ہے کیونکہ ۲۶ جنوری ۱۸۶۷ءکو غلام حسین بگٹی آخری بلوچ ہیرو انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہوتا ہے اور اس کی شہادت ہی بلوچستان کی تسخیر پر آخری مہر کی حیثیت رکھتی تھی اس سے پہلے تقریباً تمام بلوچ قبائل انگریزوں کے زیر نگین آچکے تھے یا پھر مصلحتاً ان کے خلاف صف آرا ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس سے ایک سال پہلے ۱۸۶۶ء میں فاتح بلوچستان سر رابرٹ سنڈیمن ڈیرہ غازی خاں کا ڈپٹی کمشنر مقرر ہو چکا تھا اور وہ فارورڈ پالیسی کے ذریعے بلوچ قوم اور اس کے اقتدار کو ختم کر رہا تھا۔ اس پالیسی کے ایک دوسرے سرکردہ رکن مسٹر بروس تھے لہٰذا بلوچی شاعری اس تاریخی واقعے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور انگریزوں کے خلاف بلوچ شعراء شعلہ فشانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

انگریزوں کی آمد سے پہلے بلوچ شاعری خواہ وہ رزمیہ ہوتی یا رومانی اس میں ایک وقار اور خود اعتمادی ملتی ہے۔ شہ مرید، مست توکلی، بی برگ، جام دُرک، اور خود میر چاکر خاں رند پہلے دور کے ممتاز شعراء ہیں۔ ان کی شاعری جوش، خود اعتمادی اور جذبۂ برتری کی نمایاں مثال ہے۔ اس دور میں جو رزمیئے لکھے گئے وہ بلوچ قوم کی بہادری، جاں سپاری اور مہمان نوازی کے ساتھ ہی ساتھ ان کے مقتدر اور ارباب ہمم ہونے کی شہادتوں سے پر ہیں اسی طرح رومانی شاعری بھی بلوچ کلچر کی پاکیزگی، نفاست، وارفتگی و خود رفتگی، سلیقہ اور رکھ رکھاؤ سے بھری ہوئی ہے۔ بلوچی کی رومانی شاعری صرف ہجر و وصال کی کیفیات اور لطیف احساسات و جذبات پر مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بلوچ قوم کے کلچر کا جوہر بھی سمویا ہوا ملتا ہے۔ زبان و خیال کی نزاکت و فصاحت کے لحاظ سے بھی یہ دور بہت ہی ممتاز معلوم ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ سے چشمے ابل رہے ہیں۔

سو لیابھن، تیغ علی بیردار مشہور و معروف رزمیہ گو تھا۔ اس کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر معاویہ کے زمانے میں قسطنطنیہ پر ایک اسلامی لشکر نے حملہ کیا تھا جس میں حضرت امام حسینؓ اور ایوب انصاری کے علاوہ بلوچ بھی ان کے ساتھ جہاد میں شریک تھے۔ اسی ڈوبمبلی کے دفتر شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ کربلا کے معرکے میں بلوچ حضرت امام حسینؓ کے ساتھ تھے۔ ایک دوسرا رزمیہ گو شاعر ہوتمان کلمتی گزرا ہے جس نے پرتگالیوں کے مکران میں حملے سے متعلق ایک طویل نظم کہی ہے۔ باغا اور سلیمان، لاشاری قبیلے کے دو شاعر تھے انھوں نے رند اور لاشار کے درمیان تیس سالہ جنگ کا مرقع اپنی نظموں میں پیش کیا ہے۔ رند قبیلہ کے ایک شاعر غلام بولک نے اپنے کلام میں رند قبیلہ کی مکران سے ہجرت اور سیوی میں گولہ قبیلہ سے لڑائی کی داستان منظوم کی ہے۔ اسی طرح غلام محمد بالاچانی۔ شہریار گورچانی، بیورغ، بن بہار، میر شہک وغیرہ رزمیہ گو شاعر گزرے ہیں۔ ان شعراء نے دیگر اصناف ادب میں بھی طبع آزمائی کی ہے خصوصاً بیورغ، بن بہار کی رومانی شاعری کافی مشہور رہی ہے۔ بیورغ میر گوہرام خاں لاشاری سفیر بن کر ذوالنون بصری کے دربار میں گیا تھا جہاں وہ امیر کی بیٹی شہزادی گراں ناز پر فریفتہ ہو گیا۔ بیورغ نے اپنے رومان کی داستان اور ارغونوں سے جنگ کے واقعات کو بہت ہی حسین پیرائے میں منظوم کیا ہے۔

اصل میں یہ دور وہ تھا جبکہ بلوچ کا بچہ بچہ شاعر ہوتا تھا۔ متمدن ہونے کی منجملہ شرائط میں سے شاعر ہونا بھی ایک ضروری شرط ہوا کرتی تھی۔ سپہ سالار، قول کا پکا، جری و بہادر، مہمان نواز، عاشق اور شاعر ہونا بلوچوں کے لئے لازمی صفات تھیں اور یہی وجہ تھی کہ جب شہ مرید کے باپ نے اس سے میر چاکر رند کی سرداری اور بزرگی کے سامنے جھک جانے کے لئے کہا تو شہ مرید نے جواب دیا کہ "مجھ میں اور میر چاکر خاں میں کیا فرق ہے؟ یہی نا کہ اسے سردار بنا دیا ہے، کیا وہ مجھ سے زیادہ شجاع ہے؟ کیا مجھ سے اچھی تلوار چلانا جانتا ہے؟"

عشق و سرمستی کا یہ عالم تھا کہ شہ مرید اپنے باپ سے کہتا ہے

ابوتی! ابوتی	میرے آبا! اے میرے آبا!
توکہ ندیستہ سودی	تم نے میری محبوبہ کو دیکھا ہی نہیں

لہ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۴۳ء؛ ۶ ۹۲ تاریخی شہادت نہیں

سلہ " " ۱۸۴۸ء نے یہ دفتر شعر شائع کیا ہے تاریخی طور پر یہ بیان محل نظر ہے۔ سمہ داستان ہانی شہ مرید

حان جیان تئی کیں پری	لہراتی ہوئی پری جان جان کو نہیں دیکھا
نوکہ مدیستن دوست نی	اگر تم میری محبوبہ کو دیکھ لیتے
لوٹکس سرِ بلوریں کلاہ	تم اپنے مندے کی ٹوپی معہ کنجا سسر
پہ ندگا تش گاہ لیتیں	اس کی اداؤں پر کب کے قربان کر چکے ہوتے

ہانی شہ مریذ بیورغ گراں ناز۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ گوہر جتنی کی داستان بھی ایک تاریخی حقیقت ہے۔ رند ولاشار کی تیس سالہ جنگ کی بنا ہی محشر خاموش تھی۔ اس کے علاوہ تقریباً تیس شعراء نے عشق کیا اور اپنے عشق کی داستان خود ہی لکھ گئے۔ یہ منظوم داستانیں بلوچی زبان کی رومانی شاعری کا قابل قدر سرمایہ ہے۔

اس سلسلہ کی ایک دوسری کڑی میر جاکر خاں رند کے بھتیجے ریحان کی شاعری ہے۔ اس کی شاعری سادہ و پُر کار ہے۔ وہ ایک دیہاتی دوشیزہ سالو سے محبت کرتا تھا۔ وہ اچانک بیمار پڑ کر فوت ہو جاتی ہے۔ ریحان نے اس کا ماتم لکھا ہے۔ سالو کا ماتم یقیناً بلوچی ادب میں ایک شاہکار تخلیق ہے ——— پہلے دور کا یہ اجمالی خاکہ ہے جبکہ بلوچ قوم سربلند اور غیور تھی۔ طاقت اور حکومت اس کے پاس موجود تھی۔ وہ ہر لحاظ سے مقتدر تھی اور اس کی تلوار اس کے ہاتھوں میں لہرایا کرتی تھی۔

دوسرا دور انگریزوں کے قبضہ بلوچستان سے شروع ہوتا ہے

ب :- بلوچ انگریزوں کی آمد سے پہلے قبائل میں تقسیم ہو چکے تھے۔ ان کی مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور رفتار زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ قومی حمیت و غیرت میں بھی فرق آ چکا تھا۔ اور جو باقی بچا تھا اسے انگریزوں نے ختم کر دیا لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بلوچی قوم انگریزوں کے خلاف صف آرا نہیں ہوئی اور اس نے انگریزوں کا خیر مقدم کیا۔ مجموعی طور پر بلوچ کسی طاقت کے سامنے بغیر پسپا ہوئے جھکنا جانتے ہی نہ تھے لہذا انگریزوں کے خلاف زبردست مدافعت کی لیکن چونکہ مرکزیت ختم ہو چکی تھی اور قبائلی رقابتیں شدید تھیں اس لئے متحدہ طور پر وہ انگریزوں کے خلاف کوئی مؤثر اقدام نہ کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے آہستہ آہستہ تمام قبیلوں کو مطیع و فرماں بردار بنا لیا۔ اور اس طرح بلوچ قوم مجموعی طور پر مسخر ہو گئی۔ محمد حسین بگٹی کی شکست، محراب خاں کی شہادت اور مریوں کی بغاوت چند ایسے تاریخی واقعات ہیں جو بلوچ قوم کو آج بھی سربلند کئے ہوئے ہیں اور ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنی شدت کے ساتھ انگریزی سامراج کے خلاف تھے اور اپنے اقتدار اعلیٰ کو قائم رکھنا چاہتے تھے لیکن انگریزوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور انگریزوں نے نہ صرف فارورڈ پالیسی اور سنڈیمن سسٹم کے تحت بلوچستان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا بلکہ اپنی حکمت عملی سے بلوچوں کو ان کے صفات قومی سے بھی محروم کر دیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب بلوچ قوم کا سماجی ڈھانچہ پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اب قبیلہ کا سردار منتخب نہیں ہوتا بلکہ وہ شخص ہوتا ہے جسے انگریز سرکار چاہتی ہے۔ اس طرح بالواسطہ بلوچ قوم اور بلوچ سرداروں میں بُعد پیدا ہو جاتا ہے اور قومی زندگی کی ترقی کی راہ میں سردار سب سے بڑے روڑے ثابت ہوتے ہیں۔ اسی زمانے میں سبی دربار کے موقعہ پر ایجنٹ گورنر جنرل اپنی بگی گھوڑوں کے بجائے سرداروں سے کھنچواتا ہے۔ بلوچ سرداروں میں غالباً بگٹی کے علاوہ سب کے سب لاٹ کی بگی کو کاندھا دیتے ہیں۔

یہ بے عزتی کی انتہا تھی، تذلیل و تضحیک کی منتہا تھی۔ ملا مزار بگٹی اپنی نظم "لاٹ اے بگی" میں اسی قومی المناکی کا اظہار کرتا ہے اور یہیں سے بلوچی شاعروں کے لب و لہجہ اور فکر میں نمایاں تبدیلی ہوتی ہے۔ اس دور کے ممتاز شعرا میں ملا فاضل رند، ملا قاسم رند، ملا ابراہیم نورتھو، ملا بوہیر دشتی، ملا عبدالنبی دشتی، احمد واجو۔ کولواہی، ملا گوہرام، ملا بہرام، دینا مشکر لنڈ۔ براہیم باہوٹ ملا عیسیٰ گوادری، شہداد للّو وغیرہ ہیں۔ ان کی شاعری یا تو پرانے واقعات اور بہادری کی داستانوں پر مشتمل ہے یا پھر بلوچ قوم کی ہزیمت و پسپائی پر ان شعراء نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔

دوسرا دور انگریزوں کی آمد سے شروع ہو کر قیام پاکستان کے کچھ دنوں پہلے تک کو احاطہ کئے ہوتے ہے۔ اس طویل عرصہ میں بلوچی شاعری گھٹنوں چلی ہے اور بلوچی زبان و ادب اس قدر ترقی نہ کر سکا جس قدر اسے کرنا چاہئیے تھا نتیجہ یہ ہوا کہ خود بلوچ قوم اپنے زبان و ادب سے بیگانہ ہو گئی اور آج چند فیصدی کے علاوہ بلوچ اپنے شعرا اور ادبا سے ناواقف محض ہیں حالانکہ انگریزی سامراج کے انتہائی ظلم و ستم کے باوجود بلوچی زبان کے شعراء

برابر لکھتے رہتے' قوم کو جھنجوڑ کر بیدار کرتے رہے لیکن چونکہ انگریز قبائلی نظام کو تقویت پہنچانے کی حکمت عملی اپنا چکے تھے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ انھوں نے بلوچ قوم اور سرداروں کے درمیان ایک فصیل تعمیر کردی تھی لہٰذا بلوچ قوم اور سرداروں کے درمیان ایک مستقل کشیدگی و بُعد پیدا ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ بلوچ جن صفات پر ناز کیا کرتے تھے وہ سب ایک ایک کرکے ختم ہوگئیں حتیٰ کہ انگریزوں کی غلامی کے جوئے نے آہستہ آہستہ بلوچوں کو اپنی زبان اور شاعری کی محبت سے بھی محروم کردیا - یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے دور میں بلوچی شاعری کا انحطاط موت کی خاموشی کی طرح مسلط مستولی نظر آتا ہے -

(ج) تیسرا دور ۱۹۴۷ء کے بعد سے شروع ہوتا ہے - حالانکہ اس کی ابتدا بہت پہلے ہوچکی تھی - لیکن اس کو ایک واضح شکل اختیار کرنے میں دیر لگی - اس دور کی بنیاد بلوچ رہنما یوسف خاں مگسی نے رکھی تھی - وہ بلوچ قوم کو آزاد اور سربلند دیکھنا چاہتے تھے اور اس قدر باشعور تھے کہ بلوچ قوم کی پسماندگی اور افلاس کی وجہ سردار اور قبائلی استحصال کو سمجھتے تھے - لہٰذا حریت پسند بلوچوں کو ایک مرکز پر لانے کے لئے موصوف نے دسمبر ۱۹۳۲ء میں "کل ہند بلوچ کانفرنس" منعقد کی - اس کانفرنس میں پہلی مرتبہ بلوچوں نے حصول آزادی کے لئے اپنا لائحہ عمل مرتب کیا لیکن چونکہ یہ وقت انفرادی یا علاقائی کوششوں کا نہ تھا بلکہ انگریزی سامراج کو ہندوستان سے نکالنے کا تھا اس لئے بلوچ قوم بھی اپنے ادب اور کلچر کے لئے تحفظ کے لئے کوئی مثبت اقدام کرنے کی بجائے تحریک آزادی ہند میں مدغم ہوگئی اور بعد میں انجمن وطن کے ذریعے انگریز اقتدار کے خلاف جدوجہد کرتے گئے - انجمن وطن بلوچ' پٹھان اور بلوچستان کی دیگر قومیتوں کا اصل میں انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ تھا لہٰذا اس دور میں بلوچی ادب اور شاعری کی ترویج و ترقی کے لئے کوئی نمایاں کوشش نہیں کی گئی لیکن بالواسطہ بلوچ شعرا تحریک آزادی سے متاثر ہوئے اور کئی نئے شعرا نئے خیالات کے ساتھ ابھرے' ان شعرا میں گل خاں نصیر' محمد حسین عنقا بطور خاص قابل ذکر ہیں اور ان کا کلام حب الوطنی کے جذبے سے سرشار نظر آتا ہے لیکن ان شعرا کی بھی شاعری تشکیل پاکستان کے بعد ہی عروج پر پہنچتی ہے -

محمد حسین عنقا چونکہ پاکستان بننے کے چند ماہ بعد ہی گرفتار ہوگئے تھے اور حال ہی میں رہا ہوئے ہیں لہٰذا ان کی شاعری پر تفصیل سے اظہار رائے ممکن نہیں - پھر بھی جس قدر نظمیں اور غزلیں ان کی زنداں سے شائع ہونے کے لئے آتی رہیں ان کے مطالعے کے بعد یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ہیئت و مواد کے اعتبار سے کافی ترقی کی ہے اور ان کی شاعری کلاسیکل بلوچی شاعری کے ہم پلہ ہے -

ان دو پیش رو شعرا کے علاوہ بلوچی شعرا میں آزاد جمالدینی - ظہور شاہ ہاشمی' عنبر پنجگوری - محمد موسیٰ ناصر آبادی - حسرت بلوچ' میر بہرام خاں نیگل' میر محمد ہمدانی - میر مراد لولانی - میر محمد ہدیاتی - طالب شاہوانی - جمال خاں میر - محمد قاسم ہوت - احمد زہیر - محمد مراد ساحر پہلے درجے کے شعرا میں ہیں اور ان شعرا کا کلام نوائے وطن کوئٹہ اور اومان میں شائع ہوتا رہا ہے -

آزاد جمالدینی کی شاعری ترقی پسند مکتبہ فکر سے متعلق ہے لہٰذا اس میں بلا کی کشش اور جاذبیت سمٹ آئی ہے - ان کا ایک مجموعہ کلام "مست عہد توار" کے نام سے شائع ہوچکا ہے مست عہد توار کی نظمیں اس امر کی غماز ہیں کہ آزاد حیات و کائنات کے رشتے سے آگاہ ہیں اور ان کی نگاہیں ان حقیقتوں سے آشنا ہیں جو بلوچ قوم کی بربادی اور پسماندگی کا سبب بنی ہیں لہٰذا وہ بلوچی شاعری کی روایت کو قائم رکھتے ہوئے بلوچ قوم کو آزادی اور حریت کے لئے ایک مرکز پر جمع ہونے کی تلقین کرتے ہیں اور سرداروں اور ریاستی جواڑوں کے خلاف متحد ہونے کا درس دیتے ہیں - وہ واشگاف الفاظ میں بلوچ قوم پر ظاہر کرتے ہیں کہ یہ استحصالی قوتیں ہی ہیں جو ان کی تباہی کا باعث بنی ہیں اور جب تک انھیں ختم نہیں کیا جاتا اس وقت تک بلوچ قوم کی سربلندی محل نظر ہے وہ جرگہ' سرداری اور قبائلی نظام کے منفی رسم و رواج کے خلاف بھی آواز بلند کرتے ہیں اور ایک نئے بلوچستان کے تعمیر کرنا چاہتے ہیں جس میں بلوچ قوم مقتدر ہو اور ایک مرتبہ پھر اس زریں دور کا آغاز کیا جا سکے جس کے بانی میر چاکر رند تھے - گل خاں نصیر اور محمد حسین عنقا بھی یہی چاہتے ہیں لیکن ان کا تصور ابھی تک اس قدر پختہ نہیں ہو سکا ہے کہ وہ قومی اور قبائلی احاطہ سے نکل کر دو ٹوک طبقاتی جدوجہد میں شریک ہوسکیں - گل خاں اور محمد حسین عنقا دونوں کی وفاداری خان اعظم قلات سے وابستہ ہے - بلوچ عوام سے وہ زیادہ سے زیادہ بورژوا انقلاب کا تصور کر سکتے ہیں لیکن اس کے برعکس آزاد جمالدین کے سامنے اصل مسئلہ

طبقاتی جدوجہد کا ہے اور یہی بات انھیں بلوچی زبان کے دوسرے تمام شعرا میں ممتاز کرتی ہے - جہاں تک بلوچی زبان کے استعمال اور خیال کی بلندی کا تعلق ہے آزاد جمالدینی اپنے تمام ہم عصروں سے بہت آگے ہیں - "سوغات" "خان اعظم سے خطاب" "بلوچستانی تول مست" ہے تواز اس ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں -

آزاد جمالدینی کے بعد ظہور شاہ ہاشمی کا تعارف ضروری ہے - آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی نظموں کا رکھ رکھاؤ بھی غزل جیسا ہی ہوتا ہے - ان کی شاعری عشق و سرمستی کی شاعری ہے اور لب و لہجہ اور زبان و بیان کے لحاظ سے انھوں نے بلوچی شاعری کی روایات کو مورچہ باتھ قائم رکھا ہے

غزل بلوچی زبان کی صنف نہیں ہے بلکہ جدید شعرائے اسے فارسی اور اردو سے مستعار لیا ہے لہٰذا فطری طور پر ماحول اور ثقافتی پس منظر پر ایرانی تاثر پیدا ہو جاتا ہے لیکن ظہور شاہ کی غزل اس عیب سے پاک ہے

ان کے علاوہ بلوچی کے دیگر شعرا میں قاضی عبدالرحیم، محمد حسن تاج - محمد حسین عاجز، آسکر جمالدینی، برکت علی بیچگوری، عبدالحکیم عازمی - احمد گل، محمد جگر، نثار احمد خان اور محترمہ بنت میرس - ان شعرا میں کافی صلاحیتیں ہیں اور ان سے بلوچی شاعری کو بڑی توقعات ہیں -

نثر | بلوچی زبان کا حقیقی سرمایہ شاعری ہے - اب تک نثر ابتدائی مراحل میں ہے - قدیم نثری تحریروں میں مذہبی پند و نصائح، نماز روزہ کی ترکیب اور دیگر مذہبی موضوعات پر کتابیں ملتی ہیں - ان کتابوں میں سب سے قدیم کتاب "دُر یکتا" ہے جسے مولوی محمد علی نے ۱۹۰۲ء میں لکھا اور جو کتب خانہ قلات میں موجود ہے - اس کے علاوہ عیسائی مشنریوں نے بلوچی نثر میں کچھ پمفلٹ شائع کرائے تھے جو اب نایاب ہیں - البتہ بائبل سوسائٹی لاہور کا شائع کردہ بائبل کا ایک حصہ ملتا ہے - اس کی تاریخ اشاعت ۱۹۱۴ء ہے - مولوی عبدالصمد سرپارنی نے آسان الصرف اور ترتیب الصلوٰۃ علی الترتیب ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۶ء میں شائع کرائی - ان چند نثری تحریروں کے علاوہ بلوچی زبان میں قدیم ترین نثری سرمایہ قطعی عدم دستیاب ہے -

تقسیم ہند کے بعد بلوچ قوم اپنی زبان اور ادب کی ترویج و ترقی کی طرف منظم طریقے سے پہلی مرتبہ متوجہ ہوئی ہے چنانچہ گزشتہ دس سال میں دو بلوچی قاعدے شائع ہوئے ہیں پہلے کے مصنف محمد حسین عنقا ہیں اور غالباً انھوں نے ۱۹۴۶ء کے اواخر میں یا ۱۹۴۷ء کے اوائل میں اسے شائع کیا تھا - دوسرا قاعدہ خیر محمد ندوی صاحب نے مرتب کیا اور بلوچ ایجوکیشنل سوسائٹی (کراچی) نے اسے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے -

سید ظہور شاہ ہاشمی نے انجمن بھائیان کی فرمائش پر بھائی دین نامی ایک تبلیغی کتاب بھی لکھی ہے جو ۱۹۵۴ء میں شائع ہو چکی ہے - ان نثری تحریروں کے علاوہ بلوچی زبان کی انجمن کوئٹہ نے دو پمفلٹ بھی شائع کئے ہیں جو اس انجمن کے دستور العمل اور وضاحتی نوٹ پر مشتمل ہیں اسی طرح کا ایک پمفلٹ بلوچی زبان کی انجمن کراچی نے شائع کیا ہے

یہ کل نثری تحریروں کا سرمایہ ہے - اس کے علاوہ اب بلوچی ادبا افسانے، مضامین اور تنقید لکھ رہے ہیں نیز دوسری زبانوں کے ادب کو بھی بلوچی میں منتقل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے - اب تک ٹالسٹائی، گورکی اور چیخوف کی کئی کہانیاں بلوچی زبان میں منتقل کی جا چکی ہیں اور کرشن چندر کی ناول "جب کھیت جاگے" اور مکتبۂ افکار کے شائع کردہ افسانوی مجموعہ "کالا سورج" کے کئی افسانوں کا ترجمہ کیا جا چکا ہے - طبع زاد افسانوی ادب بھی پیدا ہو رہا ہے اور پرانے شعرا کے کلام کا تعارف اور ان پر تنقید کی بھی کوشش کی گئی ہے - ان نثری ادب لکھنے والوں میں بالاچ، یاد بنا ریکی، نور بخش، شیر محمد خاں مری، عبداللہ جان جمالدینی، آزاد جمالدینی، غلام محمد شاہوانی، تاج محمد وغیرہ اچھے نثار ہیں - آزاد جمالدینی اور شیر محمد خاں مری نے چند خوبصورت کہانیاں بھی لکھی ہیں جو زبان اور مواد کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں - شیر محمد خاں کا افسانہ "خون" یقیناً افسانوی ادب میں فخر کے ساتھ پیش کیا جا سکتا ہے -

عبداللہ جان جمالدینی کی نثر شگفتہ اور بے تکلف ہے - ان کا ایک مختصر سا تاثراتی مضمون "صبح کا ستارا" بہت ہی خوب ہے - نثری ادب کی تخلیق کے سلسلے میں ریڈیو پاکستان بھی مدد و معاون ثابت ہوا ہے اور اکثر و بیشتر فیچر، ڈرامے اور تقریریں یہاں سے براڈ کاسٹ ہوتی ہیں - ہر چند کہ ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہونے والے نثر پاروں کی زبان قابل اصلاح ہے پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ ایک ادارہ تو ایسا موجود ہے جہاں سے بلوچی زبان و ادب کی اشاعت ہو رہی ہے اس

سلسلے میں یقیناً "مدیر "اومان" میر محمد ندوی صاحب کی مساعی بھی قابل ستائش ہیں۔

نثری ادب کی پسماندگی اور بے بضاعتی کی وجہ یہ ہے کہ انگریز سامراج نے اپنی سامراجی منصوبہ بندیوں کے تحت بلوچی زبان و ادب کو پنپنے کا موقعہ نہ دیا بلکہ انتہائی خوبصورتی سے اس کی جڑ کاٹ دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مدت تک بلوچی صرف بول چال کی زبان ہو کر رہ گئی ——— اس طرح بلوچی کے لکھنے کا مسئلہ بالکل نیا مسئلہ ہے اور اس سلسلے میں بہت سی پیچیدگیاں ——— ہیں جن سے بلوچی داں طبقہ کو عہدہ برآ ہونا ہے۔ ان میں رسم الخط کا مسئلہ سب سے مقدم ہے اور اگر اس مسئلہ کو سائنسی طور پر حل کیا جا سکا تو بلوچی ادب و زبان کا مستقبل بہت ہی تابناک ہو جائے گا۔

دس سال میں

بلوچی ادب کا اجمالی جائزہ لینے کے بعد یہ کہنا ہرگز مبالغہ آمیز نہ ہوگا کہ پاکستان کے قیام کے فوراً ہی بعد بلوچی ادبا اور شعرا کی مساعی سے صدیوں کا جمود ختم ہو گیا اور بلوچی نظم و نثر نے تیز رفتاری سے ترقی کی نیز اسی دس سال کے عرصہ میں بلوچی زبان کی متعدد انجمنیں کوئٹہ اور کراچی میں بنیں اور انھوں نے بہ پابندی ہفتہ وار ادبی نشستوں کا سلسلہ شروع کیا۔ بلوچی زبان عدیوان کراچی نے گل خان نصیر کے کلام کا مجموعہ "گل بانگ" شائع کیا اور کئی کتابیں اور مجموعے ان کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہیں۔ نیز قدیم سرمایہ شاعری کو دیوان کی صورت میں یکجا کیا گیا ہے جو یقیناً ماضی کے ورثے کے تحفظ کے لئے ایک مثبت اقدام گردانا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کراچی میں بلوچ ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام ماہنامہ "اومان" کی اشاعت اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیاں حوصلہ افزا ہیں اور حسن و قبح اور معیار کی اشاعت سے قطع نظر کرکے ان سے بہت سی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ حال ہی میں بلوچی زبان عہ سرجکّ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس ادبی انجمن کے مقاصد میں باضابطہ بلوچی قدیم و جدید ادب کی اشاعت، نئے ادبا و شعرا کی راہ نمائی اور ایک ماہنامہ کا اجرا ہے۔ آدرش بلند اور حوصلہ افزا ہے اب یہ دیکھنا ہے کہ اس جماعت کے باعزم و جواں حوصلہ نوجوان ادیب بلوچی ادب کی خدمت سرانجام دینے کے لئے کیا اقدامات کرتے ہیں۔

گزشتہ دس سال (۴۵ء تا ۵۵ء) میں بلوچی زبان کی ترویج و ترقی بلوچ شعرا و ادبا کی انفرادی و اجتماعی کوششوں اور جد و جہد کا نتیجہ ہے حکومت پاکستان نے افسوس کہ اس سلسلے میں اب تک عملی تعاون کا ثبوت نہیں دیا۔ حالانکہ ایک سے زائد مرتبہ حکومت پاکستان کی توجہ ایک بلوچی رسالے کے اجرا کی طرف مبذول کرائی جا چکی ہے۔ حالانکہ بنگالی، پشتو، سندھی، پنجابی اور اردو کے علاوہ عربی و فارسی کے رسالے بھی حکومت پاکستان اپنے انتظام و اہتمام میں شائع کرتی ہے۔ بلوچی زبان و ادب سے اس بے توجہی کے متعلق استصواب کرنے کے بجائے زیادہ مناسب یہ ہے کہ حکومت پاکستان کی توجہ پھر ایک مرتبہ بلوچی رسالے کے اجرا کی طرف مبذول کرائی جائے۔

آخر میں

مجھے دو ایک باتیں اور کہنا ہیں۔ اس مضمون کو نہایت عجلت، بے سر و سامانی اور محدود وقت میں لکھا گیا ہے۔ جو بھی کچھ مواد اس مضمون کے سلسلے میں میں نے حاصل کیا ہے اور جن حضرات نے بطور خاص اس مضمون کی تیاری کے سلسلے میں میری ہر ممکن اعانت کی ہے ان میں محمد حسین عنقا، آزاد جمالدینی، سید ظہور شاہ ہاشمی اور میر محمد ندوی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان کی مخلصانہ رہبری اور مواد کی فراہمی کے بعد ہی میں برادرم صہبا لکھنوی کی خواہش پر یہ مضمون لکھ سکا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مضمون کے بعد بلوچی ادب پر یقیناً مزید مضامین لکھے جائیں گے اور اس کے قدیم سرمایہ شعر و ادب کی تلاش و جستجو جاری رہیگی۔

ص۔ ل

ادبی و تہذیبی خبریں و تبصرے

رفتار عالم

حضرت خواجہ حسن نظامی کی رحلت

۳۱ جولائی ۵۵ء کی شب میں اردو کے صاحب طرز ادیب، مایہ ناز انشا پرداز و عالم باعمل حضرت خواجہ حسن نظامی پانچ ماہ کی مسلسل علالت کے بعد رحلت فرما گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خواجہ صاحب ۲۵ دسمبر ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اردو، فارسی، عربی اور ہندی زبانوں پر آپ کو کامل عبور تھا۔ آپ نے ہندی میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ اسلامی تاریخ، فلسفہ اور دیگر موضوعات پر آپ کی پانچسو سے زیادہ کتابیں ہیں جن میں ۱۸۵۷ء کا غدر کافی مشہور ہے۔ ۱۹۱۱ء میں آپ نے مصر، فلسطین، شام اور حجاز کا سفر کیا۔ سفر سے واپس آکر آپ نے اپنا سفرنامہ لکھا جو ہزاروں کی تعداد میں فروخت ہوا۔ منادی آپ کا مشہور اخبار تھا جس میں نظام الاوقات کے ساتھ آپ کی ڈائری شائع ہوتی تھی جسے عام طور پر دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاتا تھا۔ آپ درگاہ سلطان نظام الدین اولیاؒ کے سجادہ نشین بھی تھے اور آپ کی فیوض و برکات سے مسلمانوں کے علاوہ غیر مذاہب کے لوگ بھی مستفید ہوتے رہتے تھے

اردو میں جس آسان طرز کی بنا آپ نے ڈالی وہ صرف آپ ہی کا حصہ ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز مثلاً مچھر، مکھی، سوئی وغیرہ پر آپ نے نہایت دلچسپ اور معنی آفریں مضامین لکھے جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے

قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی کی وفات

ابھی سعادت حسن منٹو، چراغ حسن حسرت اور حسن نظامی کی جدائی کا غم تازہ ہی تھا کہ اردو کے ایک اور مشہور ادیب قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھی بھی داغ مفارقت دے گئے۔ قاضی صاحب اسلامی تاریخ پر ایک سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے مسلم ثقافت کے بعض ایسے اچھوتے مباحث پر نہایت پُرمغز مقالے لکھے جو اپنی جگہ قول فیصل بن کر رہ گئے۔ ۵۳ء سے قاضی صاحب سندھ یونیورسٹی میں شعبۂ اسلامی تاریخ کے نگراں تھے۔ اس سے قبل آپ انجمن ترقی اردو میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے ساتھ کام کرتے رہے۔

وفات سے قبل آپ نے سرسید علیہ الرحمۃ کے حالات پر ایک نہایت بلیغ اور جامع و مانع مقالہ تیار کرنا شروع کیا تھا۔ جو بدقسمتی سے نامکمل رہ گیا۔ آپکی وفات سے ادبی و ثقافتی دنیا میں جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پر ہونا بہت مشکل ہے۔

مولانا حسرت کی بیوہ کی امداد

منٹو کی وفات پر بھی پاکستان بھر کے ادیبوں، شاعروں، اخباروں، رسالوں نے متفقہ طور پر صوبائی اور مرکزی حکومتوں سے یہ درخواست اور مطالبہ کیا تھا کہ منٹو کی بیوہ اور ان کی بچیوں کے لئے معقول وظیفہ مقرر کیا جائے تاکہ وہ باعزت طور پر اپنی زندگیاں گذار سکیں اور بچیوں کی تعلیم کا معقول انتظام ہو سکے۔ افسوس ہے کہ اس درخواست اور مطالبہ پر۔ جہاں تک ہماری اطلاعات کا تعلق ہے۔ حکومت کو توجہ دینے یا غور کرنے کی مہلت نہ مل سکی پچھلے دنوں چراغ حسن حسرت کی وفات پر پھر ایک بار اسی نوع کی حکومت سے درخواست کی گئی لیکن اس درخواست کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا!

مجید لاہوری ایڈیٹر نمکدان نے بکوشش داد (جہاں تک ہمیں علم ہے۔ حکومت کو غیرت دلانے کے لئے ...۳ روپے ماہوار حسرت صاحب

کی بیوہ کو ماہوار دینے کا اعلان کیا ہے ۔ یہ رقم تین تاجر، دو شاعر اور دو صحافی مل کر ادا کر رہے ہیں۔ یہ امداد اس وقت تک جاری رہے گی جب تک حکومت حسرت صاحب کے متعلقین کو کوئی رقم دینا منظور نہ کرے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کے ارباب حل و عقد کب اپنے معماران قوم کی امداد و سرپرستی کے لئے وقت نکالتے ہیں ۔ یہ حقیقت کتنی شرمناک ہے کہ پڑوسی ملک بھارت تمام مستحق ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو عرصے سے وظیفے دے کر اپنی علم پروری اور ادب دوستی کا ثبوت دے رہا ہے اور پاکستان میں بجز گنے چنے اور پسندیدہ حضرات کے علاوہ کسی بھی مستحق اور ضرورت مند ادیب و شاعر کو آج تک کوئی امداد یا وظیفہ نہیں دیا گیا ۔ یا دینے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی ۔ حالانکہ شادی بیاہ خصوصی اجتماعات پر رونق محفل بنانے کے لئے ۔۔ یہی ادیب و شاعر بلائے جاتے ہیں ۔ کاش ارباب حکومت، علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی سرپرستی کو بھی ۔۔ بڑے بڑے منصوبوں میں شامل کرنے کی زحمت گوارا فرمالیں ۔

اختر انصاری اکبر آبادی کی گرفتاری اور ضمانت پر رہائی

گھیانہ ۴ر جولائی (بحوالہ روزنامہ جنگ کراچی) مشہور شاعر شیر افضل جعفری نے اختر انصاری اکبر آبادی (ایڈیٹر رسالہ مشرب کراچی) کے خلاف زیر دفعہ ۴۲۰/۴۰۶ ایک استغاثہ ملک محمد یار صاحب کی عدالت میں دائر کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں اختر انصاری اکبر آبادی نے ایک خط شیر افضل جعفری کو لکھا کہ "آپ کا مجموعہ کلام "چناب رنگ" میرے ادارہ فکر و نظر اہتمام اس شرط پر طبع کیا جائے گا کہ نصف رقم مصنف اور نصف رقم ادارہ برداشت کرے"۔ مسٹر شیر افضل نے ۲۶۵ روپے ملزم (اختر انصاری اکبر آبادی) کو ارسال کر دئے مگر وہ کتاب دو سال تک نہیں چھپ سکی۔ مسٹر شیر افضل نے جب ادارۂ فکر و نظر کے صدر ابو مسلم صحافی کو خط لکھا تو موخر الذکر نے یہ کتاب چھپوادی مگر اختر انصاری اکبر آبادی نے طے شدہ شرائط سے انہیں آگاہ نہیں کیا اس لئے مصنف منافع سے محروم ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے اختر انصاری اکبر آبادی کو نوٹس دے دیا مگر خاطر خواہ جواب نہ پانے پر استغاثہ دائر کر دیا ۔۔ عدالت نے ملزم کے نام گرفتاری کا وارنٹ جاری کر دیا ۔!

کہا جاتا ہے کہ اس خبر کی کراچی میں اشاعت کے بعد اختر انصاری اکبر آبادی دو روز تک روپوش رہے ۔ لیکن تیسرے روز مبینہ وارنٹ کی بنا پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور بعد میں ابو مسلم صحافی مدیر اعلیٰ ماہنامہ مشرب کراچی (جسے امدادی کمیٹی مجلس عاقبت اندیش لمیٹڈ نکالتی ہے)، نے ضمانت دے کر انہیں رہا کرا لیا ۔ مزید تفصیلات کا انتظار ہے ۔

اس استغاثہ میں جو الزام اختر انصاری اکبر آبادی پر لگایا گیا ہے اس کی صحت یا عدم صحت کے بارے میں ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو نہایت افسوسناک ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح ادیبوں اور ناشروں کے درمیان جو ربط و مفاہمت ہے اور جس طرح نشر و اشاعت کا کام ابھی ابتدائی منزلوں سے گذر رہا ہے اس پر اس نوع کے واقعات یقیناً غلط اثرات ڈالیں گے اور ادیب و شاعر کے درمیان شکوک اور بد اعتمادی کی خلیج حائل ہو جائے گی ۔ کاش یہ واقعہ حقائق پر مبنی نہ ہو اور اختر انصاری اکبر آبادی اپنی پوزیشن صاف کر سکیں ۔

سندھی اردو کانفرنس

ادبستان خیر پور میرس کے زیر اہتمام ۱۸ اگست ۵۵ء کو ۹ بجے ممتاز کالج ہال میں پہلی کانفرنس کا زیر صدارت ظہیر کاشمیری آغاز ہوا ۔ اس کانفرنس میں سندھ کے تمام نامور شعراء کے علاوہ مشہور ادیبوں اور شاعروں ابراہیم جلیس، قتیل شفائی، صہبا لکھنوی، مسلم ضیائی ۔ تحسین سروری ۔ حمایت علی شاعر، ادیب سہارنپوری ۔ ناصر کاسگنجوی اور حبیب جالب وغیرہ نے شرکت کی ۔ پہلے اجلاس میں فیض احمد فیض کا منظوم پیغام وقار عظیم، ممتاز حسین اور عبادت بریلوی کے پیغامات کے بعد سندھی اور اردو ادب پر مقالے پڑھے گئے ۔ رات میں سندھ کے مشہور شاعر شیخ ایاز کی صدارت میں نہایت کامیاب مشاعرہ ہوا جو رات کے ۳ بجے تک جاری رہا ۔ مشاعرہ میں بھی سندھی اور اردو کے شاعروں نے حصہ لیا جن میں سندھی شعراء شیخ ایاز ۔ عبدالکریم گدائی، نیاز ہمایونی، بشیر موریانی بطور خاص قابل ذکر ہیں ۔

ادبستان خیرپور میرس - ایک نیا ادبی ادارہ ہے جس نے صرف ۸ ماہ کے قلیل عرصہ میں خیرپور جیسے دور افتادہ علاقہ میں قابل قدر ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ لائبریری کا قیام، تعلیم بالغان کا انتظام اور ادبستان کے تحت علمی اور ادبی نشستوں کا باقاعدگی سے جاری رہنا۔ اس ادارہ کے سرگرم رکن اور روح رواں حسن حمیدی کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے - یہ امر مزید دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اس ادبی ادارہ کو وزیر اعلیٰ خیرپور ممتاز حسن صاحب قزلباش، علی مردان صاحب اسپیکر اور دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری علم دوست حضرات کا مکمل تعاون حاصل ہے اور ان سب کے تعاون اور ادبستان کے کارکنوں کی مخلصانہ کوششوں سے خیرپور میں علم و ادب کا صحیح ذوق و شعور پیدا ہوگیا ہے -

پاک وہند مشاعرہ

انجمن ترقی اردو حیدرآباد سندھ کے زیر اہتمام نواب مشتاق احمد گورمانی کی صدارت میں ۱۹ اگست کو پاک وہند مشاعرہ ہوا ۔۔۔ گورمانی صاحب نے مبارک علی شاہ صاحب صدر انجمن ترقی اردو حیدرآباد سندھ کی صدارتی تقریر کے جواب میں پاکستان کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے انہیں فکر نو اور تعمیر نو کا مشورہ دیا اور کہا کہ ملک کی صحیح تعمیر و نشوونما صرف انہیں دانشوروں پر منحصر ہے -

مشاعرہ میں حضرت جگر، پروفیسر شور - احسان دانش - زیڈ اے بخاری، شعری بھوپالی - سحاب قزلباش - صہبا، ادیب - مجاز - محشر، ناصر - اطہر - پروفیسر عظیم عباسی - سید محمد جعفری - حمایت علی شاعر تحسین وغیرہ نے حصہ لیا گورمانی صاحب کی صدارت کے باعث پولیس اور پہرے کا نہایت اعلیٰ انتظام تھا جس کے نتیجہ میں شاعر اور عوام ایک دوسرے سے کافی دور تھے - اسی لئے مشاعرہ داد و تحسین سے تقریباً بے نیاز رہا۔ انتہا یہ کہ جگر صاحب کو جنہوں نے مشاعروں کی چھتیں اڑا دی ہیں - اس مشاعرہ میں نہایت خاموشی سے سنا گیا - یہی حال دوسرے شاعروں کا رہا صرف پروفیسر شور تنہا کامیاب شاعر تھے جنہوں نے اپنی منفرد غزلیات اور حسین طرز ترنم سے مشاعرہ میں ارتعاش اور گرمی پیدا کردی بہرحال پروفیسر ضیا اور ان کے رفیقوں کی کوششیں لائق تحسین ہیں کہ وہ حیدرآباد سندھ جیسے دور افتادہ علاقہ میں نمایندہ شاعروں اور ادیبوں کا اجتماع کرتے رہتے ہیں -

بلبل اکیڈیمی کا افتتاح

ڈھاکہ میں بلبل اکیڈیمی مشہور رقاص بلبل چودہری کی یاد میں قائم کی گئی ہے اس اکیڈیمی میں تقریباً ۱۰۰ طالب علم داخل ہوچکے ہیں اور ۱۵ ٹیچر فنون لطیفہ کی تعلیم دینے کے لئے رضاکارانہ طور پر کام کررہے ہیں ہفتہ میں دو دن رقص و موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے -

ڈاکٹر امرناتھ جھا چل بسے

مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر امرناتھ جھا کا ۲ ستمبر کو پٹنہ میں انتقال ہوگیا - آپ کی عمر ۵۹ سال تھی - آپ عرصہ تک الہ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے پھر یوپی اور بہار کے پبلک سروس کمیشن کے صدر کی حیثیت سے آپ نے خدمات انجام دیں -

سرود نواز سخاوت حسین کی وفات

لکھنؤ کے مشہور سرود نواز پروفیسر سخاوت حسین تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں انتقال کرگئے - کافی عرصہ تک آپ لکھنؤ میوزک کالج میں تعلیم دیتے رہے آپ نے یورپ اور دیگر ممالک کے دورہ میں اپنے علم و فن سے کافی شہرت حاصل کی تھی -

قاضی نذر الاسلام رانچی میں

مشہور انقلابی شاعر قاضی نذر الاسلام اپنے متعلقین کے ساتھ کلکتہ سے رانچی روانہ ہوگئے ہیں جہاں دماغی امراض کے مشہور ڈاکٹر میجر ڈیوس آپ کا علاج کریں گے -

جگن ناتھ آزاد بحیثیت اردو انفرمیشن آفیسر

حکومت ہند کے اردو انفرمیشن آفیسر سردار شمشیر سنگھ نرولا انگریزی سیکشن کے انچارج بنائے گئے ہیں اور ان کی جگہ پر اردو کے مشہور شاعر جگن ناتھ آزاد کا تقرر ہوا ہے -

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

(چند پیغامات، چند تاثرات)

قاضی محمد عبد الغفار

مجبی ۔ آپ کی یاد آوری کا شکریہ ۔ میں بیماری اور اپریشن کی منزلوں سے گزر کر پرسوں ہی علی گڑھ واپس آیا ہوں لیکن ابھی اپنے قلم سے کام لینے کے قابل نہیں ہوں ۔ اس لئے کہ دورانِ آپریشن میں سیدھے ہاتھ کی دو انگلیوں کا دورانِ خون بند ہو گیا ہے ۔ میں "افکار" کی ترقی کاوں سے آرزومند ہوں اور جیسے ہی اپنے قلم سے لکھنے کے قابل ہو جاؤں گا آپ کے لئے اپنا پیام بھیجوں گا ۔

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

میں افکار کا برابر مطالعہ کرتا رہا ہوں ۔ اس نے اپنا بلند معیار ہمیشہ قائم رکھا ہے ، اور اکثر ایسی چیزیں پیش کی ہیں جو اردو کے سرمایۂ ادب میں مستقل اضافہ ہیں ۔ اس کے قابل ایڈیٹر ہر قسم کے تعاون کے مستحق ہیں ۔ وہ جس حسن و خوبی اور پابندیٔ وقت کے ساتھ افکار کو نکالتے رہے ہیں اس کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہوں ۔ اور رسالے کی بقاء و کامیابی کے واسطے دست بدعا ہوں ۔

مولانا رازق الخیری

محترم صہبا صاحب ! سلام مسنون ۔۔ آپ کا اصرار ہے کہ میں افکار کے دس سالہ نمبر کے لئے پیام بھیجوں ۔ خاص نمبروں کا میں اب قائل نہیں رہا ۔ عام اشاعتیں بھی وقت کی پابندی [illegible] بازاری فحش کتابوں کے

ہمارے ہاں جو رسالے نکل رہے ہیں یا کوئی بڑا آدمی یا کوئی جماعت یا کوئی محکمہ جن پرچوں کی پشت پر ہے ذکر ان کا نہیں بلکہ ان ماہناموں کا ہے جو حسن کی نمائش کرنے والی عورتوں کی تصاویر اور حالات بلکہ ایسے افسانے بھی شائع نہیں کرتے جو عیاشی، بدمعاشی، بداخلاقی کی طرف نوجوانوں کو مائل کریں اور نہ ایسے معموں کی اشاعت جائز سمجھتے ہیں جن سے ترغیب ہو جوا کھیلنے کی۔ پاکیزہ ادبی اصلاحی رسالے کیسے کیسے پاپڑ بیل کر اور کس طرح خون پانی ایک کر کے مسلسل باقاعدہ شائع کئے جاتے ہیں۔ عوام تو خیر سمجھ ہی نہیں سکتے اس کا صحیح اندازہ وہ مدیرانِ و مالکانِ رسائل بھی نہیں کر سکتے جو تفریح یا شہرت کے لئے پرچے نکال رہے ہیں۔

ایڈورٹائزرز اینڈ پبلشرز کلب کے ایک ڈنر میں مغربی جرمنی کے سفیر نے بتایا تھا کہ ان کے چھ کروڑ کی آبادی کے ملک میں رسالوں کی مجموعی اشاعت چھ کروڑ ہے گویا فی آدمی ایک۔ دو دفعہ کی پٹی ہوئی مگر ایک زندہ قوم میں اپنی زبان کے رسالوں کی قدر دانی کا یہ عالم ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہماری ناقدری اور بے حسی کی یہ کیفیت ہے کہ پاکستان بھر میں ایک بھی صاف ستھرا پاکیزہ رسالہ ایسا نہیں جو دس ہزار ہی کی اشاعت کا دعویٰ کر سکے۔

ہجرت کے بعد سے ہمارے رسالوں کے چہرے زرد پڑے ہیں۔ ان کے سب کس بل نکل گئے۔ ہجرت کے بعد ابتدائی دو سال میں جو تھوڑی بہت بہار رہ گئی تھی۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان وی پی منی آڈر کا سلسلہ بند ہو جانے سے خزاں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ ہمارے ادیب جو چمنِ ادب کو سینچ رہے تھے اپنے خون سے، ہمارے رسالے جو امین ہیں ہماری تہذیب ہماری ثقافت، ہمارے تمدن، ہماری تاریخ ہماری زبان کے آج شکار ہیں کس مپرسی کا۔ ادیب بھوکے مر رہے ہیں اور ادبی رسائل ایڑیاں رگڑ رہے ہیں!

ناسازگار حالات، ناموافق ماحول اور ناقدری کے دور میں ادبی رسائل کا جاری رکھنا اور پھر اس طرح جاری رکھنا کہ ان کی روایات باقی رہیں بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کیسی کیسی کٹھن منزلیں طے کرنے کے بعد "افکار" نے دس سال پورے کئے ہیں، کس قدر شدید مشکلات کا آپ کو سامنا کرنا پڑ رہا ہے کتنی سخت مشکلوں میں آپ مبتلا ہیں یہ آپ ہی کا دل جانتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر وقت ہر لمحہ آپ کو فکر ہے افکار کا۔ ہر انسان کی بہت سی حیثیتیں اور اس کے کردار کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ افکار آپ کے سر پر کچھ ایسا سوار ہے کہ کسی اور ذمہ داری کا آپ کو ہوش ہی نہیں۔ اردو زبان، اردو ادب، اردو صحافت کی دو چار سال نہیں مسلسل دس سال کی خدمت کے بعد بھی آپ کو چین اور اطمینان کی چند گھڑیاں میسر نہیں۔

مغربی ممالک اور زندہ قوموں میں کسی ماہنامے کی عمر دس سال قابلِ ذکر نہیں ہوتی مگر ہمارے ہاں تو قابلِ ذکر ایک درجن رسالے بھی نہ ہوں گے جن کی عمر دس سال ہو۔ افکار کا دامن فضولیات لغویات خرافات سے پاک ہے۔ کسی پرچے کی افکار نقالی نہیں کرتا، چھچھور پن اور دل آزاری بھی اس کا مسلک نہیں۔ اس کے مضامین کا معیار بلند ہے۔ ان میں تنوع ہے اور دل آویزی لئے ہوئے۔ بڑی ہمت اور استقلال سے آپ افکار شائع کر رہے ہیں اور آفریں ہے آپ کی استقامت پر۔ جن توقعات پر یہ دس سالہ نمبر شائع ہو رہا ہے، خدا کرے وہ پوری ہوں اور وہ دن بھی اب جلد آ جائے کہ افکار کی طرف سے آپ کو اطمینان نصیب ہو۔ اور قدرت نے آپ کو جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں وہ اجاگر ہو سکیں۔

ممتاز حسین

برادرم صہبا صاحب - افکار کی دسویں سالگرہ کے موقع پر جب میں کچھ لکھنے بیٹھا ہوں تو مجھے وہ زمانہ یاد آ رہا ہے جب کہ میں بھوپال گیا تھا اور آپ کے یہاں مقیم تھا۔ یوں تو اس وقت افکار کو نکلتے ہوئے دو سال گزر چکے تھے لیکن آپ کی تگ و دو کو دیکھ کر

یہی احساس ہوتا تھا کہ گویا انکار ابھی حال ہی میں نکلا ہے جنگ کی معنوی ملازمت، کہنے کی پرورش اور پھر ایک ادبی رسالہ کا نکالنا جب میں ان ساری چیزوں کو اپنی نگاہ میں رکھتا ہوں تو مجھے آپ کی انتھک توانائی۔ استقلال، ہمت اور ادب پرورکے جذبے کی نہ صرف داد دینی پڑتی ہے بلکہ بقول میر "یا استاد" کہنا پڑتا ہے۔

اس کے بعد پھر آپ سے کراچی میں اس وقت ملاقات ہوئی جبکہ آپ کے پاس کچھ نہ تھا حتیٰ کہ انکار بھی نہ تھا اور آپ تقریباً اس کی فت سے سبکسار ہو چکے تھے۔ لیکن میں نے یہی مشورہ دیا کہ صہبا بھائی انکار کو نہ چھوڑیئے۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے جو آپ نے میرے اس مشورے کو قبول کیا اور آپ یہ کہتے ہیں کہ میں نے بس تمہارے کہنے سے انکار کو کراچی سے بھی جاری کیا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ انکار آپ ہی کے قوت ارادی اور غیر مختتم خزانہ توانائی (ENERGY) کی پیداوار ہے۔ خیر یہ سب تو ہوا، انکار ان پرچوں میں ہے جو سال ابتدا سے آج کے زمانے تک مسلسل طور پر اعلیٰ ادب اور تندرست ادب کا معیار قائم کئے ہوئے ہے۔ اردو داں طبقے کو اس پر فخر کرنا چاہئے کہ انکار اس زمانے میں بھی مشعل بکف رہا جبکہ اس کے بہت حریف پہلو بچا کر نکل چکے تھے اور زیادہ کیا لکھوں۔

احمد ندیم قاسمی

انکار نے اس دور میں بھی ادب کی توانائی اور تازگی کا پرچم بلند رکھا ہے اور یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ ایک میں ہی نہیں، تمام احباب آپ کی اس مستقل مزاجی کے معترف ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

برادرم صہبا صاحب! آپ کا گرامی نامہ مل گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے دس سالہ نمبر میں شرکت نہ کر سکا۔ یونیورٹی میں چھٹیاں تھیں اور میں باہر چلا گیا تھا۔ کئی مہینے سفر میں رہا۔ ان حالات میں مضمون لکھنا میرے لئے مشکل تھا۔ امید ہے کہ میری مجبوریوں کے پیش نظر مجھے معاف فرمادیں گے۔

ویسے آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ میں انکار کو نہایت اعلیٰ درجہ کا پرچہ سمجھتا رہا ہوں اور مجھے ہمیشہ اس کی محفل میں شریک ہو کر خوشی ہوتی ہے۔ اس لئے جی چاہتا تھا کہ دس سالہ نمبر میں ضرور شریک ہوں۔ میں نے انکار کا بچپن دیکھا ہے۔ اس کی جوانی دیکھی ہے اور میں ہمیشہ اس کا ہمنوا رہا ہوں اور آج بھی میرا یہی حال ہے۔

گزشتہ دس سال میں جس عزم اور ارادے کے ساتھ آپ انکار کو نکال رہے ہیں اس کے لئے آپ قابل مبارکباد ہیں۔ کیسے کیسے دور گزرے ہیں لیکن آپ نے ہمیشہ اس کو حوادث کے تھپیڑوں سے بچائے رکھا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے آپ نے اُس وقت پرچہ نکالا جب دوسری جنگ عظیم ختم ہو رہی تھی اور ہماری زندگی کا قافلہ ایک نئے موڑ پر آ گیا تھا۔ آپ نے اس وقت بھی صحیح رہنمائی کی۔ اور زندگی کی ارتقائی قوتوں کا ساتھ دیا۔ سچ پوچھئے تو مجھے آپ کی یہی بات سب سے زیادہ پسند تھی۔ اور اسی لئے میں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہا اور زندگی کے اس نئے دور میں بھی میں آپ کے ساتھ ہوں کیونکہ آپ اس پُر آشوب زمانے میں بھی اپنے راستے سے نہیں ہٹے۔ بڑے بڑوں کے قدم اس زمانہ میں لڑکھڑا گئے۔ لیکن آپ سے کوئی لغزش نہیں ہوئی۔

اس عرصے میں چوٹی کے ادیبوں نے آپ سے تعاون کیا صرف اس لئے کہ انکار صحت مند نظریات کا علمبردار تھا۔ آج بھی یہی اس کا حال ہے اور مجھے اسی لئے آج بھی اس سے وہی دلچسپی ہے جو آج سے دس سال پہلے تھی۔ اور آج بھی میں اسی طرح آپ کے ساتھ ہوں جس طرح اس سے قبل تھا۔

خدا کرے آپ کا نمبر ویسا ہی نکلے جیسا کہ آپ نکالنا چاہتے ہیں میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے

ابراہیم جلیس

برادرم صہبا صاحب! مجھے یہ معلوم کر کے بہت مسرت ہوئی کہ آپ افکار کا دس سالہ نمبر شائع کر رہے ہیں۔ خدا کرے کہ آپ اس کا سو سالہ نمبر بھی شائع کر سکیں۔ میں نے آپ کے اس یادگار نمبر کے لئے کوئی نیا مضمون یا افسانہ لکھنے کی بہت کوشش کی لیکن آپ میری مصروفیات سے بخوبی واقف ہیں۔ اب میں صرف اداریے لکھنے کے کام کا رہ گیا ہوں سو وہ اس لئے نہیں لکھ سکتا کہ وہ آپ کا حق ہے بہرحال میں آپ کے اس نمبر کی کامیابی اور سو سالہ نمبر کی اشاعت کا منتظر ہوں۔

مجھے بڑا فخر ہے کہ افکار کی پہلی اشاعت ہی سے میرا نام افکار کے قلمی معاونین میں شامل ہو گیا۔

صہبا صاحب۔ میں آپ کی ہمت کی داد دوں گا کہ سخت سے سخت ناسازگار حالات میں بھی آپ نے افکار کو اپنے سینے سے لگا کر پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج افکار اردو ادب کے چند اہم اور معیاری رسائل میں شامل ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہے کہ آپ تنہا آدمی کس طرح اتنا خوبصورت اور معیاری پرچہ شائع کر لیتے ہیں۔! آپ کی ہمت کی جتنی بھی داد دی جائے وہ کم ہے۔

(ڈاکٹر) ملک راج آنند

میرے پیارے دوست! ابھی دو دن ہوئے یورپ سے واپسی پر محبت نامہ ملا۔ مجھے واقعی افسوس ہے کہ آپ کے خاص نمبر کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ بات یہ ہوئی کہ یورپ جاتے وقت میں کسی کو یہ ہدایت نہیں کر گیا تھا کہ میری ڈاک وہیں بھیج دی جائے۔ آپ کا خط یہیں رہا۔ ورنہ میں ضرور کچھ لکھتا۔

اسے حقیقت سمجھیے کہ افکار اردو ادب کی خدمت میں پاک و ہند کے تمام ادبی رسالوں سے تجاوز کر گیا ہے۔ یہ آپ ہی کا دم ہے کہ ادب کشی کے اس دور میں افکار کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور اسے معیار سے گرنے نہیں دیتے۔ اپنے پرچے کی دسویں سالگرہ پر میری پرخلوص مبارک باد قبول کیجئے۔

میں دو افسانے بھیج رہا ہوں۔ اپنے نمبر میں کسی ایک کو شامل کر لیجئے گا۔ یا دونوں کو۔ جیسا آپ چاہیں۔

سردست تو تصویر بھیجنے سے قاصر ہوں۔ لیکن جلد بھیجئے کا وعدہ رہا۔

کیا کہوں کہ پاکستان آنے کا خواب ابھی تک خواب ہی بنا ہوا ہے۔ حالات کی ستم ظریفی تو دیکھئے کہ میں دنیا کے ہر ملک میں جا سکتا ہوں لیکن آج تک پاکستان جانے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ جہاں پیدا ہوا۔ جہاں پرورش پائی۔ جہاں ماضی کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں شاید کبھی آ سکوں اور آپ سے بھی مل سکوں۔

پروفیسر شور (علیگ)

افکار کی دہ سالہ انتھک اور پرخلوص خدمت ادب کے پیش نظر بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ افکار نے آرٹ اور ادب کے بلند نصب العین کو جلبِ منفعت، ضمیر فروشی، صوبائی عصبیت، شخصیت پرستی اور دماغی عیاشی کے عامیانہ پروپیگنڈے سے ہمیشہ پاک رکھا ہے۔ افکار اپنے زاویۂ نگاہ میں خالص "تصویر جاناں" اور فراری انفعالیت کا کبھی قائل نہیں رہا۔ افکار کا ہاتھ زندگی کی نبض پر ہے۔ اسکی آواز انسان اور سماج کے لئے ایک مستقل پیام تعمیر ہے۔ ایسی تعمیر جس میں بے خودی سے زیادہ خود آگاہی کار فرما ہے۔

ڈاکٹر سلامت اللہ

افکار ہمیشہ ادب کی ... اور خوب صورت بنانے کی

جد وجہد میں نمایاں حصہ لیا ہے کہ یہ ادب کا منصب ہے۔ تمام ادیبوں اور ادب نواز عوام کا فرض ہے کہ افکار کی ہر طرح حوصلہ افزائی کریں۔

کوثر چاندپوری

میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ افکار مسلسل مجھے مل رہا ہے آپ نے افکار کو کراچی سے جاری کرنے اور پھر اسے زندہ رکھنے میں جس عزم اور صلاحیت کا ثبوت دیا ہے وہ آپ کے آہنی انسان ہونے کی ایک کھلی علامت ہے۔ افکار اپنے معیار حسن کتابت اور ترتیب کے اعتبار سے بہت زیادہ قابل تعریف وستائش ہے

شوکت صدیقی

جس طرح شاہد احمد دہلوی کے بغیر ساقی۔ اور مولانا صلاح الدین کے بغیر ادبی دنیا نامکمل معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح صہبا اور افکار، لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھوپال سے افکار کا اجرا اردو رسائل کی تاریخ میں اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا کہ اس نے اس روایت کو بدل دیا کہ اچھے رسائل، بڑے شہروں کے علاوہ اور کہیں سے نہیں نکل سکتے۔ افکار نکلا، اور اس شان سے نکلا کہ اب وہ اپنا مقام پیدا کر چکا ہے۔

مجھ کو یقین ہے کہ افکار کی دسویں سالگرہ۔ کا یہ خصوصی شمارہ اردو ادب میں ایک قابل قدر اور یادگار اضافہ کرے گا اس لئے کہ میرے سامنے افکار کے وہ خاص نمبر موجود ہیں، جن میں اعلیٰ ادبی معیار کے ساتھ ساتھ ترتیب و تدوین میں ہمیشہ ندرت اور فنکارانہ ذوق کا ثبوت بہم پہونچایا گیا ہے۔

چند یادیں چند آنسو

پیارے صہبا۔ تازہ نظم "افکار" کے دس سالہ نمبر کے لئے بھیج رہا ہوں۔ پرسوں تمہارے بھوپال سے دس دن رہ کر واپس آیا ہوں۔ رشدی صاحب سے بڑی سرسری ملاقات ہوئی۔ بہرکیف سب لوگ اچھی طرح ہیں۔ کہیں نہ کہیں تمہارا اور افکار کا تذکرہ ہو ہی جاتا ہے

تمہارا

جان نثار اختر

(بمبئی)

مجی صہبا صاحب! تسلیم، خط ملا۔ بہت بہت شکریہ، ایک تازہ غزل بھیج رہا ہوں۔ میں نے بہت دنوں سے کوئی تصویر نہیں کھنچوائی ہے۔ چار پانچ سال پرانا ایک فوٹو سردست موجود ہے۔ وہ بھیجتا ہوں۔ ممکن ہے اس سے آپ کا کام چل جائے۔

میں نے ابھی تک باقاعدگی کے ساتھ لکھنا شروع نہیں کیا ہے وہ تعطل جو دس سال پہلے شروع ہوا تھا ہنوز جاری ہے۔ بارے وہ داخلی اور نفسیاتی اسباب جو اس تعطل کا سبب تھے تقریباً ختم ہو چکے ہیں اب میں تقریباً نارمل انسان کی حیثیت رکھتا ہوں۔ چنانچہ بالکل غیر ارادی طور پر کبھی کبھار ایک آدھ غزل ہو جاتی ہے۔ حالات ذرا اور بہتر ہو جائیں تو افسانہ اور تنقید اور نظم و قطعہ بھی لکھوں گا عزم اور حوصلہ بہت ہے اور اگر یہ ہے تو شاید اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں گا

(پروفیسر) اختر انصاری

(یونیورسٹی علیگڑھ)

مجی۔ سلام شوق، اشتیاق نیاز۔ ایک ہفتہ ہوا افکار کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ بظاہر پرچہ کی ورق گردانی کرتا رہا اصل میں ماضی کے اوراق ذہن میں کھل رہے تھے۔ تم یاد آئے۔ تمہارے ساتھ گزارے ہوئے دن یاد آئے۔ تمہارا جانا یاد آیا، اور پھر سب یادیں آنسوؤں میں ڈھل گئیں، بچے نزدیک ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ منہ پھیر کر آنسو پونچھ لئے۔

تمہارا بھوپال سے جانا تنہا تمہارا جانا نہ تھا۔ افکار ایک کارواں تھا جو تمہارے ساتھ کراچی چلا گیا۔ میں جن کے ناز اٹھاتا تھا یا جن پر ناز

(باقی صفحہ ۳۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

ادارہ

ایک تعارف

ہمارے صنعتی ادارے

پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز پاکستان کو ہوائی سروس کے سلسلہ میں خود مکتفی بنانے کے جذبہ سے جون ۱۹۵۴ء میں پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز کا افتتاح کیا گیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ بہت تھوڑی مدت میں اس ہوائی سروس نے اندرون اور بیرون ملک ہوائی سروس کا جال پھیلا کر نہ صرف مغربی اور مشرقی پاکستان کے دونوں بازوؤں کو ملا دیا بلکہ بیرون ملک بھی۔ اس سروس نے آرام و آرائش کا بہتر انتظام کر کے، وقت کو کم کر کے اور ہوائی سفر کے کرایوں کو کم کر کے پاکستان کی ہوائی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ یہ خلوص و عمل ہی کا نتیجہ ہے کہ اس قومی ہوائی سروس نے پاکستان کے بہترین صلاحیت رکھنے والے نوجوانوں کو غیر ممالک میں تربیت دے کر کمپنی کو ہوا بازوں، انجنیئروں اور کاریگروں وغیرہ کی ضروریات سے تقریباً بے نیاز کر لیا ہے۔ اس ہوائی کمپنی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے کراچی۔ لندن۔ ڈھاکہ۔ لاہور اور دوسرے مقامات کے سفر کے درمیانی وقفوں کو کئی کئی گھنٹے کم کر دیا ہے۔ پاکستان کو ذرائع حمل و نقل کے سلسلہ میں جن شدید دشواریوں کا سامنا تھا۔ پاکستان انٹرنیشنل ایرلائنز کے قیام اور اس کی تیز رفتار ترقی کے بعد وہ بڑی حد تک دور ہو گئی ہیں اور اطلاعات کے بموجب اس ہوائی سروس کو مزید وسعت دینے اور عوام کو ہر ممکنہ سہولت بہم پہنچانے کی جو اسکیمیں اس ہوائی سروس کے پیش نظر ہیں۔ توقع ہے کہ ان کی تکمیل پر پاکستان کی یہ قومی ہوائی سروس بین الاقوامی ہوائی سروسوں میں ایک امتیازی حیثیت کی حامل ہوگی۔

امپیریل کیمیکل انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ لندن کی مشہور امپیریل کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ کی ذیلی کمپنی جو پاکستان میں لمیٹڈ ہے عرصہ دراز سے کیمیائی صنعت کو فروغ دینے اور پاکستانی عوام کی خدمت کرنے کا فرض نہایت خلوص و محنت سے انجام دے رہی ہے۔ کرم کش ادویہ۔ غیر آہنی دھاتوں، پلاسٹک، رنگ، روغن، لیدر کلاتھ، بارود، کیمیاوی مرکبات، کیمیاوی کھاد اور کیمیاوی رنگ کی تیاری اس کمپنی میں مشہور سائنسدانوں اور ماہرین فن کی نگرانی میں کی جاتی ہے۔ کمپنی کے ماہرین فن کیمیاوی صنعت کو مزید ترقی دینے کے لئے مسلسل تجربات کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ امر لائق تحسین ہے کہ کیمیاوی صنعت میں آئی۔ سی۔ آئی کا نشان سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔

برما شیل پاکستان کے طول و عرض میں برما شیل اپنے اعلیٰ تربیت یافتہ اور تجربہ کار عملہ کے تعاون سے صنعتی اداروں، کارخانوں اور عوامی ضروریات کو باحسن طریق پورا کر رہا ہے۔ اس مشہور و مستند ادارے میں فنی تجربہ اور اعلیٰ قابلیت رکھنے والا ایک بڑا عملہ نہایت مستعدی سے اپنی خدمات انجام دیتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کی صنعتی ترقی میں برما شیل اور اس کے دیانتدار اور محنتی عملہ کی خدمات ناقابل تردید ہیں۔

سیونگز سرٹیفکیٹ دنیا کے تمام ترقی یافتہ ممالک قومی سرمایہ کا تحفظ، بچت کی اسکیمیں اور تعمیری منصوبوں میں افراد قوم کو حصہ لینے کی سہولتیں بہم پہنچاتے ہیں ـــــ چنانچہ حکومت پاکستان بھی وقتاً فوقتاً قومی قرضے اور سیونگز سرٹیفکیٹ جیسی مفید اسکیموں کو جاری کر کے عوام و خواص کو ان میں سرمایہ لگانے کی دعوت دیتی رہتی ہے۔ اس طرح نہ صرف سرمایہ محفوظ رہ کر قوم کے افادی اور تعمیری منصوبوں میں لگایا جاتا ہے بلکہ سرمایہ جمع کرنے والوں کو مقررہ مدت کے بعد اپنے سرمایہ پر منافع بھی ملتا رہتا ہے۔ مستقبل کے بارے میں سوچنا۔ ہر زندہ قوم کے ہر فرد کا اولین فرض ہے اور سرمایہ کے تحفظ کا بہترین ذریعہ سیونگز سرٹیفکیٹ کی خریداری ہے۔ جو پاکستان میں ہر جگہ پوسٹ آفسوں سے

دستیاب ہو سکتے ہیں۔

باٹا جفت سازی میں باٹا کا نام ساری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ عظیم صنعتی ادارہ اپنی قدامت، اپنے ماہرین فن اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کے لیے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سستے آرام دہ اور مضبوط جوتوں کی تیاری اس ادارہ کی چند مسلمہ خصوصیات ہیں۔ ہر عمر کے لوگوں کے لیے اور ہر موسم کے لیے باٹا شو کمپنی جوتے تیار کرتی ہے اور نہایت خوبصورت اور آراستہ دوکانوں پر اپنے مقررہ ایجنٹوں کے ذریعہ بڑے سلیقہ سے انھیں فروخت کرتی ہے۔ پاکستان میں باٹا پور (لاہور) جوتوں کی تیاری کا سب سے بڑا مرکز ہے جہاں تجربہ کار عملہ نہایت محنت و جانفشانی سے پاکستانی عوام کی ایک بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لگاتار کام کرتا رہتا ہے۔ باٹا کے جوتے ہر طبقہ میں یکساں مقبول و پسندیدہ ہیں۔

ہمدرد دواخانہ طبی اداروں میں ہمدرد کی شہرت، نیکنامی، عوام الناس کی خدمت جدید سائنٹیفک طریقوں سے ادویہ کی تیاری اور ادارہ کے اعلیٰ انتظامات کا سہرا صرف حکیم محمد سعید صاحب دہلوی کی ذاتی دلچسپی اور ان کے خصوصی انہماک کا نتیجہ ہے۔ حال ہی میں اس ادارہ نے بچوں کی مشہور دوا "نونہال" "گو حیاتین آمیز" کر کے ترقی کی طرف ایک اور مثالی قدم بڑھایا ہے۔ "نونہال" کے علاوہ ہمدرد کی تیار کردہ "صافی" "شربت" "روح افزا" اور "سعالین" بھی ہر طبقہ میں مقبول ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمدرد کی تیار کردہ سینکڑوں دیگر ادویہ جو ہماری روزمرہ کی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ نہایت مناسب قیمتوں پر ہمدرد دواخانہ کی جگہ جگہ قایم شدہ شاخوں اور مقررہ اسٹاکسٹوں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمدرد اس ملک کا سب سے بڑا طبی ادارہ ہے۔ جو عوام کی صحت جیسی بنیادی ضرورت کی تکمیل میں قابل ستائش خدمات انجام دے رہا ہے۔

پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ سگریٹ سازی کے سلسلہ میں پاکستان ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ کا نام ایک سند کی حیثیت رکھتا ہے اس کارخانہ میں عوام و خواص کے معیار زندگی کے مطابق سستی اور قیمتی ہر قسم کی سگریٹیں ماہرین فن کی نگرانی میں تیار کی جاتی ہیں۔ دنیا کی مشہور سگریٹ ساز کمپنی ڈبلیو۔ ڈی۔ اینڈ ایچ او وِلس، برسٹل اینڈ لندن کے جانشین کی حیثیت سے پاکستان ٹوبیکو کمپنی نے سگریٹوں کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا ہے۔

پلیرز نمبر تھری، تھری کیسلس، گولڈ فلیک، پلیرز میڈیم، کیپسٹن، سیزرس، برکلے، پاسنگ شو، پیلا ہاتھی اور کنگ اسٹارک اس کارخانہ کی وہ مشہور سگریٹیں ہیں جنھیں پاکستان میں ہر جگہ ذوق و شوق سے استعمال کیا جاتا ہے اور یہی اس کارخانہ کی سگریٹوں کی پسندیدگی اور مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ یہ تمام سگریٹیں پاکستان میں ہی ماہر اور تجربہ کار افراد کی نگرانی میں تیار کی جاتی ہیں اور پاکستان بھر کی ضروریات کو بڑے پیمانہ پر صرف یہی کارخانہ پورا کرتا ہے۔ اور جہاں تک ہمارے علم میں ہے اس کارخانہ کی وسیع سپلائی، عوام کی ضروریات کی تکمیل اور اعلیٰ انتظام کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر عشرت حبیب اللہ صاحب کی ذاتی دلچسپی اور خصوصی توجہ کا نتیجہ ہے۔

آئی۔ ایم سلک ملز لمیٹڈ اور ممتاز احمد سلک ملز پاکستان میں آرٹ سلک فیبرکس تیار کرنے والے یہ دونوں مشہور کارخانے قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان ملوں کے تیار کردہ سلک فیبرکس میں کریپ ساٹن۔ بروکیڈس، موتی چور، وائل، ڈور لیڈی ہیملٹن۔ بوسکی۔ جارجٹ قابل ذکر ہیں۔

آئی ایم سلک ملز کا بروکیڈس، موتی چور اور لیڈی ہیملٹن، اور ممتاز احمد سلک ملز کا ساٹن اور بروکیڈ خصوصیت کے ساتھ ہر طبقہ میں کافی مقبول ہیں۔ آئی ایم سلک ملز کا قیام ۱۹۵۱ء میں ہوا تھا۔ میکرس اینڈ کمپنی اس ملز کے مینجنگ ایجنٹس ہیں۔ سیٹھ ای۔ آئی میکر مینجنگ ڈائرکٹر اور میسرز احمد ملے کریم، قاسم ای چھاپرا اور طاہر میکر اس کے ڈائرکٹرس ہیں ان حضرات کی خصوصی توجہ سے آئی ایم سلک ملز روز افزوں ترقی کر رہا ہے اس ملز کے تیار کردہ سلک کی بازار میں کافی مانگ اور کھپت ہے۔

ممتاز احمد سلک ملز ۱۹۵۰ء میں قایم ہوا تھا۔ میسرز میاں محمد حاجی عبدالرحیم اور عبدالکریم عبدالرحیم اس ملز کے مالکان ہیں انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس ملز کا تیار کردہ سلک فیبرکس ہر لحاظ سے معیاری اور پسندیدہ ہے۔

کوہ نور کیمیکل کمپنی

اس مشہور کمپنی کا قیام ۱۹۳۲ء میں ہوا تھا۔ دہلی اور کلکتہ اس کمپنی کے ابتدائی مرکز تھے۔ جہاں تبت سنو کے علاوہ تیل اور خضاب وغیرہ کی تیاری اعلیٰ پیمانہ پر کی جاتی تھی۔ ۱۹۴۹ء سے کوہ نور کیمیکل کمپنی نے وسیع انتظامات کے ساتھ کراچی میں کام شروع کیا۔ اور بہت تھوڑے ہی عرصہ میں تبت سنو، کولڈ کریم، ٹالکم پاؤڈر سینٹ ہر قسم کے روغنیات، تیل پالش خضاب اور دیگر سامانِ آرائش تیار کر کے پاکستان کے عوام و خواص کو دیگر ممالک کے سامان آرائش سے تقریباً بے نیاز کر دیا۔ کوہ نور کیمیکل کمپنی نے اپنی مصنوعات کو ہر لحاظ سے بہتر بنا کر اور ان کی کم سے کم قیمتیں اور کم سے کم منافع وصول کر کے صنعتی نقطۂ نگاہ سے ملک کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ اس کمپنی کے روح رواں میسرز محمد الیاس اور محمد عثمان اللہ والے ہیں جو اتنی کامیابی، نیکنامی اور شہرت و معیار کے ساتھ اس صنعتی ادارہ کو فروغ دے رہے ہیں اور مسلسل اپنی مصنوعات میں نہ صرف اضافہ کر رہے ہیں بلکہ ماہرین فن کی نگرانی میں برابر تجربات بھی کرا رہے ہیں تاکہ وہ غیر ملکی مصنوعات کے مقابلہ میں زیادہ بہتر زیادہ معیاری اور زیادہ سستی مصنوعات کی تیاری سے ملک کی ضروریات کو بآسانی پورا کر سکیں۔ آج بھی اس کمپنی کا تیار کردہ تبت سنو، پاؤڈر خضاب اور تیل وغیرہ پاکستان کے ہر حصہ میں اپنی عمدگی اور قیمت کم ہونے کی وجہ سے بے حد مقبول و پسندیدہ ہے

کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز اور ذوالفقار انڈسٹریز

پاکستان کی صنعتی ترقی میں دیگر اداروں کی طرح کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز اور ذوالفقار انڈسٹریز نے بھی صابن سازی کے سلسلہ میں ملک کی بیش از بیش خدمت کی ہے اور عوام کے لیئے ہر قسم کے صابن تیار کر کے ملک کو خود مکتفی بنانے کا فرض نہایت خوش اسلوبی اور جانفشانی سے انجام دیا ہے۔

کریسنٹ پاک سوپ اینڈ آئل ملز کا قیام ۱۹۵۰ء میں ہوا تھا۔ قاضی محمد ابراہیم صاحب پروپرائٹر کی خصوصی توجہ اور ان کے ماہر عملہ کی لگاتار محنت کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک قلیل مدت ہی میں اس صنعتی ادارہ نے کئی اچھے صابنوں کو مقبول عام کر دیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پام روز (ٹائلیٹ سوپ) سیف گارڈ (نہانے کا صابن) البرق (کپڑے دھونے کا صابن) عوام و خواص میں یکساں پسند کیئے جاتے ہیں۔ آئندہ پروگرام میں ڈی جرما (میڈیکیٹیڈ سوپ) جس میں ۱۱۔ G شامل ہے بازار میں لایا جا رہا ہے۔ اس ادارہ کو مسٹر لوگز امشہور آرٹش کیمسٹ کا پورا تعاون حاصل ہے۔ جن کی خصوصی نگرانی میں کریسنٹ پاک سوپ کے صابنوں کی تیاری کی جاتی ہے۔

ذوالفقار انڈسٹریز ۱۹۴۹ء سے صابنوں کی تیاری کر رہا ہے میر ذوالفقار علی صاحب میونسپل کاؤنسلر اس کے مالک ہیں۔ آپ ایک مخلص قومی کارکن کی حیثیت سے کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ کی خصوصی توجہ اور ذوالفقار انڈسٹریز کے نگران اعلیٰ سید رؤف علی صاحب کی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر یہ صنعتی ادارہ بہتر سے بہتر صابنوں کی تیاری کر رہا ہے۔ للی (کریم ٹوائلٹ سوپ) گلفام۔ کیمیا۔ جس میں 4 - G شامل ہے۔ للی سوپ فلیکس اشنان ٹوائلٹ سوپ کے علاوہ ڈائمنڈ بار سوپ۔ ۲۵۵۔ ۵۵۵ (کپڑے دھونے کے صابن) ذوالفقار انڈسٹریز کے چند مشہور اور مقبول صابن ہیں۔ اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ پاکستان میں صابن سازی کے سلسلہ میں ہمارے صنعت کار ملک کے عوام کی ضروریات کے مطابق نہایت معیاری اور کم قیمت صابن تیار کر کے عوام اور خواص کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔

طبیی دواخانہ یونانی

برصغیر ہند و پاک کے طبی اداروں میں۔ قدامت، کارکردگی اور معیار کے لحاظ سے طبیی دواخانہ کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ ۱۸۱۵ء سے اس دواخانہ کا آغاز ہوا۔ ابتداً اندور میں بڑے پیمانہ پر کام شروع کیا گیا اور صحیح توازن کے ساتھ مرکبات و مجربات کی تیاری میں اس دواخانہ نے جلد ہی شہرت حاصل کر لی۔ ۱۹۳۴ء میں طبیی دواخانہ کی ایک برانچ بمبئی میں بھی قایم کی گئی اور وہاں بھی سابقہ معیار کو برقرار رکھ کر عوام الناس کی بیش از بیش خدمت کی گئی۔ تقسیم ملک کے بعد طبیی دواخانہ کے مالک حکیم محمد علی طبیی صاحب جن کی اعلیٰ صلاحیت سوجھ بوجھ، اور قدیم و جدید طب پر وسیع معلومات سے طبیی دواخانہ نے شہرت اور نام پیدا کیا تھا پاکستان آگئے اور کراچی میں آپ نے طبیی دواخانہ کو قائم کر کے اس کی دیرینہ روایات کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ ان روایات کو کچھ آگے بھی بڑھایا۔

حکیم محمد علی طبیی صاحب آصفیہ طبیہ کالج گورنمنٹ بھوپال کے سند یافتہ اور گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ فن طب پر وسیع معلومات اور دیرینہ

تجربہ کی بنا پر طبیبی دواخانہ کراچی نے بھی تھوڑے ہی عرصہ میں ہر طبقہ میں شہرت و مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ دواخانہ میں آپ کی خصوصی نگرانی میں جدید سائنٹفک طریقوں پر صحیح اوزان کے ساتھ مرکبات و مجربات تیار کیے جاتے ہیں۔ طبیبی دواخانہ کی مشہور پیٹنٹ ادویہ شاہی کمال معجون مقوی، حب اکبری بہترین اجزاء اور نفیس پیکنگ کے ساتھ مناسب قیمتوں پر ہر جگہ مل سکتی ہیں۔

حیدر آباد ٹرسٹ

۱۹۵۰ء میں حیدر آباد امداد و آبادکاری ٹرسٹ ۹۰ لاکھ روپیہ اور حیدر آباد امداد باہمی ٹرسٹ ۴۵ لاکھ روپے کے سرمایہ سے قائم کیے گئے جس سے مہاجرین کی عام طور پر امداد و آبادکاری کی گئی۔ اس کے بعد تقریباً ایک کروڑ چودہ لاکھ روپیہ سے ٹرسٹ نے ایک صنعتی پروگرام شروع کیا۔ چنانچہ اس وقت تک پیچ فیکٹری، کلے ورکس، سرامک انڈسٹریز اور ریفریجری پراڈکٹس کا قیام عمل میں آچکا ہے اور ان صنعتی اداروں کی مصنوعات سے ملک کی بیشتر ضروریات کو پورا کیا جا رہا ہے۔ آئندہ پروگرام میں سائیکل فیکٹری کے قیام کے سلسلہ میں مشنری وغیرہ حاصل کی جا چکی ہے۔ میر لائق علی صاحب کی نگرانی اور ذاتی دلچسپی کے باعث یہ ٹرسٹ پاکستان کی صنعتی ترقی میں امتیازی خدمات انجام دے رہا ہے۔ کئی شفاخانے اور مدرسے قائم کرنے کے علاوہ ٹرسٹ تعلیمی وظیفے دے کر کئی طالب علموں کو انجینیری اور ڈاکٹری کی تعلیم کے لیئے انگلستان اور امریکہ بھیج رہا ہے جن میں سے بیشتر حصول تعلیم کے بعد پاکستان واپس آکر ملک و قوم کی خدمت کر رہے ہیں۔ حیدر آباد ٹرسٹ کی یہ تعمیری کوششیں یقیناً لائق تحسین ہیں۔

منٹگمری بسکٹ

منٹگمری جیسے زرخیز اور دودھ اور مکھن کے لیئے مشہور علاقہ میں بسکٹ سازی کا کام بہت بڑے پلانٹ پر شروع ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ اس فیکٹری میں تعلیم یافتہ اور تجربہ کار افراد کی نگرانی میں نہایت معیاری اور غیر ملکی بسکٹوں کے مقابلہ میں نہایت عمدہ اور سستے بسکٹ وسیع پیمانہ پر تیار ہوتے ہیں جنھیں عام طور پر پاکستان میں استعمال کیا جاتا ہے اور یہ امر باعث مسرت ہے کہ بسکٹ سازی کے سلسلہ میں ہمارا ملک غیر ممالک سے درآمد ہونے والے مہنگے بسکٹوں سے تقریباً بے نیاز ہو چکا ہے۔ فیکٹری کے ارباب حل و عقد نے اب تک جتنی بھی منٹگمری بسکٹ کی قسمیں تیار کی ہیں وہ ہر طبقہ میں یکساں پسند کی گئی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ ان کا تیار کردہ "نائس" بسکٹ اپنی نفاست، لذت اور عمدگی کے لحاظ سے بہت زیادہ مقبول ہے۔

سپر بلاک

بلاک سازی۔ نشر و اشاعت اور صحافت و ادب کی توسیع و ترقی کے سلسلہ کی ایک بنیادی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ پاکستان میں عموماً اور کراچی میں خصوصاً بلاک سازی کا کام روز افزوں ترقی پذیر ہے۔ سپر بلاک ایک قدیم بلاک ساز ادارہ ہے جس میں تجربہ کار اور ماہرین فن کی نگرانی میں بلاک سازی کا کام کیا جاتا ہے۔ اس نوع کے اداروں میں اعلیٰ کارکردگی، وقت کی پابندی اور صحیح اصول کار ہی ترقی کی ضمانت ہوتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ سپر بلاک کے کارکنان ان صفات سے متصف ہیں اور ہر قسم کے رنگین و سادہ بلاک نہایت نفاست اور وقت کی پابندی کے ساتھ مناسب اجرت پر تیار کر کے ادب و صحافت کی مقدور بھر خدمت کر رہے ہیں۔

پی۔ آئی۔ آئی۔ ایف

کراچی میں بین الاقوامی نمائشوں کو آغاز کرنے کا سہرا ملک کے ذہین مستعد اور تجربہ کار نوجوان مسٹر ایس۔ ایم جمیل چیف آرگنائزر کے سر ہے جنہوں نے اس سے پہلے دو بار نہایت وسیع پیمانہ پر اور اعلیٰ انتظامات کے ساتھ بین الاقوامی نمائشیں کر کے کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ اب انھیں کی شبانہ روز کوششوں اور حکومت پاکستان کے مکمل تعاون کے نتیجہ میں تیسری بین الاقوامی نمائش ۱۶ ستمبر سے شروع ہو رہی ہے جو ایک ماہ تک جاری رہے گی۔ اس میں ۱۴ ملکوں نے شرکت کی ہے اور وسیع جگہوں پر اپنے اپنے ملکوں کی مصنوعات کو نمائش کے لیئے پیش کر رہے ہیں۔ اس نوع کی نمائشوں سے پاکستان کو صرف بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ بلکہ اس طرح ساری دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں سے اس کا قریبی ربط و تعلق بھی پیدا ہو گیا ہے۔ تیسری بین الاقوامی نمائش پچھلی دو بین الاقوامی نمائشوں کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے زیادہ بڑی، زیادہ نمائندہ اور زیادہ حسین و پُرکشش ہے۔

کریٹو آرٹ اسٹوڈیوز

یوپی کے ایک مشہور خاندان کے نوعمر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آرٹسٹ حسن بیگ صاحب اس آرٹ اسٹوڈیوز کے خالق

ہیں۔ وہ کامرشیل آرٹ میں لکھنؤ اور کراچی کے کئی مقابلوں میں بڑے انعامات حاصل کر چکے ہیں ان کی پینٹنگس میں بڑی کشش اور جان ہے اور ان کے موئے قلم میں قدرت نے جو اثر آفرینی اور ندرت پیدا کی ہے اسے دیکھتے ہوئے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں ملک کے بڑے آرٹسٹوں میں ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہوں گے۔

زنجیر پاکستان کے قیام سے پہلے ہندوستان کی صنعت فلمسازی میں مسعود ایک بڑے فلم آرٹسٹ کی حیثیت سے کافی مشہور تھے گذشتہ تقریباً پانچ سال سے وہ لاہور میں ہیں اور اب انھوں نے جے۔ ایم۔ ایس پروڈکشنز کے نام سے اپنے ذاتی فلمساز ادارہ کا آغاز کر دیا ہے۔ اس ادارہ کے تحت پہلی فلم "زنجیر" تکمیل کے آخری مراحل طے کر رہی ہے اور یہ توقع بیجا نہ ہوگی کہ مسعود جیسے تعلیم یافتہ تجربہ کار اور فلمی صنعت کی وسیع معلومات رکھنے والے آرٹسٹ کی زیر ہدایت تیار ہونے والی فلم "زنجیر" پاکستان کی صنعت فلمسازی میں زرین باب کا اضافہ کرے گی۔

نذرانہ سید مرتضیٰ جیلانی کی زیر ہدایت تیار ہونے والی نئی فلم "نذرانہ" جوبلی پکچرز کے توسط سے عنقریب کراچی، سندھ و بلوچستان میں نمائش کے لیے پیش کی جا رہی ہے۔ اطلاعات کے بموجب یہ کہا جا سکتا ہے کہ "نذرانہ" اپنے موضوع اور پیشکش کے لحاظ سے پاکستان کی ایک معیاری اور پسندیدہ تصویر ہوگی۔

☆

نقش ہیں سب ناتمام .....

(صفحہ ۳۳۵ سے آگے)

کرتا تھا تمہارے آگے پیچھے سب بھوپال چھوڑ گئے۔ احسن گئے، فخری گئے۔ جان نثار گئے، کیف گئے سب ہی تو چلے گئے۔ یوں ہی بلبل روتا ہوں۔

تم نے بہت دن ہیں مجھے یاد کیا۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ یکسر بھلا تو نہیں دیا۔ کبھی کبھی خط لکھتے رہا کرو۔ دوست

تمہارا اپنا

اختر سعید

(بھوپال)

Rs 1,00,000
ایک لاکھ روپے کے انعامات
۱۰ر ستمبر ــــ ۱۵ر اکتوبر ۵۵
پہلا انعام
شیورلیٹ کار
ماڈل ۱۹۵۵ء
دوسرا انعام
مارس کار ۱۰ ایچ پی ماڈل ۱۹۵۵ء
تیسرا انعام
ہلمین منکس
دو ریڈیو گرام
دو فرج ڈیپ فریزر اور
۲۹۳ دیگر انعامات
بشریٰ
بین الاقوامی صنعتی نمائش
۱۹۵۵ء
زندگی میں بڑے بڑے انعامات حاصل کرنے کے مواقع قسمت ہی سے میسر آتے ہیں لیکن یہ عظیم الشان نمائش ہمیشہ کی طرح اس بار پھر اپنی گوناگوں دلچسپیوں کے علاوہ ایک لاکھ روپے کے تین سو بیش قیمت انعامات کی پیش کش کرتی ہے۔ اس نمائش کے سیزن ٹکٹ کی قیمت صرف دس روپے ہے جس میں ایک انعامی کوپن کے علاوہ تیس داخلے کے کوپن ہیں جن پر آپ اس پرشکوہ نمائش کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔ انعامی کوپن کے لکی نمبروں پر ۳ موٹر کاریں اور ۲۹۷ دوسرے انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔
آپ کے لئے انعامات حاصل کرنیکا یہ زرّین موقع ہے
آج ہی اپنے سیزن ٹکٹ خرید کر انعامات کے امیدوار بن جائیے
ایس ایم جمیل چیف آرگنائزر ـ پی۔ آئی۔ ایف
ادریس چیمبرز ـ ۱۴ وڈ اسٹریٹ کراچی ـ فون نمبر ۳۳۳۲۱

نائس بسکٹ سے
چاء اچھی ہو جاتی ہے

کوئی شک نہیں کہ معمولی چاء مفرح مشروب ہے
لیکن چند بسکٹ اس کی عمدگی میں اضافہ کر دیتے
ہیں "نائس" بسکٹ آپ کی چاء کو اور زیادہ عمدہ
بنا دیں گے۔ آج یا جب جی چاہے ایک بار آزمائش کیجئے

منٹگمری
بسکٹس

ایجنٹس:-
پاکستان ٹکس کارپوریشن
موتی بلڈنگ، بندر روڈ، کراچی

KAYS

(صہبا لکھنوی، مدیر، طابع و ناشر نے ادبی پریس میں چھپوا کر دفتر افکار، بندر روڈ
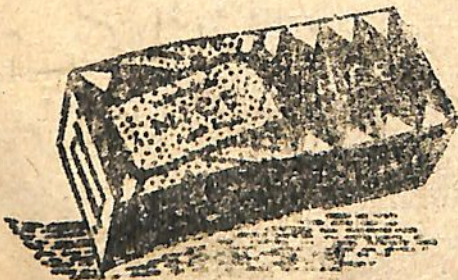
آرٹ، زندگی ہے

زندگی، حُسن ہے

حُسن، تخلیق ہے

Creative Art Studio

stablished 1945

Head Office:
dabistan, I'dgah, Bunder Road,
Karachi-1.

Regd. S. No. 1902

Sub-Offices:
Quetta, Lahore, Dacca,
Calcutta, Bombay, Bhopal.

AFKAR

Vol. II ——★ 10th ANNIVERSARY NUMBER, 1955 ★—— No. 49-50

Only Title printed at The New Tide Printing Press, McLeod Road, Karachi,